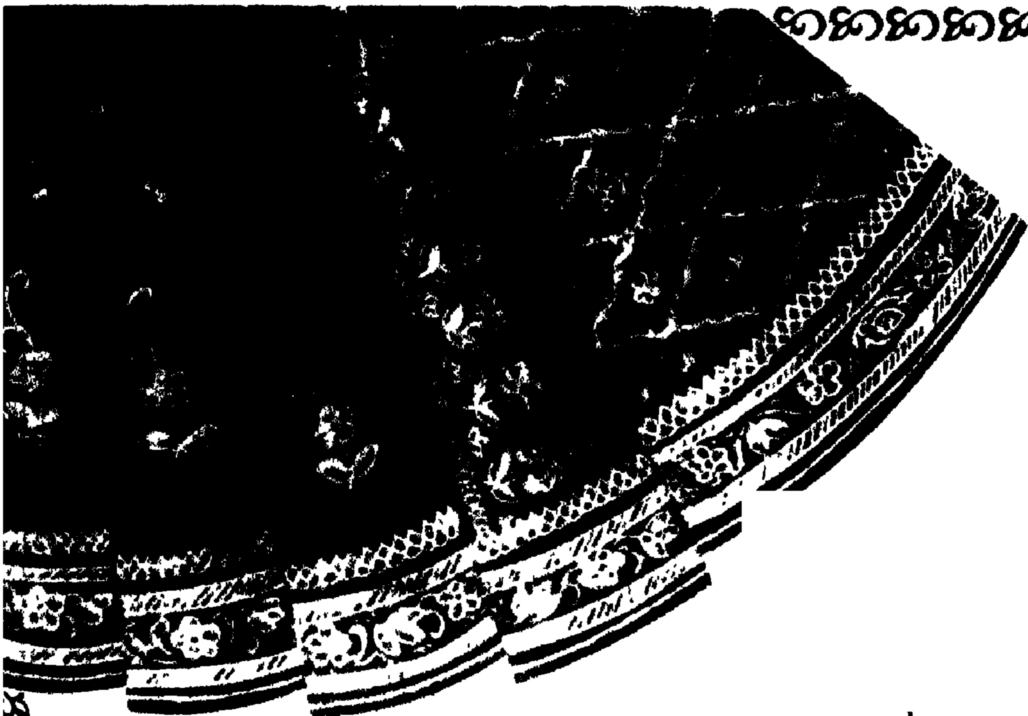
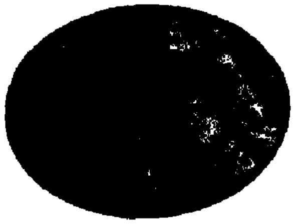


اعلیٰ درجے کی ساریوں کا تازہ ترین اسٹاک



• فینسی پاٹولا • پیور سلک • بالوچری

• کانتھا اسٹچ • کوراسلک • کنجی ورم • گودوال

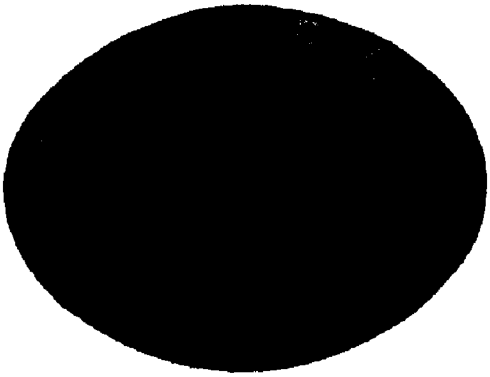


• ساؤتھ سلک • راجکوٹ سلک • گھرچولا • پانیز

• جامیوار • پرنٹڈ کریپ • پرنٹڈ شفون • شیاموئے

ساٹن • بنی کریپ • ٹسیل کے ساتھ گیریجا سلک

• گوری سلک اور بنارسی کے دیگر اسٹاک



NAURATANS
SAREE EMPORIUM

نورتنس ساری ایمپوریم

ایورسٹ ہاؤس

۳۶ سی، چورنگی روڈ، کلکتہ-۷۰۰۰۷۱ • فون: ۲۴۲-۲۲۶۲

- احمد سعید ملیح آبادی نمبر
- ادیبوں کی حیاتِ معاشقہ نمبر
- قمر رئیس نمبر
- انشاء عالمی اردو افسانے نمبر
- صدی شمارہ
- اسکنڈے نیویائی ادب نمبر
- نیاز فتحپوری نمبر

اور کئی خصوصی گوشوں کی کامیاب اشاعت پر

ماہنامہ انشاء

کو دلی مبارکباد!!

جمال الدین احمد صدیقی

نیاز فتحپوری نمبر

NIAZ FATEHPURI NUMBER

قیمت عام شمارۂ انشاء : ۸روپے (اندرون ملک)

زرسالانہ : ۹۰روپے (اندرون ملک)

Price of Ordinary Issue : Rs. 8/- (In India)

Annual Subscription : Rs. 90/- (In India)

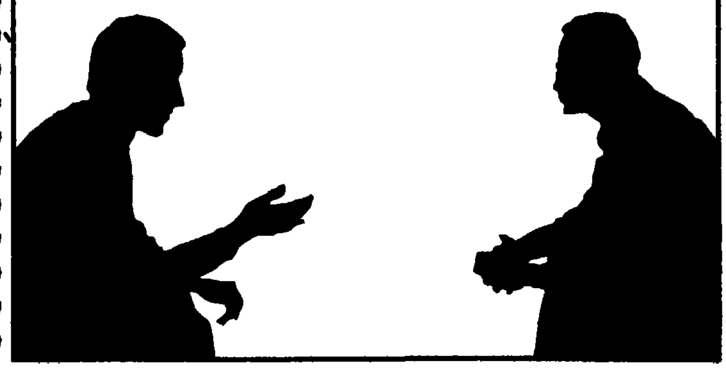
£ 12 or US $ 20 (Abroad)

Price of Niaz Fatehpuri Number : Rs. 200/- (in India)

£ 15 or US $ 22

(Abroad)

(By registered airmail)



اِنشاء

ISSN : 0971-6009

جلد : ۱۲	شمارہ : ۱	جنوری ۱۹۹۷

رہنما : احمد سعید ملیح آبادی

ڈاکٹر قمر رئیس

مدیر : ف۔ س۔ اعجاز

مجلس مشاورت : محمد امیر الدین

افضل اقبال

آرٹ : ثاقب فیروز

انشاء گرافکس

۶۔اے، کنائی سیل اسٹریٹ

کلکتہ۔۷۰۰۰۷۳

فون : ۲۵-۳۱۰۷

CARE :

Drafts / Cheques are accepted in favour of

"M/S. INSHA PUBLICATIONS"

(U.K. Subscribers are advised to send bearer B.P.O.)

Mailing Address.

MAHNAMA INSHA

Insha Publications

25-B, Zakaria St ,

Calcutta -700 073 (India)

Phone : 25-4616 ● Fax : 247-8063

فہرست

فہرست

یہ ہے نیاز فتحپوری نمبر

"نیاز فتحپوری نمبر" حاضر خدمت ہے۔

نیاز فتحپوری کیا نہیں تھے۔ شاعر، افسانہ نگار، ناقد، محقق، مورخ، صحافی، مترجم، عالم دین بہت کچھ تھے۔ مجموعی طور پر کہا جائے تو وہ علم کا سمندر اور کوہ شکن افکار کے مالک تھے۔ علامہ نیاز غالباً پہلے اردو ادیب و صحافی تھے جنہوں نے ادب و صحافت کو پیشہ سمجھ کر اختیار کیا اور یہ پیشہ انہیں راس بھی آگیا۔ انہوں نے اپنے موقرادبی جریدہ "نگار" اور اپنے ادب عالیہ کو ذریعہ معاش بنایا۔ ان کا یہ ذریعہ معاش ہی ان کا ذریعہ عزت و شہرت بھی بنا۔ انھیں حکومت ہند نے ۱۹۶۲ء میں پدم بھوشن کے خطاب سے نوازا تھا۔ افسوس کہ وہ پاکستان منتقل ہوگئے جہاں ۲۴/ مئی ۱۹۶۶ء کو ان کا ۸۲ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔

نیاز کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے سرسید اور شبلی نعمانی کے علاوہ رابندر ناتھ ٹیگور، مہدی افادی اور ابو الکلام آزاد کی تحریروں کا اثر قبول کیا۔ تفصیلی مطالعہ اس نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ نیاز مذہب کے معاملے میں سرسید کے ہمنوا تھے اور شاعری اور نثر میں وہ علامہ شبلی سے متاثر نظر آتے تھے۔ اگرچہ سرسید ملی ریفارمر تھے، ان کا مقصد انسٹی ٹیوشنل تعلیم میں انقلاب برپا کرنا تھا جب کہ نیاز سرسید کے برخلاف ایک ذہنی انقلاب پسند ثابت ہوئے۔ وہ سیاسی تبدیلی سے زیادہ افراد اور سماج کی فکری اور ذہنی تبدیلی میں دلچسپی لیتے تھے۔ ان کی اجتہادی زندگی ذہنی ظلمت پرستوں کے خلاف ایک بغاوت تھی۔ ناعاقبت اندیش مولویت کے وہ کٹر دشمن تھے۔ اس میدان میں ان کا مناظرہ ایک نعرۂ مستانہ کے ساتھ شروع ہوا کرتا تھا اور اکثر نیاز صاحب کو ان کے علمی و فکری اجتہاد کے جرم میں ملا لوگ باغی، اسلام اور کافر قرار دیتے رہے۔ لیکن نیاز نے ایسے الزامات کی کبھی پرواہ نہ کی۔ وہ ہر آگ کے دریا کو پار کر گئے۔ وہ ایک روشن خیال، صحیح العقیدہ اور مضبوط مسلمان تھے جسے خدا کی ہستی اور مقصد کائنات اور نکات کلام الہیٰ سے رسمی نہیں بلکہ عقلی و روحانی دلچسپی تھی۔ جس کے نزدیک "روشن آیتیں" خاص مفہوم اور معنی رکھتی تھیں۔

نیاز عورت کو فطرت کی بہترین تخلیق قرار دیتے تھے۔ اگرچہ وہ اپنے بندگی کے تصور کے ہاتھوں مورد الزام ٹھہرائے جاتے رہے مگر عورت کے بارے میں ان کے خیالات ان کی شہرت میں چار چاند لگا گئے۔ ظاہر ہے اس طرح بھی ایک طبقہ کو ان کے ساتھ برسرپیکار رہنا تھا۔ سچ یہ ہے کہ مذاہب عالم کا عمیق مطالعہ اور تقابلی جائزہ نیز معلومات نفسیات و جنسیات اور اس پر مستزاد فلسفہ، تاریخ و منطق کے شعبوں میں انہیں جو کامل دستگاہ تھی اس نے انھیں عمر بھر متحرک رکھا اور وہ اپنے مخالفین کے لیے قابل رشک بھی بنے رہے اور دہشت ناک بھی۔

علامہ نیاز کے بارے میں بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہوتی رہیں یا کی جاتی رہیں۔ آج ان کے سیاسی، مذہبی اور تنقیدی افکار کو عصری مسائل کے تناظر میں دیکھا جائے تو بہت سی غلط فہمیاں دور ہو سکتی ہیں۔ خود تنقید نیازی میں مشمولہ استدلال و جواز ان کج فہمیوں کا ازالہ کر دیتے ہیں۔ نیاز صاحب اپنے معاصرین میں مولانا آزاد کے خاص قدرداں تھے۔ اگرچہ دونوں کا ذوق علمی ایک نہیں تھا اور نہ طبیعتیں اور رجحانات یکساں تھے۔ دونوں کے حالات اور دلچسپیوں کے موضوع ایک دوسرے سے الگ تھے۔ ایک مقام تک ساتھ چلنے کے بعد دونوں اپنی اپنی الگ راہ پر چل نکلتے ہیں۔ نیاز کی تنقید کا وضاحتی، فہمائشی اور ایمائی انداز مولانا آزاد کے خطیبانہ لہجے سے الگ ابھر رکھتا ہے۔ شاید اس کا سبب یہ ہو کہ مولانا آزاد ایک جید عالم دین، مفسر قرآن اور صاحب طرز مدیر ہونے کے ساتھ سیاسی قائد بھی تھے اور حب الوطنی کے علمی جذبے سے زیادہ سروکار رکھتے تھے۔ وہ جدوجہد آزادی کے سپہ سالاروں میں سے تھے۔ انھیں قدم قدم پر قومی، سیاسی اور ملی قیادت کا بحران دور کرنے میں گہری دلچسپی تھی۔ چنانچہ ان کی تحریروں میں ایک خاص قسم کی خطابت اور تقریروں والی سرجوشی کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ البتہ "غبار خاطر" میں ان کی طبیعت کی شوخی البیلی شگفتگی لیے ہوئے سامنے آتی ہے۔

اور ان کی عادت کے برخلاف لفظی ثقالت انشائے لطیف کا پیرایہ اختیار کر لیتی ہے۔

نیاز کی تحریریں منطق و استدلال سے اپنا اسلوب تیار کرتی ہیں۔ جہاں جہاں ان کی فکری توانائی سنجیدگی اور منطقیانہ انداز سے گزر کر انشائے لطیف کے دائرے میں داخل ہوئی ہے وہاں ان کے قلم کی جولانی اور طبیعت کی شوخی غالب کے خطوں کی سی ہو جاتی ہے۔ ہاں ایک رومانیت کا اضافہ اس میں ضرور ہو جاتا ہے۔ مکتوبات نیاز ایک خاصے کی چیز ہیں اور ان میں طنز و ظرافت کے رنگ نمایاں ہیں۔ کہیں کہیں کہسار تحریر پر ان کا تخئیل ایسا تابندہ نظر آتا ہے جیسے بھادوں کی ہلکی پھواروں کے بیچ ہنستی کھلتی دھوپ میں قوس قزح اٹھی کمان کا جادو جگا رہی ہو۔ اور پھر نثری تحریروں میں اشعار کا برجستہ استعمال لطیف تحریر کو حسین تر بھی بنا دیتا ہے۔

نیاز ادب اور شاعری میں علامہ شبلی سے زیادہ متاثر بتائے جاتے ہیں لیکن ایسا نہیں ہے کہ کسی ایک وجہ سے ان کی طبیعت کسی ایک طرف زیادہ مائل ہو گئی ہو۔ یوں تو انگریزی، فارسی، عربی اور ترکی زبانوں سے وہ آگاہ تھے اور تمام ادب کے مزاج دان بن چکے تھے لیکن ٹیگور کی گیتانجلی کا تخئیل اور فضا کا اجلا پن ان کی ان نثری تحریروں میں قدرے رچ بس گیا تھا جو انھوں نے گیتانجلی کے اردو ترجمے کے بعد دیں۔ مجموعی طور پر تنقید میں انھوں نے ایک باغیانہ روش اختیار کی جو ان کے گہرے مطالعہ کے ساتھ ساتھ ان کے اٹل نظریوں اور حوصلوں پر مبنی تھی۔ کبھی کبھی ان کی ذاتی پسندیدگی کے زیر اثر مرتب کی گئی تنقید نے شاندار کامیابی حاصل کی۔ جیسے اپنے حلقے میں غالب کے مقابل مومن کو وہ بڑا شاعر منوانے میں کامیاب ہو گئے یا ظفر کی شاعری کے بارے میں ان کی رائے کامیاب اور متوازن مان لی گئی۔ اس کے برعکس اصغر گونڈوی کی شاعری پر نیاز صاحب نے جس قدر لکھا وہ جوش کی فراوانی کا نتیجہ تھا یا جگر کے بارے میں ان کی ذاتی ناپسندیدگی ان کی تنقید پر حاوی ہو گئی۔ اس کے باوجود ان کی ایسی تحریریں معانی و مطالب سے یکسر عاری نہیں کہی جا سکتیں۔

جہاں تک ان کی شاعری کا تعلق ہے انھوں نے زبردست طبع موزوں پائی تھی اور کلاسیکی شاعری کی طرح لفظوں سے وہ اچھی آنکھ مچولی کھیل سکتے تھے اور پہلو بدل بدل کر شعر کہنے کی صلاحیت ان میں تھی۔ ان کی یہ صلاحیت بھوپال کے طرحی مشاعرے میں خاص طور پر سامنے آئی جب انھوں نے ایک مصرعۂ طرح پر کئی کئی غزلیں کہہ ڈالیں۔ انھیں اگرچہ بڑا شاعر کبھی نہیں مانا گیا اور کہنے والوں نے یہ کہہ کر اپنی بھڑاس نکالی کہ شاعری کی ناکامی نے انھیں تند مزاج کا نقاد بنا دیا ہے۔ ممکن ہے اس میں کچھ سچائی ہو لیکن ان کی شاعری خصوصاً غزلیں زبان و بیان کی مہارت ثابت کرنے تک محدود نہیں تھیں ان میں مضامین کا تنوع بھی پایا جاتا ہے۔ فکر اور احساس اور جذبے سے پر ان کے کئی اشعار سامع یا قاری کی طبیعت پر اچھا اثر چھوڑتے ہیں یہ شعر دیکھئے

اک طرف ہے چشم گریاں اک طرف ابر بہار
دیکھنا یہ ہے کہ کس سے کتنا رویا جائے ہے

نیاز کے افسانے قابل ذکر ہیں۔ وہ اردو افسانے کے جنم داتاؤں میں سے ہیں۔ اردو افسانہ ان کے دور میں اپنے قالب کی تلاش میں تھا۔ سجاد حیدر یلدرم، منشی پریم چند، نیاز افسانے کی نیو رکھ رہے تھے۔ نیاز صاحب نے مغربی افسانوں کا کافی مطالعہ کیا تھا۔ چنانچہ ان کے افسانے "شہاب کی سرگزشت" ۔ "ایک شاعر کا انجام" ۔ "صحرا کا گلاب" وغیرہ جنھیں اس زمانے میں مقبولیت تو بے شک حاصل ہوئی مگر وہ بدیشی فلسفہ و فکر سے بوجھل نظر آتے ہیں۔ اس کے باوجود نیاز کے افسانوں کی طرف مراجعت کے بغیر اردو افسانے کی تاریخ مرتب نہیں کی جا سکتی۔ بعض نقادوں کی رائے ہے کہ نیاز بدیسی زبانوں کے تراجم اپنی تخلیق کے طور پر پیش کر دیتے تھے۔ یہ بہرحال اب تک ثابت نہیں ہے کہ نیاز کے افسانوی کرداروں کی سوچ بدیسی افسانوں سے مستعار لی گئی تھی یا خود نیاز شدید طور پر بدیسی افسانوی ادب کے زیر اثر تھے۔ لہٰذا نیاز نے اپنے افسانوں کے قارئین کی لاعلمی یا اردو افسانے کے صنفی بحران سے کس قدر فائدہ اٹھایا اس کا تعین خود ناقدین کی صوابدید پر منحصر ہے۔

نیاز صاحب کی ادارت میں شائع ہونے والا رسالہ "نگار" نیاز کے نام اور اردو ادبی صحافت کے مقام کو بہت اونچا لے گیا۔ نیاز صاحب کا ادیب اور شاعر ہونا ایک بات ہے اور ان کا صحافی و مدیر ہونا الگ بات ہے۔ نیاز کے علاوہ چند ایک نام صحافت اور ادارت کے سلسلے میں قابل ذکر گردانے جاتے ہیں۔ لیکن نیاز ان معنوں میں لاثانی ہیں کہ وہ جو چاہتے تھے وہی اپنے قارئین کو دیا کرتے تھے اور جب چاہتے بلا شرکت غیرے "نگار" کے پورے پورے شمارے اپنے قلم سے لکھ دیا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ فرضی ناموں سے جادو جگانے اور "فتنہ اٹھانے" کا گر بھی انھیں آتا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ سب اس لیے ممکن تھا کہ وہ ایک پیشہ ور اور نباض وقت صحافی تھے۔ آج زیادہ تر اردو پرچوں کو خام کار صحافیوں کے سہارے اپنی منزلیں طے کرنا پڑ رہی ہیں اس لیے قومی اور علمی دانشوری مات کھا رہی ہے۔ آزاد، محمد علی، ظفر علی خان، نیاز، سلیمان ندوی، ظ انصاری ایسے صحافی اور مدیر تھے جو قارئین کے ہاتھوں صرف اپنی روشنائی اور کاغذ فروخت نہیں کرتے تھے۔ ایسے باکمال لوگ عنقا ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ المیہ یہ ہے کہ نیاز کے بعد خود نیازیات کو نقد کرنے والوں کے ہاتھوں اس ہنر کی صحیح رکھوالی نہیں ہو سکی۔ نیاز صاحب اگرچہ ایک پیشہ ور قلم کار اور صحافی تھے لیکن اپنے پیشے کے بے حد مخلص خدمتگار تھے۔ نیاز کے بعد ظ انصاری مرحوم نے اس خصوصیت کا التزام رکھا اگرچہ وہ نہ کوئی مستقل پرچہ دے سکے اور نہ کسی ایک جریدے سے مستقل طور پر وابستہ رہ سکے۔

"نیاز فتحپوری نمبر" کے لیے مواد کافی مدت میں حاصل ہوا۔ اسے "اسکنڈے نیویائی ادب نمبر" سے قبل شائع ہو جانا چاہیے تھا لیکن اس کے بعد شائع ہو رہا ہے۔ جن قلمکاروں نے اس نمبر کے لیے اپنی نگارشات پیش کیں ان کے ہم ممنون ہیں۔ ماہر نیازیات ڈاکٹر فرمان فتحپوری، مدیر "نگار" پاکستان کا شکریہ ادا کرنا ہم پر واجب ہے کہ انھوں نے اس نمبر کی کامیابی کے لیے اپنی نیک خواہشات کا اظہار فرمایا اور چند مفید مشورے اور نیاز کے جشن طلائی میں پڑھے گئے مقالات کا مجموعہ برائے استفادہ ارسال فرمایا۔ نگار پاکستان کے اس وقیع نمبر سے دو تین مضامین اس نمبر میں شامل کئے جا رہے ہیں۔ مزید تین چار مضامین حضرت نیاز کے بارے میں "نگار" کے پرانے شماروں یا نگار کے نیاز نمبر سے لیے گئے ہیں تاکہ صاحب موضوع کی شخصیت کے خد و خال زیادہ سے زیادہ نمایاں ہو جائیں۔ اور جو قرض ان کی دانشوری کا ہندوستان کے اہل صحافت پر ہے اسے اتارنے کی اولین کوشش کی جا سکے۔ اس وقت ہمارے پیش نظر ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ حضرت جوش ملیح آبادی کے برخلاف حضرت نیاز کے ملک چھوڑ کے جانے کو بہت کم لوگوں نے محسوس کیا کیونکہ وہ خالص علمی اور ادبی آدمی تھے۔ حضرت جوش کی طرح علم و ادب کے علاوہ سیاست اور ایوانہائے امارت و حکومت سے ان کو کوئی تعلق نہ تھا۔ ہماری دلی خواہش ہے کہ دیر آید درست آید کے مصداق صحیح خراج عقیدت انھیں پیش کیا جائے۔ اس کوشش میں ہم کہاں تک کامیاب ہوئے اس کا فیصلہ تو ناظرین ہی کر سکیں گے۔

نمبر کے بیشتر مضامین کی کتابت ۹۴ء میں مکمل ہو چکی تھی جب کہ جنوری ۹۵ء (صدی شمارہ) سے انشاء کمپیوٹر کتابت کے ذریعہ شائع ہونے لگا۔ چنانچہ بعد میں موصولہ مواد کی کتابت کمپیوٹر سے کی گئی ہے۔ امید ہے ناظرین کی آنکھیں اس فرق کو برداشت کر لیں گی۔

اس بات کی سخت ضرورت تھی کہ نیاز صاحب کی تحریروں کا ایک جامع انتخاب نمبر میں شامل کر دیا جائے لیکن وسائل محدود ہونے کے سبب اس آرزو کی تکمیل نہیں ہو سکی، ہمیں اس کا اعتراف ہے۔ نیاز صاحب کی افسانوی، منظوم، تنقیدی، ترجماتی اور ادارتی تحریروں کا قابل لحاظ انتخاب شائع کرنے کے لیے مزید ۳۰۰ صفحات کی ضرورت پڑتی۔ افسوس یہ کام نہ ہو سکا لیکن ان کی حیات و خدمات فن اور روشن خیالی کی فکری اساس کو اجاگر کرنے کا زیادہ سے زیادہ اہتمام کیا گیا ہے۔ "من و یزداں" کا ایک بہت مختصر مگر جامع انتخاب محترم رئیس الدین فریدی صاحب مدیر "روزنامہ ہند" نے وقت نظری سے کیا ہے۔ اور وہ نمبر میں شامل کیا گیا ہے۔ آج ان افکار کو عام کرنے کی ضرورت ہے۔ لہٰذا امید ہے کہ انشاء نوازوں اور نیاز نوازوں کو "نیاز فتحپوری نمبر" سے کچھ نہ کچھ حاصل ضرور ہو گا۔ انھیں مایوسی نہیں ہو گی۔ خصوصاً اس لیے کہ خدمات نیاز کا جائزہ کئی نئے زاویوں سے بھی لیا گیا ہے اور ان کے بعض افکار کا ہندوستانی نکتہ نگاہ سے مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔

نیاز فتح پوری

مرتب : ڈاکٹر مرزا حامد بیگ
گورنمنٹ کالج
اٹک (پاکستان)

نام		نیاز محمد خاں (والدہ کی طرف سے)
تاریخی نام	.	لیاقت علی خاں (والد کی طرف سے)
		۱۳۰۲ھ
قلمی نام	.	نیاز فتح پوری
پیدائش	.	۱۸۸۴ء بہ مقام سنئی گھاٹ ضلع بارہ بنکی، بھارت
وفات	:	۲۴/مئی ۱۹۶۶ء بہ مقام کراچی (سندھ) پاکستان
تعلیم	.	میٹرک مدرسہ اسلامیہ فتح پور ۱۸۹۹ء

فتح پور ہسوہ میں ابتدائی تعلیم مولوی حبیب الدین سے اور بعد ازاں لکھنو میں مولوی صدیق حسن غازی پوری سے پائی۔ دس برس کی عمر میں ۹۴-۱۸۹۳ء مدرسہ اسلامیہ فتح پور میں داخل ہوئے۔ جہاں سے ۱۸۹۸ء میں انگریزی مڈل پاس کی۔ اس اثناء میں دارالعلوم ندوہ، لکھنو اور مدرسۂ عالیہ رام پور میں تقریباً ڈیڑھ برس مولانا عرب محمد طیب اور مولانا ظہور الحق خیرآبادی کی شاگردی کی بعد ازاں مدرسہ اسلامیہ فتح پور سے ۱۸۹۹ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔

مختصر حالات زندگی .

نیاز کے والد محمد امیر خاں پولیس انسپکٹر تھے۔ آبائی وطن فتح پور ہسوہ (یو-پی) تھا۔ والد کے تبادلوں کے سبب بارہ بنکی، فتح پور، لکھنو اور رام پور میں بچپن اور لڑکپن گزرا۔ تاہم ۱۸۸۴ء تا ۱۹۱۴ء تقریباً اکیس بائیس برس فتح پور میں قیام رہا۔ ۹۷-۱۸۹۶ء میں جب والد صاحب ریٹائر ہوئے اور رام پور میں وکالت شروع کی تو نیاز بھی ان کے ساتھ رام پور میں رہے، جہاں سے واپسی پر فتح پور سے مڈل اور میٹرک کے امتحانات پاس کیے. ان دنوں شعر کہنے لگے تھے۔ نیاز نے ۱۹۰۰ء میں بطور سب انسپکٹر پولیس مراد آباد میں پولیس ٹریننگ لی۔ ۱۹۰۱ء میں بہ حیثیت سب انسپکٹر تھانہ ہنڈیا (الہ آباد) میں تعینات ہوئے اور ۱۹۰۲ء میں مستعفی ہوگئے۔ ۱۹۰۳ء تا ۱۹۰۵ء مدرسہ اسلامیہ (انگریزی شاخ) کے ہیڈ ماسٹر رہے۔ ۱۹۰۶ء تا ۱۹۰۷ء بادنی اسٹیٹ (کدورا) میں نواب ریاض الحسن خاں کے زمانہ میں ہیڈ ماسٹر، کوتوال شہر اور پرائیوٹ سکریٹری کے طور پر کام کرتے رہے۔ ۱۹۰۷ء تا ۱۹۰۸ء اجے گڑھ اسٹیٹ بندیلکھنڈ میں سپرنٹنڈنٹ پولیس اور ۱۹۰۸ء تا ۱۹۰۹ء اسکز اسٹیٹ ہانسی (ضلع ہسار) میں بہ حیثیت میونسپل سکریٹری ملازمت کی۔
۱۹۰۹ء تا ۱۹۱۰ء دوبارہ مدرسۂ اسلامیہ سے منسلک رہے۔ ۱۹۱۰ء میں اخبار "زمیندار" کے عملے میں چلے گئے۔ ۱۹۱۱ء میں ایک بار پھر ہانسی

(ضلع ہسار) میں میونسپل سکریٹری کے طور پر کام کیا اور ہفتہ وار "توحید" کے معاون مدیر رہے۔ ۱۹۱۲ء میں تیسری بار مدرسۂ اسلامیہ کے تدریسی عملے میں شامل ہوگئے۔ جہاں ۱۹۱۴ء تک کام کیا۔ اس کے بعد دلی چلے گئے اور حکیم محمد اجمل خاں کے قائم کردہ انگریزی اسکول کے نگران مقرر ہوئے۔ ۱۹۱۵ء تا ۱۹۲۲ء بھوپال میں رہے۔ ۱۹۱۹ء میں اخبار "رعیت" کے مدیر اعلیٰ تھے۔ ۱۹۲۷ء تا ۱۹۶۲ء لکھنو میں قیام رہا۔ ۱۹۶۲ء میں پاکستان ہجرت کر آنے اور ۳۱/ جولائی ۱۹۶۲ء تا وفات کراچی (پاکستان) میں قیام رہا۔ نیاز صاحب نے تین شادیاں کیں۔ پہلی شادی ۱۹۰۱ء میں بہ عمر سترہ سال الہ آباد میں ہوئی ۱۹۲۳ء میں پہلی بیوی کا انتقال ہوگیا۔ ۱۹۲۴ء میں دوسری شادی بہ مقام لکھنو مختار بیگم سے ہوئی۔ ۱۹۴۷ء میں مختار بیگم کا انتقال ہوا تو اسی سال مرحومہ کی چھوٹی بہن گلزار بیگم بنت محمد ولایت خاں سے لکھنو میں شادی ہوئی۔ فروری ۱۹۲۲ء میں ل۔ احمد کی تحریک پر آگرہ سے اپنا ادبی ماہنامہ "نگار" جاری کیا۔ نیاز صاحب نے ترکی کی مشہور شاعرہ نگار بنت عثمان کے نام پر اس رسالے کا نام نگار تجویز کیا تھا۔ یہ پرچہ دسمبر ۱۹۲۲ء تک آگرہ سے جنوری ۱۹۲۳ء تا جون ۱۹۲۷ء بھوپال اور جولائی ۱۹۲۷ء تا جولائی ۱۹۶۲ء لکھنو سے نکلتا رہا۔ اگست ۱۹۶۲ء سے مئی ۱۹۶۶ء تک کراچی سے یہ پرچہ "نگار پاکستان" کے نام سے جاری رکھا۔ ۱۹۶۶ء کے آغاز پر معلوم ہوا کہ نیاز سرطان کے مرض میں مبتلا ہیں، اس موذی مرض نے ۲۴/ مئی ۱۹۶۶ء تک مہلت دی۔

اولین تحریریں : ابتدائی افسانے اور مضامین (۱۹۱۰ء تا ۱۹۲۰ء) "انتخاب لاجواب" لاہور، صلائے عام" دہلی، "تمدن" دہلی اور "نقاد" آگرہ میں شائع ہوئے۔

اولین مطبوعہ افسانہ : ایک پارسی دوشیزہ کو دیکھ کر مطبوعہ : "نقاد" آگرہ / "تمدن" دہلی جنوری ۱۹۱۳ء۔
بقول نیاز یہ افسانہ نمائش الہ آباد سے متاثر ہو کر ۱۹۱۰ء میں قلم بند کیا گیا تھا۔

قلمی آثار (مطبوعہ کتب) :

۱۔ "ایک شاعر کا انجام" (طویل مختصر افسانہ) مساوات پریس، الہ آباد . طبع اول ۱۹۱۳ء
طبع دوم : نگار بک ایجنسی، لکھنو۔ ۱۹۲۹ء
طبع سوم : عبد الحق اکیڈمی، حیدر آباد دکن
۲۔ نگارستان (افسانے / مضامین) صدیق بکڈپو، لکھنو۔ طبع اول س۔ن
۳۔ "نقاب اٹھ جانے کے بعد" (افسانے) نگار بک ایجنسی، لکھنو۔ طبع اول ۱۹۴۲ء
۴۔ "جمالستان" (افسانے) نگار بک ایجنسی، لکھنو۔ طبع اول ۱۹۳۳ء
۵۔ "حسن کی عیاریاں اور دوسرے افسانے" (افسانے) زاویہ ادبیہ، حیدر آباد دکن۔ طبع اول (س۔ن) یہ مجموعہ بعد میں "تاریخ کے گمشدہ اوراق" کے نام سے شائع ہوا۔
۶۔ "مختارات نیاز" (افسانے / مضامین) دہلی طبع اول (س۔ن) یہ مجموعہ ۱۹۳۹ء سے قبل شائع ہوا، اس میں ۱۹۲۰ء تا ۱۹۲۹ء تک کی تحریریں ہیں جن میں سے بیشتر ترجمہ کردہ ہیں۔
۷۔ "شہاب کی سرگزشت" (طویل مختصر افسانہ) صدیق بک ڈپو، لکھنو۔ طبع اول (س۔ن) یہ کتاب ۱۹۳۹ء سے قبل شائع ہوئی۔ صدیق بک ڈپو نے ۱۹۴۲ء میں دوسرا ایڈیشن شائع کیا۔
۸۔ "شبستان کا قطرۂ گوہریں" (طویل مختصر افسانہ)

آخری بار یہ کتاب ادارہ ادب العالیہ، کراچی نے شائع کی۔

۹۔ "قربان گاہ حسن" (ارض بابل کا ایک تاریخی طویل مختصر افسانہ) طبع اول : ۱۹۳۹ء سے قبل

۱۰۔ "کیوپڈ اینڈ سائکی" (طویل مختصر افسانہ) طبع اول : ۱۹۳۹ء سے قبل

۱۱۔ "صحابیات" (سوانحی مضامین) طبع اول : ۱۹۳۹ء سے قبل

۱۲۔ "المسئلۃ الشرقیہ" از مصطفےٰ کمال پاشا کا ترجمہ طبع اول ۔ ۱۹۳۹ء سے قبل

یہ سیاسیات اسلامی سے متعلق کتاب کا عربی سے ترجمہ ہے۔

۱۳۔ "فلاسفۂ قدیم کی روحوں کا اجتماع"

۱۴۔ "مکتوبات نیاز" (تین جلدیں) نگار بک ایجنسی، لکھنو۔ طبع اول ۔ ۱۹۳۹ء سے قبل

۱۵۔ "جذبات بھاشا" (۱) (مضامین) نگار بک ایجنسی، لکھنو۔ طبع اول ۔ ۱۹۳۹ء سے قبل

۱۶۔ "ترغیبات جنسی" (جنسیات / نفسیات) نگار بک ایجنسی، لکھنو۔ طبع اول ۱۹۳۹ء سے قبل

۱۷۔ "مجموعہ استفسارات و جوابات" (تین جلدیں)

پہلی جلد ۔ نگار بک ایجنسی، لکھنو۔ طبع اول ۱۹۳۴ء

دوسری، تیسری ۔ نگار بک ایجنسی، لکھنو۔ طبع اول ۱۹۳۶ء

۱۸۔ "انتقادیات" (تین جلدیں / مضامین) عبدالحق اکیڈمی، حیدرآباد دکن

۱۹۔ "مذھب" (مذھبیات) نگار بک ایجنسی، لکھنو

۲۰۔ "مالہ و ماعلیہ" نگار بک ایجنسی، لکھنو

۲۱۔ "کہکشاں کا ایک سانحہ" نگار بک ایجنسی، لکھنو

۲۲۔ "اصحاب کہف" (تاریخ / سوانحی اشارے) نگار بک ایجنسی، لکھنو

۲۳۔ "جھانسی کی رانی" (سوانح)

۲۴۔ "چند گھنٹے علمائے کرام کی روحوں کے ساتھ" (تاریخ / خاکے)

۲۵۔ "مادئین کا مذہب" (مذہبیات / فلسفہ)

۲۶۔ "مشکلات غالب" (تنقید)

۲۷۔ "مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ" (فلسفہ / مذھبیات)

۲۸۔ "تاریخ الدولتین" از جرجی زیدان کا عربی سے ترجمہ (تاریخ اسلام) جامعہ ملیہ، دہلی۔ طبع اول : ۱۹۳۹ء سے قبل

۲۹۔ "عرض نغمہ" از رابندر ناتھ ٹیگور کا ترجمہ المعروف "گیتانجلی"

۳۰۔ "فراست الید" (علم نجوم) نگار بک ایجنسی، لکھنو طبع اول ۔ س ۔ ن

۳۱۔ "مذاکرات نیاز" (۱۹۲۷ء تا ۱۹۲۹ء کے مضامین) آزاد بک ڈپو، دہلی۔ طبع اول : (س ۔ ن) یہ کتاب ۱۹۳۹ء سے قبل شائع ہوئی۔

---

(۱) "جذبات بھاشا" ۱۹۔ ۱۹۱۵ء میں تصنیف ہو چکی تھی۔ اس نمبر میں اس پر سلطان احمد از جہلم کا وہ تبصرہ شامل ہے جو ماہنامہ "زمانہ" کے شمارۂ نومبر ۱۹۱۶ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کی بازیافت مانک ٹالا صاحب نے فرمائی ہے۔ (مدیر انشاء)

"مطالعات نیاز" نگار بک ایجنسی، لکھنو

۳۲- "من و یزداں" (فلسفہ / مذہبیات) دو جلدیں۔

۳۳- "گہوارۂ تمدن" (سماجیات) ناشر : مولوی قمرالحسن، نور محل، بھوپال طبع اول : ۱۹۲۲ء سے قبل

۳۴- "نقش ہائے رنگا رنگ"

۳۵- "محمد بن قاسم سے بابر تک" (تاریخ / سماجیات)

۳۶- "اسلامی ہند" (تاریخ بھارت) نگار بک ایجنسی، لکھنو۔ طبع اول : سن۔ن

۳۷- "توقیت" (تاریخ) نگار بک ایجنسی، لکھنو۔ طبع اول : سن۔ن

۳۸- "مریخی سیاح کی ڈائری" (مضمون) نگار بک ایجنسی، لکھنو۔ طبع اول : ۱۹۳۹ء سے قبل
یہ مضمون ۱۹۱۵ء میں لکھا گیا۔ اس کا مقصد ہوم رول کی تحریک کو مسلمانوں کے لیے مضر ثابت کرنا تھا۔

۳۹- "صدا الصحرا" (قومی نظم) نگار بک ایجنسی لکھنو۔ طبع اول : ۱۹۳۹ء سے قبل

۴۰- "علمائے قدیم" (تین مقالات) نگار بک ایجنسی، لکھنو۔ طبع اول : ۱۹۳۹ء سے قبل

۴۱- "حرکت کے کرشمے" نگار بک ایجنسی، لکھنو۔ طبع اول : ۱۹۳۹ء سے قبل

نیاز کے تحریر کردہ "نگار" کے خاص نمبر، جن کی اہمیت باقاعدہ مطبوعہ کتب کی سی ہے۔

(۱) ملاحظات نمبر جنوری ۱۹۲۶ء

(۲) ڈرامہ اصحاب کہف نمبر جنوری ۱۹۳۷ء

(۳) قرآن نمبر جنوری ۱۹۴۵ء

(۴) پاکستان نمبر جنوری ۱۹۴۸ء

(۵) ایک مستقبل کی تلاش نمبر (نصف حصہ) جنوری ۱۹۵۱ء

(۶) فرمانروایان اسلام نمبر جنوری ۱۹۵۴ء

(۷) معلومات اسلامی و علمائے اسلام نمبر جنوری ۱۹۵۵ء

(۸) معلومات نمبر۔ جنوری ۱۹۵۸ء

(۹) تنقیح اسلام نمبر۔ جنوری ۱۹۵۹ء

(۱۰) غالب نمبر ۱۹۶۱ء

غیر مدون : لاتعداد علمی و ادبی مضامین اور تبصرے۔

اعزاز :

۱- "پدم بھوشن" حکومت ہند کا اعلیٰ ترین سول اعزاز ۱۹۶۲ء

نظریہ فن :

"مطالعۂ فطرت اور لٹریچر میں کیا فرق ہے؟ تم سوائے اس کے اور کوئی فرق نہ پاؤ گے کہ اگر وہ تخیل ہے تو یہ اس کی زبان ہے۔ اگر وہ صرف ایک حس ہے تو یہ حس کا بیان ہے"۔

(بہ حوالہ تمہید "کیوپڈ و سائیکی" ہمدم برقی پریس ۱۹۱۸ء)

حضرت نیاز مختلف زمانوں میں



۱۹۱۴ء



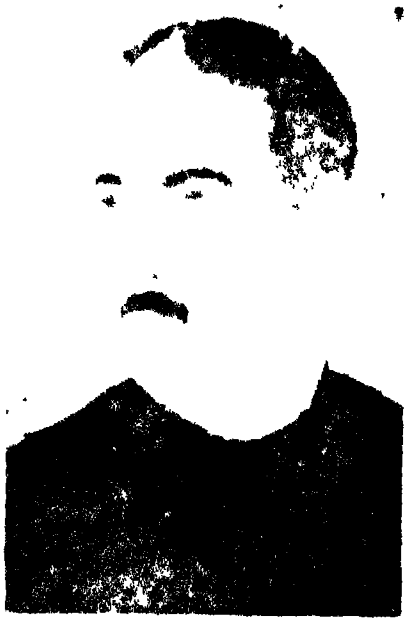
۱۹۲۵ء



۱۹۲۸ء



۱۹۳۱ء

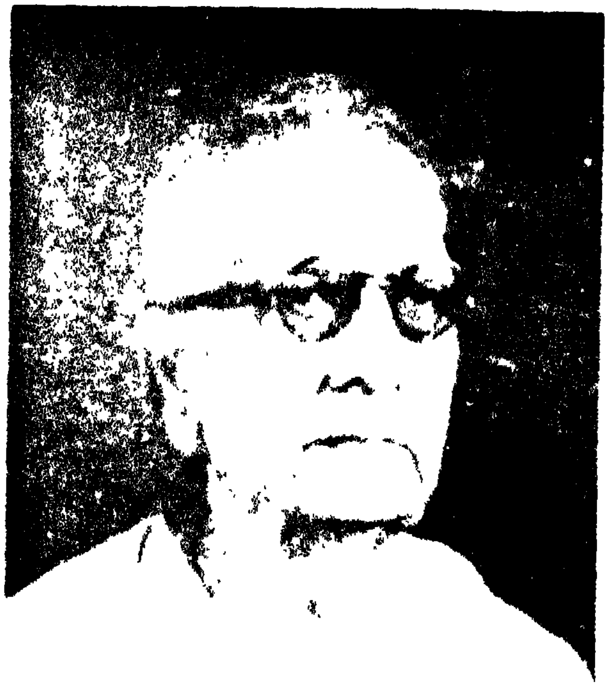


۱۹۴۲ء



۱۹۳۲ء

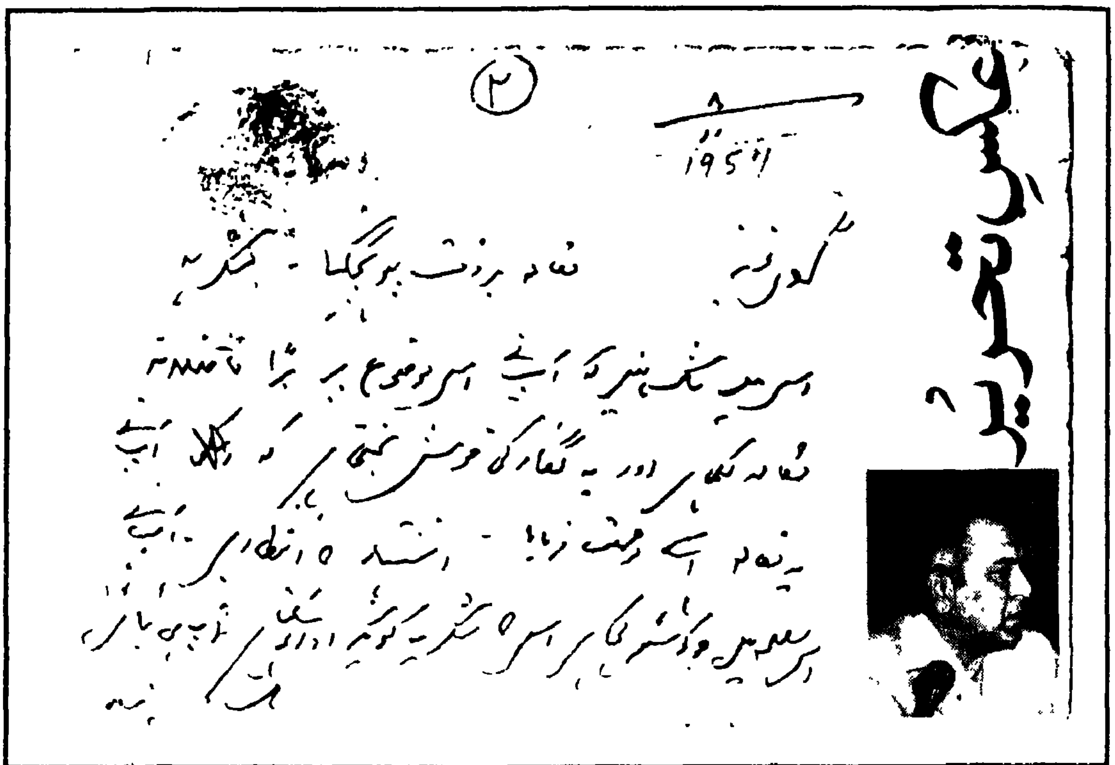
حضرت نیاز
مختلف زمانوں میں

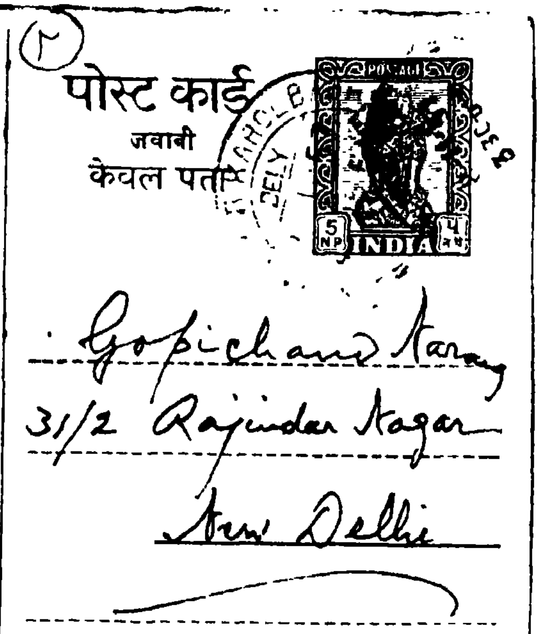


۱۹۶۰ء



۱۹۵۲ء

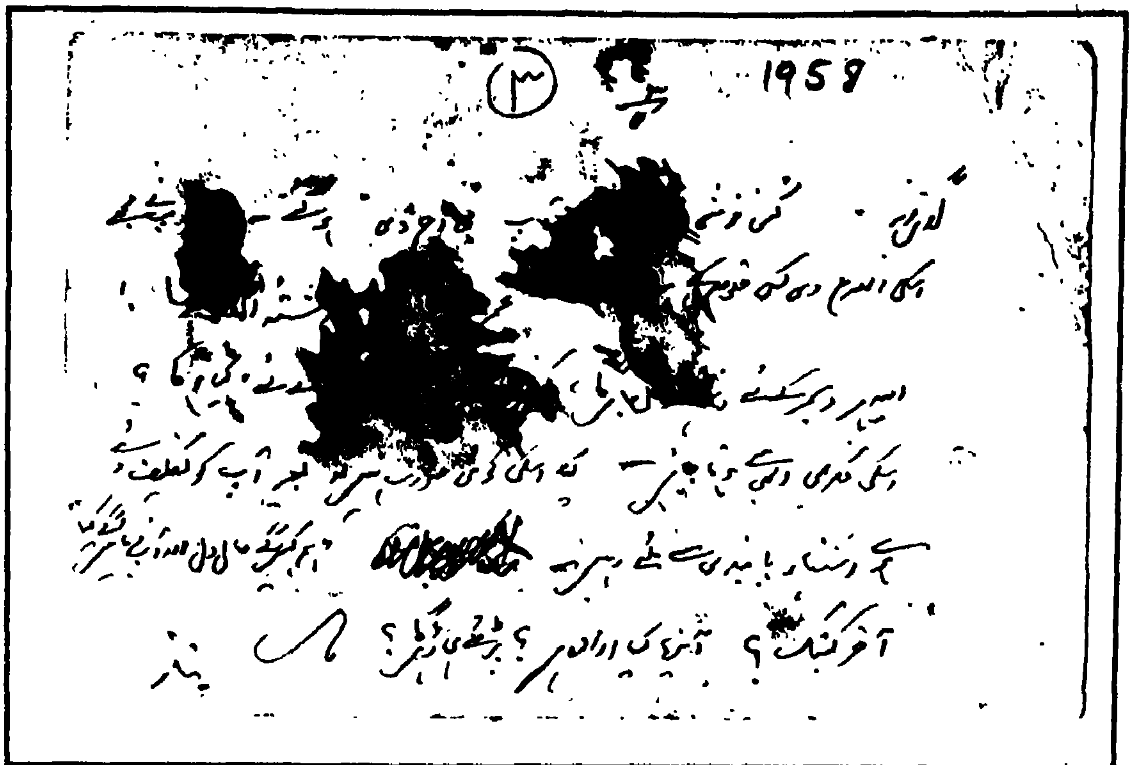


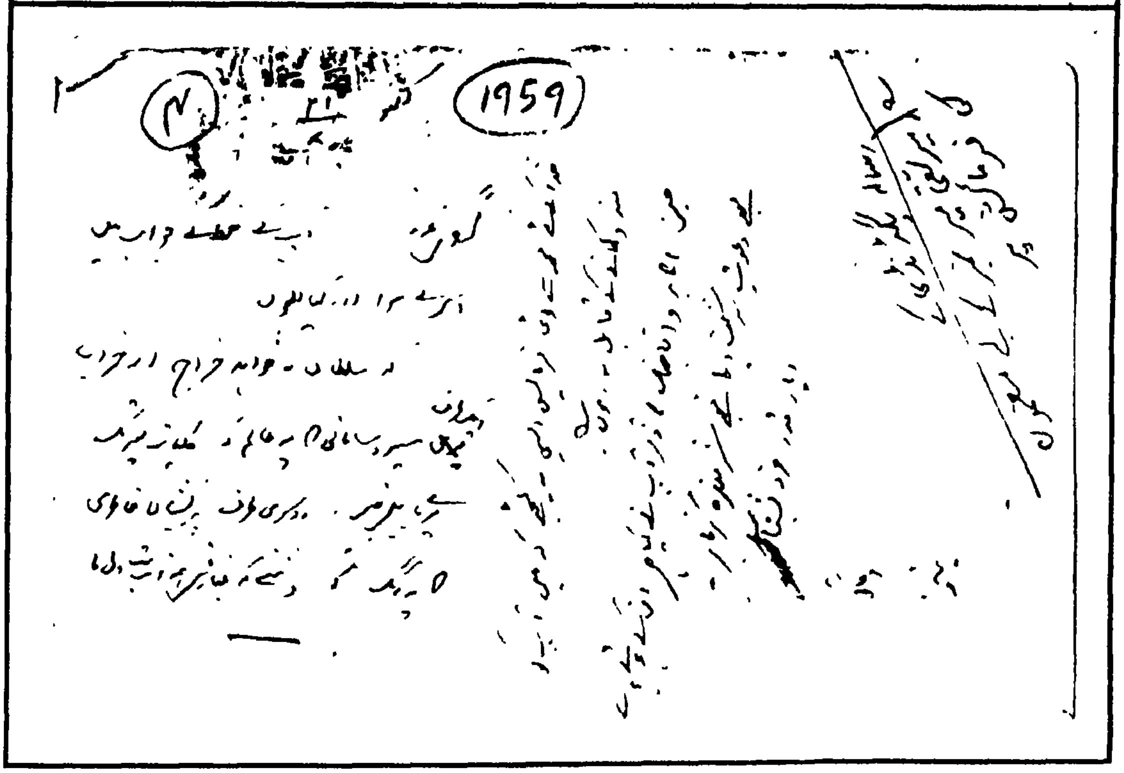


علامہ نیاز فتح پوری ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے قدر دان تھے۔ دونوں میں اکثر خط و کتابت ہوا کرتی تھی۔ نارنگ صاحب نے نیاز مرحوم کے کئی خطوط حفاظت سے رکھ چھوڑے ہیں۔ ان میں سے چند مکتوبات اس نمبر میں اشاعت کے لئے انہوں نے ہمیں روانہ فرمائے، اس کے لئے ہم ان کے ممنون ہیں۔ ہر پوسٹ کارڈ پر ترتیب نمبر محترم نارنگ صاحب نے قائم کر دیا ہے اور ضروری حواشی بھی قاری کے لئے تحریر کر دئے ہیں۔

مکتوب نمبر ۱ ہمیں ملا نہیں۔ مکتوب نمبر ۷ جگہ کی قلت کے سبب شامل نہیں کیا جاسکا۔

——————— (مدیر انشاء)


(۳)
1958


(۴)
1959

(۵)

1959 ۱/۹ [illegible]

[illegible]

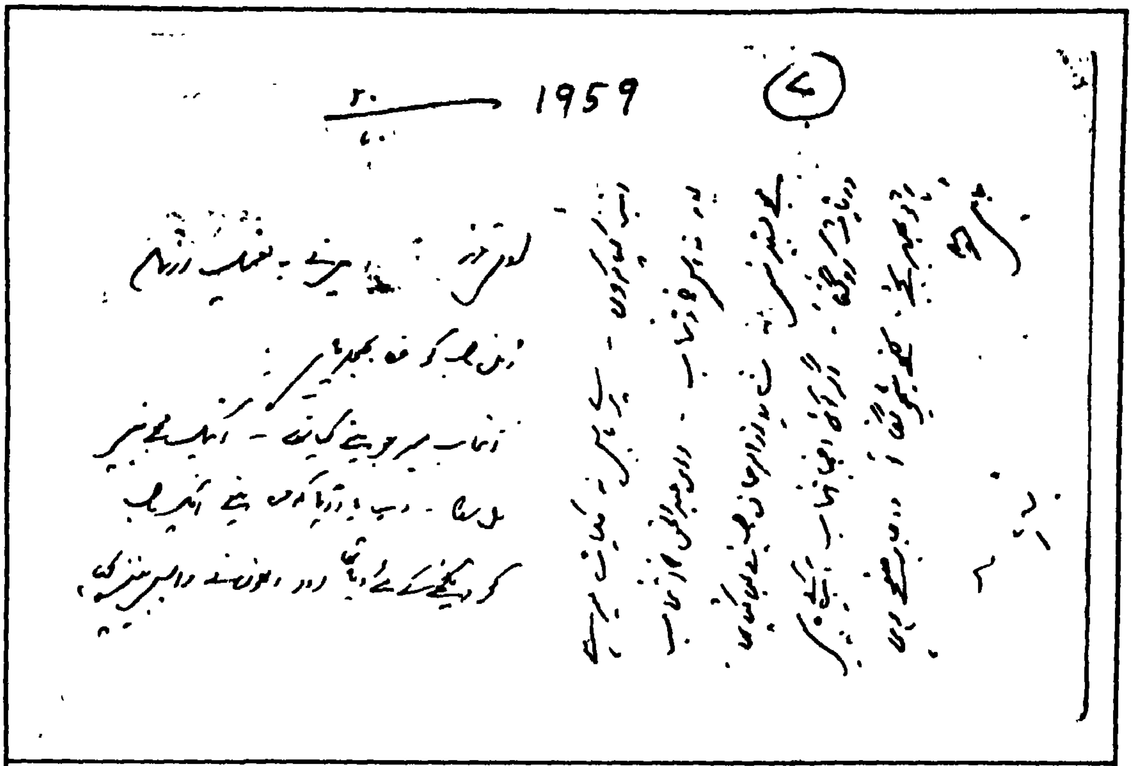
26.9.59

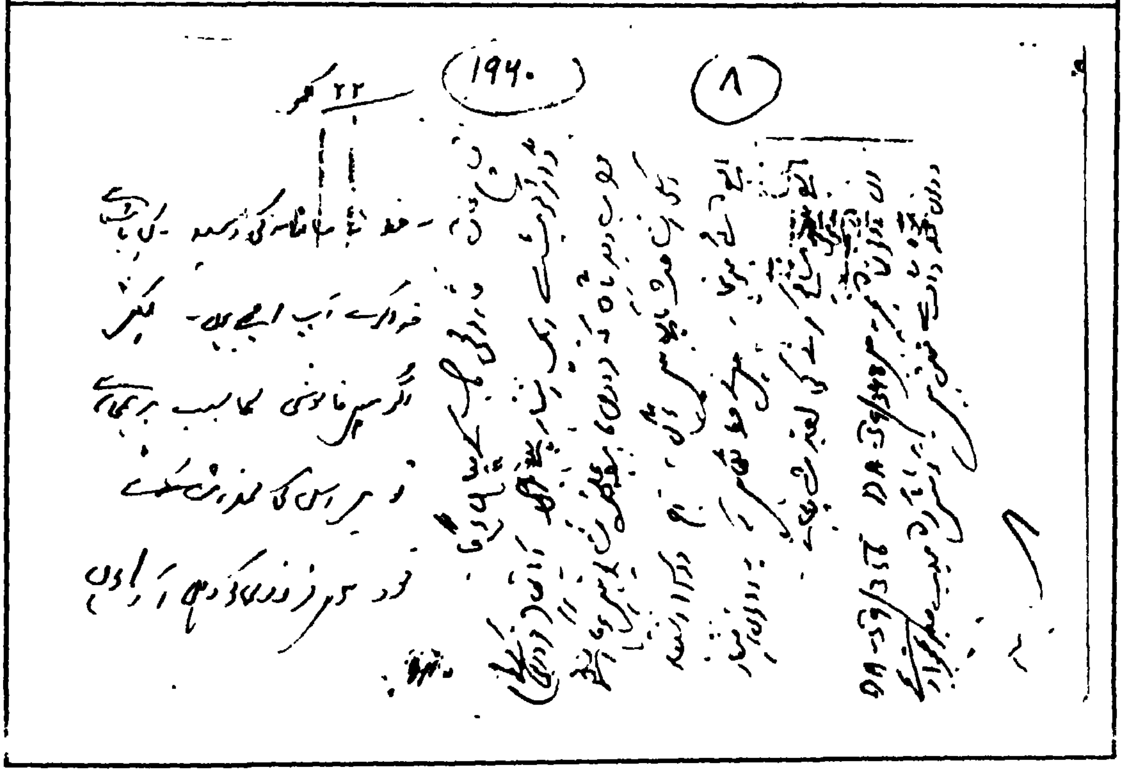
1959

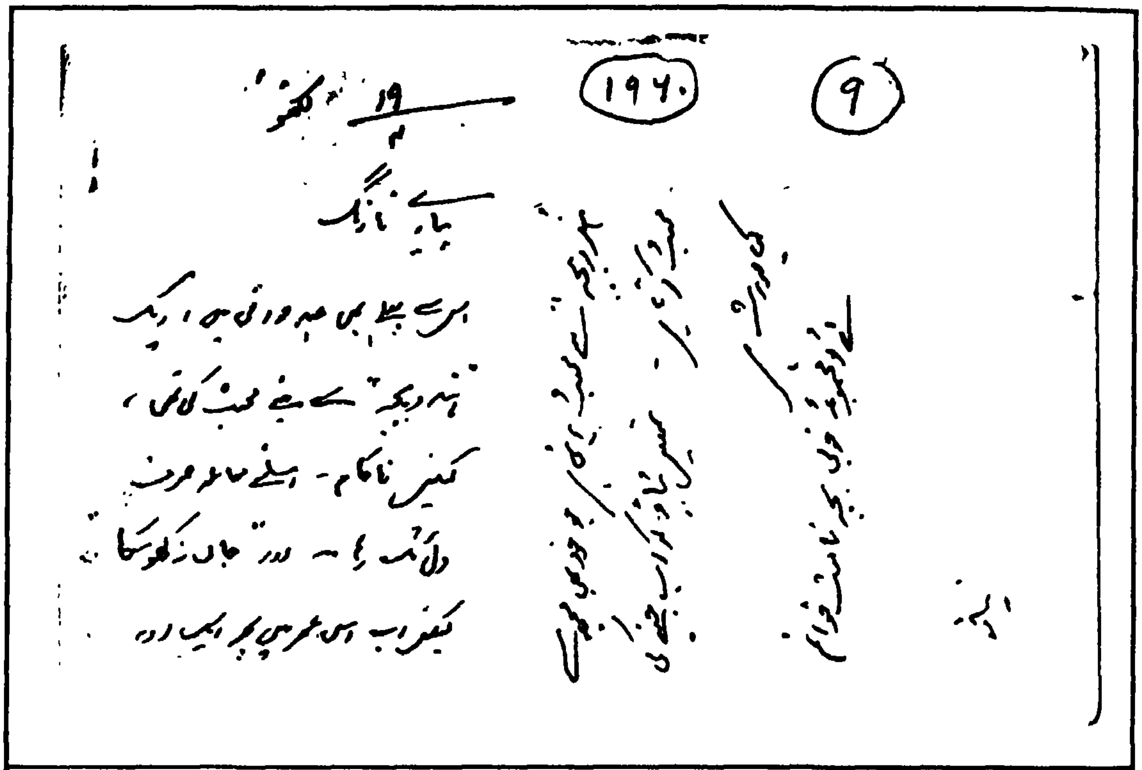
۱۰/۹

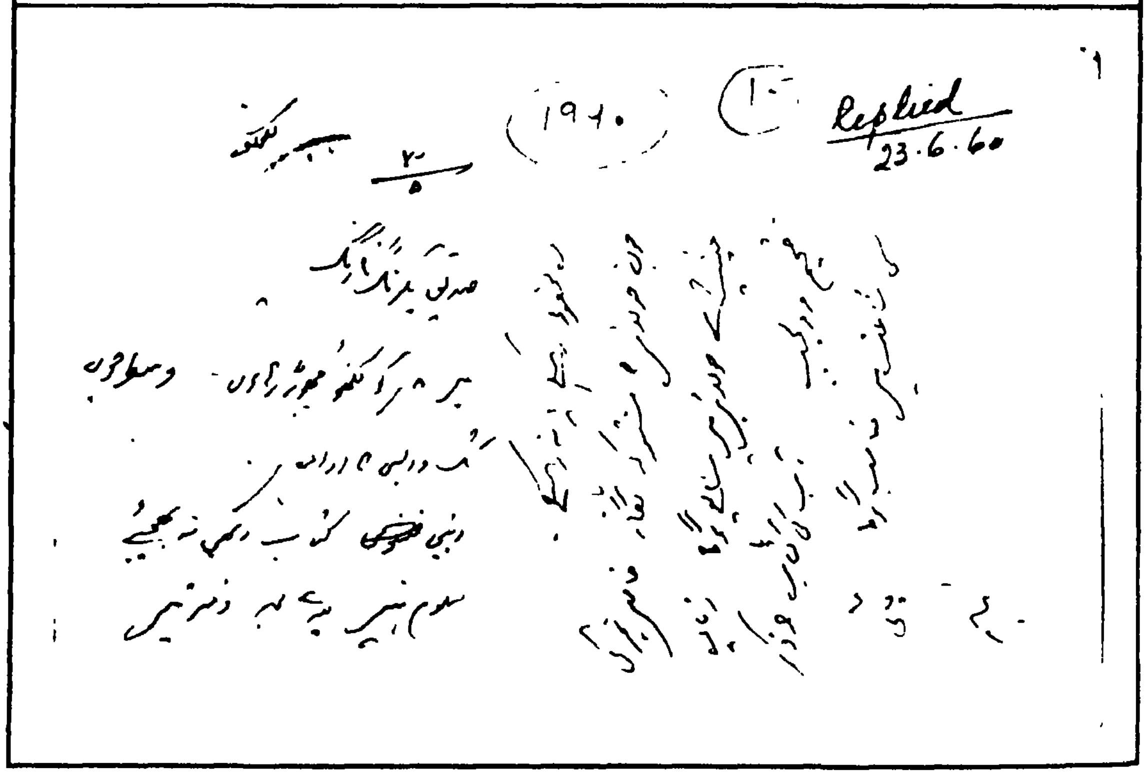
(۴)

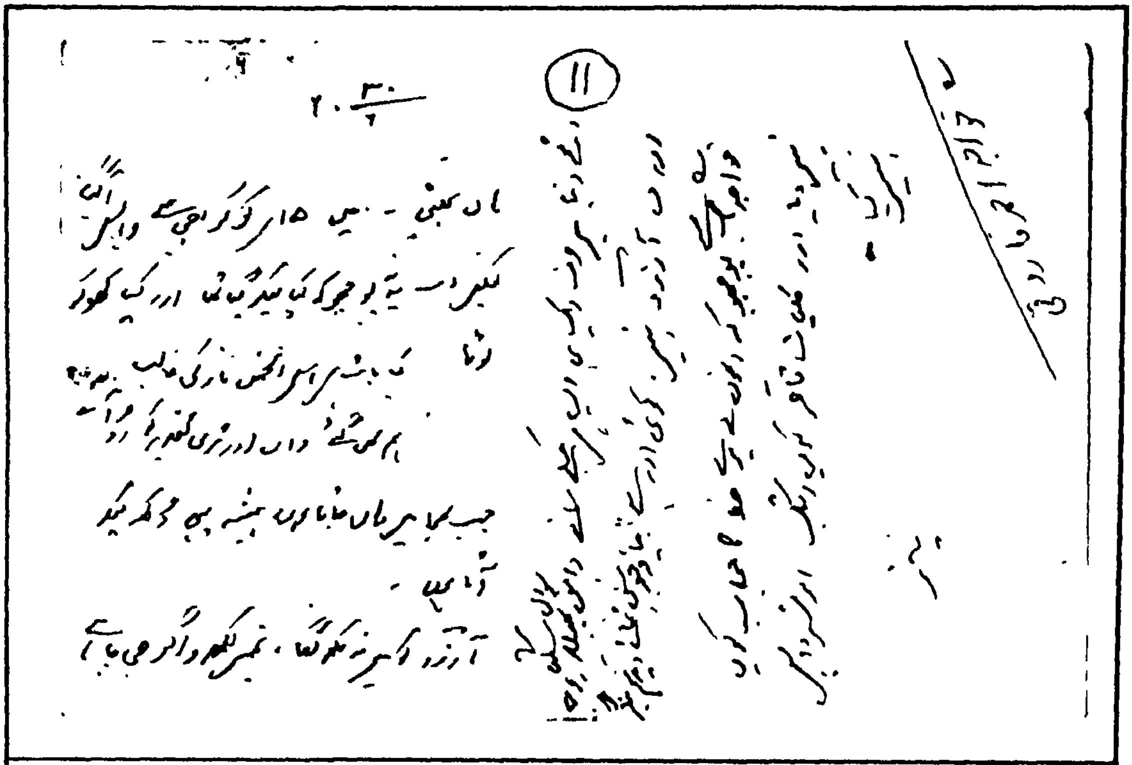
[illegible]

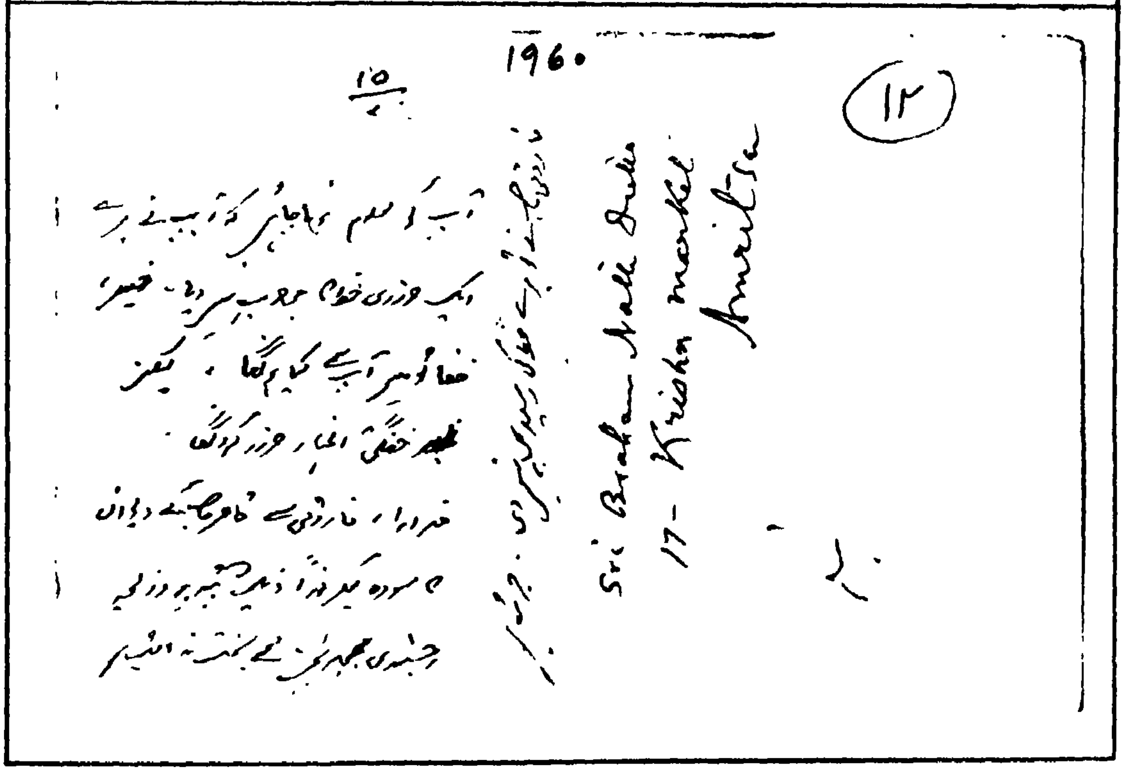

(7)
1959


(8)
(١٩٦٠)
٢٢


۹
۱۹۶۰
لکھنؤ


Replied
23.6.60
۱۰
۱۹۶۰





1960

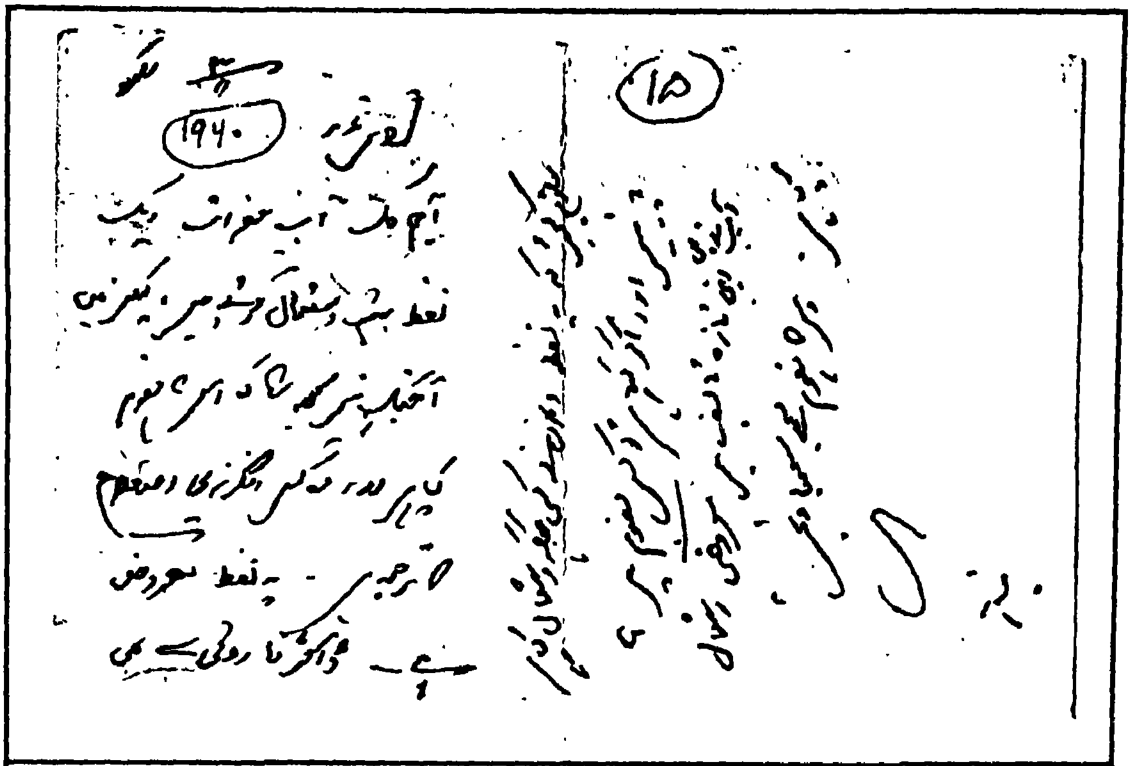
Sri Braham Nath Dutt
17- Krishna market
Amritsar

(۱۳) ۱۳/۱۰/۱۹۶۷

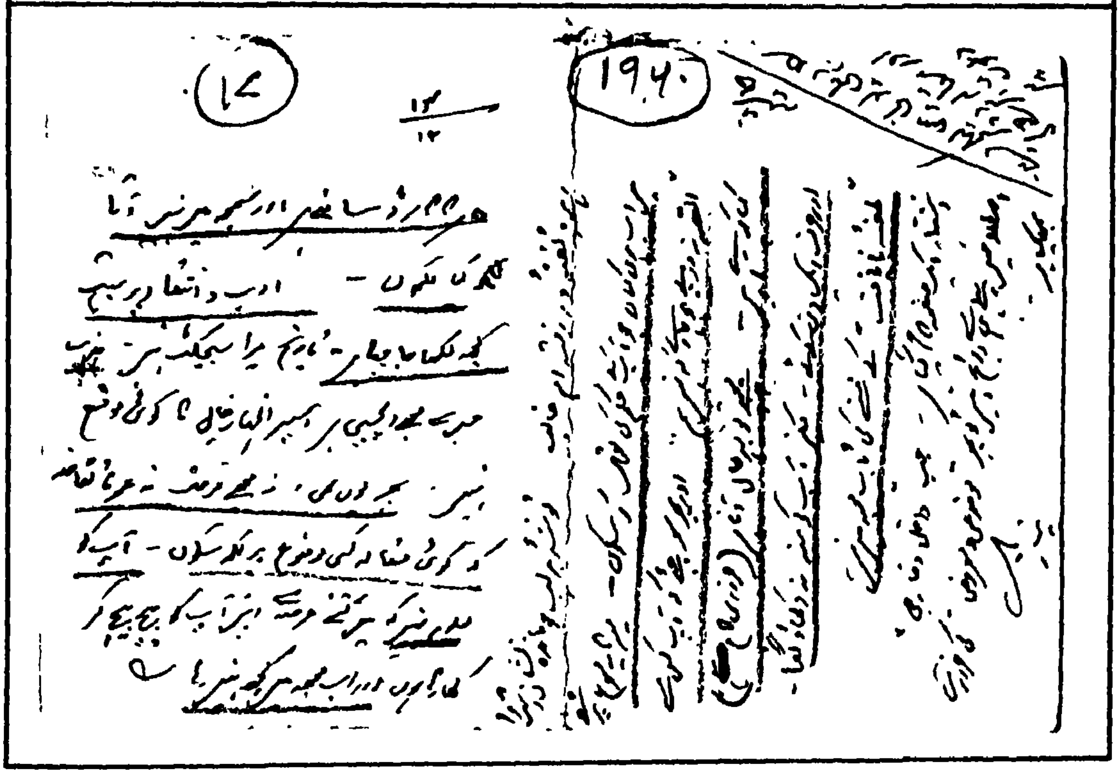
عزیزی نادر

(۱۴) (۱۹۶۰)

عزیزی نادر



۱۵
۱۹۶۰



۱۷
۱۹۶۰

PHONE : 6464
TELEGRAMS : NIGAR

THE NIGAR

(AN ORGAN OF RATIONALISTS AND FREE THINKERS)

(ESTABLISHED 1922)

NIGAR BUILDING
LUCKNOW.

Ref. No.

۲۶ نومبر

بندہ نواز — مکرمت نامہ شکریہ۔

"طلوع سحر" پر جو تبصرہ نگار میں شائع ہوا وہ میرا لکھا ہوا نہیں ہے آپ بخوبی

میرا نام غلط سمجھے ہیں۔ جناب انور نجمی شاعر کی میں بڑی قدر کرتا ہوں

اور ان شعر و ادب سے بڑا عزیز سمجھتا ہوں۔ "وادیٔ خیال" شعر [illegible] ---

بہت ہی دلچسپ کے ساتھ منظور ہوا۔۔

نگار کو آپ نے جناب نجمی کے جو اشعار نگار کو بھیجے ہیں

دفاتر شکریہ بس وقت پر موصول ہو گئے جب آپ کا رقعہ [illegible] اشعار اور

بھیج دیجئے گا کہ میں [illegible] کو خوب سے لطف لے سکوں۔

رسالہ [illegible] شاعری [illegible] اشاعت میں

نہ آتا تو

دیکھئے آپ کو یہ زلف دراز ———

پروفیسر [illegible] کا مضمون مجھے بہت پسند آیا — [illegible]

نیاز فتح پوری

یہ مضمون اور [illegible] [illegible] نجمی [illegible]

نیاز صاحب کا ایک خط بنام پروفیسر کرامت علی کرامت کا عکس۔
ملاحظہ فرمائیں لیٹر پیڈ پر "نگار" کی سرخی کے نیچے انگریزی میں یہ عبارت چھپی ہوئی ہے: "عقل پرستوں اور آزاد مفکروں کا ترجمان"۔

دسمبر کا پرچہ تو شائع ہو گیا [illegible] خصوصی [illegible] شمارہ

اقبال نمبر ہو گیا

پروفیسر خورشید عالم کا پتہ : Cadet College
Hasan Abdal (W. Pak.)

کبھی کبھی یاد کر لیتے ہیں [illegible]

دعا

نیاز

آپ نے غضب کیا کہ ایسی معمولی چیز بھی [illegible] اگر
[illegible] مجھے [illegible] اور آپ میری [illegible] جواب لکھیے
بدلطف [illegible]

نیاز

سازِ صد آہنگ

(فضا ابنِ فیضی)

کتنی حسیں تھی، تیری طبیعت کی روشنی
ہر گوشۂ خیال کو گلنار کر دیا
دینے لگی ہے لَو، مہ و انجم کی چاندنی
ہے قطرہ قطرہ، جام بہ دست و سبو بہ کف
آوارہ تیری موج گہر ہے، صدف صدف
سینے میں گُل کے، تو نے زرِ ناب بھر دیا

یہ پرتوِ بہار و فروغِ مہِ تمام
تیرے خمِ سحر سے تراوش ہے نور کی
تجھ سے ملا لطافتِ جذبات کو دوام
ڈھالے ہیں تو نے شوخیِ ادراک کے صنم
لرزاں ہے شخصیت پہ تری، سر سے تا قدم
اک موجِ رنگ، فلسفیانہ شعور کی

حرّیتِ ضمیر و نظر کے چراغ کو
تو نے یہاں، فتیلہ و روغن عطا کیا
صہبا سے تازہ بخشی، جنوں کے ایاغ کو
یہ تیرے ذہن کا چم و خم، یہ شگفتہ سوچ
ہاتھوں کو دے کے اہلِ نظر کے جنوں کا لوچ
پیراہنِ شعور کو دامن عطا کیا

تیرے سدا بہار قلم کی لطافتیں
ذہنوں میں، رنگ بن کے، معانی بکھر گیے
تجھ سے ہیں، نبضِ عصرِ رواں میں حرارتیں
تیری نظر کا حسن، تری شوخیِ خیال
بن کر، رخِ "نگار" پہ ہے غازۂ جمال
چھُو کر تری نگاہ کو جلوے سنور گیے

کھولا ہے تو نے، اک نگہِ نکتہ سنج سے
عقل و حیات کی گرہِ ناکشودہ کو
چھُوٹا نہ کوئی، تیرے جنوں کے شکنج سے
چھیڑا ہے سازِ شوق کو، آواز نے تری
با وصفِ سعی، نرگسِ غمّاز نے تری
ہاتھوں سے کب دیا، دلِ آساں ربودہ کو

افکار ہیں ترے، کہ صنم پارۂ خیال
اسلوب کی یہ سیم تنی و سمن بری
رنگینیِ بیاں ہے، کہ رخسار پر گلال
الفاظ ہیں، کہ پھول پہ شبنم رُکی ہوئی
جذبے کا ہے یہ تاؤ، کماں یا تنی ہوئی
رعنائیِ سخن ہے، کہ شیشے میں ہے پری

تیرے مزاج کی یہ ادابار شعریت
پرکھے ہوئے کرشمے، ادائیں جنچی تلی
یہ بولتی ہوئی، ترے فن کی اشاریت
کتنا لطیف ہے، ترا افسانوی شعور
وہ جانتا ہے فن کی ادا، فکر کا سرور
جس پر پڑی ہیں، تیری نگاہیں جنچی تلی

کس کو ملا، یہ نثر نگاری کا بانکپن
اک طرزِ خاص سے ہے گل افشاں ترا قلم
ہے خرمنِ نجوم، ترا خرمن سخن
وہ ابتدا ہو، کفر و شریعت کے باب کی
یا "سرگزشت" ہو، کسی مفتون شہاب کی
برسا ہے بن کے "ابرِ بہاراں، ترا قلم

کتنا بلند ہے، تری تنقید کا عیار
تونے پرکھ لیا، ادب و فن کی روح کو
ہے سرمۂ بصیرتِ منزل، ترا غبار
گرمیِ طبع سے تری، محفل ہے جوش میں
فکر و نظر کے میکدۂ بے خردش میں
تازہ کیا ہے، غلغلۂ الصّبوح کو

تھا ورنہ کون، واقفِ اسرار ارتقا؟
تونے بدل دیا ہے، نئی نسل کا مزاج
ہے تیزیِ نفس تری، رفتارِ ارتقا
پیکر ہیں تیرے فن کے، گل اندام و نازنیں
شبنم کی بوند، تجھ سے بنی، لعلِ احمریں
تونے چمن میں موسمِ گل کو دیا رواج

ہے تجھ پہ ختم، طرزِ نگارش کی یہ روش
تیرے قلم کا، کوئی تتبع نہ کر سکا
کس کو ملی شعور کی یہ داخلی تپش
ہیرے کی روح تونے سموئی ہے کانچ میں
جبتک تپا، نہ تیری بصیرت کی آنچ میں
سورج کوئی، نہ اپنے افق سے ابھر سکا

یہ چشم آگہی کی "حکیمانہ شوخیاں"
لفظوں کو، پیکرِ من و یزداں بنا دیا
تیرے نقوشِ پا ہیں حقائق کے کارواں
آسودہ تیرے سائے میں انسانیت کی جان
ہنستے ہیں پھول تیری بہاروں کے درمیان
ننھی کلی کو، تونے گلستاں بنا دیا

تجھ کو یہ کس ختن کی کشش کھینچ لے گئی؟
تیری تلاش میں ہیں غزالانِ لکھنؤ
گل کو، کہاں چمن کی کشش کھینچ لے گئی
بھوپال کی فضاؤں میں چھلکائے تونے جام
تجھ سے، شفق طراز رہی ہے اودھ کی شام
تجھ کو بھلا سکیں گے نہ یارانِ لکھنؤ

پرتو نہ ہو کہیں، تری فکرِ بلند کا
وہ آفتابِ تازہ، جو میری نظر میں ہے
مرکز ہے تو، مری نگہہ خود پسند کا
میں اجنبی نہیں، ادب و فن کے گاؤں میں
طے کی ہے میں نے راہ، اُجالوں کی چھاؤں میں
تو، ایک شمع بن کے، مری رہ گزر میں ہے

سارے اصناف ادب میں تیرے جوہر بے مثال

م۔ اخلاق

اے ادیبِ نامور اُردو ادب کے آفتاب
تجھ سے علم وفکر کے روشن ہوئے ہیں کتنے باب
تیری فطرت گو رہی عزلت پسند و گوشہ گیر
اوجِ تابانی پہ چمکی تیری قسمت کی لکیر
تو بظاہر کم سخن تھا اور کم آمیز تھا
قافلہ علم و ادب کا تیرے دم سے تیز تھا
پیکرِ اخلاق تھا تُو تُو تھا تہذیبوں کی جان
تُو ہمہ جہتی کا عالم تُو ہمہ گیری کی شان
تُو کہ تھا خود اک ادارہ تُو کہ اک تحریک تھا
فکر کا مکتب تھا تُو یا علم کا اک سلسلہ
سارے اصنافِ ادب میں تیرے جوہر بے مثال
ہر حقیقت پر ترا بے لاگ اظہارِ خیال
اے مصوّرِ حُسن کا تُو محرمِ اسرار تھا
صاحبِ تحقیق تھا نقّاد تھا نثّار تھا
فلسفہ علمِ فقہ منطق حدیث و نفسیات
ہر جگہ ہر انجمن میں تھی نمایاں تیری ذات
وہ فنِ انشاء ہو موسیقی ہو یا علم الکلام
ہم نے ہر محفل میں پایا ہے ترا افضل مقام
تیرے اسلوبِ نگارش تیری طرزِ فکر کی
اک انوکھی بات تھی اک اجتہادی شان تھی
اے صحافی تجھ پہ تاریخ و نجوم و فن نثار
تُو معانی و بیاں کی مملکت کا تاجدار

نثر میں اک تجزیاتی طرز کی دے کر بِنا
تُو نے تعمیری ادب کا نام روشن کر دیا

کون اب جذباتِ بھاشا کو سمجھنے آئے گا
کس سے اب انجام اک شاعر کا دیکھا جائے گا
ہوتی جاتی ہے من و یزداں کے آگے عقل دنگ
راس کیونکر آئیں گے اب نقش ہائے رنگ رنگ
شبنمستاں کا کوئی اب گوہر یہ قطرہ نہیں
گم شدہ اوراق تھے تاریخ کے کتنے حسیں

کون ہوگا مسند آرا اب نگارستان میں　　کس کی ہستی جان ڈالے گی جمالستان میں
مشکلاتِ غالب آخر اب کریں گی کس پہ ناز　　اپنے خالق کے لئے تڑپیں گے مکتوبِ نیاز
سرگذشت اپنی سُنے گا کس کے منہ سے اب شہاب　　کس کو ڈھونڈے گی تجلّی بعد اُٹھنے کے نقاب
اب بھلا آئے گا کس کو عرضِ نغمہ کا خیال　　حل کرے گا کون ترغیباتِ جنسی کے سوال
بابِ استفسار ہیں خالی جوابوں کے لئے　　یہ شناسی کا ہُنر ہے اب کتابوں کے لئے
کتنے گہوارے تمدّن کے ہیں اب خالی پڑے　　وہ سلیقے اب کہاں تفسیر کے تنقید کے
جمع جو ہر ہوں پُرانے فلسفے کے اب کہاں　　کس طرح شعری نقائص کی اُڑیں اب دھجّیاں
تھی مذاہب پر زمانے کے تری گہری نظر　　تُو نے ڈالی روشنی تحقیق پر تاریخ پر
شرقیہ ہو مسئلے یا حُسن کی عیاریاں　　فیض سب پر ہے ترا اے صاحب جادو بیاں
ہوں مذاکر تیرے یا مذہب کے پیچیدہ نکات　　ہر جگہ افضل رہا ہے تیرا کہنا تیری بات
تیرے بعد اب اے نیاز اے نازشِ ہندوستاں　　اک خلا ہے وسعتِ علم و ادب کے درمیاں

خون روئے آسماں یا غم سے خوں روئے زمیں
یہ خلا برسوں تو کیا صدیوں میں پُر ہوتا نہیں

حوالے :- جذبات بھاشا۔ ایک شاعر کا انجام۔ من و یزداں۔ نقش ہائے رنگا رنگ۔
شبنمستاں کا قطرۂ گوہریں۔ تاریخ کے اوراق گمشدہ۔ نگارستان۔ جمالستان۔
مشکلاتِ غالب۔ مکتوباتِ نیاز۔ شہاب کی سرگذشت۔ نقاب اٹھ جانے کے بعد۔
عرضِ نغمہ۔ ترغیباتِ جنسی۔ استفسارات و جواب۔ فراست الید۔ گہوارۂ تمدن۔
انتقادیات۔ فلاسفۂ قدیم کی روحوں کا اجتماع۔ مالہ و مالیہ۔ مذاہبِ عالم کا تقابلی مطالعہ۔
محمد بن قاسم سے بابر تک۔ المسئلۃ الشرقیہ۔ حُسن کی عیاریاں۔ مذاکرات نیاز۔ مذہب۔

نیاز فتح پوری۔ ایک ہمہ جہت شخصیت

حکیم محمد سعید
Hamdard Foundation Pakistan
Hamdard Centre
Nazimabad,
Karachi - 74600 (Pakistan)

علامہ نیاز فتح پوری ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی متنوع علمی و ادبی خدمات کے پیش نظر ہم انہیں بجا طور پر ایک دبستان سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ وہ ایک اعلا درجے کے افسانہ نگار، صف اول کے مترجم، معیشی و معاشرتی مسائل پر گہری نظر رکھنے والے دانشور اور ایک صاحب طرز انشا پرداز تھے۔ ان کی ان مختلف النوع خصوصیات کے پیش نظر ان کے بارے میں گفتگو کرنے والے ہر شخص کو یہ دشواری پیش آتی ہے کہ وہ بات کا آغاز کہاں سے کرے۔ انہوں نے اپنے رسالے "نگار" کو اپنے خیال کی ترویج و اشاعت کا وسیلہ بنالیا تھا جس کی وجہ سے ان کا یہ رسالہ اپنی جگہ ایک تحریک کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ علامہ نیاز فتح پوری ان مدیروں میں سے ایک تھے جو پورا رسالہ خود اپنی تحریروں سے مکمل کر سکتے تھے۔ انہوں نے اپنے رسالے کے معیار کو اس قدر بلند رکھا تھا کہ ہر وہ ادیب جو اس رسالے میں چھپ جاتا تھا، اسے مستند و معتبر ادیب سمجھا جاتا تھا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ آج بھی جب اعلا معیار کے دو چار رسالوں کا ہی ذکر کیا جاتا ہے تو "نگار" کا نام اس ذکر میں ضرور شامل ہوتا ہے۔

علامہ نیاز نے رسالہ نگار میں نہایت اہم تہذیبی، مذہبی اور اخلاقی اور ادبی مباحث کا سلسلہ چھیڑا تھا جس کی وجہ سے پورے ملک کی توجہ ان کے رسالے کی طرف مبذول ہو گئی تھی اور ملک کے گوشے گوشے سے ان کی موافقت و مخالفت میں مضامین لکھے جانے کا عمل شروع ہوا۔ اس طرح انہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعہ سے دنیائے علم و ادب میں زندگی کی ایک لہر دوڑادی تھی۔ سرسید، ان کے رفقا اور علامہ اقبال کے بعد علامہ نیاز فتح پوری کو بلاشبہ ایسی ہمہ گیر شخصیت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے جو پورے ملک کی توجہ کا مرکز بنی رہی۔ لکیر کے فقیر لوگ ان کے سخت دشمن ہو گئے اور انہیں طرح طرح سے تنقید کا نشانہ بنانے لگے، لیکن علامہ نیاز فتح پوری ان لوگوں کی تنقید سے بے نیاز معقولیت کا چراغ روشن کئے، اجالے بکھیرنے کی مہم کو مسلسل آگے بڑھاتے رہے اور مذہب کی ظاہری رسومات سے الگ مذہب کے اصل مقصد اور تعلیمات کے جوہر کو عام کرنے میں معروف رہے۔

.ہی معاملات کے علاوہ بھی انہوں نے جدید خیالات اور عصری آگہی کو وسیع پیانے پر روشناس کرانے کو اپنی زندگی کا مقصد بنالیا تھا۔
ن کے اس رویے کے پیش نظر ہم ان کو بجا طور پر معقولیت اور خرد افروزی کی تحریک کا حصہ قرار دے سکتے ہیں جس کا آغاز سر سید نے
یا تھا۔

اردو ادب میں مختصر افسانہ نگاری کی روایت بہت پرانی نہیں ہے۔ ہمارے ہاں انگریزی ادب کے زیر اثر افسانہ نگاری کا آغاز کیا گیا اور سماجی حقیقت نگاری و رومانی افسانہ نگاری کی دو مختلف جہتوں میں بیک وقت سفر شروع ہوا۔ ان دو جہتوں میں سے دوسری جہت یعنی رومانی افسانہ نگاری کے بانیوں میں علامہ نیاز فتح پوری کا نام سر فہرست ہے۔ انہوں نے مختلف زبانوں سے تراجم کے علاوہ بہت سے طبع زاد افسانے بھی لکھے ہیں۔ رومانی افسانہ نگاری کی بنیاد ڈالنے والوں میں نیاز فتح پوری کے علاوہ سجاد حیدر یلدرم، مجنوں گورکھپوری اور ل۔ احمد وغیرہ کے نام بھی شامل ہیں۔ علامہ نیاز کے افسانوں کا اسلوب نہایت دل چسپ، دل کش اور دلآویز ہے۔ ان کے افسانوں کے مجموعے "خیالستان" اور "جمالستان" منفرد انداز تحریر کی نہایت اعلا مثالیں ہیں۔

علامہ نیاز فتح پوری نے "نگار" کے جو خاص نمبر شائع کئے ہیں وہ ہماری ادبی تاریخ کا حصہ بن گئے ہیں۔ ان خاص نمبروں میں کچھ نمبر ادبی و شعری شخصیات کے فن اور زندگی سے متعلق ہیں اور کچھ ادبی مسائل مثلاً تنقید وغیرہ سے متعلق ہیں۔ وہ مومن کی غزل کے بڑے دلدادہ تھے۔ لہٰذا "نگار" کا مومن نمبر انہوں نے نہایت محنت اور توجہ سے شائع کیا تھا اور کوشش کی تھی کہ مومن کے تغزل کو پوری طرح اجاگر کیا جائے۔ ان کی اس محنت اور توجہ کا یہ نتیجہ ہے کہ آج تک اس کی اہمیت کم نہیں ہو سکی ہے اور اس کے بغیر مطالعۂ مومن کی تکمیل ناممکن ہے۔ کچھ ایسی ہی صورت ان کے تنقیدی نمبر کی ہے۔ ان خاص نمبروں کے علاوہ "نگار" کے دوسرے خاص نمبروں کی بھی اہمیت برقرار ہے اور آج ادب کے طالب علم "نگار" کے خاص نمبروں سے استفادہ کرتے ہیں۔

افسانوں کے علاوہ نیاز فتح پوری کی تصانیف میں "من ویزداں"، "شہاب کی سرگزشت" اور "فراست الید" جیسی کتابیں شامل ہیں جو اپنے موضوعات کے اعتبار سے بالکل ہی مختلف ہیں۔ ان مختلف النوع موضوعات پر ان کی تصانیف سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ زندگی کو ایک کل سمجھتے تھے اور اس کی کلیت کو اجاگر کرنے کے سلسلے میں انہوں نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔

نیاز صاحب

محمد طفیل

میں نے نیاز صاحب کا نام اس وقت سنا تھا جب خود بچہ تھا۔ مگر آج مجھے باتیں کرنی پڑیں گی ایک بوڑھے بچے کے بارے میں۔ لوگ بچے اور بوڑھے کو برابر سمجھتے ہیں مگر نیاز ایسے بوڑھوں میں نہیں جنہیں بچہ کہا جاسکے۔ کلیہ غلط ہوگیا۔ بچپن ہی میں یہ سنا تھا کہ لکھنو میں ایک کافر، نیاز نامی ہے جو ایسی باتیں لکھتا ہے جو اسلام کا بدترین دشمن بھی نہیں لکھ سکتا۔ اس وقت ان کے خلاف جلسے ہوتے تھے۔ تقریریں ہوتی تھیں۔ ایک ہنگامہ بپا تھا۔ مولانا سید سلیمان ندوی آنجہانی اور مولانا عبدالماجد دریابادی ایں جہانی نیاز صاحب کو کافر اور ملحد قرار دے رہے تھے۔ کیا خبر تھی کہ جب اسی کافر اور ملحد سے ملاقات ہوگی تو وہ کئی عابدوں سے بہتر انسان ثابت ہوگا۔ میری کوئی شامت تھوڑی آئی ہے جو میں یہ کہوں کہ علماء بلاوجہ ہی برہم تھے۔ بات یہ ہے کہ نیاز صاحب کی شرارت آمیز باتوں نے انہیں جو گرمایا تو وہ آپے میں نہ رہے۔ دوسرے ہمارے علماء مذہب کے معاملے میں عقل کو دخل دینے بھی تو نہیں دیتے۔ بس اتنی سی غلطی تھی جو نیاز صاحب سے ہوئی، لکھتے ہیں

"ایک طرف یہ کہتے ہو کہ اسلام نے بت پرستی کو مٹایا اور دوسری طرف اسی میں مبتلا ہو۔ بت خواہ وہ خدا ہی کا کیوں نہ ہو بت ہے اور توڑے جانے کے قابل۔ اور خدا خواہ وہ کوئی بت ہی کیوں نہ ہو۔ قابل پرستش ہے۔ اگر تم اس نازک فرق کو نہیں سمجھ سکتے تو جاؤ اٹھو وضو کر کے نماز پڑھو۔ تمہارا بت تم سے خفا نہ ہو جائے۔ میں بھی جاتا ہوں۔ آئینہ سامنے رکھ کر اپنے خدا کو پوجوں گا"۔
(صفحہ نمبر ۹۳، سالنامہ نگار جنوری ۱۹۶۰ء)

دوسری جگہ یوں

"مذہب نام ہے صرف کورانہ و جاہلانہ انقیاد و اطاعت کا، اس لیے اس کا وجود، خواہ وہ ضروری ہو یا غیر ضروری، مفید ہو یا غیر مفید۔ صرف اس طرح قائم رہ سکتا ہے کہ وہ جہل ولاعلمی کی دنیا میں رہے۔ علم کے میدان میں اس کی تگ و دو حد درجہ نامعقول جسارت ہے۔ کیونکہ یہیں آکر سب سے پہلے اس کے پائے لنگ کا حال کھلتا ہے اور وہ مضحکہ خیز چیز بن جاتا ہے" (من و یزداں حصہ دوم صفحہ ۳۹۳)

مثالیں اور بھی بہت سی دی جاسکتیں ہیں۔ مگر چھوڑیئے۔

کفر و اسلام کی اس جنگ کے بعد، جس میں سرد فریق نیاز اور گرم فریق علماء تھے، انہوں نے ایک محاذ کھول دیا۔ شیعہ اور سنیوں کے درمیان مسئلہ خلافت کا۔ نچلا بیٹھنا ان کے بس کی بات ہی نہیں۔ اس بحث کا آغاز "ہر نام" سے ہوتا ہے جو قرآن اور حدیث کے حوالوں سے باتیں کرتے ہیں اور حوالے دیتے ہیں ان کتابوں کے جن میں تقریب التہذیب استیعاب، اسد الغابہ، تاریخ کبیر، تاریخ کامل، تاریخ ابو الفدا، لباب التاویل، مواہب لدنیہ، تاریخ خمیس، صواعق محرقہ، حضائص، ریاض النقرہ، طبقات کبریٰ، تاریخ الخلفاء، مدارج النبوۃ، جامع البیان، تفسیر کبیر، موطا، سیرۃ ابن ہشام، روض الانف وغیرہ ہیں۔ یہ ساری کتابیں رجال، اسیر، تاریخ اور تفسیر کی مشہور کتابیں ہیں۔ اس سے پہلے میں نے ان میں سے چند ہی کے نام سنے تھے۔ چہ جائیکہ پڑھا ہو۔ جانچا ہو۔ مگر حیرت ہے ایک غیر مسلم پر، جو نہ صرف ان کتابوں کو پڑھتا ہے بلکہ ان میں ڈوب کر اپنے مطلب کے حوالے بھی نکال لاتا ہے۔ جہاں تک میرا ذہن کام کرتا ہے وہ تو یہ ہے کہ ہر نام کے پردے میں خود نیاز صاحب ہی تھے۔

ربع صدی پہلے ہی کا یہ بھی ذکر ہے کہ انہوں نے ایک شوشہ۔ خط کی صورت میں چھوڑا، جس میں تمام علما۔ سے یہ پوچھا کہ ایک مسلمان جو فاسق وفاجر ہے اور ہر لحاظ سے برا انسان ہے اور اس کے برعکس ایک غیر مسلم، جو ہر طرح سے بہتر انسان ہے اور دنیا کی کوئی برائی اس میں نہیں۔ ان دونوں میں سے جنت کا حق دار کون ہوگا۔

بہت سے علما۔ نے اپنی رائے گول مول سی دی۔ کچھ نے کنی کترائی۔ بہتوں نے یہ لکھا کہ مسلمان ہی جنت کا حق دار ہوگا، خواہ وہ کتنا ہی برا کیوں نہ ہو۔ جواب میں انہوں نے بڑے تند و تیز مضامین لکھے۔ ان کے کہنے کا جو کچھ بھی لب لباب تھا وہ کچھ یوں تھا

آپ لاکھ سمجھائیں۔ یہ بات میری سمجھ میں نہ آئے گی۔ خدا صرف مسلمانوں کا ہے اور سوا ان کے سب کو جہنم میں پھینک دے گا۔ ظہور اسلام سے لے کر اس وقت تک زیادہ سے زیادہ دو چار ارب مسلمان پیدا ہوئے ہوں گے اور ان کے مقابلے میں ہزار گنا زیادہ اور مذاہب کے لوگ، پھر کیا کوئی ذی عقل باور کر سکتا ہے کہ خدا ایک کو تو جنت دے ہزار کو دوزخ میں جلائے۔ اس کو اتنے جہنمی پیدا کرنے کی آخر ضرورت ہی کیا تھی اور اتنی مخلوق کو جن میں جانے کتنی عورتیں اور بچے ہوں گے آگ میں ڈال کر تڑپانے سے خدا کی کونسی مسرت وابستہ ہے۔ آپ کے پاس اس کا ایک ہی جواب ہے کہ اس کی مرضی اور میرے پاس بھی اس کے خلاف ایک ہی احتجاج ہے۔

یارب ز سیل حادثہ حادثہ طوفاں رسیدہ باد ۔۔۔ بت خانہ کہ خانقش نام کردہ اند

(مکاتیب نیاز)

جہاں تک میرا خیال ہے نیاز صاحب اندر سے بڑے مذہبی آدمی ہیں۔ انہوں نے اب تک مذہب کے بارے میں جو کچھ اور جتنا کچھ لکھا اس میں صرف جھوٹی مذہبیت کو جھنجھوڑا۔ بنے ہوئے خدائی فوجداروں کے مذہبی پندار کو آئینہ دکھایا۔ نیاز صاحب کوئی کافر وافر نہیں ہیں بلکہ معاملہ صرف اتنا نظر آتا ہے۔ کافر ہوا میں دین کے آداب دیکھ کر۔ بہرحال یہ چھیڑ چھاڑ انہیں بڑی مہنگی پڑی۔ ساری خدائی ایک طرف تھی اور یہ اکیلے ایک طرف۔ مولویوں سے بغاوت، رسول سے بغاوت کے نام سے تعبیر ہوئی اور پھر بات خدا سے بغاوت تک پہنچا دی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے مولویوں کے خلاف نقاب اٹھ جانے سے عدم قسم کے تقدس توڑ افسانے لکھے۔ ضد میں آکر اعتدال کی حدود یہ بھی پھاند گئے اور ہمارے علما۔ بھی حالانکہ ضرورت یہ تھی کہ ذرا پچکار کے اس "مسلمان کو کافر بنالیا جاتا" اس ذہنی ورزش کا اور کوئی فائدہ ہوا یا نہیں۔ مگر حقیقی نیاز سامنے آگیا اور عقل کو بھی مذہب کے معاملات میں ساتھ لے لینے کی بنیاد پڑ گئی۔

میں نے جو کہا ہے کہ نیاز صاحب اندر سے مذہبی آدمی ہیں تو اس کی کچھ وجوہ بھی ہیں۔ ابھی ایک کتاب "خلافت معاویہ و یزید" نکلی۔ بہت سے نامور علما۔ نے اس کی بڑی تعریف کی حالانکہ اس میں بڑی اوٹ پٹانگ باتیں درج ہیں۔ اس میں یزید کو خلیفۂ برحق کہا گیا ہے۔ پھر یزید کو امیرالمومنین علیہ اسلام اور رضی اللہ تعالیٰ عنہ لکھ کر مسلمانوں کے جذبات سے کھیلا گیا۔ مطلب یہ کہ سخت دل آزار قسم کی کتاب ہے۔ ڈاکٹر عبدالحق ایسے ادیب اور مولانا عبدالماجد دریابادی ایسے عالم نے اس کتاب کی تعریف کی مگر نیاز نے جو کافر ہیں، بڑا سخت ریویو لکھا اور اس کے مندرجات کو مطعون کروانا۔

اگر کوئی رسول کی عظمت کے بارے میں، خدا کے وجود کے بارے میں اور اسلام کی برتری کے بارے میں، نیاز صاحب کی تحریروں میں ڈھونڈنا چاہے تو وہ قطعاً مایوس نہ ہوگا۔ مگر کتنے ہیں جنہوں نے نیاز کے اس پہلو پر غور کیا ہوگا۔ ایک آدھ شہادت کے بعد، میں اس باب کو نہ چھیڑوں گا اس لیے کہ میں کوئی "مفتی وقت" نہیں ہوں کہ کسی کو مسلمان ہونے کے اور کسی کو مسلمان نہ ہونے کے پرمٹ بانٹتا پھروں۔ نیاز صاحب اپنے عقائد کے بارے میں خود کہتے ہیں

"غضب خدا کا، میں سو بار کہہ چکا ہوں کہ خدا کی عظمت و جبروت اور اس کی قوت و قدرت کا اس طرح قائل ہوں کہ شاید ہی کوئی اور ہو۔ ہزار

بار لکھ چکا ہوں کہ رسولؐ کی صداقت و بلندی فطرت پر جس طرح ایمان میں لایا ہوں شاید ہی کوئی دوسرا ایمان لایا ہو۔ لیکن باوجود اس اقرار کے بھی میں کافر ہوں۔ ملحد ہوں۔ مرتد ہوں۔ پھر اگر اسی اقرار و عقیدہ کا نام کفر و الحاد ہے تو

نازم بہ کفر خویش کہ بہ ایمان برابر ست (من و یزداں صفحہ ۸۹)

نیاز صاحب کے عقائد کے بارے میں زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے مذہب کے معاملے میں سرسید کے ہمنوا نظر آتے ہیں۔ سرسید بھی اپنے وقت میں ' کافر اور ملحد ' تھے۔ یہ بھی ہیں۔ اس لیے کہ دونوں کا جرم یہ ہے کہ انہوں نے مذہب کو عقلی انداز میں سمجھنے کی کوشش کی۔ آج لاکھوں کروڑوں مسلمان ہیں۔ مگر ان میں کوئی سرسید نظر نہیں آتا۔ اسی طرح کل بھی لاکھوں کروڑوں مسلمان ہوں گے مگر ان میں کوئی نیاز نہ ہو گا۔

نیاز صاحب سے میری پہلی ملاقات ۱۹۴۴ء میں ہوئی تھی۔ اس وقت کی کوئی بات میرے ذہن میں نہیں۔ سوا اس کے کہ میں انہیں ایک بڑا ادیب سمجھ کر ان سے ملنے چلا گیا تھا۔ دوبارہ ۱۹۴۶ء میں ملا۔

دوران گفتگو کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ بھی چلا۔ نیاز صاحب نے اس وقت تک، زیادہ تر اپنی کتابیں خود ہی چھاپی تھیں۔ میں نے یہ سمجھتے ہوئے کہ یہ اپنی کوئی کتاب کسی دوسرے ادارے کو نہ دیں گے پوچھ لیا۔ اگر آپ اپنی دو چار کتابیں ادارہ فروغ اردو کو بھی چھاپنے کے لیے دیں تو کرم ہو۔ خلاف توقع انہوں نے "بہت اچھا" کہہ دیا اور میں نے شائع بھی کیں لیکن ان میں وہ مضامین نہ تھے جو میں چاہتا تھا بعد میں یہ مضامین من و یزداں (حصہ اول) کے نام سے خود نیاز صاحب نے چھاپے۔

یہ وہی مضامین تھے جن پر ایک زمانے میں ہنگامہ بپا تھا اور دین کا "سچا درد رکھنے والے" نیاز صاحب کو قتل کر دینے کی فکر میں تھے۔ میں نے ایسے مضامین کی اشاعت کے بارے میں کیوں سوچا تھا یہ مسئلہ آج بھی میرے لیے غور طلب ہے۔ مگر یہ مسئلہ غور طلب نہیں کہ میں اگر نیاز صاحب کی ذہانت اور ان کی تحریر کا قائل ہوا تھا تو انہیں مضامین سے۔ عقل اور تحریر کا اتنا بانکپن یکجا کم ہی کبھی ہوا ہو گا۔

نیاز صاحب کی تحریر کی بات نکلی ہے تو میری دو چار باتیں اور بھی سن لیں۔ یہ مضمون لکھنے کے لیے میں نے نیاز صاحب کی کتابوں کو پھر سے پڑھنا شروع کر دیا۔ اس لیے کہ میرا خیال ہے کہ نیاز صاحب اپنی تحریروں میں بالکل واشگاف ہیں۔ دل و دماغ دونوں اعتبار سے۔

شروع شروع میں بعض خوبصورت فقروں اور جملوں پہ نشان بھی لگائے۔ مگر میں یہ کام کہاں تک کرتا۔ ہر سطر، ہر فقرہ اپنی طرف متوجہ کر لیتا بعد میں تو ان کی تحریروں کے بہاؤ میں ایسا بہا کہ کچھ ہوش نہ رہا۔ پھر نہ کوئی نشان ہی لگا سکا اور نہ کہیں اٹک سکا۔ بہتا ہی چلا گیا۔ یہ بھی پتہ نہ چلا کہ صبح کے تین بج گئے۔ تین بجے ہوں اور سماں یہ ہو۔ ٹھنڈی یخ رات، انوٹ سناٹا، دور کتے کے بھونکنے کی آواز، کسی کسی گھر میں سرسراہٹ، کہیں اکا دکا حقہ میں لپٹی ہوئی آواز۔ کبھی آپ نے نیاز کی تحریریں، ایسے ماحول میں پڑھی ہیں۔ اگر پڑھی ہوں گی تو ان پر الہام کا گمان بھی ہوا ہو گا۔ ایسے سے میں " ایک شاعر کا انجام " پڑھ رہا تھا۔ کیا بتاؤں، میں نے کیا کچھ نہ پایا۔

نیاز صاحب نے جو کچھ بھی امتیاز حاصل کیا۔ وہ اپنے قلم کے سحر سے حاصل کیا۔ لکھنے کے لیے کسی اہتمام کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بلکہ باتیں بھی کرتے جاتے ہیں لکھتے بھی جاتے ہیں۔ گلوری منہ میں ہوگی۔ خوں خوں کر کے باتوں میں ساتھ دیں گے۔ ضرورت پڑی تو پیک نگل کر بولیں گے۔ "یہ آپ نے کیسے سمجھ لیا کہ کام میں مشغول ہوں"۔ حافظہ بلا کا پایا ہے۔ ہر چیز، ہر کتاب ان کے ذہن میں منتقل ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے بڑے بڑے کام صرف چند دنوں میں کر ڈالے "۔ گہوارۂ تمدن " ایسی کتاب صرف پندرہ دن میں ذہن سے کاغذ پر منتقل ہو گئی تھی۔

ان کے ہاں آمد ہی آمد ہے۔ آورد نام کو نہیں۔ الفاظ واقعی ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں۔ یہ کمال میں نے صرف انیس، جوش اور نیاز میں دیکھا باقی سب کے ہاں کاریگری ہے۔ وہ چاہے محمد حسین آزاد ہوں چاہے کوئی اور۔ ہاں ابوالکلام کا نام بھی لیا جا سکتا ہے مگر انہوں نے آورد کو آمد بنایا۔ اس لئے میں نے دانستہ انہیں اس گروہ میں شامل نہیں کیا۔ یوں تو نیاز ابوالکلام سے متاثر ہیں۔ نیاز ہی کیا پورا دور متاثر ہے۔ ابوالکلام نے تحریر کی باگیں خطابت کے ہاتھ میں دے دیں مگر نیاز نے ایسا نہیں کیا۔ انہوں نے اپنا رنگ جمانے کے لیے تحریر کی آبرو کی قیمت اپنی ریاضیت سے ادا کی اور اسی نے

ان میں انا پیدا کیا۔

ان کے "انا" کا ایک واقعہ وہ عرض داشت بھی ہے جو انہوں نے بیگم صاحبہ بھوپال کے نام لکھی تھی۔ سن پندرہ سولہ کا واقعہ ہوگا۔ یہ زمانہ وہ تھا جب ان کا "گیتانجلی" کا ترجمہ شائع ہو چکا تھا "شاعر کا انجام" اور "جذبات بھاشا" چھپ چکی تھیں۔ بھوپال میں ان کے کچھ قدردان پیدا ہوئے جنہوں نے انہیں بھوپال آنے کی دعوت بھی دی اور بات بھی بیگم صاحبہ تک پہنچائی۔ بیگم صاحبہ نے وعدہ کر لیا کہ نیاز صاحب کا ہر طرح سے خیال رکھا جائے گا۔ نیاز صاحب جب بھوپال پہنچے تو فوری طور پر کچھ نہ ہوا۔ مجبوراً انہیں محکمۂ اوقاف میں کام کرنا پڑا۔ جب دو برس یونہی گزر گئے تو دوستوں کے تقاضے سے انہوں نے ایک عرض داشت بیگم صاحبہ کو بھیجی۔ وہ عرض داشت یہ ہے

زمن سپاس تو آید ہمیں کہ نالانم — زخندہ ات چہ نوابردہ ام کہ گریانم
نگاہ مہر کہ برمن فگندۂ بینم — سحاب لطف کہ برمن فشردۂ دانم
ولے ز آرزو خود ہنوز منفعلم — ز اقتضائے کمال خودش پشیمانم
بدست من سر دامان خود رسیدن دہ — وگرنہ چاک شدن خواہدش گریبانم
عجب نباشد اگر می زنی بدستارت — بجائے طرہ کہ من گوہرے زعمانم
بر مرا بہ مشامت کہ مشکم از تاتار — بکش مرا ببرت، ستغے از صفاہانم
مرا بہ افسرو دیہیم خود بدہ جائے — کہ من بہ تاب و صفا لعلے از بدخشانم
مرا بپرس زحساں و شیخ شیرازی — کہ نغمۂ عرب و طوطئے ز ایرانم
مرا بہ وعدۂ لطفے چوشاد فرمودی — نہ زیبدت کہ تماشہ کنی پریشانم
چہا کنی کہ تو امروز نیشتر سازی — ہماں امید کہ دی ساختی رگ جانم
تلافئے کن و قدرم شناس و کارم دہ — کہ باشد از نظر عدل و نظم شایانم
وگرنہ دہ خبر از نامرادیم کہ زنم — بہ سنگ تخت فنا قلب شیشہ سامانم

ملاحظہ فرمائی آپ نے عرضداشت، دیکھیے درخواست میں بھی ان کا انا کس مقام پر ہے۔ بیگم صاحبہ پر طنز اور اپنی حد درجہ بڑائی کا احساس یہ طنطنہ آپ کو اس قلندر کے علاوہ اور کس کے ہاں ملے گا؟ بیگم صاحبہ کا بھی ظرف دیکھیے کہ انہوں نے ایسی عرضداشت پر بھی ان کا (۱۹۱۸ء میں) کوئی ڈیڑھ دو سو روپیہ ماہوار کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ تا کہ "بزرگوار" آزادانہ تصنیف و تالیف کا کام کر سکیں۔

عمل زندگی میں یہ ریاضی ہیں یا اقلیدس ہیں۔ جس طرح ایک عدد دوسرے عدد کو جمع تفریق ہوئے بغیر کوئی نقصان نہیں پہنچاتا اسی طرح یہ بھی اپنے ملنے والوں کو جمع تفریق ہوئے بغیر کوئی نقصان نہیں پہنچاتے۔ اور گوتم بدھ کی طرح، ان کے پاس ایک خاص قسم کا ذہنی سکون بھی ملتا ہے۔ ربودگی اور بھاری بھرکم پن کے ساتھ ایک خاص قسم کا استغنا۔ تکلف نام کو نہیں۔ چھوٹے پندار سے یارانہ نہیں۔ سوچنے کا انداز نرالا۔ مذہبی معاملہ ہو یا علمی و ادبی، انہیں اپنے جوہر دکھائے بغیر چین نہیں پڑتا۔ چاہے کسی بھی معاملے میں سو سو کیڑے ڈلوا لیجیے۔ ہماشما کا تو ذکر ہی کیا۔ انہوں نے خدا کی کتاب (قرآن) تک کو کہہ دیا کہ یہ خدا کا کلام نہیں، بلکہ اس کتاب کو اگر رسولؐ کی کتاب مانیں تو اس سے رسولؐ کی عظمت اور بڑھے گی۔ مطلب یہ کہ بات دنیا سے الگ جو کرنی ہوئی۔

انہوں نے اگر کسی کے خلاف لکھا ہے تو وہ سب کے سب ایسے ہیں جن کا ادب میں اونچا مقام ہے۔ چھوٹے موٹے ادیبوں کو تو منہ ہی نہیں لگاتے۔ پہلے بھی میں نے عرض کیا ہے کہ بتدیوں کی تو بے جا حد تک تعریف افزائی کر جائیں گے اس خیال سے نہیں کہ وہ ایسے توصیفی کلمات کے مستحق

ہوتے ہیں بلکہ اس خیال سے کہ ان کی مخفی صلاحیتوں کو ابھرنے کا موقع تو ملے اور ------ اور ------ انہوں نے بڑے بڑے اساتذہ کو وہ وہ اصطلاحیں دی ہیں کہ بے چارے نکو بن کر رہ گئے ۔ کوئی خوش قسمت ہی ہوگا ۔ جو ان کے قلم کی زد سے بچا ہو ۔ جہاں تک شعر کے سمجھنے کا تعلق ہے خوب سمجھتے ہیں ۔ شعروں کا آپریشن بھی خوب کرتے ہیں ۔ مگر اس آپریشن میں بعض اوقات شعر کو ذبح بھی کر ڈالتے ہیں ۔

نیاز صاحب نے فارسی تو اپنے والد ماجد سے پڑھی اور عربی مختلف اساتذہ سے ۔ انہی بزرگوں کا یہ سب کیا دھرا ہے جو نیاز کی شکل میں ہمارے سامنے آیا ۔ اور یہی وجہ ہے کہ بسا اوقات ان کے فقرے سمجھ میں نہیں آتے ۔ بہ ظاہر اردو کے ہوتے ہیں مگر ٹوہ لگائی جائے تو ان میں سے کچھ فارسی کے نکلتے ہیں اور کچھ عربی کے اور پڑا ان غریبوں کا ہو جاتا ہے جو اپنی طرف سے اردو پڑھنا چاہتے ہیں ۔

نیاز صاحب غالباً پہلے شخص ہیں جنہوں نے قلم کو آمدنی کا ذریعہ بنایا ۔ جب تک یہ بھوپال میں تھے اس وقت تک ان کا اپنا کوئی اشاعتی ادارہ نہ تھا مگر یہ مضامین اس وقت بھی معاوضتاً دیتے تھے ۔ ۱۹۱۰ء میں یہ باقاعدہ قسم کے مضمون نگار تھے ۔ تمدن ، اسوۂ حسنہ ، صوفی ، خطیب وغیرہ رسائل میں ان کے مضامین نکلتے بھی تھے ۔ چلتے بھی تھے ۔ اس کے بعد جب انہوں نے باقاعدہ کتابوں کی نشر و اشاعت کا سلسلہ چلایا اور نگار کو آسمان صحافت تک پہنچایا تو لاکھوں کمائے خوب خوب کتابیں لکھیں جو بکیں بھی خوب خوب ۔ نگار کے بھی وہ وہ نمبر نکلے کہ ان پر اضافہ تقریباً ناممکن ہے ۔

یوں تو نگار کے قلمی معاونین میں ، ہمیشہ بڑے لکھنے والے رہے مگر ان سب کی موجودگی میں بھی نیاز کی تحریر کی بات ہی اور ہوتی تھی اور جی چاہتا تھا کہ کاش سارا رسالہ خود نیاز صاحب کی تحریروں ہی سے مزین ہوتا ۔ چنانچہ انہوں نے ایسا بھی کر دکھایا ۔ سارے کا سارا نمبر خود کہہ کر پیش کر دیا پڑھنے والے نہال ہو گئے ۔ یہ مرتبہ بھی نیاز صاحب کے سوا ، کسی اور کو نصیب نہ ہوا ۔

نیاز صاحب مومن کے بڑے مداح ہیں ۔ جو کوئی بھی مومن کا زیادہ مداح ہوگا وہ لازمی طور پر اس کے ہمعصر غالب کا طرف دار نہ ہوگا ۔ یہی حال کچھ نیاز صاحب کا بھی ہے مگر یہ اپنے مضامین میں جتنے شعر غالب کے کوٹ کرتے ہیں اتنے مومن کے نہیں کرتے ۔ احتیاط صرف اتنی کرتے ہیں کہ غالب کے اردو شعروں کے بجائے ، فارسی کے شعر اپنی نثر میں سجاتے ہیں ۔ معلوم ہوا کہ یہ غالب کو فارسی کا شاعر اور مومن کو اردو کا شاعر مانتے ہیں ۔ یہ فلسفے کو صرف تصوف اور تصوف کو غزل نہیں سمجھتے ۔ یہی وجہ ہے کہ غزل کا جو تصور ان کے ہاں ہے ۔ وہ مومن ہی میں ملتا ہے ۔ غالب میں نسبتاً کم ملتا ہے ۔ بہ ظاہر یہ بات چاقو چل جانے والی ہے ۔ مگر یہ کچھ زیادہ غلط نہیں ۔

اس لحاظ سے بھی نیاز صاحب کی زندگی کا مطالعہ کیا جائے تو یہ عملی زندگی میں بھی مومن ہی نظر آتے ہیں ۔ مومن ہی کی طرح عورت سے لطف اندوز ہوتے ہیں ۔ مومن ہی کی طرح عورت کی پرستش کرتے ہیں اور مومن ہی کی طرح کا ، ان کے ہاں بھی تصور عفت ملتا ہے ۔ کچھ عجیب سی رندی میں عفت اور عفت میں رندی کا سا انداز ہے ۔

مومن اپنی مثنویات میں جس طرح نظر آتے ہیں نیاز ویسے ہی اپنے خطوط میں نظر آتے ہیں ۔ میں نے ان کی تحریروں میں شراب کی باتیں پڑھی ہیں مگر انہیں کبھی پیتے ہوئے نہ پایا ۔ ادھر ادھر پوچھا بھی ، مگر ان کی بادہ خواری کا حال نہ کھلا ۔ پیتے ضرور ہوں گے ۔ اس لیے کہ دوستوں کو بھی کہتے ہیں کہ چار انگل شراب پیو اور خدا کو یاد کرو " ۔ اگر یہ بات نہ ہوئی تو ان کا قلم اتنا سچا اور اتنا بے ریا نہ ہوتا ۔ شراب میں ہزار عیب ہوں گے مگر بادہ خوار کا باطن میلا ہونے نہیں دیتی ۔ اس باب میں ان کا مسلک کچھ اس قسم کا نظر آتا ہے ۔

گہہ ، گہہ ، خور و کم خور و تنہا مے خوار

میرا بڑا جی چاہتا ہے کہ میں بھی معقول آدمی بن جاؤں ۔ مگر نہیں بن سکا ۔ اچھے برے مشاغل کا اتنا ہجوم ہے کہ پناہ بخدا ۔ میرے پاس جتنے خط آتے ہیں ان سب کا جواب دینا میرے بس کی بات ہی نہیں رہی ۔ پھر یہ بھی نہیں کہ مجھے اپنی اس زیادتی کا احساس نہ ہو ۔ مگر میں کیا کروں ۔ ہجوم کار کی زیادتیوں نے مجھے عاجز سا بنا دیا ہے ۔ اس کے برعکس نیاز صاحب خطوط کے جواب میں اتنے باقاعدہ ہیں جیسے سورج کا ہر روز نکلنا ۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ اٹھارہ برس کے عرصے میں انہوں نے میرے کسی خط کا جواب نہ دیا ہو ۔ میں کتنا نالائق ، یہ کتنے باضابطہ ، رشک چھوڑ ، حسد والی بات ہے یہ !

یہ صرف خطوں کے جواب ہی میں باقاعدہ نہیں بلکہ ان کی پوری زندگی ہی ایک ضابطے میں ڈھلی ہوئی ہے۔ انہیں جو کام اس وقت کرنا ہے وہی کام دوسرے دن اور اسی وقت کرنا ہے۔ نیاز صاحب خط کا جواب ضرور دیں گے خواہ صرف اتنا ہی لکھا ہو۔ "تم لکھنو آرہی ہو۔ بالکل جھوٹ! نیاز"۔ میرا خیال ہے کہ نیاز صاحب میری طرح دن رات کے اتنا چھوٹا ہونے پر خوش نہ ہوں گے۔ ضرور چوبیس گھنٹوں کے بجائے ایک سو چوبیس گھنٹے چاہتے ہوں گے۔ ۶۲ گھنٹے دن کے ۶۲ گھنٹے رات کے، مگر انہیں بھی سب کی طرح ۱۲ گھنٹے دن میسر ہیں اور ۱۲ گھنٹے رات کے۔ مگر ان بارہ گھنٹوں میں یہ کیا کچھ کرتے ہیں آئیے ذرا اس کا تو سراغ لگائیں۔

صبح اٹھتے ہیں۔ سیر کرتے ہیں۔ خطوں کے جواب دیتے ہیں (اس میں سبھی قسم کے خطوط ہوتے ہیں۔ عام کاروباری بھی، احباب کے نام بھی، ادبی نوعیت کے بھی اور عاشقانہ بھی) آئے ہوئے اچھے برے مضامین پڑھتے ہیں (یہ کام بہ ظاہر تو بڑا اشانہ دار معلوم ہوتا ہے۔ مگر جو کرتا ہے اسے ہی معلوم ہے کہ ایڈیٹری کس عذاب کا نام ہے) مضامین کی تصحیح کرتے ہیں، ناقابل اشاعت مضامین واپس کرتے ہیں۔ کھانا کھاتے ہیں۔ قیلولہ کرتے ہیں۔ تصنیف و تالیف کا کام کرتے ہیں۔ دوست احباب سے گپ لڑاتے ہیں۔ چائے نہیں پیتے۔ پان کھاتے ہیں۔ سگریٹ نہیں پیتے۔ شام کو کوئی نہ کوئی دلچسپ کام کرتے ہیں۔ سنیما دیکھتے ہیں "کسی نہ کسی" سے ملنے چلے جاتے ہیں۔ مطالعہ کرتے ہیں۔

مجھے نیاز صاحب کے خط بڑے پیارے معلوم ہوتے ہیں۔ مکتوبات نیاز میں جتنے خط ہیں۔ ان میں کچھ تو فرضی ہیں جو انہوں نے کسی نہ کسی مسئلے کو خط ہی کے پیرایہ میں لکھنے کو بہتر جان کر لکھ ڈالے۔ مگر بیشتر خط ایسے ہیں جن کا واقعی کوئی مخاطب تھا بھی اور نہیں بھی۔

مکاتیب نمبر کی ترتیب کے وقت مجھے ان کے کچھ ایسے خط بھی ملے تھے جن میں نیاز صاحب نے اپنے جوان قلم سے خون کی سیاہی چھڑکی تھی مگر میں نے ان کی اشاعت مناسب نہ سمجھی۔ اس لیے کہ مجھے نیاز صاحب کی شخصیت سے ایک نیازمندانہ ربط ہے مگر نیاز صاحب خود اس کی کچھ پروا نہیں کرتے وہ علی الاعلان راجہ اندر رہنے میں کسی قسم کی جھجک محسوس نہیں کرتے۔ اس لیے میں بھی انہیں مسیح کیوں سمجھوں۔

صنف لطیف کی نفسیات کا جتنا گہرا مطالعہ ان کے ہاں ملتا ہے وہ انہی کا حصہ ہے۔ "جذبات بھاشا" ہمیں ان کے ادبی رجحانات کا رخ سمجھاتی ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ کس طرح عورت کی نفسیات کی عکاسی اور نقاشی کرتے ہیں۔ قاضی عبدالغفار نے بھی "لیلے کے خطوط" میں عورت کی نفسیات کی بڑی عمدہ عکاسی کی ہے۔ مگر ان دونوں میں ایک بنیادی فرق ہے قاضی صاحب کے ہاں عورت کی جو نفسیات ملتی ہے۔ وہ کوٹھے والیوں کی ہے نیاز کے ہاں شوقین عورتوں کی نفسیات ہے۔

اس نوع کا، ان کا ایک مضمون "کیوپڈ اور سائیکی" ہے۔ پڑھتے جائیے اور مرحبا کہتے جائیے۔ مگر میں یہاں ان کے مضمون "رقاصہ" کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ بڑی گہری باتیں ہیں اس میں یوں معلوم ہوتا ہے جیسے نیاز صاحب اس کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ رقاصہ کی تعریفیں کرتے ہیں مگر یہ کہتے ہیں۔ "کاش تو صرف میری ہوتی اور اس پر افسوس بھی کرتے ہیں کہ تو سب کی ہے"۔ شاید یہی وہ انداز فکر تھا جس کی وجہ سے انہوں نے کوٹھوں پر چڑھنے کے بجائے، شائستہ عورتوں ہی سے ایک قسم کی ذہنی وابستگی رکھی۔ یہ "وصل کے بعد تنہائی بھی اک دنیا ہے"۔ پر بھی ایمان رکھتے ہیں۔ جو قطعی طور پر ذہنی آوارگی کی سند ہے۔ یہ اگر اپنی زندگی کو کچھ محرومیوں سے بھی آشنا نہ رکھتے تو اس رنگ میں اتر ہی نہیں سکتے تھے۔ اتنا گہرا مشاہدہ کہ تصور کی آنکھیں ہار مان لیں۔ شاید ہی اردو میں کہیں ملے۔ اگر یہ اس نوع کے بھی عملی انسان ہوتے اور اپنی جوانی کو نگار کے صفحات سے اٹھا کر، ہاتھ پہ لیے پھرتے تو ایسا مضمون قیامت تک نہ لکھ سکتے۔ انہوں نے ہمیشہ بازار کی روٹی اور بازار کی چیز سے پرہیز کیا۔ عجیب سے رند پاک باطن ہیں یہ!

جہاں تک میں خود نیاز صاحب کی تحریروں سے اندازہ کر سکا وہ تو یہی ہے کہ ابتدائی زندگی انہیں بڑی پابندیوں اور بڑی گھڑکیوں کے سے ماحول میں بسر کرنی پڑی۔ مگر جب عمر ایسی لگی جس میں ذہنی نشاط کی قیمت معلوم ہوتی ہے تو پھر وہ کھل کھیلے۔

پیٹھا برس لگنے کے بعد انہوں نے کیا کچھ کیا ہوگا۔ اس کا کچھ زیادہ پتہ نہیں چلتا۔ یہ ہزار نگنے سہی، مگر پھر بھی جوش اور فراق کی طرح نہیں ہیں جو یہ آواز کہتے ہوں کہ میں نے دو درجن عشق کئے اور میں نے تین درجن عشق کئے۔ یہ درجنوں عشق والی بات آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی۔

نیاز صاحب کی عمر اس وقت اسی برس کے قریب ہے۔ اگر میری عمر بھی اتنی ہوتی تو مجھے یہ سب کچھ لکھنا چاہیئے تھا۔ اب تو میں نے ان کی بزرگی کا ذرا بھی لحاظ نہیں کیا۔

اقرار کرتا ہوں۔ اگر میں نیاز صاحب کی خدمت میں اتنا گستاخ نہ بنتا تو اچھا ہی تھا مگر میں نے یہ سب کچھ دانستہ کیا ہے اس لیے کہ میرا خیال ہے اور لوگ ضرور نیاز صاحب کو فرشتہ بنا کے چھوڑیں گے مگر میں اتنے بڑے آدمی کو اتنا ذلیل ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

(از "نگار" پاکستان سالنامہ ۱۹۶۳ء)

"لکھنؤ کی شاعری میں الفاظ کی طلسم بندی، کنگھی، چوٹی، انگیا، آنچل، آرسی، سرمہ، بے معنی صنائع و بدائع اور اسی قسم کی بہت سطحی و غیر سنجیدہ خصوصیات کے پیدا ہونے کا سبب یہی تھا کہ اس وقت کی زندگی، ہی ایک جھوٹی زندگی تھی اور رات دن ان کو انہیں چیزوں سے واسطہ تھا اور انہیں پر ان کے نشاط کی بنیاد قائم تھی، ان کی شاعری کا موضوع عہدِ وحشت کی وہ عورت تھی جب اس سے صرف ہوس رانی کا کام لیا جاتا تھا اور جس کو اسباب آرائش و زیبائش کی دوسری کم مایہ جنسوں کی طرح قابل بیع و شرئ جنس قرار دے دیا گیا تھا، لکھنؤ کی سرزمین میں قصر شاہی سے لے کر فقیر کے جھونپڑے تک یکساں طور پر جذبۂ شہوت پرستی کار فرما تھا، نہ فرمانروا کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس رہ گیا تھا اور نہ رعایا کو تحسین و تمدن کا۔ ہر شخص اپنی جگہ عیش کوشی و نشاط اندوزی میں معروف و منہمک تھا اور نسائیت جو معصیت زندگی کا لازمی نتیجہ ہے بلا تفریق ہر طبقہ کے مردوں میں پیدا ہوتی جا رہی تھی، سرکار انگریزی نے شاہ و رعایا سب سے عسکری روح چھین لی تھی اور ان کے جذبات عزت و شجاعت کو صرف بٹیر بازی، کنکوے بازی اور تیتر بازی میں تبدیل کر دیا تھا اور وہ بالکل غیر معلوم و غیر محسوس طور پر انسانیت کی اس نچلی سطح پر آرہے تھے جو حیوانیت تک پہنچنے کے لئے حد فاصل درمیان نہیں رکھتی۔"

نیاز



علامہ نیاز اور فتح پور

ضیاء حسنی

اردو کے مایۂ ناز ادیب، شیریں نوا شاعر، معتبر ناقد، بیباک صحافی، نسل ساز جریدۂ نگار کے مدیر حضرتِ نیازؔ ۱۸۸۴ء کو سنئی گھاٹ ضلع بارہ بنکی میں پیدا ہوئے۔ اُن کا تاریخی نام لیاقت علی خاں ہے۔ اُن دنوں ان کے والد مرحوم امیر محمد خاں وہاں سب انسپکٹر آف پولیس کے عہدہ پر فائز تھے۔ اُن کا آبائی وطن فتح پور ہے جو مشہور صنعتی شہر کان پور اور زیارت گاہ الٰہ آباد کے درمیان واقع ہے۔ اِس کا پُرانا نام اینٹا تھا اور اسے علاؤالدین نے فتح کر کے اس کا نام فتح پور رکھا تھا اور جب سے یہ اسی نام سے موسوم ہے۔ اگرچہ یہ کم آبادی والا پس ماندہ شہر اُتر پردیش کے دوسرے شہروں کے شانہ بشانہ نہیں چل سکا اور زبان حال سے اپنی زبوں حالی اور سربراہانِ ملک کی بے التفاتی کا شکوہ سنج بھی رہا ہے لیکن جب کبھی ملک کی معطر زلفیں اُلجھیں تو اُس نے اپنے ناخنِ تدبیر سے اُنھیں سلجھانے سے کبھی پہلو تہی نہیں کی۔ اس بستی میں سدا روحانیت اور مذہبیت کا بول بالا رہا ہے اور اس سرزمین سے اُبھرنے والے فرزندانِ جلیل نے اخلاق کے اعتبار سے اُجڑے ہوئے دلوں اور اندھیرے اور سنسان پیکروں کو منوّر اور روشن کیا ہے اور سسکتی اور بلکتی انسانیت کو پُرسکون بھی کرتے رہے ہیں۔ یہاں کے جیالے، نڈر اور بے خوف نوجوانوں نے طوفانوں کو منھ چڑھاتے ہوئے تاریخ کے تیز و تند دھارے کو موڑنے کی بھرپور کوششیں کی ہیں اور جب مجبور و بے بس ہوئے تو والہانہ طور پر تختہ دار کو چوم کر زندۂ جاوید بن گئے۔ فتحپور کو یہ بھی فخر حاصل ہے کہ اس خاک سے متعدد ادیب و شاعر اُبھرے اور عالم و فاضل اور دانشور بھی، جنھوں نے اپنی علمی و ادبی خدمات سے دنیائے ادب میں ناموری حاصل کی۔ میں زیادہ دیر ان تفصیلات میں نہ اُلجھاؤں گا لیکن مطالعۂ نیازؔ وہ محبوب موضوع ہے جو آپ کا دامن پکڑتا رہا ہے اور اس کا تقاضا ہے کہ آپ دیارِ نیازؔ کو بھی ایک اُچٹتی نظر سے دیکھتے چلیں جہاں کی خوشگوار فضاؤں نے نیازؔ کی رہنمائی کی اور یہیں سے انھوں نے اپنی شناخت کرانے کا آغاز کیا تھا۔ اِس بستی کی تاریخ صدیوں پُرانی ہے جب کبھی ملک میں کوئی انقلاب رُونما ہوا تو اس کی دستک یہاں بھی سُنائی دی کبھی فتحپور راجگانِ قنوج کے زیرنگیں رہا اور کبھی یہ شاہانِ شرقی کے زیر اقتدار آیا۔ ماضی میں فتحپور سے زیادہ اس کے قصبات کوڑا، کھجوا اور ہنگام کی اہمیت تھی۔ مغلوں اور نوابانِ اودھ کے زمانہ میں کوڑا ہر لحاظ سے اہمیت رکھتا تھا۔ کھنڈرات سے پتہ چلتا ہے کہ کئی میل کے رقبہ میں آبادی تھی۔ سرکار کوڑا دکرٹرا کا یہ صدر مقام بھی تھا۔ یہاں ایک مشہور درسگاہ تھی جہاں دور دراز علاقوں سے تشنگانِ علم جوق در جوق چلے آتے تھے۔ حضرت مخدوم صاحب اور اُن کے پرپوتے صاحبِ سلسلہ بزرگ حضرت سید شاہ جمال اولیاء کے سبب سے بھی اسے کافی شہرت حاصل ہوئی۔ حضرت سید شاہ جمالؒ کے ممتاز شاگرد ملّا لطف اللہ کا مزار بھی یہیں ہے۔ موصوف شیخ کے خلیفہ اور سعادتمند شاگرد تھے۔ مولانا حکیم سید نصرت حسین کا تعلق بھی اسی خاندان سے ہے اور کوڑا اُن کا وطن ہے۔ موصوف شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے ممتاز شاگرد اور اُن کے رفیق کار تھے۔ حکیم صاحب کا دورانِ اسارت مالٹا میں ۱۹۱۷ء میں انتقال ہوا۔ مولانا حسرت موہانی کا ننیہال کوڑا کے قریب مسّی میں تھا۔ وہ گاہے گاہے اپنے احباب سے ملنے کوڑا جاتے تھے۔ اُن کا درجِ ذیل شعر ان ملاقاتوں کی یاد دلاتا ہے:

وہ جو اک لیکا کبھی خاکِ جہاں آباد سے ✽ اب تلک موجود ہے کچھ کچھ لگا لائے تھے ہم

اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اُن کی غزلیہ شاعری کو کوڑا کی خوشگوار فضاؤں میں پروان چڑھنے کا موقع ملا۔ کھجوا بھی عہدِ مغلیہ میں دو جنگوں کے سبب سے شہرت رکھتا ہے۔ پہلی بار اورنگ زیب اور شاہ شجاع کے مابین ۱۶۵۶ء میں جنگ ہوئی اور اورنگ زیب کو فتح حاصل ہوئی اور دوسری

بار ۱۷۱۲ء میں فرخ سیر نے جہاندار شاہ کو شکست دی۔ اورنگ زیب کے عہد میں تعمیر کی ہوئی ایک وسیع و عریض عمارت مغلوں کی عظمتِ رفتہ کی یاد دلا رہی ہے جس کے متعدد کمرے اور دو شاندار پھاٹک آج بھی قائم ہیں۔ اسی عمارت کے قریب کئی بیگھوں میں ایک باغ لگوایا گیا تھا جسے شاہی باغ کہا جاتا ہے۔ اسی قصبہ میں انگریزوں نے ۵۲ مجاہدینِ آزادی کو اِملی کے درخت پر لٹکا کر باری باری پھانسی دی تھی۔ یہ اِملی کا درخت آج بھی جبر و تشدد کی اس داستان کو سنا رہا ہے۔

ہتگام بھی قدیم تاریخی قصبہ ہے۔ اس کا پرانا نام ہستناگرام تھا جسے اب ہتگام کہا جاتا ہے۔ راجگانِ قنوج سے یہ وابستہ تھا۔ اس میں ایک تاریخی مسجد جسے 'چندی مسجد' کہتے ہیں وہ آج بھی موجود ہے۔ اس قصبہ میں علماء، فضلاء اور خدا رسیدہ بزرگوں کے مزارات کثیر تعداد میں موجود ہیں اور یہاں کے کھنڈرات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کبھی کافی آباد رہا ہوگا۔ عہدِ برطانیہ کے آغاز میں یہاں عدالت منصفی قائم تھی اور اس کے منصف سر سید احمد خاں کے بھائی سید محمد خاں تھے۔ انھوں نے ۱۸۳۷ء میں اُردو کا دوسرا اخبار نکالا تھا۔

فتح پور کو آباد کرنے اور یہاں کے باشندوں کی اصلاح اور انھیں راہِ راست پر لگانے کا کام دو نیک سیرت اور خدا رسیدہ بزرگوں نے کیا۔ یہ شاہ سید و ولی اور مخدوم نظام الدین بھاجری ہیں جن کے کارناموں کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ سید واڑہ، خیلدار اور بھاجری میں شیوخ اور سادات آباد تھے اور مسوانی بٹی اور زید دن میں عالی نسب پٹھان رہتے تھے۔ محلہ آبو نگر کو نواب عبدالصمد نے اپنے فرزند ابو محمد کے نام پر آباد کیا تھا۔

ہسوہ بھی ضلع فتحپور کی قدیم بستی ہے۔ اکبر نے جونپور جاتے ہوئے کمال خاں کو اس علاقہ کا انتظام کرنے کے سلسلہ میں ہسوہ میں تعینات کیا تھا۔ اس کے بعد آصف خاں اور عبدالحمید مامور ہوئے۔ ۱۶۴۲ء میں نواب ابو محمد نے اسے پھر سے آباد کیا۔ یہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کی ملی جلی آبادی تھی اور صدیوں سے لوگ مل جل کر رہتے تھے۔ حضرت مولانا سید شاہ عبدالسلام کا تعلق بھی اسی قصبہ سے ہے۔ موصوف کافی صفات کے حامل بزرگ تھے۔ بے ضرورت کلام نہ کرتے۔ سادگی، قناعت اور دنیا بیزاری ان کی زندگی سے نمایاں تھی۔ شاہ نجم الدینؒ اور مولوی حافظ ناظر علی کاکوروی ان کے خاص خلفاء میں تھے۔ نیازؔ کے والدِ مرحوم امیر محمد خاں بھی اُن کے مرید تھے۔

فتح پور عہدِ برطانیہ میں ۱۸۲۶ء میں ضلع کی حیثیت حاصل کرسکا۔ اس سے پہلے اس کا نصف مغربی حصہ سرکار کوڑا میں اور نصف مشرقی حصہ سرکار کڑا میں شامل تھا۔

جدوجہد آزادی اور ملک کو فرنگی تسلط سے آزاد کرانے میں اس ضلع کی نمایاں خدمات ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہاں جنگِ آزادی کی کوششیں ذرا دیر سے شروع ہوئیں لیکن یہاں کے کفن بردوش اور جاں فروش مجاہدینِ آزادی کو کسی نوع فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ڈپٹی حکمت اللہ، جوالا پرشاد، دریاؤ سنگھ اور مولوی احمد اللہ شاہ کی اجتماعی کوششوں سے ۹ جون ۱۸۵۷ء سے جولائی کے وسط تک تقریباً ۵ ہفتے اہلِ فتح پور کو آزاد فضا میں سانس لینے کا موقع نصیب ہوا لیکن بدقسمتی سے سازشیں کام کر گئیں اور جیالے مجاہدینِ آزادی تختۂ دار پر لٹک کر شہید ہو گئے۔ ڈپٹی حکمت اللہ معرکۂ فتح پور میں ہی ڈپٹی مجسٹریٹ تھے لیکن آزادی کے اس متوالے کو کسی نوع فرنگی تسلط پسند نہ تھا اس لئے وہ مجاہدین کی صف میں شامل ہو گئے تھے۔ انگریزوں نے جیسے ہی مجاہدین پر قابو پا لیا تو انھوں نے حکمت اللہ کا سر تن سے جدا کر کے اُسے کوتوالی میں لٹکا دیا تھا تاکہ دوسرے مجاہدین خوف زدہ ہو کر سمٹ کر بیٹھ جائیں۔ نیازؔ کے دادا پیر محمد خاں کو بھی اسی دوران پھانسی دی گئی تھی۔

نیازؔ سے پہلے عبداللہ فتح پوری نے ڈرامے تصنیف کر کے دُنیائے اردو میں ناموری حاصل کی تھی۔ ان کا نام اُردو کے ڈراموں کے قدیم ترین معماروں میں لیا جاتا ہے اور ڈاکٹر نامی نے اس سلسلہ میں انھیں آغا حشر سے آگے بتایا ہے۔ نیازؔ کے ہمعصروں میں سحرؔ ہنگامی، نشترؔ ہنگامی، ملی اوسط رشک، سفیرؔ فتح پوری، حکیم محمد طاہر اور حسن الدین خاموشؔ بھی شعر گوئی اور نثر نگاری میں اپنے جوہر دکھا رہے تھے۔ سحرؔ اور نشترؔ ایک معزز شائستہ گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ اُن کی تخلیقات 'زمانہ' کانپور، 'ادیب' اور 'تمدن' میں چھپا کرتی تھیں ـــــ

حسن الدین خاموش اپنی نثری تخلیقات کا سہارا لے کر سامنے آئے۔ اُن کی کتابیں "یادگارِ ظہور" اور ناول "لیڈی ڈاکٹر حلیمہ خانم" قابلِ ذکر ہیں۔ موصوف نے برسوں اخبار "دلچسپ" بھی نکالا لیکن نیازؔ جیسا قد آور ادیب و صحافی اور شاعر نہیں اُبھرا۔ اُن کے جریدۂ نگار کی تمام دُنیائے اردو میں دھوم مچ گئی۔ عصرِ حاضر میں اکثر ادیب و شاعر جو فلکِ ادب کے درخشندہ ستارے بن کر چمکے انھیں نیازؔ اور نگار سے روشنی ملتی رہی ہے۔

نیازؔ نے فتح پور کے اثنائے قیام میں اپنے گھر کو آباد دیکھا تھا۔ ان کا خاندان خوش حال تھا اور وہ ایک ایسے وسیع و عریض مکان میں رہتے تھے جسے گڈھی کہا جاتا تھا۔ وہ لکھتے ہیں "بڑا آباد گھر تھا۔ کم از کم بیس افراد ایک دسترخوان پر کھانا کھاتے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے میری آنکھوں کے سامنے بالکل اُجڑ گیا۔ یہاں تک کہ وہ اب بالکل سنسان کھنڈر رہ گیا ہے۔" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نیازؔ فتح پور میں نشیب و فراز سے گزرتے رہے ہیں۔ جہاں انھوں نے دورِ فراغت دیکھا تھا وہاں وہ اپنی نگاہوں کے سامنے فکر، بے اطمینانی اور تردد کی گھنیری بدلیاں بھی اُبھرتی ہوئی دیکھتے رہے ہیں۔ یہی وہ زمانہ ہے کہ جب اُنھیں ضرورت کے موقعوں پر ملازمت بھی کرنی پڑی۔ فتح پور کے اثنائے قیام میں ایک بار اُن کی زندگی کے لالے پڑ گئے تھے۔ اگر زندگی وفا نہ کرتی اور حالات ساز گار نہ ہوتے تو دنیائے اردو ایک جادو نگار نثر نگار اور بے باک صحافی سے محروم ہو جاتی۔ ذرا اس حادثے کو حضرت نیازؔ کی زبانی سُنتے چلئے!

"طالب علمی کا زمانہ ہے اور میں اپنے وطن فتح پور میں ہوں۔ عمر بارہ سال کی ہے اور ۱۸۹۶ء۔ ہر مہینہ کی صبح کو چند ساتھیوں کے ساتھ آبادی سے باہر نکل کر دن بھر باغ و صحرا میں چکر لگانا زندگی کا معمول ہے۔ ایک مرتبہ بارش کے زمانہ میں ہم سب ایک باغ میں جمع ہیں اور فکر یہ ہے کہ صرف آموں سے پیٹ بھریں۔ چونکہ یہ باغ میرا ہی تھا اس لئے سوال سرقہ کا بھی نہ تھا۔ آم کا ایک درخت وسیع پختہ کنوئیں کے کنارے واقع تھا۔ اس پر سب چڑھ گئے اور آم توڑنے میں مصروف ہو گئے۔ دفعتاً پورب کی طرف سے ایک سیاہ آندھی اُٹھی اور آناً فاناً اتنی تاریکی ہو گئی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ اس کے ساتھ ہوا کی تیزی کا یہ عالم ہو گیا کہ درخت جس پر ہم لوگ سوار تھے پرکاہ کی طرح ہلنے لگا اور اس کی شاخیں چرچر کرنے لگیں۔ کچھ خبر نہ تھی کہ ہم لوگ کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں؟ ہوش و حواس، بصارت و آواز سب گم۔ چند منٹ نہ گزرے تھے کہ شاخیں ایسی چرچراہٹ کے ساتھ جیسے کوئی مہیب دیو چیخ رہا ہو ایک ایک کر کے زمین پر آرہیں۔ اتفاق سے وہ شاخ جس پر میں بیٹھا ہوا تھا کنوئیں پر گری۔ بجائے اس کے کہ زمین سے ٹکرا کر میرا سر پاش پاش ہو جاتا میں کنوئیں کے خلا میں لٹک گیا۔ کنواں کافی گہرا تھا اور اگر شاخ میرے ہاتھ سے چھوٹ جاتی تو میں یقیناً ڈوب جاتا لیکن میں نے اپنے حواس بجا رکھے۔ آندھی اب گزر چکی تھی اور میں شاخ پر پھر سنبھل کر بیٹھ گیا اور پاؤں پانی کی سطح کو چھو رہے تھے۔ کافی دیر کے بعد لوگ پانی کی تلاش میں نکلے اور جب انھوں نے کنوئیں سے باہر نکالا تو میں نے دیکھا کہ میرے ساتھی شاخوں سے اُلجھ کر ختم ہو چکے تھے۔"

(ماہنامہ "نقوش" لاہور۔ "آپ بیتی نمبر")

نیازؔ نے کم و بیش سات سال تعلیم کے دوران فتح پور میں بسر کئے۔ عربی، فارسی، انگریزی، منطق، فلسفہ، صرف و نحو، قرآن مجید، فقہ و حدیث کا درس انھوں نے فتح پور کے اثنائے قیام میں حاصل کیا۔ ان کا بیان ہے "میں ایک ہی وقت میں مولانا نور محمدؒ سے عربی پڑھتا تھا اور انگریزی شاخ میں انگریزی بھی اور دو کیفیات لے کر گھر لوٹتا تھا۔ غرض انھوں نے مدرسہ اسلامیہ (انگریزی شاخ) سے انٹرنس کے امتحان میں کامیابی حاصل کی اور بقول اُن کے یہی وہ زمانہ ہے کہ جب اُنھیں مذہب کے مطالعہ کا شوق دامن گیر ہوا اور اسی زمانہ میں

اُنھوں نے مذہب کو تحقیق و تشکیک کی نگاہوں سے دیکھنا شروع کیا اسی زمانہ میں انھیں شعر گوئی کا چسکا بھی لگا۔ یہی وہ زمانہ تھا کہ جب حسرت بھی فتحپور میں زیر تعلیم تھے اور وہ غزل گوئی کی طرف مائل ہو چکے تھے اور بقول نیاز اُن کی غزلیات ایک مخصوص حلقہ میں مقبولیت حاصل کر رہی تھیں وہ حسرت کے شانہ بشانہ غزل گوئی میں معروف رہتے لیکن اُن کا رنگ بالکل الگ تھا۔ غرض فتحپور کو یہ فخر حاصل ہے کہ رئیس المتغزلین حسرت اور صاحب طرز اور منفرد ادیب نیاز کو دنیائے ادب میں نمایاں ہونے کی اسی سرزمین سے راہ ہموار ہوئی۔ حسرت کا قیام فتحپور میں بسلسلۂ تعلیم ۱۸۹۲ء سے ۱۸۹۸ء تک رہا انھوں نے ۱۸۹۳ء سے شعر کہنا شروع کیا اور وہ ۱۸۹۸ء میں انٹرنس پاس کر کے علی گڈھ چلے گئے۔ نیاز کو بھی ادبی معاملات میں یہیں صحیح سمت ملی اور وہ اپنے وطن سے ممتاز ادبی ماہناموں میں اپنی منظومات بھیج کر اپنی شناخت کرانے لگے تھے۔ اس کے بعد ان میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی۔ یوں تو جیسے جیسے ادیب و شاعر معمر ہوتا ہے اس کا فن جوان ہوتا جاتا ہے۔

نیاز صاحب یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ مولانا سید ظہور الاسلام فارسی کے نکھرے ستھرے ذوق کے حامل تھے لیکن وہ اپنے والد مرحوم امیر محمد خاں کی فارسی دانی اور شاعرانہ کمالات کے زیادہ مداح ہیں۔ ان کے بموجب ان کے والد نے انھیں نہ صرف زبانِ فارسی کی شیرینی اور لوچ کی لذّت بخشی بلکہ ان کے اندر ایسا ذوق بھی بیدار کیا جو اُن کی آئندہ علمی زندگی کے لئے مبارک ثابت ہوا۔ یہی وہ زمانہ ہے کہ جب انھوں نے غالب کی شاعری کا غائر مطالعہ کیا۔ ذرا اس علمی ماحول کو ایک نظر دیکھتے چلئے:

"یہ اُس وقت کی بات ہے جب غالب کو مرے ہوئے صرف تیس سال کا زمانہ گزرا تھا۔ والد مرحوم پنشن لے کر خانہ نشین ہو گئے تھے اور مخصوص منتہی طلبا کو فارسی کا درس دیا کرتے تھے ..... والد مرحوم کا دستور تھا کہ پہلے وہ متن سُنتے اور اس سے وہ اندازہ کر لیتے کہ طالب علم کس حد تک عبارت کا مفہوم سمجھ چکا ہے۔ اس کے بعد وہ مشکل الفاظ کے معنی بتا کر پوچھتے "کیا سمجھے؟" اگر کسی نے صحیح مفہوم بتا دیا تو خیر ورنہ اس سے پھر کبھی متن نہ سُنتے۔ رسائل طغرا زیر درس تھی۔ حسرت موہانی قرأت کر رہے تھے۔ جب وہ اس فقرہ پر پہنچے "بہم رسیٔ بناگوشِ مطرباں جلاجل نعل در آتش" اور اس کا مفہوم بتانے لگے تو والد مرحوم نے انھیں روک دیا اور مولوی امام علی کی طرف اشارہ کر کے فرمایا "اس مولوی کو بتانے دو" لیکن مولوی صاحب اس جملہ کی نشستِ الفاظ بھی نہ سمجھ سکے تھے معنی کیا بتاتے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے دن وہ گلستاں پڑھنے والوں کی صف میں شامل کر دئے گئے۔

درس کے بعد یہ صحبتِ شعر و سخن ختم نہیں ہو جاتی تھی بلکہ دیر تک اس کا سلسلہ جاری رہتا۔ وہ خود بھی مختلف فارسی شعرا کا کلام سُناتے اور طلبا سے بھی سُنتے۔ ایک دن فارسی کے صوفی شعرا کا ذکر چھڑ گیا اور اسی سلسلہ میں جب بیدل کی شاعری پر گفتگو شروع ہوئی تو اس سلسلہ میں حسرت موہانی نے غالب کا ذکر بھی چھیڑ دیا اور یہ شعر پڑھا ؎

ما ہما عینِ خودیم ما خود از دہم دوئی   درمیانِ ماؤ غالب ماؤ غالب حائل ست

والد نے سن کر زور سے قہقہہ لگایا اور بولے "سید تو نے حد کر دی، کیا اس سے زیادہ بے معنی شعر غالب کا تجھے اور کوئی یاد نہ تھا" حسرت یہ سن کر خاموش ہو گئے اور پھر والد مرحوم نے دیر تک متصوفانہ شاعری کی تاریخ اور اس کے اسبابِ ترقی پر گفتگو کرنے کے بعد فرمایا "غالب طبعاً صوفی منش انسان نہ تھا بلکہ یہ ذوق اُسے بیدل کے مطالعہ سے پیدا ہوا تھا۔ اس کا تصوف زیادہ تر مستعار چیز تھا اور حال سے اوّل اوّل اسے کوئی تعلق نہ تھا۔ ممکن ہے بعد کو حوادثِ سن اور زمانہ کے حالات نے اس میں یہ کیفیت پیدا کر دی ہو۔ تصوف کا تعلق لطائف غیبی سے ہے اس لئے اس کے اظہار کے لئے زبان و اندازِ بیان میں مخصوص لطافت اور نرمی کا پایا جانا ضروری ہے اس لئے جب کوئی دعوت تصوف و فلسفۂ الٰہیات حقیقت ثابتہ کی طرح کھلم کھلا پیش کیا جانے لگا تو وہ تصو[illegible] سکتا ہے لیکن شعر اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ غالب کا یہ شعر جس میں اس نے پہلے ماؤ غالب

کو تجسیمی حیثیت سے پیش کیا ہے پھر تنزیہی حیثیت سے اس نوع کا اصطلاحی شعر بے معیاری نہیں۔ بیدل کے یہاں یہ نقص کہیں نظر نہ آئے گا۔ وہ خدا کا تصور بھی اسی طرح پیش کرتا ہے ؎

عکس افتادہ در آئینۂ ہوشش　　　گل تو ان گفت ولے چیدن نیست

بات وہی "ما و غالب ست" کی سی ہے لیکن سراپا عجز و ربودگی۔ یہ تھا میرا اوّلین تعارف غالب سے جو اس لحاظ سے بہت مبارک ثابت ہوا۔ "

اس بیان سے فتحپور کا علمی و ادبی ماحول، تعلیم کا صحیح ذوق بیدار کرنے کی کوشش اور مکتبوں میں کس نوعیت کی تعلیم دی جاتی تھی یہ سبھی کچھ اُبھر کر سامنے آگیا ہے۔

مشاغل اور آلام روزگار نے نیاز کو فتحپور میں زیادہ زمانہ گزارنے کا موقع نہیں دیا اور نہ صرف اکیس بائیس سال اپنے وطن میں رہ سکے اور اس درمیان میں بھی وہ لکھنؤ، رام پور اور دوسرے مقامات جاتے رہے۔ اس کے بعد وہ ترکِ سکونت کرکے چلے گئے لیکن وطن کی یاد انھیں کسی کل چین سے رہنے نہیں دیتی تھی۔ جب کوئی ہم وطن مل جاتا یا وہ خود فتحپور تشریف لاتے تو ماضی کی کتنی بھولی بسری یادیں اُبھرنے لگتیں اور وہ ہر کس و ناکس کو یاد کرتے یہاں تک کہ انھیں فجی کے کباب بھی یاد آتے، میزبان سے فرمائش کرکے انہیں منگواتے اور مزہ لے لے کر کھاتے۔ فجی سیخ کے کباب بناتے تھے۔ نیاز صاحب فرماتے "فجی کے کباب ٹنڈے (لکھنؤ والے) کے کبابوں سے اچھے ہوتے ہیں اور یہ بھی چاہتے تھے کہ وہ لکھنؤ جاکر وہاں دکان لگائے اور اپنی مالی حالت سدھارلے۔ مدرسہ اسلامیہ کے طالب علم رہ چکے تھے اس لئے مسلم کالج سے دلچسپی رکھتے تھے۔ اس ادارے کو آگے بڑھانے کے لئے پُرخلوص مشورے دیتے۔ لڑکیوں کے کالج کے قیام کے لئے اُکساتے۔ اس سلسلہ میں تعاون دینے کا وعدہ بھی کرتے۔ اراکین کالج نے توجہ نہیں دی ورنہ نیاز صاحب کے تعاون سے کالج کافی ترقی کرلیتا۔ اپنے احباب سے ملتے اور ماضی کی یادوں میں کھوجاتے۔ فتح پور سے انھیں جو تعلق خاطر تھا کبھی کبھی اس کا عکس نگار کے اداریوں سے بھی نمایاں ہونے لگتا تھا۔ بھوپال سے لکھنؤ آتے ہی نگار کے مارچ ۲۷ء کے شمارے میں فتح پور کا ذکر یوں کیا ہے :

" اس میں شک نہیں کہ لکھنؤ کو (جس حد تک صحافت کا تعلق ہے) اب کوئی علمی و ادبی مرکزیت حاصل نہیں ہے اور نہ یہاں کا ذوق عام ایسا ہے جس پر اعتماد کرکے کوئی شخص نشاطِ عمل اپنے اندر پیدا کر سکے اور یہی سبب ہے کہ یہاں کی آب و ہوا کو رسائل کے لئے ناموافق کہا جاتا ہے لیکن اگر مصر کی شاہنشاہی پر کنعاں کی گداگری کو ترجیح دی جاسکتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ میں لاہور و دہلی کی آسانیوں پر لکھنؤ کے مصائب و مشکلات کو ترجیح نہ دوں جسے فتح پور سے زیادہ قریب ہونے کا فخر حاصل ہے۔ "

ملاحظہ فرمائیے لکھنؤ کا انتخاب فتح پور سے قربت کے سبب ہے اور یہ قربت باعث فخر ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری کا نام محتاج تعارف نہیں۔ جن دنوں وہ مسلم کالج میں زیر تعلیم تھے ۳۸ یا ۳۹ء کی بات ہے وہ نیاز صاحب کو مسلم کالج کے سالانہ مشاعرے میں مدعو کرنے کے لئے پہنچے۔ یہ نیاز صاحب سے اوّلین ملاقات تھی۔ ڈرتے ڈرتے اُنھوں نے مشاعرے کی دعوت دی۔ اُنھوں نے جواب دیا۔ "چلئے! فتح پور نے مجھے یاد تو کیا۔ آپ لوگوں نے تو مجھے بالکل بھلا دیا لیکن میں اس سرزمین کو نہیں بھولنے کا۔" دیکھئے! نیاز کو اپنے وطن سے کیسی دلی محبت تھی اور وہ محبت ان فقروں سے پھوٹی پڑتی ہے۔ غرض نیاز صاحب نے نہ صرف اس مشاعرے میں صدارت کی بلکہ اُن کی سفارش پر کئی اہم شاعر بھی شریکِ مشاعرہ ہوئے تھے۔ اس طرح اس کی رونق دو بالا ہوگئی تھی۔

علامہ نیاز اور ان کی بھرپور زندگی پر نظر ڈالنے کے لئے ان کا مضمون "والد مرحوم، میں اور نگار" کو ایک نظر دیکھ لینا چاہئے۔ اُنھوں نے اپنے نسب

اور خاندان کا تذکرہ کرتے ہوئے کسی قدر کسرِ نفسی سے کام لیا ہے۔ اُن کے اجداد کا شمار شرفائے فتح پور میں ہوتا تھا اور وہ نسباً پٹھان تھے۔ اُنھوں نے لکھا ہے: ''نہ بہ لحاظ نسب میں اپنے آپ کو فاروقی، صدیقی یا تیموری و چنگیزی کہہ سکتا ہوں نہ دولت و امارت کے لحاظ سے اپنے خاندان کے کسی فرد کی نشان دہی کر سکتا ہوں۔ رہا علم و فضل سو اس کا ذکر ہی فضول ہے کیونکہ میرے آبا و اجداد سب معمولی پڑھے لکھے تھے اور سب سے پہلے جس کی ذات سے صحیح معنی میں علم کی روشنی میرے گھر پہنچی وہ میرے والد مرحوم تھے۔'' نیازؔ کا یہ بیان اُن کی عظمت کی دلیل ہے لیکن اسی مضمون میں آگے چل کر وہ اپنے والد مرحوم کے بارے میں اس طرح لکھتے ہیں جو قابلِ غور ہے:

''بٹیر بازی اور مرغ بازی البتہ اُنھوں نے کبھی نہیں کی لیکن ان کے علاوہ (بادہ خواری چھوڑ کر) اور بہت سی بازیاں جن کا ایک شاعرِ رنگین مزاج شائق ہو سکتا ہے ضرور اُنھوں نے اختیار کیں۔ شعر و سخن کے علاوہ رقص و سرود سے بھی انھیں خاص دلچسپی تھی اور شہر کے تمام عمائد و امرا ان محافل میں شریک ہوتے تھے۔''

دوسرے موقع پر فرماتے ہیں: ''میرے والد نے مجھے اس دربار (چودھرائن کے مکان) میں بھیجنا شروع کیا اور یہیں سے میرے شباب کا وہ دَور شروع ہوا جسے میں اپنے ادبی دور کا بھی آغاز کہہ سکتا ہوں۔''

حالانکہ نیازؔ کے بیان کے بموجب ان کے والد صحیح العقیدہ مسلمان تھے اور ان کے تعلقات مولانا سید ظہور الاسلام اور مولانا نور محمد جیسے متقی اور خدا رسیدہ بزرگوں سے تھے اور دورانِ ملازمت ہی وہ مشہور شیخ طریقت مولانا سید شاہ عبدالسلام واسطیؒ[7] کے حلقۂ ارادت میں آ گئے تھے اور کسی قدر ان کے مزاج میں سادگی آ گئی تھی۔ اِن دونوں بیانوں سے تضاد اُبھرتا ہے۔

نیازؔ صاحب نے اسی مضمون میں اپنے شفیق اور ذی علم استاذ مولانا نور محمد صاحب کے بارے میں اِن الفاظ میں تذکرہ کیا ہے۔ اِسے بھی ایک نظر دیکھتے چلیے:

''میری عمر کا بارہواں سال ہے اور میں اپنے وطن کے مدرسۂ اسلامیہ میں تعلیم کی غرض سے آ جاتا ہوں۔ یہ مدرسہ عربی کا تھا جسے مولانا سید ظہور الاسلام نے قائم کیا تھا جہاں صرف درسِ نظامی کی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں۔ اُن کے ایک خواجہ تاش مولانا نور محمد صاحب تھے اور انھیں کو مولانا ظہور الاسلام نے اس مدرسہ کا نگراں اور مختارِ کل بنا دیا تھا۔

یہ پنجاب کے کسی مقام (شاید قصور) کے رہنے والے تھے اور اس میں شک نہیں کہ بڑے متقی انسان تھے لیکن سراپا ہیبت و جبروت یکسر تقشف و عبوس۔ برخلاف اس کے مولانا ظہور الاسلام بڑے رقیق القلب انسان تھے۔ وہ فارسی کا بڑا اچھا ذوق رکھتے تھے اور اُن کے اس ادبی رجحان نے اُن میں زاہدانہ احتساب و دار و گیر کے بجائے بہت نرمی اور عفو و درگذر کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ مولانا نور محمد صاحب انگریزی تعلیم کے سخت مخالف تھے اور مولانا ظہور الاسلام موافق اور اس ذہنی اختلاف کا نتیجہ یہ ہوا کہ مدرسہ اسلامیہ میں عرصہ تک انگریزی تعلیم کا خاطر خواہ انتظام نہیں ہو سکا۔''

واضح ہو کہ مولانا سید ظہور الاسلام اور مولانا نور محمد برادرِ طریقت تھے اور شیخ (مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادیؒ[7]) کے حکم سے بانیٔ مدرسہ مولانا سید ظہور الاسلام مولانا نور محمد کو فتح پور لے آئے تھے اور تاحیات دونوں شیر و شکر رہے۔ نیازؔ آگے چل کر اپنے عالم و فاضل اور شفیق استاذ مولانا نور محمد کے بارے میں اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں:

"مولانا نور محمد عربی کے عالم تھے لیکن صرف صرف و نحو، فقہ، حدیث کی حد تک۔ اُن کا علم جامع نہ تھا۔ اُن کو منطق و فلسفہ کا ذوق کم تھا اور ادبیت کا بالکل نہیں۔ جب وہ کتاب پڑھاتے تھے تو ہمیشہ شرح و حواشی سے مدد لیتے تھے اور کوئی بے ساختہ تقریر کسی علمی موضوع پر نہ کر سکتے تھے لیکن سختی کا عالم یہ تھا کہ طلباء کو سخت جسمانی ضرر پہنچانے سے ان کو دریغ نہ تھا۔ میں نسبتاً تفصیل سے اس لئے لکھ رہا ہوں کہ میری ذہنیت میں مذہب و مذہبیت سے انحراف کی جو کیفیت پیدا ہوئی اس کی ذمہ داری ایک حد تک اس ماحول پر بھی تھی۔ میں مولانا کا بہت ادب کرتا تھا (اور ادب نہ کرتا تو کیا کرتا؟) مگر مولانا کی طرف سے محبت کبھی کسی طالب علم کے دل میں پیدا نہ ہوئی۔ وہ اس امر سے واقف ہی نہ تھے۔ مولانا نور محمد کی سخت گیری و تقشف اور حافظ خانہ کے وجود نے جو بالکل ایک مذبح کی حیثیت رکھتا تھا میرے اندر مذہب کی طرف سے ایک خاص کیفیتِ احتراز پیدا کر دی تھی اور میں سوچا کرتا تھا کہ اگر اسلام یہی ذہنیت پیدا کرتا ہے تو یہ معقول مذہب نہیں۔ میں نماز کا پابند تھا مگر اتنا زیادہ نہیں تاہم یہ مجھے خوب یاد ہے کہ جب حضرت مولانا نور محمد صاحب نماز پڑھاتے تھے تو میرا جی بالکل نہ لگتا تھا کیونکہ وہ بد آواز و بد لہجہ شخص تھے۔ برخلاف اس کے جب کبھی مولانا ظہور الاسلام کی اقتدا میں نماز پڑھنے کا موقع ملتا تو میرے ذہن پر ایک خاص کیفیت طاری ہوتی۔ تصوف کی بعض کتابوں سے مجھے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی چنانچہ اس زمانہ میں ابن عربی کی فصوص الحکم کا ترجمہ میں نے شروع کر دیا تو انھوں نے اس سے باز رکھنے کی کوشش کی کیونکہ وہ نہایت وہابی قسم کے مسلمان تھے اور ابن عربی کے فلسفۂ تصوف کو ماورائے مذہب کچھ اور چیز ہے وہ کبھی پسند نہ کرتے تھے۔"

جن لوگوں کو نیاز صاحب کے منفرد مزاج اور اُن کی افتادِ طبیعت سے واقفیت ہے۔ اُنہیں یہ بیان قطعی حیرت انگیز نہ لگے گا۔ نیاز صاحب کا یہ فرمانا بجا ہے "آزردگیٔ دل دوستاں" میری فردِ عمل میں یہی وہ ایک معصیت ہے جو شاید سب سے کم نظر آئے گی" لیکن یہ بھی ایک روشن حقیقت ہے کہ نیاز جن ہمعصروں سے دلگیر اور ناراض ہو جاتے تو انہیں رد کرنے اور زک دینے کے لئے کوئی کسر اُٹھا نہ رکھتے۔ ماضی کو ایک نظر دیکھ لیجئے! کتنے ہنگامے اور شورشیں انھوں نے پیدا کیں۔ جب اُنہوں نے کسی ادیب و شاعر، مولوی یا صوفی کے خلاف قلم اٹھایا تو اس کے بخیے اُدھیڑ کر رکھ دئے۔ پریم چند، دیا نرائن نگم، سیماب، عبدالماجد دریابادیؒ، جوش ملیح آبادی اور جگر مراد آبادی کسی کو نہیں بخشا۔ نگار کے سارے صفحات بھر دئے۔ سپید کو سیاہ اور سیاہ کو سپید بناتے رہے۔ احمد جمال پاشا (مرحوم) نے اس سلسلہ میں پتے کی بات کہی ہے۔

"جب تک مخالفت اور ہنگاموں کے طوفان نہ اُٹھیں نیاز صاحب چادر تان کر چین اور عیش کی نیند نہیں سو سکتے اس لئے جب میں ان کے بارے میں چونکا دینے والی بات سُنتا ہوں تو مجھے قطعی تعجب نہیں ہوتا۔ ہاں! یہ اطمینان ضرور ہو جاتا ہے کہ اس وقت نیاز صاحب اطمینان سے ضرور ہوں گے۔"

بس یقین جانئے! نیاز صاحب نے اپنے استاذِ محترم مولانا نور محمد صاحبؒ کے بارے میں جو بھی لکھا ہے سلسلہ در سلسلہ ماضی کی ایک کڑی ہے۔ وہ تو بہ استغنار کی منزل سے گزر رہے تھے لیکن اپنے محبوب مشغلہ سے کنارہ کش نہیں ہوتے اور اپنے قلم کی روانی اور طغیانی کو روک نہ سکے۔ ایسے میں کتنی ناگفتنی باتیں نوکِ قلم سے نکل کر صفحہ قرطاس پر بکھر گئیں۔

اس موقع پر اُن کے عزیز دوست ادیبِ شہیر "زیدی کے حشر" (ناولٹ) کے مصنف حضرت مجنوں گورکھپوری کی وقیع رائے کو بھی ایک نظر دیکھتے چلئے! موصوف نیاز صاحب سے بے حد قریب رہ چکے ہیں۔

"نیاز ایک سنجیدہ اور صاحبِ عقل و ہوش آدمی ہیں۔ انھوں نے اپنے کو نہ تو کبھی شعر میں کھویا اور نہ کبھی رومان

میں ڈبویا حالانکہ وہ شعر و رومان دونوں کی پھڑکتی ہوئی رگیں پکڑنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔"

صحیح ہے نگار کے کاروبار کو نہ صرف بحسن و خوبی چلانے بلکہ اس میں تیزی لانے پر اُن کی گہری نگاہ رہتی تھی اس لئے چھیڑ خوباں کو جاری رکھتے تھے۔ کبھی کسی ادیب و شاعر کی خبر لی۔ کبھی کسی صوفی یا مولوی کی پگڑی اُچھالی۔ اس طرح کے مضامین لکھ کر سنسنی خیزی پیدا کرتے تھے جیسے "احمدی جماعت اور میں"، "چند گھنٹے قادیان میں" اور "خارستانِ احادیث" قبیل کے مضامین نہ لکھتے تو نگار کی وقعت کم نہ ہوتی۔ آگے مجنوں صاحب اور وضاحت سے فرماتے ہیں :

"میں نے ۱۹۲۷ء یا ۱۹۲۸ء میں اپنی خردانہ رائے دی تھی کہ مذہبی مباحث کو علمائے دین و ہادیانِ متین کے لئے چھوڑ دیا جائے اور نگار کے صفحات کو ان سے پاک رکھا جائے لیکن نیاز کی طبیعت میں کچھ چلبلاپن بھی ہے۔ دوسرے وہ سنسنی خیز باتوں کی تجارتی حیثیت کو ایک معاملہ سنج کی حیثیت سے مجھ سے بہتر سمجھتے ہیں اس لئے انھوں نے میری بات سُنی اَن سُنی کر دی اور آج تک وہ ان جھگڑوں سے حظ حاصل کر رہے ہیں جو سات جنم لے کر بھی میں نہ کر سکوں گا۔"

جب بھی وہ علماء اور زہاد پر قلم اُٹھاتے تو اُن کی شوخئ بیان نقطۂ عروج پہ پہنچ جاتی اور اس موضوع سے حظ اُٹھاتے ہوئے بے باکی کے عالم میں سب کچھ کہہ جاتے۔ اُن کے انداز تحریر سے ایسا لگتا کہ وہ کبھی علمائے دین کی بات کہہ رہے ہیں لہٰذا ان کی پُرزور مخالفت ہوئی ہنگامے ہوئے لیکن وہ اس قسم کی عبارات لکھتے ہی رہے۔

"آپ نے بھی کس طبقہ کا ذکر کیا۔ آپ اتنا وقت کسی گناہ میں صرف کرتے تو بہتر تھا۔ یہ "محراب دعا" سے "حلقۂ دام" تیار کرنے والے باوجود کوتاہ آستینی کے انتہائی دراز دستی سے کبھی نہ چوکنے والے اور وہ سب کچھ کر گزرنے والے جو دوسروں کے لئے ممنوع ہے ہماری قوم کے وہ افراد ہیں جنہیں پاؤں کا چھالا کہنا چاہئے کہ جب تک آپ انہیں پھوڑ نہ ڈالیں راستہ چلنا ممکن نہیں۔ انھوں نے سلطنتوں کو کھا لیا، قوموں کو ہضم کر لیا۔"

نیاز صاحب خود فرماتے ہیں کہ انھوں نے مولویوں کے خلاف محاذ قائم کر لیا تھا اور وہ اُن کے بارے میں برابر لکھ رہے تھے۔ مولانا نور محمد صاحب کا بھی تعلق علمائے دین سے ہے اور وہ نیاز کے استاد بھی ہیں لیکن انھوں نے اُن کو بھی نہ بخشا اور زندگی کے جھٹپٹے میں تلخ کلامی سے اُن کی یاد تازہ کی۔

واقعہ یہ ہے کہ فتح پور کے دینی ماحول کا تذکرہ مولانا سید ظہور الاسلام اور مولانا نور محمد کے ذکرِ خیر کے بغیر نامکمل رہے گا۔ اوّل الذکر عالم باعمل، حاذق طبیب اور بانی مدرسہ اسلامیہ تھے۔ ثانی الذکر مولانا نور محمد عالم فاضل اور درویشِ کامل تھے۔ نیاز خود معترف ہیں کہ مولانا نور محمد بے حد متقی اور پرہیزگار تھے۔ پھر بھی ایسا خیال ظاہر کیا ہے کہ وہ طلباء کو جسمانی ضرر پہنچانے سے دریغ نہیں کرتے تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ماضی میں اساتذہ بچوں کو سدھارنے اور انھیں راہِ راست پر لانے کے لئے ذرا سختی کرتے تھے اور مولانا بھی بچوں کو راہِ راست پر لانے کے لئے تنبیہ کرتے تھے لیکن یہ غلط ہے کہ وہ حد سے گزر جاتے تھے۔ ایسا کوئی واقعہ رونما نہیں ہوا کہ کسی بچے کے ہاتھ پیر ٹوٹ گئے ہوں بلکہ ان کے کتنے شاگرد ان کا بے حد احترام کرتے تھے۔ مولانا حسرت موہانی، مولانا عبدالرزاق کانپوری، مولانا عزیز الحسن غوری مجذوب، مولانا محمد صادق اور نہ جانے کتنے طالب علم مولانا سے فیض حاصل کر کے نمایاں ہوئے اور عزت و توقیر حاصل کی لیکن کسی نے بھی ایسی کوئی شکایت نہ کی بلکہ یہ سبھی حضرات

پروانے کی طرح اس شمع علم پر نثار ہوا کرتے تھے۔

نیاز کا یہ بھی ارشاد ہے کہ مولانا صاحب بدآواز اور بدلہجہ تھے اور ان کی اقتدا میں نماز پڑھنے میں ان کا جی نہ لگتا تھا۔ میں نے مولانا نور محمد صاحب کو نہیں دیکھا لیکن مشہور عالم و فاضل مولانا حافظ عبدالوحید صاحب (جو کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں) اب بھی بقید حیات ہیں۔ انھوں نے مولانا کی اقتدا میں نماز پڑھی ہے اور ان کا تاثر یہ ہے کہ ان کے پیچھے نماز پڑھنے میں دل لگتا تھا اور یہ بھی فرمایا کہ مقتدی جوق در جوق ان کے پیچھے نماز پڑھنے کے لئے کھنچے چلے آتے تھے اور ان کی تقریر دلپذیر بھی دلچسپی سے سنتے تھے۔ مولانا رح کی زندگی ایسی تھی کہ روشنی بن کر چمک رہی تھی اور اس نے کتنے اندھیرے دلوں کو روشن کر دیا۔ نیاز احمد خاں صاحب مرحوم نے اپنا واقعہ راقم الحروف کو سنایا۔ ان کا کسی خوبصورت عورت سے دل لگ گیا تھا اور ان کے دل کا یہی تقاضا تھا کہ اس کے ہو رہیں۔ ان دنوں موصوف کی بھری جوانی تھی اور وہ شاداں و فرحاں اور تندرست بھی تھے۔ دوسری طرف سے بھی التفات مل رہا تھا۔ وہ آگے بڑھنا چاہتے لیکن بڑھ نہ پاتے۔ اس طرح بے چینی اور اضطراب بڑھ رہا تھا۔ اسی زمانہ میں مولانا نے درس کے وقت یہ فرمایا۔ مومن کی یہ شان ہے کہ وہ نگاہ جھکا کے چلتا ہے۔ پھر انہوں نے خصوصی طور پر خاں صاحب کو متوجہ کرتے ہوئے فرمایا: "خوب سمجھ لیجئے خاں صاحب!" ایسی آواز سنتے ہی خاں صاحب کی حالت بدل گئی اور انھوں نے ایسا محسوس کیا کہ جیسے کسی نے اُن کا دل دھو دیا ہو۔ اس کے بعد انہیں اس خاتون کا کبھی دھیان نہیں آیا۔ اور بھی اس قسم کے واقعات ہیں جو اس مختصر مضمون میں پیش نہیں کئے جا سکتے۔

نیاز صاحب یہ بھی فرماتے ہیں کہ مولانا نور محمدؒ کا علم حاضر نہ تھا اور جب وہ کتاب پڑھاتے تھے تو ہمیشہ شرح و حواشی سے مدد لیتے تھے اور کوئی بے ساختہ تقریر کسی علمی موضوع پر نہ کر سکتے تھے۔ اوّل تو یہ دونوں باتیں صحیح نہیں ہیں۔ مولانا کے کسی شاگرد نے ایسی بات نہیں کہی۔ دوسرے بالکل یہی الزام[1] معترضینِ نیاز اُن کی زندگی میں اُٹھاتے رہے ہیں۔ بہتیروں نے ایسی بات کہی ہے کہ نیاز کا علم انسائیکلوپیڈیا اور معلومات کی عام کتابوں تک محدود ہے اور اس کی مدد سے کام لیتے ہیں اور اس طرح اپنے علم و فضل کا رعب ڈالا کرتے ہیں۔ حضرت نیاز کے بارے میں یہ بھی مشہور ہے کہ ان کے اکثر مضامین ماخوذ ہوتے ہیں اور وہ اپنے ماخذ کا حوالہ نہیں دیتے۔ اسی طرح استفسارات و جوابات کے سلسلہ میں وہ ان کتابوں کے نام ظاہر نہیں کرتے جن سے مدد لیتے ہیں۔ نیاز صاحب یقیناً معلومات کی کتابوں سے استفادہ کرتے تھے پھر بھی انھوں نے مولانا نور محمد صاحب پر یہی الزامات عائد کئے ہیں۔ انہوں نے نگار کا خدا نمبر نکالا اور یہ ماخوذ تھا جس کے سبب سے کافی اعتراضات ہوئے۔

مولانا سید عبدالحی حسنیؒ جو کثیر التصانیف شخصیت کے مالک ہیں اور ان کے قلم سے ۸ (آٹھ) جلدوں میں ایک وقیع کتاب "نزہتہ الخواطر" نکلی ہے۔ انہوں نے یہ کتاب عربی زبان میں اس لئے لکھی تھی تاکہ اسے عالم اسلام میں بخوبی پڑھا جا سکے۔ اس تذکروں کی کتاب میں علماء، مشائخ، سلاطین، امراء، شعراء، ادباء اور ہر صنف و فن کے اہل کمال دوش بدوش اور پہلو بہ پہلو نظر آتے ہیں۔ مولانا ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ناظم بھی رہ چکے ہیں اور موصوف نے مولانا نور محمدؒ سے فقہ کی کوئی کتاب بھی پڑھی ہے۔ "نزہتہ الخواطر" میں وہ مولانا نور محمدؒ کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"مولانا نور محمد فتح پوریؒ

شیخ فاضل نور محمد ابن شیخ احمد حنفی شاہ پوری ثم فتح پوری نیک علماء میں سے تھے۔ پنجاب کے شہروں میں سے ایک شہر شاہ پور میں ۱۲۷۲ھ میں پیدا ہوئے اور بعض درسی کتابیں مولوی عبدالرحمان ابن عبداللہ

---

[1] نیاز نمبر میں ل۔ احمد اور پروفیسر احتشام حسین کے مضامین دیکھے جا سکتے ہیں۔ ان دونوں ادیبوں نے اعتراضات کو ظاہر کر کے نیاز صاحب کی موافقت میں جواب دینے کی بھی کوشش کی ہے۔

مُلتانی سے پڑھیں۔ پھر سفر کر کے دہلی آئے اور شیخ عبدالرب کے مدرسہ میں مفتی عبداللہ سے علم حاصل کیا اور حکیم غلام رضا ابن مرتضیٰ شریفی سے طب کی تعلیم حاصل کی۔ پھر علی گڑھ آگئے اور مفتی لطف اللہ ابن اسداللہ کوئلی کے ساتھ لگ گئے اور ان سے معقولات اور منقولات کی اکثر کتابیں پڑھیں۔ پھر موصوف کو مدرسہ اسلامیہ فتح پور میں درس کی ذمہ داریاں سونپی گئیں۔ چنانچہ آپ نے فتح پور میں سکونت اختیار کی۔ یہاں درس دینے لگے۔ بہت سے[1] لوگوں نے آپ سے کسب فیض کیا۔"

مولانا عارف ہسوی کانگریس کے لیڈر، نیاز کے دوست اور صحافی تھے۔ وہ حسرت کے سلسلہ میں مولانا نور محمدؒ کو ان الفاظ سے یاد کرتے ہیں :

" فتح پور میں مولانا (حسرت موہانی) کا زمانہ طالب علمی کے اعتبارات سے یادگار رہے گا۔ اوّل تو مولانا نور محمد صاحبؒ مولانا سید ظہور الاسلام صاحب اور مولانا حبیب الرحمان صاحب جیسے برگزیدہ اور مقدس حضرات کا فیض صحبت ایک ایسی نعمتِ عظمیٰ تھی کہ پھر شاید حسرت کو ایسی مقدس صحبت نصیب ہوئی ہو۔"

علامہ سید سلیمان ندویؒ مضمون " واحسرتا " میں بھی اِن الفاظ میں مولانا نور محمد کا تذکرہ کرتے ہیں :

" فتحپور کی آب و ہوا حسرت کی ادبی و ذہنی تعلیم کے لئے بہت راس آئی۔ یہاں مولانا سید ظہور الاسلام صاحب ایک نہایت متقی و پرہیزگار و باصفات بزرگ تھے۔ ان کے علاوہ مولانا نور محمد صاحب اور مولانا حبیب الدین صاحب جیسے بزرگوں کا فیض بھی نصیب ہوا۔"

اِن مفصل اور دقیع آرا، سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا نور محمد صاحب بڑی خوبیوں کے بزرگ تھے اور بلاشبہ وہ ایسی روشنی تھے جس نے کتنے دلوں کو روشن و منور کیا تھا۔ نیاز نے لکھا ہے کہ اِس ماحول کا ان کی زندگی کو بنانے اور بگاڑنے میں بڑا ہاتھ ہے لیکن حسرت، مجذوب اور عبدالرزاق کانپوری جیسے کتنے اشخاص کی رہنمائی اس قابل قدر ہستی کے ذریعہ سے ہوئی۔

یہ صحیح ہے کہ نیاز صاحب نے مذہب اور اہلِ مذہب کے خلاف محاذ قائم کر کے کوئی اچھی بات نہیں کی اور بقول مجنوں گورکھپوری وہ ان مباحث سے نگار کے صفحات کو پاک رکھتے تو زیادہ بہتر ہوتا لیکن اس خطا اور چوک کے سبب سے اُن کے دوسرے محاسن کو نظر انداز کیا جائے اور ان کے کارناموں کو پسِ پشت ڈال دیا جائے یہ بھی ناانصافی اور بددیانتی ہوگی۔ نیاز کی جرأت مندی، بے خوفی، استقلال، ریاضت، قوت ممیزہ یہ اُن کی شخصیت کے خاص جوہر ہیں جنہیں کسی طرح فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔ شاعرِ انقلاب جوش نے ان کے بارے میں صحیح کہا ہے "اُن کی ذات کے احاطے میں کتنے خلاقی کے شہر آباد ہیں، کتنے شعور کے لشکر پڑاؤ ڈالے ہوئے ہیں" اب ان محاسن سے مزین اس شخصیت کو آپ بھی ایک نظر دیکھ لیجئے!

وہ زندگی میں اگلا قدم اٹھانے کے سلسلہ میں کافی جلدی اچھا فیصلہ کر لیتے تھے۔ وہ آگے بڑھنے میں کبھی خوف اور دہشت محسوس نہ کرتے تھے۔ عملی زندگی شروع کی اور جلد ہی تھانیداری کو ٹھوکر لگا کر آگے بڑھ گئے۔ مسلم اسکول کی ہیڈ ماسٹری بھی انہیں نہ بھا سکی اور دہلی اور آگرہ پہنچے۔

---

[1] آپ سے کسبِ فیض حاصل کرنے والوں میں نیاز کے علاوہ حسرت، مجذوب، عبدالرزاق کانپوری اور مولانا عبدالوحید بھی شامل ہیں۔

وہاں بھی نہ ٹھہرے۔ ریاست بھوپال کی ملازمت تھوڑے دنوں اُن کا دامن پکڑے رہی پھر "نگار" کے پشتارہ کو لئے ہوئے لکھنؤ آبسے۔ حبّ الوطنی سے سرشار دل رکھنے والے نیاز ہندوستان نہ چھوڑتے لیکن ان کے ایک قریبی عزیز نے عین پیرانہ سالی میں اُن کے راستہ میں کانٹے بو دئے تھے جسے اُنہوں نے ایک بچّے کی طرح پروان چڑھایا اور اپنی ساری متاع اُس کے حوالے کردی تھی۔ وہ سب کچھ چھوڑ کر پاکستان چلے گئے۔ یہ واقعہ بھی ان کی عظمت کی یاد دلاتا ہے۔ اس ترکِ سکونت کے معاملہ میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری ان کے معاون بنے جو اُن کے پرانے نیاز مند اور ہم وطن ہیں۔

دیارِ غیر میں بھی وہ گھڑی کی سوئی کی طرح برابر مصروف رہے بلکہ نوشت و خواند کی اور ذمہ داریاں بڑھالیں۔ نگار کی ادارت کے علاوہ کتنے اہم کام ہاتھ میں لے لئے اور جس کام کا ذمہ لیا اسے اپنا ہی سمجھ کر پورا کیا۔ پیرانہ سالی میں جو کام کیا اس کی نوعیت و اہمیت کو دیکھ کر معترضین کے منہ بند ہو گئے۔ اسی عالم میں داعیٔ اجل کا پیغام آ پہنچا لیکن مرتے مرتے اس مقصد میں لگے رہے جسے ۶۰-۶۵ برس تک شد و مد سے کیا تھا۔ ذرا آخری ایّام کا حال شان الحق حقی کی زبانی سنئے!

"اگر اپنی جوانی میں نیاز صاحب بڑے محنتی اور مستعد آدمی تھے تو یہ اُن کی جوانی کا فیض ہوگا مگر اب سے پہلے کس نے دیکھا تھا کہ وہ اسّی برس کی عمر میں بھی جوانی کا دم خم رکھتے ہیں اور بسترِ مرگ پر موت کا پروانہ ملنے کے بعد بھی علمی کاموں سے کنارہ کش نہیں ہو سکتے۔"

انتقال سے چند ماہ پہلے کا ذکر ہے۔ نیاز صاحب بیمار پڑے۔ ہسپتال میں آپریشن ہوا اور اب آخری بار ہسپتال سے پاؤں پھیر آئے ہیں۔ علاج سے بھی ہاتھ اٹھا لیا گیا ہے محض برائے نام ہو رہا ہے۔ سرطان کے موذی مرض سے واسطہ ہے جس نے انہیں بستر پر پچھاڑ دیا ہے۔ میں سوچتا ہوں اب انھیں کس کام کے لئے زحمت دیں، صبر ہی کرنا چاہئے۔ لیجئے! ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ "میں ہوں نیاز فتحپوری۔ میرے پاس کوئی کام نہیں آیا، بھجوائیے ضرور بھجوائیے۔ دیکھتا رہوں گا۔" میں نے اُن کے واسطے کاغذ کا ایک پلندہ بھجوا دیا۔ ایسے پلندے بعض جگہ سے مہینوں واپس نہیں آتے۔ انھوں نے دو ہی دن میں دیکھ بھال کر واپس کر دیا۔ "اب اور بھیجئے اور بھیجتے رہئے۔" حالت ایسی تھی کہ دیدنی نہ گفتنی۔ شکل پہچاننا مشکل تھا۔ درد اور کرب، اپاہجی اور بے چینی اس پر بھی ان کے ذوقِ کار کا یہ عالم تھا "گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے"۔ مسودات آخر آخر تک ان کے پاس جاتے رہے۔

خواب خواب ہی ہوتے ہیں۔ مجھے ان سے نفسیاتی دلچسپی ضرور ہے۔ کوئی توہم لاحق نہیں۔ بہر حال عجیب اتفاق ہے کہ ۲۴ مئی کی صبح کو میری آنکھ کھلی تو یہ خواب ذہن میں تازہ ہی تھا کہ نیاز صاحب سے ملنے گیا ہوں۔ میں نے ان سے کہا۔ رشید مودودی جنہیں آپ جانتے ہیں آپ کی عیادت کو آنا چاہتے ہیں۔ بولے۔ ہاں! ان سے ضرور ملوائیے۔ چہرے پر نظر کی تو صحت مند پایا۔ میں نے کہا۔

نیاز صاحب! اب تو آپ ماشاء اللہ بالکل اچھے ہیں۔ وہ بستر سے کھڑے ہو گئے اور بولے "ہاں! میں بالکل اچھا ہوں"۔ میں خود ابھی بستر سے اٹھنے نہیں پایا تھا ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ یہ بخاری صاحب تھے۔ نیاز صاحب کے ہمسائے، جو ان کے مکان سے بول رہے تھے۔ انھوں نے بتایا "آج صبح چار بجے نیاز صاحب کا انتقال ہو گیا۔ إنا للہ۔ . . . ."

یہ تھے نیاز فتحپوری جو سورج کی طرح فتحپور سے طلوع ہوئے اور کراچی میں غروب ہو گئے۔

نوٹ:۔ اس مضمون کی ترتیب کے موقع پر درج ذیل رسائل اور کتابیں پیش نظر رہی ہیں:

(۱) نگار (نیاز نمبر) حصۂ اوّل و دوم (۲) نگار (سالنامہ) ۱۹۸۶ء (۳) نقوش (آپ بیتی نمبر) لاہور (۴) فروغِ اُردو (آزادی نمبر) (۵) آجکل (حسرت نمبر) دہلی (۶) حیاتِ مولانا عبدالحیؒ (مولانا ابوالحسن علی ندوی) (۷) حیات مولانا سید ظہور الاسلام (مولوی نجیب اصغر و ڈاکٹر اسماعیل آزاد)

نیاز فتح پوری اور بھوپال

ڈاکٹر محمد نعمان
اسسٹنٹ پروفیسر
شعبۂ اردو
سیفیہ آرٹس، کامرس، لاء کالج
بھوپال

آزادی سے قبل ہندوستان کے وسیع و عریض صوبے مدھیہ پردیش کی راجدھانی بھوپال کو، مالوہ، گونڈوانہ اور بندیل کھنڈ کے علاقوں پر مشتمل مسلم ریاست کی حیثیت حاصل تھی جو سر سبز گھنے جنگلات، پہاڑیوں، گھاٹیوں، ندیوں اور تالابوں سے گھرے ہونے کے سبب نہ صرف قدرتی حسن سے مالا مال تھی بلکہ فرمانروایانِ بھوپال کی ادبی سرپرستی نیز مخصوص تہذیبی حالات کے باعث یہ ریاست علم و ادب کا ایسا گہوارہ بن گئی تھی کہ وسطِ ہند میں شمالی اور جنوبی مسلم ریاستوں کی تہذیبی نمائندگی کرتی تھی۔

ہندوستان کے جن مشاہیرِ علم و ادب کا اس سرزمین سے بالواسطہ یا بلاواسطہ تعلق رہا ہے ان میں بعض نے ادبی مقاصد کے حصول کی خاطر اور بعض نے بغرضِ ملازمت مختصر یا طویل مدت تک یہاں سکونت پذیر رہ کر ادبی خدمات انجام دیں۔ کچھ مشاہیر ایسے بھی تھے جن کے اعزا یا شاگردوں کی وجہ سے ان کی آمد و رفت یا خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا۔ ان بزرگوں میں مرزا اسد اللہ خاں غالب، رجب علی بیگ سرور، سر سید احمد خاں، علامہ شبلی نعمانی، امیر مینائی، اسلم جے راجپوری، ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری، مولوی عبدالرزاق البرامکہ، سر راس مسعود، علامہ اقبال، جگر مرادآبادی، علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، شوق قدوائی، حفیظ جالندھری، مولوی عبدالحق، ظہیر دہلوی، ماہی جائسی، مولانا ابوالکلام آزاد، مضطر خیرآبادی، ارشد تھانوی، محوی صدیقی، نیاز فتحپوری، کوثر چاندپوری، جاں نثار اختر، گیان چند جین کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

نیاز فتحپوری کی طویل اور ہمہ جہت علمی ادبی خدمات محتاجِ تعارف نہیں۔ ان کی افسانہ نگاری، انشا پردازی اور تصنیفی کاموں کا عرصہ ۱۹۱۱ء سے ۱۹۲۵ء پر محیط ہے۔ ۱۹۱۵ء سے ۱۹۲۷ء تک وہ بھوپال میں مقیم رہے اور یہاں تقریباً ۱۲ سالہ قیام کے دوران انھوں نے جو اہم ادبی کارنامے انجام دیے ہیں ان میں ماہنامہ "نگار" کے اجراء کے علاوہ ان کی بیشتر تصانیف و تراجم قیام بھوپال کے دوران وجود میں آئیں۔ تراجم کے بارے میں بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ بھوپال کے "محکمۂ تاریخ" کے ہی رہینِ منت ہیں۔ بھوپال کا دفتر تاریخ دراصل ایک قسم کا دارالمصنفین تھا جس سے عبدالرزاق البرامکہ، مولوی مہدی، مولانا مودودی، محوی صدیقی، محمد امین زبیری، محمد یوسف قیصر، اور نیاز فتحپوری جیسے نامور ادیب وابستہ تھے۔ اس محکمہ کی نگراں اور سرپرست خود والیٔ ریاست نواب سلطان جہاں بیگم تھیں۔

بھوپال آنے سے قبل ہی نیاز فتحپوری کو افسانوں اور انشائے لطیف کے ذریعہ ملک گیر شہرت حاصل ہو گئی تھی۔ بھوپال میں بھی ان کے قدرداں موجود تھے جن کے اصرار پر ۱۹۱۵ء میں بعہد نواب سلطان جہاں بیگم وہ بھوپال آ گئے۔ بھوپال میں محکمۂ اوقاف کی ملازمت کے بعد انھیں کچھ عرصہ محکمۂ پولیس سے وابستہ رہنا پڑا اور دو سال بعد "دفتر تاریخ" سے منسلک ہو کر تصنیف، تالیف اور ترجمہ کے کاموں میں مصروف ہو گئے۔

اُن کی بھوپال آمد اور قیام کے سلسلہ میں محمد طفیل لکھتے ہیں:

> "بھوپال میں ان کے کچھ قدرداں پیدا ہوئے جنھوں نے انھیں بھوپال آنے کی دعوت دی اور یہ بات بھی بیگم صاحبہ تک پہنچائی۔ بیگم صاحبہ نے وعدہ کر لیا کہ نیاز صاحب کا ہر طرح خیال رکھا جائے گا۔ نیاز صاحب بھوپال پہنچے تو فوری طور پر کچھ نہ ہوا۔ مجبوراً انھیں محکمۂ اوقاف میں کام کرنا پڑا۔ جب دو برس یونہی گزر گئے تو دوستوں کے تقاضے سے انھوں نے ایک عرضداشت بیگم صاحبہ کو بھیجی)۔

اس عرضداشت میں بیگم صاحبہ پر طنز اور اپنی بڑائی کا حد درجہ احساس تھا۔ بیگم صاحبہ کا ظرف بھی دیکھئے کہ انھوں نے ۱۹۱۸ء میں کوئی ڈیڑھ سو روپے ماہوار وظیفہ مقرر کردیا۔" ـــــ ("نیاز صاحب" از محمد طفیل۔ ماہنامہ نگار نیاز نمبر، حصہ اول ص۱۶۱)

نیاز صاحب کے ذریعہ پیش کردہ منظوم عرضداشت ملاحظہ کیجئے ؎

زمن سپاس تو آید ہمیں کہ نالانم — زخندہ ات چہ نوابردہ ام کہ عریانم
نگاہ مہر کہ برمن فگندۂ بینم — سحاب لطف کہ برمن فشردۂ دانم
ولے ز آرزوئے خود ہنوز منفعلم — ز اِقتضائے کمال خودش پشیمانم
بدست من سر دامان خود رسیدن دہ — دگرنہ چاک شدن خواہرش گریبانم
عجب نہ باشد اگر می زنی بہ ستارت — بجائے طرّہ کہ من گوہرے زعمانم
ببر مرا بہ مشامت کہ شکم از تاتار — بکش مرا ببرت تیغے از صفاہانم
مرا بپرس ز حسّان و شیخ شیرازی — کہ نغمۂ عرب و طوطیٔ ز ایرانم
مرا بہ وعدۂ لطفے چو شاد فرمودی — نہ زیبدت کہ تماشہ کنی پریشانم
جہا کنی کہ تو امروز نیشتر سازی — ہما امید کہ دی رگ جانم
تاملے کن و قدرم شناس و کارم دہ — کہ باشد از نظر عدل و نظم شایانم
دگرانہ دہ خبر از نارادیم کہ زنم — بہ سنگ سخت فغا قلب شیشہ سامانم

(ماخوذ از ماہنامہ نگار، جولائی ۱۹۶۰ء)

مذکورہ عرضداشت کے بعد ریاست بھوپال کی جانب سے نیاز فتحپوری کی ہر طرح سے مدد کی گئی اور انھیں آزادانہ طور پر تصنیفی و تالیفی کاموں میں مصروف رہنے کی غرض سے ماہانہ وظیفہ مقرر کردیا گیا جس کا اعتراف خود نیاز فتحپوری نے اِس طرح کیا :

"میرے لئے یہ فخر بس ہے کہ مجھے انھیں بابرکت ہستیوں کے سایۂ دامن دولت و علم میں زندگی بسر کرنے کی فرصت خدا نے مرحمت فرمائی ہے اور شاہانہ فیاضیوں کے ساتھ ساتھ میں تصنیف و تالیف کے لئے آزاد چھوڑ دیا گیا ہوں۔"

ـــــ (تعارف "گہوارۂ تمدن" از نیاز فتحپوری ص۱۵ (ایڈیشن ثانی))

قیام بھوپال کے دوران لکھی گئیں نیاز صاحب کی تصانیف میں "گہوارۂ تمدن" کا موضوع خواتین کی تمدنی زندگی سے متعلق ہے۔ یہ کتاب "دفتر تاریخ" بھوپال کی یادگار ہے جس کا انتساب نواب سلطان جہاں بیگم کے نام اِن الفاظ میں کیا گیا ہے :

"مانا کہ لعل و گہر بغیر کسی وصف اضافی کے بھی دنیا میں ایک مستقل امتیاز رکھتے ہیں لیکن ان کا حقیقی شرف تو اسی طرف کلہ سے وابستہ ہے جہاں جگمگانے کے لئے وہ حقیقتاً وضع ہوئے ہیں اس لئے اگر میں ان اوراق کو علیا حضرت بلقیس مرتبت، نوشیرواں صفت، گردوں رکاب، والا جناب سلطان جہاں بیگم ..... ادامہا اللہ بالعز والکمال فرمانروائے دارالاقبال بھوپال کے اسم گرامی سے منسوب کرنے کی عزت حاصل کرکے مسرور و مفتخر ہوں تو جائے حیرت نہیں کیونکہ اربابِ نظر لعل و گہر کو نہیں بلکہ

عروج طالع لعل و گہر کو دیکھتے ہیں"

"گہوارۂ تمدن" دو ماہ کی قلیل مدت میں مکمل ہوگئی تھی۔ اس کا سبب تصنیف بقلم ابوالخیر مودودی ملاحظہ کیجئے :

"........ ۱۹۱۹ء کا واقعہ ہے۔ نیاز صاحب کے دوستوں نے اصرار کیا کہ وہ اسی سال بیگم صاحبہ کی سالگرہ کے موقع پر کوئی تصنیف پیش کریں۔ سالگرہ دو مہینے بعد ہی ہونے والی تھی، معاملہ کٹھن تھا لیکن نیاز بہرحال

اس سے عہدہ برآ ہوئے۔ نواب سلطان جہاں بیگم کی رعایت مذاق کے مطابق کتاب تصنیف کی اور سالگرہ کے دن پیش ہوگئی"۔

("نیاز فتحپوری" از ابوالخیر مودودی، مطبوعہ "نقوش" شخصیات نمبر ۱ ص ۶۰۷)

"محکمۂ تاریخ بھوپال" سے وابستگی کے دوران نیاز نے "تاریخ الدولتین" کے نام سے عربی کتاب "تاریخ التمدن الاسلامی" کی چوتھی جلد کا ترجمہ کیا، جس کے تین ابواب میں پیغمبر اسلام ؐ، بنی امیہ اور بنی عباس کے حالات قلمبند کیے گئے ہیں۔

قیام بھوپال کی یادگار "مصطفےٰ کمال پاشا" بھی دراصل عربی سے اردو ترجمہ ہے جس میں نیاز نے اپنے مخصوص اسلوب کو برقرار رکھا ہے۔

نیاز کی تالیف "تاریخ اسلام ابتداء سے حملہ تیمور تک" ماہنامہ "نگار" بھوپال میں قسط وار شائع ہونے کے بعد کتابی صورت میں شائع ہوکر منظرِ عام پر آئی۔

بھوپال میں لکھی گئیں تصانیف میں "صحابیات" اگرچہ نیاز صاحب سے منسوب کی جاتی ہے لیکن اس کے مصنف نیاز کے داماد قمرالحسن[1] تھے۔ البتہ اس کا طویل مقدمہ نیاز فتحپوری کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔

قیام بھوپال کے دوران نیاز فتحپوری کا سب سے اہم کارنامہ ماہنامہ "نگار" کا اجراء ہے جو ایک ادبی جریدہ ہی نہیں تھا بلکہ ایک تحریک بھی تھا جس نے تقریباً ۴۴ سال تک نیاز کی زیرِ ادارت پابندی سے شائع ہوکر نوجوان نسل اور ادیبوں کی ذہنی تعمیر و تربیت کا اہم فریضہ انجام دیا اور آج بھی ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی زیرِ ادارت کراچی سے شائع ہو رہا ہے۔

نیاز فتحپوری نے "نگار" کو محض ادبی رسالہ کی حد تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے وقت کے تقاضوں اور ضرورتوں کے تحت آراستہ و پیراستہ کرکے اپنی بیدار مغزی کا ثبوت پیش کیا اور پہلے ہی شمارے میں اس امر کی وضاحت کر دی کہ ــــ

"جس وقت ترتیب نگار کے فرائض پر میں نے غور کیا تو ضروریات زمانہ کو دیکھتے ہوئے یہ فیصلہ تو میں نے پہلی ہی سانس میں کر لیا کہ "نگار" کو خالص ادبی رسالہ تو بننے نہ دوں گا کیونکہ ادب کی مانگ جو چند سال پیشتر تھی باقی نہیں رہی۔"

("عناصر نگار" ماہنامہ نگار، بھوپال ۱۹۲۲ء شمارہ اول ص ۵)

نیاز کی روشن خیالی اور بیدار مغزی کے سبب "نگار" کی مقبولیت میں روز افزوں اضافہ ہوتا گیا۔ منیجر "نگار" قیوم صاحب کے بیان کے مطابق ــــ

"بھوپال میں "نگار" کی اشاعت ۳ ہزار تھی۔ لکھنؤ آنے کے بعد ..... ۱/۲ ۵ ہزار اشاعت ہوگئی تھی جو شاید کسی اردو رسالے کو نصیب نہ ہوئی ہوگی۔"

(بحوالہ کتاب "نیاز فتحپوری" از امیر عارفی ص ۴۶)

"نگار" (بھوپال) کے پانچ سال پورے ہونے پر مدیر نگار نے جلد ۱۰ شمارہ ۶ کے اداریہ میں اپنے اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے لکھا:

"یہ رسالہ دسویں جلد کا آخری پرچہ ہے اور خدا کا شکر ہے کہ یہ سال بھی اسی طرح گزر گیا کہ مجھے ملک کی طرف سے "قدر ناشناسی" کی زیادہ شکایت پیدا نہ ہوئی ..... گزشتہ پانچ سال کے اندر نگار نے جو مرتبہ ملک میں حاصل کیا ہے اس پر نگاہ کرتے ہوئے جب اس کی رفتار ترقی کو دیکھتا ہوں تو بے اختیار یہ کہنے کو جی چاہتا ہے ؎

زمانہ گلشن عیشے کرا بہ یغما داد ÷ کہ گل بدامن ما دستہ دستہ می آید"

(ملاحظات از نگار، بھوپال دسمبر ۱۹۲۶ء)

نیاز بھوپال میں کامیابی اور اطمینان کے ساتھ علمی ادبی خدمات انجام دینے میں منہمک تھے کہ اچانک بعض وجوہ کی بناء پر انھیں

---

[1] قمرالحسن (جن کا عالم جوانی میں انتقال ہوگیا تھا) انشاء پرداز اور افسانہ نگار بھی تھے۔ ان کے متعلق کوثر چاندپوری مرحوم نے راقم الحروف کے سوال کے جواب میں اپنے خط میں لکھا تھا کہ "میں بھوپال کا پہلا افسانہ نگار قمرالحسن مرحوم کو تسلیم کرتا ہوں۔"

بھوپال چھوڑنا پڑا۔ اس سلسلہ میں انھوں نے سب سے پہلے "نگار" اپریل اور مئی ۱۹۲۶ء کے اداریوں میں اپنی بعض پریشانیوں کی جانب اشارہ کر کے قارئین "نگار" کو آگاہ کیا اور بعد میں "نگار" اکتوبر ۱۹۲۶ء کے اداریہ میں واضح طور پر لکھا کہ :

" حکومت بھوپال کا انقلاب یوں تو ہر اس شخص کے لئے جو یہاں وابستہ ہے ایک خاص اہمیت رکھتا ہے لیکن میرے لئے اس کی نوعیت وہ ہے جسے میں صرف "عالم بیم و رجا" سے تعبیر کر سکتا ہوں۔ .... چونکہ میرے اس معاملے کے تصفیہ پر نگار کا مستقبل بہت کچھ منحصر ہے اس لئے میں نے اس کا ذکر کر دیا تاکہ اگر آئندہ ناظرینِ نگار کوئی خاص تبدیلی میرے لائحہ عمل میں پائیں تو اس کو ہونے والی بات سمجھ کر اظہار حیرت نہ کریں۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ کسی انقلاب کا اثر نگار پر برا پڑے گا، کیونکہ وہ جب تک میں ہوں خواہ بھوپال میں رہوں یا کہیں اور نگار اسی طرح جاری رہے گا ' انشاء اللہ العزیز۔"

نیاز صاحب جس "عالم بیم و رجا" میں مبتلا تھے اس میں حالات نے ان کی مساعدت نہیں کی اور وہی ہوا کہ جس کا اندیشہ تھا، یعنی نیاز کو بوجوہ بھوپال چھوڑ کر لکھنؤ جانا پڑا۔

اس اہم واقعہ کی وجہ تسمیہ کے سلسلہ میں "نگار" بھوپال کے پہلے منیجر عبدالقیوم نے امیر عارفی (مصنف "نیاز فتحپوری") کو ایک انٹرویو میں بتایا کہ :

" بیگم صاحبہ بھوپال کے تین لڑکے تھے۔ نصراللہ خاں، عبیداللہ خاں اور سب سے چھوٹے حمیداللہ خاں۔ بیگم بھوپال کی زندگی میں نصراللہ خاں ولی عہد تھے لیکن ماں کی زندگی اور دوران ولی عہدی ان کا انتقال ہوگیا تھا۔ اب مسئلہ پھر ولی عہدی کا کھڑا ہوا۔ نصراللہ خاں کے بیٹے دادی کے بعد اپنے آپ کو حکومت کا حقدار سمجھتے تھے اور اس کے لئے وہ لڑ رہے تھے۔ بھوپال کے درباری اور دوسرے لوگ دو حصوں میں بٹے ہوئے تھے۔ کچھ لوگ نصراللہ خاں کے لڑکوں کے طرفدار تھے اور کچھ حمیداللہ خاں کے۔

نیاز بھی اکثر نجی محفلوں میں نصراللہ خاں کے بیٹوں کی طرفداری کرتے تھے۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ حکومت وراثت نہیں ہے .... اور یہاں ماں کی موجودگی میں لڑکے کا انتقال ہوا ہے اس لئے اسلامی قانون میں ایسی کوئی دفعہ نہیں ہے کہ پوتوں کو حق سے محروم کر دے .... نواب حمیداللہ خاں کو نیاز کی اس رائے کا علم تھا، جب حمیداللہ خاں والیٔ ریاست بنائے گئے تو نیاز کو بھوپال چھوڑنا پڑا۔

.... میں یہ نہیں کہہ سکتا کیا ہوا۔ ہو سکتا ہے کہ نیاز نے ہی احتیاطاً بھوپال چھوڑ دیا ہو یا پھر حمیداللہ خاں اور ان کے اراکین حکومت نے نیاز کو بھوپال چھوڑنے پر مجبور کیا ہو؟ " (بحوالہ "نیاز فتحپوری" از امیر عارفی ص ۳۷-۳۶)

مذکورہ بیان میں منیجر نگار تذبذب کا شکار نظر آتے ہیں۔ ان کے بیان سے نیاز فتحپوری کے بھوپال چھوڑنے کے اسباب پر واضح روشنی نہیں پڑتی۔ اگر منیجر نگار کا بیان صحیح ہوتا تو نیاز صاحب کی بار بار بھوپال آمد اور قیام کا سلسلہ نہ صرف منقطع ہو جاتا بلکہ وہ نواب حمیداللہ خاں کی تخت نشینی اور ان کے ذریعہ مجلس مقننہ کی تشکیل کے اعلان پر ماہنامہ "نگار" جون ۱۹۲۶ء اور اکتوبر ۱۹۲۷ء کے شماروں میں خصوصی اداریہ تحریر کر کے اپنی دلی مسرت کا اظہار نہ کرتے۔ اس سلسلہ میں لکھے گئے اداریہ خصوصی کا آخری اقتباس ملاحظہ کیجئے :

" .... ناظرینِ نگار کے لئے یہ خبر نئی نہیں ہے کیونکہ وہ اس سے قبل ملک کے اخبارات میں اس کا ذکر دیکھ چکے ہیں، لیکن چونکہ میری ادبی و علمی زندگی اور نگار کی حیات اسی آستانِ نکتہ نواز اور اسی بارگاہ علم پرور سے وابستہ ہے اس لئے میرے لئے ناگزیر تھا کہ میں اس جدید انقلاب کے بعد سب سے پہلا اشاعت کا سرنامہ اسی خبر کو قرار دوں جو کہ نہ صرف میرے بلکہ تمام وابستگان دامن دولت کے لئے ایک دنیائے مسرت اپنے ساتھ لائی ہے ؎

تا گل و سبزہ و ریحاں زخیاباں جوشند — تاکف و موج و گرداب بدریا بینند
تا بریں پشتہ فشاں از مہ و پرویں یابند — تا دریں رہ اثر از آدم و حوا بینند
تا بہر حال شمار دے و بہمن در زند — تا بہر ماہ طراز دی و فردا بینند

ہم بدیں ساز بہنگامۂ ہر عید سعید
شاہ جم کو کبہ را انجمن آرا بینند "

(ماہنامہ "نگار" لکھنؤ۔ جلد ۱۲، شمارہ ۴، اکتوبر ۱۹۲۷ء صہ۲)

اس اعتبار سے نیاز فتحپوری کی بھوپال سے لکھنؤ منتقلی کے سلسلہ میں منیجر نگار کے بیان کے بجائے جناب مالک رام کی حسب ذیل رائے زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے :

" ۱۹۲۷ء میں نیاز بھوپال کی سکونت ترک کر کے لکھنؤ آ گئے۔ لا محالہ نگار کا دفتر بھی ان کے ساتھ یہاں آ گیا۔ اب گویا نگار کے عروج کا زمانہ شروع ہوا۔ بے شک وہ بھوپال میں بھی کامیابی اور نیک نامی کے ساتھ چل رہا تھا۔ نہ صرف خود کفیل تھا بلکہ نیاز کے لئے اچھی آمدنی اور شریفانہ بسر اوقات کا معقول ذریعہ بن گیا تھا۔......... لیکن اس کے باوجود بھوپال کی سیاسی فضا آزادیٔ تحریر کے لئے ساز گار نہ تھی .... بھوپال میں مولانا شبلی کو سیرت النبیؐ کی تالیف میں جو کچھ پیش آیا تھا وہ کسی سے مخفی نہیں اسی لئے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ نیاز کے لئے یہاں رہتے ہوئے اسلامی علوم و مسائل پر آزادی سے لکھنے کا بھلا کیا موقع ہو سکتا تھا۔ جب یہ لکھنؤ آ گئے تو یہاں انھوں نے باقاعدگی سے ان امور سے متعلق لکھنا شروع کیا۔ "

("نیاز فتحپوری" از مالک رام، مطبوعہ نگار (پاکستان) ستمبر ۱۹۶۶ء)

نیاز فتحپوری رومانوی ادیب تسلیم کئے جاتے ہیں۔ وہ حسن کے دلدادہ تھے اور ان کی تخلیقات میں جابجا اس کی عکاسی ملتی ہے۔ بھوپال ایک خوبصورت شہر ہے۔ یہاں کے بڑے تالاب کے کنارے صبح و شام کا منظر نہایت نظر فریب ہوتا ہے۔ اس کی جھلکیاں نیاز کی نظم " بھوپال کی ایک شام " میں ملاحظہ کیجئے :

رنگ شفق عبیر ہے شام کی زلف تار میں
آگ لگی ہوئی ہے یاسمن بنفشہ زار میں

مجمر سنبلی میں ہے آتش گل دہک رہی
کاسۂ نیلمی میں یا مے ہے پڑی چھلک رہی

زخمی تیشہ کر دیا دامن کہسار کو
کس نے جگا دیا غضب سوئے ہوئے شرار کو

شعلہ بہ جام ہے کوئی ساقیٔ لاجورد رنگ
ڈوب گیا ہے نیل میں دامن شاہد فرنگ

دشت چنار مشتعل کب سر کوہسار ہے
جوشش بحر بر رواں تختۂ لالہ زار ہے

کس کے کنار نے دیا کوہ یمن کو یہ فشار
لعل رقیق ہو کے سب بہہ گئے شکل جوئبار

÷

آہ مگر یہ کیا ہوا لو وہ بڑھی سواد شام
ابتر و منتشر ہوا رنگ و ضیا کا یہ نظام

اف رے مصور ازل یہ ترا رنگ احتیاط
چل بھی دیا اٹھا کے تو نقش و نگار کی بساط

(رسالہ "نقاد" مئی ۱۹۱۶ء)

÷

نیاز صاحب کو بھوپال کا موسم کتنا پسند تھا اس کا اظہار انھوں نے " نگار" لکھنؤ، جولائی ۱۹۲۷ء کے اداریہ میں اس طرح کیا ہے :

" جن لوگوں کو گرمی اور بارش کا زمانہ بھوپال میں بسر کرنے کا موقع ملا ہے وہ واقف ہیں کہ یہ دونوں موسم وہاں کے کس قدر ہلکے اور پُر لطف ہوتے ہیں اس لئے اب جو میں بارہ سال تک ان دونوں کا لطف اٹھانے کے بعد یہاں آیا ہوں تو ایسا محسوس کرتا ہوں کہ گرمی شاید خدا کا کوئی عذاب ہے جو ہر سال بندوں پر نازل ہوتا ہے اور جس سے نجات پانے کی کوئی تدبیر انسان کے پاس نہیں ہے ....."

بھوپال میں نیاز صاحب کا قیام نور محل میں تھا۔ یہاں کے ادبی ماحول کی طرح مذہبی ماحول نے بھی انھیں خاصہ متاثر کیا تھا۔ اس سلسلہ میں منیجر نگار کا بیان ہے کہ :-

" بھوپال میں جہاں نیازؔ کا قیام تھا وہاں سے "تاج المساجد" پاس ہی تھی۔ وہ بارش میں بھی چھتری اور لالٹین لئے عشاء کی نماز کے لئے جاتے تھے اس زمانہ میں وہ بہت مذہبی آدمی تھے۔ رمضان کے مہینے میں ہر چیز کا احترام کرتے تھے۔ مجھ سے کہتے تھے روزہ میں دوپہر کو آرام کیجئے لیکن لکھنؤ میں ان کا رویہ بدل گیا۔ وہ مذہب سے بیزار ہو گئے تھے۔"

(بحوالہ "نیاز فتحپوری" از امیر عارفی ص ۵۶)

بھوپال میں نیازؔ مرحوم کے ادبی مشاغل پر اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر سلیم حامد رضوی لکھتے ہیں :۔

" ...... بھوپال میں شعر و شاعری کا ذوق عام تھا۔ چنانچہ نیاز صاحب خود بھی علمی مشغلے کے ساتھ ساتھ شعر و شاعری کی طرف متوجہ رہے۔ عام طور پر مشاعروں میں شریک نہیں ہوتے تھے البتہ مخصوص صحبتوں میں کلام سُنایا کرتے تھے۔ مانی جائسی کے مشاعروں میں ضرور شریک ہوا کرتے تھے۔"

("نیاز فتحپوری اور بھوپال" نیاز اوّل ماہنامہ نگار ص ۸۴)

سلیم حامد رضوی، محمد یوسف قیصر کے حوالے سے اس سلسلہ میں مزید لکھتے ہیں :

" نیازؔ صاحب کے ہمعصر سید محمد یوسف قیصر کا بیان ہے کہ کبھی کبھی نور محل نیاز صاحب کی قیام گاہ پر جایا کرتا تھا، دفتر کے اوقات کے علاوہ ہمیشہ ان کو مطالعہ کتب میں مصروف پایا۔ اردو، فارسی اور عربی کی کتابوں کے علاوہ ان کے پاس انگریزی کتابوں کا ذخیرہ بھی بہت تھا۔ ...... بحث کرنا ان کا خاص مشغلہ تھا۔"

("نیاز فتحپوری اور بھوپال" نیاز اول ماہنامہ نگار ص ۸۶)

اس سلسلہ میں مانی جائسی کا بیان ہے کہ :۔

" بھوپال میں ہمارا حلقۂ احباب چند افراد پر مشتمل تھا۔ روزانہ ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں اور کیا کہوں زندگی کس لطف سے گزرتی تھی۔ خود نیاز صاحب، ملک حبیب احمد، قمر الحسن (یہ ایک نوجوان اور نہایت ہونہار انشا پرداز تھے لیکن افسوس کہ جوان مر گئے)، ابوالاعلیٰ مودودی اور ان کے بڑے بھائی ابو الخیر مودودی، ماسٹر ناصر علی ــــــ وہ لطف مستزاد ہوتا تھا جو دوسرے تیسرے مہینے دو چار روز کے لئے ضیائی اور لطیف کے آجانے سے میسر ہو جاتا تھا۔ سبھی بلند پایہ ادیب تھے۔"

("یاد ماضی" از مانی جائسی۔ نگار، نیاز نمبر ۲ ص ۱۳)

نیازؔ فتحپوری اور ان کے احباب نے بھوپال میں ایک ادبی انجمن قائم کی تھی جس کا نام "سبعہ سیارہ" تھا۔ اس انجمن کے متعلق محمد احمد سبزواری لکھتے ہیں :

" .... ارشد صاحب اور نیاز صاحب نے مل کر ایک انجمن "سبعہ سیارہ" کی بنیاد ڈالی۔ اس میں ان دو حضرات کے علاوہ فہمی ترمذی، مولانا یوسف قیصر، مولانا عبدالحلیم، محوی صدیقی اور عصمت اللہ شامل تھے۔"

(مضمون "مولانا ارشد تھانوی" نگار، مارچ ۱۹۶۸ء)

مطالعہ کتب، فوٹو گرافی، اچھا کھانا اور شکار نیازؔ صاحب کے محبوب مشاغل تھے۔ شکار کے متعلق انھوں نے خود لکھا ہے :

" ...... مختصر یوں سمجھ لیجئے کہ ایک بار ریلوں کے تصادم میں بھی زخمی ہوا ــــــ ڈاکوؤں نے بھی مجھے بارہا گھیر لیا اور شکار کے سلسلہ میں خدا جانے کتنی بار شیروں نے رحم کھا کر مجھے زندہ چھوڑ دیا۔ ہر چند میں شیر کا شکار کرنے میں کبھی کامیاب نہیں ہوا لیکن خدا کا شکر ہے کہ وہ بھی کبھی مجھے اپنا شکار نہیں بنا سکے۔ سب سے آخری واقعہ بھوپال کا ہے جب شیر مجھ سے ایک گز کے فاصلے پر کامل ایک گھنٹہ تک بیٹھا رہا اور میں گودی (گڑھے) کے اندر چھپا ہوا کپکپاتا رہا۔"

("نیاز فتح پوری" نقوش، لاہور۔ آپ بیتی نمبر ص ۱۰۶)

نیازؔ صاحب کو اچھا کھانا کھانے کا کس قدر شوق تھا اس کا اندازہ، جناب کوثر چاندپوری کے حسب ذیل دو اقتباسات سے لگایا جاسکتا ہے:

"ایک روز سویرے ہی جیپ میں بیٹھ کر میرے پاس آگئے۔ پوچھا یوسف ہوٹل کہاں ہے، میں نے اس کا اشتہار پڑھا ہے۔ وہاں جاکر کچوریاں کھانا چاہتا ہوں۔

یہیں کیوں نہ منگالی جائیں، میں نے پوچھا۔ جی نہیں وہیں جاکر گرم گرم کھاؤں گا۔ اس عمر میں مجھے اچھا کھانے سے بڑی دلچسپی ہے۔ نیاز صاحب ہوٹل چلے گئے اور شام کو گرم اور پھولی پھولی کچوریوں کی بہت تعریف کی۔"

(نیاز فتچپوری ۔۔ شخصیت اور فن کے آئینے میں" نگار نمبر ۱ ص ۶۵)

"........... یہ سفر (فروری یا مارچ ۱۹۵۵ء) نیاز صاحب نے اپنے کسی مقدمے کے سلسلہ میں کیا تھا.......

میں نے نیاز صاحب کے ذوق طعام کا احترام کرتے ہوئے انھیں دوپہر کو کھانے پر مدعو کیا اور مرغ مسلّم نہایت اہتمام سے تیار کروایا جو انھیں بہت پسند آیا اور روانگی کے وقت ایک مرغ اور پکوانے کی فرمائش کی۔ اسٹیشن پہنچ کر معلوم ہوا کہ نواب زادہ رشید الظفر اور مولانا طرزی مشرقی سے بھی یہی فرمائش کی گئی تھی چنانچہ ان دونوں نے بھی الگ الگ ناشتہ دانوں میں مرغ بھجوائے تھے۔"

(نیاز فتچپوری ۔ شخصیت اور فن کے آئینے میں۔ نگار نمبر ۱ ص ۶۶)

بھوپال میں نیاز فتچپوری کا حلقۂ احباب اگرچہ مختصر و محدود تھا لیکن یہاں ان کے قدردانوں اور عقیدتمندوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ بعض عقیدت مندوں کے تاثرات ملاحظہ کیجئے جن کے مطالعے سے نیاز فتچپوری کی شخصیت، مزاج اور طرز فکر و خیال کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ جناب کوثر چاند پوری نے نیاز صاحب سے پہلی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے ان کا حلیہ اس طرح بیان کیا ہے:

"سانولے رنگ، بھرے ہوئے چہرے، بھاری جسم اور متوسط قد و قامت کا ایک باوقار آدمی سنہری کمانی کی عینک لگائے، شیروانی پہنے، سر پر دوپلی یا ترکی ٹوپی رکھے اکثر بھوپال کی تنگ و طویل بازار ابراہیم پورہ یا لوہا بازار میں آیا کرتا تھا، کبھی امیر حسن کی دکان پر اور کبھی عبدالحکیم جنرل مرچنٹ کے یہاں۔ اس کی خشخشی داڑھی اور قدرے لمبی مونچھوں میں کوئی ندرت نہ تھی لیکن منہ کے چھوٹے اور گول دہانے اور خمار آگیں آنکھوں میں ایک عالمانہ سنجیدگی اور ادیبانہ تحیر یقیناً تھا........... ایک مرتبہ یہی شخص قمر الحسن (مرحوم)[1] کے ساتھ بازار میں ملا....... میں نے ان سے پوچھا یہ کون صاحب ہیں؟ آپ نہیں جانتے، نیاز صاحب ہیں، آئیے میں آپ کو ان سے ملا دوں۔"

("نگار"۔ نیاز نمبر۔ حصہ اول ص ۶۲)

کوثر صاحب مزید لکھتے ہیں کہ:

"........... ان کے متعلق یہ خیال عام تھا کہ وہ بہت مغرور آدمی ہیں، باتیں بہت کم کرتے ہیں اور لئے دئے رہنے کے عادی ہیں لیکن اس دن پتہ چلا کہ انھیں مغرور کہنا صحیح نہیں۔ وہ خود دار اور کم آمیز ضرور معلوم ہوئے جیسا کہ ہر فنکار کو ہونا چاہئے۔ آگے چل کر ان کی خصوصیات کا اظہار ہوتا رہا کہ وہ کم آمیزی اور کم گوئی کی اس شہرت کے باوجود بہت اچھے ملنے والے، بڑے پر گو اور خوش مذاق ہیں۔ جن سے ملتے ہیں بڑی بے تکلفی اور خلوص سے ملتے ہیں۔ ناجنسوں کی موجودگی میں اپنے اوپر ایک متکبرانہ انداز ضرور طاری کر لیتے ہیں۔"

("نگار"۔ نیاز نمبر۔ حصہ اول۔ ص ۶۳)

اسی مضمون میں کوثر صاحب نے نیاز فتچپوری کی ظرافت اور ذہانت سے متعلق واقعات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"ایک دن میں نے اپنی کتاب 'اطبائے عہد مغلیہ' کا ذکر کیا.......... نیاز صاحب ذرا مزاحیہ موڈ میں تھے، بولے 'ذرا سی ترکیب کیجئے کتاب خوب بکے گی، اس میں اطبا کے مجربات اور شامل کر دیجئے۔' اس پر ایک قہقہہ پڑا........ اسی

---

[1] قمر الحسن صاحب ہائی کورٹ میں ملازم تھے، ان سے نیاز صاحب کی صاحبزادی منسوب تھیں۔

صحبت میں ناخون اور ناخن کی بحث چھڑ گئی۔ میں نے کہا ناخون بھی غلط نہیں بلکہ اصل اور بنیادی لفظ یہی ہے یعنی وہ جگہ جہاں خون بالکل نہ ہو۔ حرف علت (واؤ) کو گرا کر بیش لگا دیا گیا ہے۔ ایک فارسی شعر ہے ؎

اے نگاریں کہ گوشت با ناخون   تو چنانی مرا بجان و بدن

امیر خسرو کی ایک پہیلی ہے ——— بیسوں کا سر کاٹ لیا   نا مارا ناخون کیا

نیاز صاحب گفتگو میں حصہ نہیں لے رہے تھے۔ آخر میں بڑی متانت سے بولے "پہیلی سے مدعا ثابت نہیں ہوتا مگر شعر سے بات صاف ہو جاتی ہے۔"   ("نگار" نیاز نمبر۔ حصہ اوّل ص۶۵)

نیاز فتحپوری کے دوست مانی جائسی کا تحریر کردہ یہ واقعہ نیاز صاحب کی اعلیٰ ظرفی اور شرافت نفس کا آئینہ دار ہے:۔

" بھوپال ہی کا ذکر ہے کہ چند مہینوں کو میرے اور نیاز صاحب کے درمیان شکر رنجی ہو گئی تھی۔ اب ان کی شرافت دیکھئے۔ ایک روز بعد مغرب، میں لکھیرہ پورہ (بھوپال) میں اپنے بالاخانے پر تنہا بیٹھا ہوا تھا۔ دفعتاً کسی نے پکارا، میں اُٹھ کے زینے پر گیا، وہیں سے دریافت کیا "کون صاحب ہیں؟" "میں ہوں نیاز محمد" "فرمائیے!" "کیا میں اوپر آ سکتا ہوں؟" "تشریف لائیے" آئے اور بیٹھ کر کہنے لگے۔ "مانی صاحب میں اس پر بحث کرنا نہیں چاہتا کہ دراصل میرا کوئی قصور ہے یا نہیں۔ جو الزام بھی مجھ پر آپ رکھتے ہوں، تسلیم ہے لیکن دنیا میں اگر خطا کوئی چیز ہے تو عفو بھی کوئی چیز ہے۔" میں نے فی الفور کہا۔ "اچھا نیاز صاحب معاف کیا!" کہنے لگے "یوں معافی نہیں۔ دل سے کدورت نکال دیجئے!" ....

نیاز صاحب کے اس فقرے نے کہ "اگر دنیا میں خطا کوئی چیز ہے تو عفو بھی کوئی چیز ہے" میری رُوح کو جھنجھوڑ دیا... یہ فقرہ ان کے تفکر اور نفسیاتی مہارت کا کارنامۂ عظیم ہے اور میں نے اکثر صحبت احباب میں اس کا ذکر کیا ہے۔"

("یادِ ماضی" از مانی جائسی "نگار" نیاز نمبر حصہ دوم ص۱۱)

مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کے چھوٹے بھائی سید ابو الخیر مودودی کے حسب ذیل تاثرات سے بھی نیاز صاحب کی شخصیت کے بعض پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

" .... میری ان سے ملاقات بھوپال ہی میں ہوئی۔ میں نے ان کو رقعہ بھیجا، آپ سے ملنے کا مشتاق ہوں، آپ تشریف لائیے یا مجھے وقت دیجئے، نیاز صاحب بے تکلف تشریف لے آئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب گیتا نجلی کا مترجم ادبی فضا پر چھایا ہوا تھا اور رقعہ لکھنے والا محض طفل مکتب تھا .... خوانندگانِ نیاز اس سے نیاز کے "انا" اور ان کی شخصیت کو سمجھ سکتے ہیں۔ میں نے ان میں کوئی پندار تبختر نہیں پایا، تعلقات بڑھے لیکن دوستانہ نہیں، خوردانہ اور بزرگانہ تھے۔ میں نے ان کی صحبت میں بے پڑھے بہت کچھ پڑھا اور انھوں نے بے سکھائے مجھے بہت کچھ سکھایا ...... ایک سچے ادیب کی طرح وہ اہلِ مناصب سے کبھی مرعوب نہیں ہوئے۔ میں نے انھیں عہدے داروں کی کہتے کبھی نہیں دیکھا۔ ان کے اَنا کا حقیقی اظہار یہ تھا کہ وہ شفقت سے میرے پاس تشریف لاتے۔ میرے بڑے بھائی سے ملنے کے کبھی خواستگار نہیں ہوئے۔ ہمیشہ یہی ہوا کہ اتفاقیہ آمنا سامنا ہو گیا اور وہ سر راہ علیک سلیک کرتے گزر گئے۔"

("نقوش" لاہور، شخصیات نمبر، حصہ اول ص۵-۶)

نواب حمید اللہ خاں کی بڑی صاحبزادی عابدہ سلطان صاحبہ (عرف بڑی بیا، حال مقیم پاکستان) نے نیاز فتحپوری اور نگار سے متعلق بعض حقائق کو جس دلچسپ انداز میں اپنے مضمون میں پیش کیا ہے، اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ نیاز فتحپوری کی کس قدر مداح اور قدرداں تھیں۔ وہ لکھتی ہیں :

"یوں تو نیاز صاحب کا قیام بھوپال میں ۱۵ء سے ۲۷ء تک رہا لیکن وہ زمانہ میری کم سنی کا تھا اس لئے میں

میں ان کے وجود سے اس وقت تک بے خبر رہی جبتک کہ نگار نے مجھے اپنی طرف مخاطب نہ کیا۔

سرکار عالیہ خلد آشیاں کے زمانے میں میرے مطالعے کے لئے صرف 'نگار' اور 'ہمایوں' دو رسالوں کی اجازت تھی اور اگرچہ میں اس کم عمری میں نہ نگار کو پڑھنے کی استعداد رکھتی تھی نہ اس کے مضامین کو سمجھنے کی صلاحیت' لیکن جس طرح ایک ناواقف شخص فنِ موسیقی سے بیگانہ ہوتے ہوئے بھی بعض بعض راگوں میں مخصوص کشش محسوس کرتا ہے غیر شعوری طور پر اس سے رشتہ 'محبوبیت' قائم کر چکی تھی اور یہ رشتہ عمر اور صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ بڑھتا گیا حتیٰ کہ سرکار عاطفت ہمارے سروں پر سے اٹھنے کے بعد' کچھ عرصہ بعد نگار کا آنا بھی بند ہوگیا۔

مگر سنِ شعور کو پہنچنے کے بعد جب میں اپنے گھر میں منتقل ہو کے خود مختار ہوئی تو میں نے نگار پھر جاری کرا لیا اور اب اس سے روز بروز دلچسپی بڑھتی گئی یہاں تک کہ میں نے نیاز صاحب کو "The king of Urdu literature & living Encyclopaedia" کا خطاب دے دیا۔ ساتھ ہی یہ شوق پیدا ہوا کہ میں خود ان سے استفادہ کر سکوں لیکن مختلف وجوہ کی بنا پر اس وقت یہ کوشش اور امید بے کار تھی۔ اس کے بعد جب شہریار سلمۂ کے لئے اردو اتالیق کے انتخاب کی تجویز میرے والد ہز ہائی نس نواب حمید اللہ خاں صاحب نے پسند فرمائی تو میں نے جن منسٹر صاحب کے سپرد یہ انتظام کیا تھا ان سے نیاز صاحب کے متعلق تذکرہ کیا۔ شروع میں تو انھوں نے ٹال دیا اور دوسرے نام تجویز کئے لیکن جب مجھے بہت زیادہ مصر پایا تو ناراض رہنے لگے اور معاملہ معرضِ تعویق میں پڑ گیا۔ رفتہ رفتہ نوبت اینجا رسید کہ ایک روز انھوں نے بالکل صاف انکار کر دیا کیونکہ (نیاز صاحب) اُن کے خیال میں دہریہ تھے۔

چونکہ میں بھی عرصہ سے نگار کو بہت اشتیاق اور غور سے دیکھتی چلی آرہی تھی اس لئے منسٹر صاحب کے اس نظریہ سے میں نے اختلاف کرتے ہوئے بہت بحث کی۔ آخر میں وہ بہت جھنجھلا کر بولے ——

" آپ نیاز کو کہاں سے اور کیسے جاننے لگیں۔ یہ کس نے آپ کے دل میں ان کا خیال جا یا ہے۔" میں نے کہا کہ " ذاتی طور پر ملاقات کا تو اتفاق نہیں ہوا۔ صرف نگار دیکھ کر ان کی معترف ہوگئی ہوں اور سوچتی ہوں کہ شہریار میاں کی بدولت مجھے بھی کچھ حاصل کرنے کا موقع مل جائے گا۔"

پھر تو منسٹر صاحب کی ناگواری کی کوئی حد نہ رہی۔ کہا۔ " 'نگار' یہاں کیوں اور کیسے آیا۔" میں نے جواب دیا "سرکار اماں منگاتی تھیں' پھر اب ہم خود منگاتے ہیں۔" کہا "یہ ہرگز نہیں آسکتا...... میں ابھی جا کے بند کراؤں گا اور دیکھوں گا کہ اب وہ کیسے ریاست بھوپال میں داخل ہوتا ہے۔" اب میری حالت یہ ہو چکی تھی کہ ؎

شوق بڑھتا گیا نگاہوں کا ؏ لذّتِ انفعال نے مارا

.... اسی ضد پر نیاز صاحب کو میں نے بطور مہمان کچھ دنوں بلا کر اپنے پاس رکھا تاکہ بھوپال میں ان کا داخلہ بند ہونے کی بھی آزمائش کر لی جائے۔ البتہ نیاز صاحب ان حالات سے ناواقف رہے .... ان کے دوران قیام میں نے یہ بھی اندازہ لگایا کہ اگر صحیح طریقہ پر ان سے درخواست کی گئی تو اتالیقی کے لئے شاید آمادہ ہو کر بھوپال آجائیں گے۔"

("حضرت نیاز سے میرا تعارف" از پرنسز عابدہ سلطان' بھوپال۔ مطبوعہ "نگار" نیاز نمبر' حصہ دوم ص ۱۵-۱۶)

بھوپال کے مشہور آرٹسٹ عبدالحلیم انصاری (مرحوم) نے نیاز فتحپوری سے متعلق اپنے تاثرات' مضمون "مولانا نیاز فتحپوری[۱]" میں قلمبند کئے ہیں۔ چند اقتباسات ملاحظہ کیجئے :

---

[۱] (۱۶ جون ۱۹۶۷ء کا تحریر کردہ' مذکورہ غیر مطبوعہ مضمون راقم الحروف کے پاس محفوظ ہے)۔

" مولانا نیازؔ سے نیاز مجھے اس وقت سے حاصل تھا جب وہ بھوپال میں مقیم تھے اور نور محل میں رہتے تھے ...... یہی وہ زمانہ تھا جب میں آرٹ کا طالب علم تھا اور آرٹ اسکول بمبئی میں تعلیم پا رہا تھا۔ میری طالب علمانہ زندگی میں بھی انھوں نے مجھ سے ربط رکھ کر اپنی عاطفانہ رواداری کو نبھایا ہے .... ۔

.... وہ بہت مصروف قسم کے انسان تھے ...... تاہم بسا اوقات از راہ اخلاص مجھ سے ملنے غریب خانے پر تشریف لے آیا کرتے تھے ...... وہ میرے آرٹ کے قدرداں تھے ۔ .... وہ لطیف ذوق رکھتے تھے، مبصرانہ نظر میری فنی و ادبی کاوشوں کی حوصلہ افزائی کرکے بڑی حد تک مجھے اعتماد بخشا۔ اگر مجھ کو یہ اعتماد و حوصلہ حاصل نہ ہوتا تو میں اپنے ذوق تخلیق و نگارش کو قائم نہ رکھ سکتا .... خطوں کا جواب دینے کے وہ بہت پابند تھے .... میں نے اپنے خطوں کے جواب بواپسی ڈاک پائے ہیں۔ میری ان کے ساتھ نشستیں بھی رہی ہیں۔ کسی مسئلے پر مشورہ ہو تو بڑے دل سے اور نرم لہجے میں بات کرتے تھے اور معقول پسند تھے ...... نیاز صاحب نے ایک بار "نگار" کا سرورق تبدیل کرنے کا خیال ظاہر کیا اور اس باب میں مشورہ بھی کیا۔ ایک خاص نشست میں جب میں نے ڈیزائن بنا کر دکھایا تو بہت پسند کیا جس کا پنسل خاکہ آج تک میرے پاس موجود ہے۔

.... نیاز صاحب میرے مخلص دوست تھے اور سچے قدر داں!

ذیل میں پیش کردہ ان کا قیمتی خیال ان کے استخلاص اور قدر دانی کی ضمانت پیش کرتا ہے جو ان کے قلبی تاثر اور خلوص کی مہک لئے ہوئے مجھ تک پہنچا ہے:

" ایک آرٹسٹ کی حیثیت سے نہیں لیکن ایک مخلص دوست کی حیثیت سے میں نے آپ کے نقوش کو حرزِ جاں بنایا ہے۔ خاکسار نیاز "

بحیثیت صدر اور مہمان خصوصی نیازؔ فتحپوری بھوپال میں کئی ادبی نشستوں اور مشاعروں میں شرکت کر چکے ہیں۔ لیکن یہاں جس یادگار مشاعرے کی روداد پیش کی جارہی ہے اس کے روح رواں خود نیازؔ صاحب تھے۔ یہ طرحی مشاعرہ انھیں کی خواہش پر زیر اہتمام خان شاکر علیخاں شعرائے بھوپال کے تعاون سے، ۱۸ر مئی ۱۹۵۷ء کی شب صدر منزل (بھوپال) کے سامنے والے میدان میں زیر صدارت نیاز فتح پوری منعقد ہوا تھا۔ اس مشاعرے کی گونج مدت دراز تک بھوپال اور بیرون بھوپال کے ادبی حلقوں میں سنی جاتی رہی اور اس کی کامیابی کے چرچے آج بھی بھوپال کے ان بزرگ شعراء اور بعض سامعین کی زبان پر ہیں جنھوں نے اس مشاعرے میں بنفس نفیس شرکت کی تھی۔

"نگار" جولائی ۱۹۵۷ء کے شمارے میں مشاعرے کا انتخاب شائع ہوا اور تفصیلی رپورٹ "آنکھوں دیکھا حال" کے عنوان سے مقامی روز نامہ "ندیم" کے ۲۲ر مئی تا ۲۶ر مئی ۱۹۵۷ء کے شماروں میں نمایاں طور پر شائع ہوئی۔ مذکورہ رپورٹ کے چند اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں جن کے مطالعے سے مشاعرے کی نوعیت اور کامیابی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

" نیاز صاحب نے مصرعہ طرح تجویز کیا تھا جس کی بنیاد آگے چل کر بھوپال میں مشاعرے کا انعقاد طے پایا۔ نیاز صاحب چاہتے تھے یہ محفل شعروسخن ایسی ہو کہ یادگار رہے اور وہ سرزمین جو ان کے لئے سب کچھ ہے جہاں انھوں نے اپنے عہدِ شباب کا وہ زمانہ گزارا جو ان کی زندگی کا حاصل تھا اور جہاں وہ دل کے کتنے ہی ٹکڑے چھوڑ گئے تھے، اس سرزمین سے غزل کی وہ راگنی چھڑے جس کی آواز پر سارا ملک جھوم اٹھے۔

کمیٹی بنی، رہبر، ادیب، شاعر، وکیل، طالب علم سب موجود تھے .... دعوت نامے چھپے۔ کوئی شاعر باقی نہ بچے۔

سب ہی کو دعوتِ فکر دی گئی .... صدر منزل کے وسیع میدان میں چاروں طرف آدمی ہی آدمی نظر آنے لگے۔ ان کی آنکھیں ڈائس کی طرف تھیں۔ وہ گوش بر آواز تھے اور وہ آواز گونج رہی تھی جس کے تذکرے ایک ماہ سے گرمیٔ محفل کا سبب بنے ہوئے تھے۔

مشاعرہ کا مصرعہ طرح تھا ــــ " میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے "
صدرِ مشاعرہ، نیاز فتحپوری کا استقبال جناب اختر سعید خاں نے ان الفاظ میں کیا ــــ " ہمارے ادب میں جتنے بھی دور گزرے ہیں ان میں نیاز صاحب ہر جگہ جلوہ افروز ہیں۔ وہ کہیں رہرو ہیں، کہیں رہبر!"
نیاز فتحپوری نے، حسب ذیل مختصر مگر جامع صدارتی خطبہ نذرِ سامعین کیا :
" اردو شاعری کا موجودہ دور، ترقی اور بڑے ہوش گوش کا ہے۔ پہلے یہاں شاعری کا میدان محدود تھا اب اس کے لئے کائنات ہے۔ موجودہ دور میں شعراء خیال اور مقصد پر زیادہ توجہ دیتے ہیں لیکن اس کی ضرورت ہے کہ زبان پر بھی خاص توجہ دی جائے۔ تشبیہات و استعارات نئے نئے انداز سے پیش کئے جائیں تاکہ زبان میں وسعت پیدا ہو۔"
نیاز صاحب نے اس مشاعرے میں، مختلف رنگوں کی حامل چار طرحی غزلیں سنا کر بھرپور داد وصول کی۔ ۱۶، اشعار پر مشتمل پہلی غزل اساتذۂ متقدمین کے رنگ میں تھی۔ چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں : ؎

مسکراتا جائے ہے یا کوئی ہنستا جائے ہے ‏ تجھ کو اے دل کیا پڑی ہے تو تو روتا جائے ہے
محو ہو جاتے ہیں سارے شکوہ ہائے دردِ دل ‏ سامنے جس دم وہ جانِ آرزو آ جائے ہے
چشمِ تر ہے اِس طرف اور اُس طرف ابرِ بہار ‏ دیکھنا ہے آج کس سے کتنا رویا جائے ہے
جاں گسل ہے گو بہت ترکِ محبت کا خیال ‏ لیکن اس پیماں شکن کو یوں بھی چاہا جائے ہے

اپنے دم سے تھا نیاز اک انجمن لیکن غریب
جاتے ہے دنیا سے آج اور کیسا تنہا جائے ہے

۲۲، اشعار پر مشتمل متاخرین کے انداز میں کہی گئی، نیاز صاحب کی دوسری غزل کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے: ؎

منزلِ خود آگہی کا قرب بڑھتا جائے ہے ‏ ہوش کھوتا جائے ہے پردہ سا اٹھتا جائے ہے
ہم سُنانے کو سُنا دیں داستانِ غم مگر ‏ کس سے ان بھیگی ہوئی پلکوں کو دیکھا جائے ہے
اس میں ہے کوئی صنم محوِ گراں خوابی ضرور ‏ ورنہ کیوں سنگِ حرم پر سر جھکایا جائے ہے
یاد میں جس کی لکھی ہے یہ غزل میں نے یہیں ‏ خاک میں بھوپال کے آسودہ پایا جائے ہے

سُن لو شاید سن سکوگے پھر نہ آواز نیاز
اب وہ جینے سے بہت بیزار ہوتا جائے ہے

نئے زاویوں سے مرکّب، تشبیہات اور سخن گسترانہ تعبیرات سے مزین، ۱۷، اشعار پر مشتمل مشاعرے میں پڑھی گئی تیسری غزل کے کچھ اشعار پیش کئے جاتے ہیں ؎

جب قفس میں مجھ کو یاد آشیاں آ جائے ہے ‏ سامنے آنکھوں کے اک بجلی سی لہرا جائے ہے
اف وہ چشمِ سرمگیں کی تابشیں کچھ اور بھی ‏ آنچ بڑھ جاتی ہے جب یہ آگ کجلا جائے ہے
میری تنہائی نہ پوچھو جیسے کوئی نقشِ پا ‏ دور صحرا کے کسی گوشہ میں پایا جائے ہے
کعبہ و بت خانہ ان دونوں میں کتنا فرق ہے ‏ آپ بن جاتا ہے یہ اور وہ بنایا جائے ہے

اب یہ حالِ دل ہے جیسے دکھ کے کانٹوں پر نیاز
ریشمی چادر کو بے دردی سے کھینچا جائے ہے

عصرِ حاضر کے رجحانات کو پیش نظر رکھ کر کہی گئی چوتھی غزل کے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں ؎

تار کی جھنکار سے بزم تھرّا جائے ہے
گاہے گاہے سازِ ہستی یوں بھی چھیڑا جائے ہے

خود زمانہ رُخ ہمارا دیکھتا ہے ہم نہیں
جس طرف مڑ جائیں ہم دھارا بھی مڑتا جائے ہے

ہم کہاں ڈوبے تھے یہ کل پوچھیے گا آج تو
کچھ تلاطم سا مگر موجوں میں پایا جائے ہے

عقل والو کچھ کہو یہ رشتۂ رازِ حیات
کیوں الجھتا جائے ہے جتنا کہ کھلتا جائے ہے

کل اسی آہنگ پر ہونا ہے تعمیرِ فغاں
آج کچھ زیرِ لب دیوانہ کہتا جائے ہے

ختم کر بہرِ خدا یہ داستانِ غم نیازؔ
تیری باتوں سے کلیجہ منہ کو آیا جائے ہے

مشاعرے کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر شیام سندر دیکشت نے انجام دئے۔ اس مشاعرے میں ۵۲ شعراء کرام نے شرکت کی۔ ان کے علاوہ فراقؔ گورکھپوری، مانیؔ جائسی، آنند نرائن ملّا اور شفیق جبلپوری کی طرحی غزلیں مجدد نیازی کے (آل انڈیا ریڈیو، لکھنؤ) نے اپنی مترنم آواز میں سنا کر سامعین سے بھرپور داد وصول کی۔ سامعین کی تعداد کے اعتبار سے بھی یہ بھوپال کا پہلا کامیاب اور یادگار مشاعرہ تھا جو ساری رات جاری رہا۔ یوں تو ہر شاعر نے اپنے تئیں اچھا کلام پیش کیا لیکن نیازؔ فتحپوری کے علاوہ جن شعراء کرام کو پسند کیا گیا اور انھیں بار بار سنا گیا ان کے اسمائے گرامی ہیں محمد علی تاجؔ بھوپالی، اظہر سعید، مقصودؔ عمرانی، ناطقؔ مالوی، اختر سعید خاں، کیفؔ بھوپالی، شفاؔ گوالیاری، باسطؔ بھوپالی، حامد سعید خاں حامدؔ اور منیرؔ بھوپالی۔“

نیازؔ فتحپوری اگرچہ علی گڑھ اور رام پور میں بھی طرحی مشاعرے منعقد کرانا چاہتے تھے لیکن سب سے پہلے اس کا انعقاد بھوپال میں کرانا نیازؔ صاحب کے اس خصوصی لگاؤ کو ظاہر کرتا ہے جو انھیں بھوپال اور اہلِ بھوپال سے تھا۔ اور اہلِ بھوپال نے بھی اس مشاعرے کو یادگار بنانے کی خاطر جس جدوجہد، محنت اور لگن کا مظاہرہ کیا وہ ان کی اس بے پایاں محبت کا بین ثبوت ہے جو انھیں نیازؔ مرحوم سے تھی چنانچہ مولوی عبدالخالق نقوی، نیازؔ صاحب سے متعلق لکھے گئے اپنے مخالفانہ مضمون ”نیازؔ فتحپوری کا نفسیاتی مطالعہ اور ان کی طائرانہ نظر“ (دوسروں پر تنقید کی کمندیں پھینکنے والا خود تنقید کے دام میں) مطبوعہ روزنامہ ”ندیم“ بھوپال، ۱۵ ؍اگست ۱۹۵۷ء، میں اس امر کا اعتراف کئے بنا نہ رہ سکے کہ ــــــــ

”یہ مشاعرہ اس لحاظ سے کافی اہمیت رکھتا تھا کہ اس کا انعقاد حضرت نیازؔ کے فکر کا نتیجہ تھا اور اس اعتبار سے بھی کہ مدتِ دراز کے بعد طرحی مشاعرہ کا نام سننے کو ملا اور وہ بھی غالبؔ کی ایک مشہور غزل پر .... اس مشاعرے کے اعلان سے بھوپال کے شعر و ادب کی فضا میں ایک ہلچل پیدا ہوگئی۔ وہ لوگ جو اِس مشاعرے کے انعقاد کے حامی تھے نیز وہ حضرات جن کو نیازؔ صاحب کی یہ تجویز پسند نہیں تھی اور انھوں نے شرکت گوارا نہیں کی، سب ہی نے بلاواسطہ یا بالواسطہ اس مشاعرے سے دلچسپی لی، جس کا کھلا ہوا ثبوت ان مشاعروں کا انعقاد ہے جو ۱۸ ؍مئی کے مشاعرے کے بعد شہر اور بیرونِ شہر میں کئی جگہ منعقد ہوئے۔“

اس مشاعرے کے بعد ۲۲ ؍مئی ۵۷ء کو نیازؔ صاحب کے اعزاز میں ”حلقۂ دانشوراں“ (بھوپال) کے زیرِ اہتمام ایک ادبی نشست منعقد ہوئی جس میں نیازؔ فتحپوری کے علمی، ادبی کارناموں کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں ناقابلِ فراموش قرار دیا گیا۔

اس طرح نیازؔ فتحپوری کا بھوپال سے بڑا گہرا تعلق تھا۔ اگرچہ بعض ناگزیر وجوہ کی بنا پر انھیں بھوپال چھوڑنے پر مجبور ہونا پڑا لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ انھوں نے اس سرزمین سے بعض امور میں جہاں اکتسابِ فیض کیا وہیں وہ اس کی نیک نامی اور شہرت کا ذریعہ بھی بنے۔ ان کے بیشتر ادبی اور صحافتی کارنامے قیامِ بھوپال کے ہی رہینِ منت ہیں۔ انھوں نے یہاں تقریباً بارہ سال تک قیام پذیر رہ کر جو اہم کارنامے انجام دئے ہیں اس کا اعتراف خود اس طرح کیا ہے :

”......... میری علمی و ادبی زندگی اور ’نگار‘ کی حیات اِسی آستانِ نکتہ نواز اور بارگاہِ علم پرور سے وابستہ رہی ہے۔“

(اداریہ ”نگار“ (لکھنؤ) جلد ۱۲، شمارہ ۴، اکتوبر ۱۹۲۷ء ص ۲)

ڈاکٹر فرمان فتحپوری

نیاز فتحپوری مستقلاً پاکستان کیوں آئے؟

نیاز فتحپوری کو ۱۹۶۲ء میں حکومتِ ہند نے بہت بڑے قومی اعزاز پدم بھوشن سے نوازا۔ اس کے بعد وہ مع "نگار" پاکستان منتقل ہو گئے۔ اس کے اسباب پر جناب فرمان فتحپوری مدیر "نگار" (پاکستان) نے روشنی ڈالی ہے۔ نیاز کے اسبابِ ترکِ وطن دلچسپ ہیں لیکن کیا انہی اسباب کی بناء پر وہ پاکستان منتقل ہوئے ہوں گے۔ وہ مضبوط دل و دماغ کے آدمی تھے جو معمولی جذبات سے کبھی مغلوب نہیں ہوتا اور استدلال کے ستونوں پر کھڑا ہوتا ہے۔ ایسی ہستی ترک وطن کے لئے صرف ان وجوہات کو کافی سمجھے یہ یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ لیکن فرمان صاحب نیاز پر سب سے مستند اتھاریٹی ہیں۔ جو حقائق انہیں معلوم تھے وہ قلمبند کر کے انہوں نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔ ممکن ہے بعض حضرات کو مصنف کی آراء سے تعرض ہو اور وہ نیاز کے ترکِ وطن پر مزید کوئی روشنی ڈال سکیں۔ انشاء کے صفحات ان کے لئے حاضر ہیں۔ .... (ف۔س۔اعجاز)

نیاز صاحب ایک باشعور اور ذمہ دار شہری کی حیثیت سے یقیناً کوئی نہ کوئی سیاسی نقطۂ نظر رکھتے تھے۔ اور برعظیم پاک و ہند کی تحریکِ آزادی کے قلمی مجاہدوں میں تھے لیکن کبھی کسی سیاسی جماعت سے خود کو وابستہ نہیں کیا۔ البتہ ان کی ہمدردیاں زبان و ثقافت کے حوالے سے ہمیشہ مسلمانوں کے ساتھ رہیں اس لئے ۱۹۳۵ء کے قریب جب زبان کا مسئلہ برعظیم کی سیاست میں مرکزی اہمیت حاصل کر گیا تو انھوں نے کانگریس کے بعض زعما کی ہندو ذہنیت اور اس کی جارحیت کے خلاف کھل کر قلم اُٹھایا کہ اس کے بعد انھیں مسلم لیگ کا حامی خیال کیا جانے لگا۔ اس سلسلے میں "نگار" جولائی ۱۹۳۶ء میں "ملاحظات" کے تحت ان کا طویل اداریہ مطالعہ کے لائق ہے۔ نگار کے ابتدائی صفحات میں ملاحظات کے عنوان سے وہ عموماً سیاسی مسائل ہی پر اظہارِ خیال کرتے تھے۔ یہ مسائل برصغیر پاک و ہند کی ہندو مسلم سیاست سے متعلق بھی ہوتے تھے اور بین الاقوامی امور سے بھی۔ لیکن ان کی سیاسی تحریریں کی حیثیت بے لاگ تبصرے کی ہوتی تھی۔ ادب کی طرح سیاست میں بھی ان کا نقطۂ نظر آزاد، بے باک اور غیر جانبدارانہ ہوتا تھا، وہ ہر سیاسی جماعت کے اس اقدام کو سراہتے یا ہدفِ تنقید بناتے تھے جو ان کے زاویہ نظر سے درست یا غلط ہوتا تھا۔ البتہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے، ان کی ہمدردیاں، ملتِ اسلامیہ کے ساتھ تھیں اور ان کو ہر اس عمل اور ردّعمل سے دکھ ہوتا تھا جس سے مسلمانوں کے قومی جذبے اور تہذیبی سرمائے کو نقصان پہنچنے کا خطرہ لاحق ہوتا تھا۔ چنانچہ جیسے ہی اُردو ہندی قضیئے کو سیاست میں داخل کیا گیا انھوں نے کھل کر اُردو کی حمایت کی اور ہندی

کے خلاف زبردست محاذ قائم کیا۔ مسلم لیگ سے وابستہ مولوی عبدالحق کے ساتھ۔ مسلم لیگ سے الگ رہ کر، اگر کوئی بڑا ادیب تھا تو وہ مولانا نیاز فتحپوری تھے۔ پاک و ہند کی ملّت اسلامیہ سے گہری ہمدردی رکھنے کی دوسری مثال ۱۹۴۸ء کا سالنامہ ہے۔ نیازؔ نے قیام پاکستان کے فوراً بعد جنوری فروری ۱۹۴۸ء میں "نگار" کا پاکستان نمبر، لکھنؤ سے شائع کیا۔ ڈھائی سو صفحے کا پورا پرچہ نیازؔ کی تراوشِ قلم کا نتیجہ ہے اور اپنے موضوع کے اعتبار سے ایسا اہم صحیفہ ہے کہ اس کا جواب ہماری کتب و مقالات میں اب بھی نظر نہیں آتا۔ اس میں نیاز نے برعظیم میں مسلمانوں کے داخلے کی تاریخ سے لے کر یہ بتایا ہے کہ یہاں مسلمانوں نے صرف ڈنڈے کے زور سے حکمرانی نہیں کی بلکہ مروّت و رواداری اور انصاف و رحم دلی سے عوام کے دلوں کو مسخر کیا ہے اور مختلف علوم و فنون اور تہذیب و تمدّن کی روشنی پھیلائی ہے۔ ان تمام باتوں کے باوجود جیسا کہ اوپر میں نے لکھا ہے، نیاز صاحب صرف ایک آزاد خیال سیاسی مبصر تھے وہ عملاً یا مسلکاً کوئی ایسی سیاسی شخصیت نہ تھے کہ پاکستان آنے یا نہ آنے کا عوامی سطح پر کسی طرح کا ردعمل ہوتا۔ ہاں ان کا شمار اُردو کے ان بڑے اور منفرد ادیبوں میں تھا جن کی زندگی کے معمولی سے معمولی اور نجی سے نجی واقعات بھی قابلِ توجہ خیال کیے جاتے ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ جب جولائی ۱۹۶۲ء میں نیاز صاحب مستقلاً پاکستان آگئے تو ان کی آمد کے سلسلے میں طرح طرح کی قیاس آرائیاں کی گئیں۔ ہندوستان میں خاص طور پر اُن کے نقلِ مکانی کو موضوعِ سخن بنایا گیا۔

بعض صحافیوں اور ادیبوں نے ان کی ہجرت کو نیاز صاحب کی حرص و ہوس کا نام دیا اور بعض نے ہندوستان سے بے وفائی پر محمول کیا۔ حرص و ہوس کی تہمت اس قیاس پر تھی کہ انھیں پاکستان آنے کے لئے کسی بڑے عہدے کی پیش کش کی گئی ہوگی اور بے وفائی اس سبب سے کہ انھوں نے ہندوستان کی جانب سے دیے گئے اس اعزاز کا بھی لحاظ نہ کیا تھا جو انھیں "پدم بھوشن" کے نام سے چند روز پہلے ملا تھا۔ بعض نے یہ کہا کہ وہ اپنی ساری منقولہ و غیر منقولہ جائداد فروخت کر گئے اور اپنا ذاتی کتب خانہ جو بیش بہا مخطوطات پر مشتمل تھا پاکستان منتقل کر کے آئے ہیں۔

نیازؔ صاحب چاہتے تو بڑی آسانی سے ان تہمتوں کا جواب دے سکتے تھے لیکن انھوں نے ایسا نہ کیا۔ طعن و تعریض کا نشانہ بننا پسند کیا لیکن زبان نہیں کھولی۔ کسی سیاسی وجہ یا مصلحت کی بنا پر نہیں۔ یکسر ذاتی، نجی اور نفسیاتی وجوہ کی بنا پر۔ میں نے بارہا چاہا کہ وہ قمر زمانی بیگم اور اپنی ہجرت کے واقعات کو وضاحت سے لکھ جائیں۔ ۱۹۶۳ء میں نیازؔ نمبر کی اشاعت کے وقت میں نے خصوصاً اصرار کیا کہ وہ اپنے حالات کے ساتھ قمر زمانی اور ہجرت کی تفصیلات بھی بیان کر جائیں۔

لیکن ان دونوں باتوں کو وہ خوش اسلوبی سے ٹال گئے۔ مالک رام صاحب نے اپنے مضمون قمر زمانی بیگم کے قصّے کا ذکر بھی کیا تھا لیکن نیاز صاحب نے یہ کہہ کر کہ جب اسے منظرِ عام پر لایا جائے تو پوری تفصیل اور صحت کے ساتھ لایا جائے۔ مالک رام صاحب کے مضمون سے اس حصے کو حذف کر دیا۔

میرے اصرار پر کچھ دنوں بعد وہ "قمر زمانی" کی تفصیلات شائع کرنے پر رضامند ہو گئے اور 'نگار' میں اس کا اشتہار بھی دے دیا گیا۔ لیکن بعض وجوہ سے یہ کام بھی نہ ہو سکا اور مجھے حکم دیا گیا کہ میری وفات کے بعد شائع کر دینا۔ یہ کام تو چند برس بعد میں نے کتابی صورت میں کر دیا۔ قمر زمانی بیگم نامی کتاب کا پہلا اڈیشن ۱۹۷۰ء میں لاہور سے اور دوسرا ۱۹۷۹ء میں اُردو اکیڈمی سندھ کراچی سے شائع ہوا۔ اپریل مئی ۱۹۷۹ء کا "نگار پاکستان" بھی اس کے لئے مخصوص کیا گیا۔ البتہ ہجرت کے واقعے کو زبان پر لانے اور بیان کرنے کی اجازت نہ مجھ کو دی اور نہ گھر کے کسی فرد کو۔ غالباً وجہ یہ تھی کہ اس واقعے کے تذکرے سے انھیں ذہنی الجھن ہوتی تھی اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ اگر انھوں نے ایسا کیا تو اس تذکرے سے ان کی چہیتی بیٹی شوکت جہاں مرحوم کی روح کو تکلیف ہوگی۔ لیکن اب نیاز صاحب کی وفات کو کم و بیش بیس سال ہونے کو ہیں۔ مختلف جامعات اور جامعات سے باہر ان پر تنقیدی و تحقیقی کام بھی ہو رہا ہے اور بعض کام کرنے والے ان کی مہاجرت کے اسباب کو کچھ سے کچھ بنائے دے رہے ہیں۔ اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعہ کو وضاحت سے بیان کر دیا جائے تاکہ آئندہ جب نیازؔ کی سوانح حیات پر کوئی قلم اٹھائے تو وہ غلط اندیشی اور غلط روی کا شکار نہ ہو۔

ادب کے قارئین کو شاید یاد ہو کہ نیاز صاحب نے ۱۹۶۳ء کے نیاز نمبر میں اپنے متعلق جو مضمون لکھا تھا اس میں اپنی ہجرت کے اسباب

کا تذکرہ بھی کنایتاً اس طور پر کر دیا تھا:

"یہاں (لکھنؤ) میں زندگی کے بہت اندوہناک واقعے پیش آئے، پہلے ۱۹۴۷ء میں میری رفیقۂ حیات اور اس کے چند سال بعد میری لڑکی شوکت کی موت، اور میں ان کو بھی جھیل گیا۔ لیکن یہ خبر نہ تھی کہ زمانے کی ترکش میں ایک آخری تیر اور بھی ہے، ایسا زہر آلود تیر کہ اس سے جانبر ہونا میرے لئے دشوار ہو جائے گا۔ اس کی توضیح ضروری نہیں۔ مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ میری زندگی کا یہ دردناک تجربہ ۱۹۶۱ء سے شروع ہوا، اور اس نے رفتہ رفتہ میرے نظام عصبی، دل و دماغ کو اس درجہ متاثر کیا کہ اشتہا مفقود ہو گئی اور غذا ترک۔ یہاں تک کہ میں صاحب فراش ہو گیا اور زندگی سے بالکل مایوس۔ پھر اگر میں تنہا ہوتا تو مجھے اپنی جان اتنی عزیز نہیں کہ اس ماحول میں جان دینے سے گریز کرتا۔ لیکن چونکہ میری رفیقۂ حیات اور اپنے دو چھوٹے بچوں کا مستقبل میرے سامنے تھا اور مجھے یقین تھا کہ میرے بعد ان کو سخت تکلیف کا مقابلہ کرنا پڑے گا اس لئے میرے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ ان کو لے کر پاکستان آ جاؤں۔"

(نگار پاکستان، مارچ اپریل ۱۹۶۳ء ص ۴۱)

لیکن اس بیان میں چونکہ نیاز صاحب نے توضیح کو غیر ضروری قرار دیا ہے اس لئے ان لوگوں کے سوا جو کہ لکھنؤ میں اپنی آنکھوں سے نیاز کی ذہنی الجھنوں کو دیکھ چکے تھے کوئی دوسرا اس امر واقعہ سے آگاہ نہ ہو سکا، ہر چند کہ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی نے عینی شاہد کے طور پر اسی وقت لکھ دیا تھا کہ

"نیاز صاحب اور ان کے ساتھ نگار کا ہندوستان سے ہجرت کر جانا ہندوستان والوں کے لئے ایک بہت افسوسناک واقعہ ہے۔ مجھے یہ بخوبی معلوم ہے کہ نیاز صاحب کسی طلب منفعت کی خاطر پاکستان نہیں گئے۔ اگر ایسا خیال ہوتا تو نیاز پاکستان کے وجود میں آنے کے وقت ہی چلے گئے ہوتے۔ ان کے سیاسی خیالات میں بھی یہاں ایسی کوئی نمایاں تبدیلی ظہور میں نہیں آئی تھی جس کے تحت ہندوستان چھوڑنے پر مجبور ہو گئے ہوں۔ اس کے علاوہ جیسا کہ میں اوپر لکھ چکا ہوں انھیں سیاسیات میں عملی طور پر کبھی دلچسپی نہیں رہی۔ انھیں اپنے کام سے کام رہا ہے۔ ملک میں چاہے جس قسم کے خیالات رائج ہوں علم و ادب سے شغف رکھنے والے ہر حال میں اپنی گذر بسر کر لیتے ہیں۔ یہی حال نیاز صاحب کا ہے۔ اسی لئے ان کی ہجرت کی توضیح کسی سیاسی عقیدہ میں تبدیلی نہیں ہو سکتی جہاں تک کہ قدردانی کا سوال ہے تو خود ہندوستان کی سرکار نے ابھی پچھلے دنوں انھیں پدما بھوشن کے خطاب سے نوازا تھا۔ سرکار سے زیادہ خود اردو داں طبقہ ان کی حتی الوسع قدر و منزلت کرتا تھا۔ ان تمام باتوں کے پیش نظر اگر بعض ہندوستانی یا پاکستانی اخباروں یا ادیبوں نے اس قسم کے الزام تراشے ہیں تو وہ صریحاً بے بنیاد ہیں۔ نیاز صاحب اب عمر کے اس دور میں پہنچ چکے ہیں جبکہ منفعت یا مزید حصول شہرت و عزت کے خیالات کوئی خاص معنی یا اہمیت نہیں رکھتے بلکہ اس عمر میں پہنچ کر ہر شخص یہی چاہتا ہے کہ اپنے بقیہ ایام بے فکری اور آرام و اطمینان سے بسر کرتا جائے اور جتنا کچھ ہو سکے اپنا ادبی یا علمی کام بغیر کسی فکر و اندیشہ کے کرتا رہے۔ یہی چیز اب نیاز صاحب کے لئے یہاں ممکن نہیں رہی تھی۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ ہجرت کس افسوسناک حالات کے تحت پیش آئی ہے۔"

(نگار پاکستان مئی جون ۱۹۶۳ء ص ۲۳)

لیکن اس بیان سے بھی یہ پتہ نہیں چلتا کہ وہ کون سے افسوسناک حالات تھے جن کے تحت نیاز صاحب کو ہندوستان چھوڑنا پڑا۔ جاننے والے جانتے تو ہیں، لیکن ڈاکٹر ہاشمی کی طرح مجملاً ہی لکھتے ہیں، افسوسناک حالات کی وضاحت نہیں کرتے مثلاً نادم سیتاپوری جو نیاز صاحب کے اسباب ہجرت سے خوب واقف تھے نیاز صاحب کی ہجرت کے بارے میں صرف اس قدر لکھتے ہیں کہ:

"نیاز صاحب مع نگار جب پاکستان پہنچے تو ہندوستان سے ادبی حلقوں میں ان کی ہجرت پر طرح طرح سے تبصرے کئے گئے تقریباً ویسی ہی فکر انگیزی جیسی جوش کے بارے میں چلی تھی، بعض لوگوں نے کہا کہ ہندوستانی ادیبوں کو پدم بھوشن قسم کے غیر شاعرانہ خطاب راس نہیں آتے۔ بعض حضرات کی رائے تھی کہ نیاز صاحب نے "وطن" سے غداری کی، کوئی کچھ کہتا تھا کوئی کچھ، جتنے منہ اتنی باتیں۔ حالانکہ ان نکتہ چینوں نے ایک منٹ کے لئے بھی یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی کہ ادبی زندگی کے علاوہ نجی زندگی بھی ہوتی ہے اور اس نجی زندگی کے تقاضے بھی، اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں ہر شخص کو اپنی نجی زندگی کے بارے میں آزادانہ فیصلہ کرنے کا مجاز ہے اور

> کسی دوسرے کو اس پر رائے زنی کا حق نہیں پہنچتا خواہ وہ اس کی شہرت کو بنیاد بنا کر اپنے آپ کو کتنا ہی قریب محسوس کرتا ہو۔
> نیاز صاحب کی نقل مکانی بھی اسی قسم کا ایک نجی مسئلہ تھا جس پر غیر ذمہ دارانہ تنقید کرنے والوں نے نہ محض نیاز کے ساتھ نا انصافی کی بلکہ خود اپنے اوپر ظلم کیا۔"
> (نگار پاکستان، نومبر ۱۹۶۶ء ص ۸)

نادم صاحب نے اس جگہ، نیاز صاحب کی ہجرت کی تفصیل سے دانستہ گریز کیا ہے۔ غالباً صرف اس لئے کہ انھیں نیاز صاحب کی گزارش کا پاس تھا۔ یا پھر یہ کہ اصل حقیقت سے وہ بھی بے خبر تھے، بات یہ ہے کہ نیاز صاحب امر واقعہ سے واقف ہر دوست اور عزیز سے گزارش کر چکے تھے کہ ان کی نجی زندگی کا جو مسئلہ ہندوستان چھوڑنے پر مجبور کر رہا ہے اُسے پبلک میں زیر بحث نہ لایا جائے کہ ایسا کرنا ان کے لئے اور ان کی مرحوم بیٹی کی روح کے لئے تکلیف دہ ہوگا۔ جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے، میں بھی اب تک اس مسئلے پر اسی خیال سے خاموش رہا لیکن یہ محسوس کر کے کہ میری خاموشی مجرمانہ بنتی جا رہی ہے اور نیاز کی ہجرت کے بارے میں اُن کے محققین و ناقدین من گھڑت سے کام لے کر، حقائق کو کچھ سے کچھ کئے دے رہے ہیں، ضروری معلوم ہوا کہ اصل واقعات کو منظر عام پر لایا جائے۔

ہندوستان سے نیاز صاحب کی ہجرت کا سبب دراصل خود نیاز صاحب کے داماد مجدّد نیازی اور مجدّد کی دوسری بیگم ہوئیں۔ مجدّد نیازی کون ہیں؟ اس کی بہت مختصر سی وضاحت اس جگہ ضروری ہے۔ ڈیرہ اسمٰعیل خاں (صوبہ سرحد) میں نیاز صاحب کے ایک دوست تھے جناب اخوند فیض محمد فاروقی صاحب۔ بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ شعر و ادب کا سچا ذوق رکھتے تھے۔ نگار و نیاز دونوں سے انھیں ربطِ خاص تھا۔ نگار کی اشاعت کے لئے بھی انھوں نے پنجاب اور سرحد کے علاقوں میں بہت کچھ کیا تھا۔ نتیجتہً نیاز صاحب سے برادرانہ تعلقات ہو گئے اور گھر جیسا آنا جانا ہو گیا۔ نیاز صاحب نے انھیں ایک اعزاز بھی دیا کہ ادارہ کے تحت ان کا نام بھی نگار میں چھپنے لگا۔[1] بالکل اس طرح جیسے جلیل اعظمی، مخمور، مجدّد نیازی اور شوکت کے نام کچھ عرصے نگار کی ادارت میں شامل رہے۔ مجدّد نیازی صاحب انہی اخوند فیض محمد فاروقی کے بڑے صاحبزادے ہیں۔

۱۹۳۱ء میں جس وقت فاروقی صاحب کی پہلی بیوی (والدۂ مجدّد) کا انتقال ہوا تو مجدّد کی عمر دس گیارہ سال کی رہی ہوگی، فاروقی صاحب سے نیاز صاحب کی خط و کتابت تو تھی ہی چنانچہ نیاز صاحب نے جن کے نزدیک تمدنی زندگی کے لئے نفسیاتی و عائلی اور معاشرتی ہر اعتبار سے گھر میں عورت کا ہونا بہت ضروری تھا۔ فاروقی صاحب کو دوسری شادی کر لینے کا مشورہ دیا۔ مشورہ خلوص اور وقت کے تقاضے پر مبنی تھا لیکن فاروقی صاحب صرف اس خیال سے کہ بچوں کے ساتھ ان کی سوتیلی ماں نہ جانے کس قسم کا سلوک کرے، شادی کرنے پر تیار نہ تھے۔ لیکن جب نیاز صاحب نے یہ پیشکش کر دی کر دی کہ "مجدّد کو لکھنؤ میرے پاس بھیج دیا جائے میں اسے اپنے بچوں کی طرح رکھوں گا" تو فاروقی صاحب رضامند ہو گئے۔ نیاز صاحب نے واقعی مجدّد کو اپنی اولاد کی طرح پالا۔ پروان چڑھایا اور اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ لکھنؤ کے ماحول میں مجدّد کی زندگی بہت کچھ بدل گئی۔ اب وہ لکھنؤ کے ہو رہے۔ نیاز صاحب نے فاروقی صاحب کے مشورے سے ۱۹۴۱ء میں اپنی اکلوتی بیٹی شوکت سے مجدّد کی شادی کر دی۔ کچھ دنوں بعد اپنی ساری منقولہ و غیر منقولہ جائیداد بھی بیٹی کے نام کر دی۔ مجدّد کے دو بیٹے جاوید و جوّاد اور ایک بیٹی ہوئی۔ ابھی بچے چھوٹے ہی تھے کہ ۱۹۵۳ء میں اچانک شوکت کا انتقال ہو گیا۔ یہ سانحہ نیاز کے لئے کتنا جاں کاہ تھا اس کا کچھ اندازہ اس اداریے سے ہو سکتا ہے جو انھوں نے ۱۹۵۳ء کے نگار میں لکھا تھا۔ پھر بھی نیاز صاحب اس صدمے کو جھیل گئے۔

مجدّد نیازی، آل انڈیا ریڈیو میں ملازم تھے۔ ان کی لااُبالی طبیعت، خوئے ناو نوش اور بے اعتدال زندگی سے ان کے جاننے والے بخوبی واقف ہیں۔ شوکت کی وفات کے بعد مجدّد کے بچوں کی نگہداشت و پرورش کا مسئلہ بھی نیاز صاحب کے سر آن پڑا اور سخت الجھن کا باعث بنا۔ اس درمیان خود نیاز صاحب کو اللہ نے آخری عمر میں اولاد نرینہ دے دی تھی۔ وہ اپنے دو کمسن بیٹوں سرفراز نیازی اور ریاض نیازی[2] کے مستقبل

---

[1] دیکھئے نگار جنوری تا دسمبر ۱۹۴۵ء۔

[2] سرفراز نیازی ۱۰، جولائی ۱۹۳۹ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم لکھنؤ میں پائی ۱۹۶۹ء میں کراچی یونیورسٹی سے فارسی میں گریجویشن کر کے فروری ۱۹۷۰ء

کے بارے میں بھی متفکر رہا کرتے تھے۔ ان الجھنوں میں ایک بار پھر انھیں تمدنی زندگی میں عورت کی ضرورت کا احساس ہوا اور گھر میں گھر کی حقیقی فضا پیدا کرنے کے خیال سے جو مشورہ انھوں نے مجدّد کے والد فاروقی صاحب کو دیا تھا وہی مجدّد کو دیا۔ چنانچہ ۱۹۶۰ء میں نیاز نے لکھنؤ ہی میں انڈین سول سروس کے ایک افسر کی بیٹی سے مجدّد کی شادی کر دی۔ شادی نیاز صاحب کی ترغیب پر خوشگوار ماحول میں ہوئی تھی۔ کچھ دنوں کے لئے گھر واقعی گھر بن گیا۔ بچّوں کے لئے عورت کی کمی پوری ہوگئی لیکن یہ فضا بہت دنوں برقرار نہ رہ سکی، جلد ناخوشگواری میں بدل گئی، خانگی مسائل میں اختلافِ رائے شروع ہوا۔ بیگم مجدّد نیازی کی عمر و شوق کے تقاضے اور مطالبے کچھ اور تھے۔ ان کی مداخلت گھر کے غیر ضروری معاملات میں بھی ہونے لگی اور رفتہ رفتہ حد سے بڑھ گئی۔ نیاز صاحب کے لئے ان کا رویّہ سخت تکلیف دہ تھا پھر بھی وہ پورے صبر وضبط کے ساتھ مسائل کو سلجھانے کی کوشش کرتے رہے۔

لیکن جب خود مجدّد نیازی اپنی بیگم کی طرح نیاز صاحب کے منہ آنے لگے تو بھی نیاز صاحب کے ہاتھوں سے صبر وضبط کا دامن نہ چھوٹا لیکن ان کا دل اندر سے یکسر بیٹھ گیا۔ طبیعت روز بروز گرتی گئی جیسا کہ پچھلی سطور میں خود نیاز صاحب کا بیان گذر چکا ہے "اشتہا مفقود ہوگئی اور غذا ترک"۔ اس دماغ سوز فضا میں جب ایک دن مجدّد اور بیگم مجدّد کے یہ الفاظ ان کے کانوں میں پڑے کہ "آپ کا اس گھر میں کیا ہے، آپ جہاں چاہیں چلے جائیں، یہ گھر آپ کا نہیں ہمارا ہے۔" تو نیاز صاحب پر بجلی گر پڑی، سکتے میں آگئے۔ اُن کے لئے زمین تنگ اور آسمان سخت ہوگیا۔ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن اسی کو کہتے ہیں، دل کا دورہ پڑا، کئی مہینے صاحبِ فراش رہے، جیسا کہ بعض حضرات نے اشارۃً لکھا ہے کہ اگر نیاز صاحب چاہتے تو اس دُکھ کا مداوا کر سکتے تھے۔ قانونی چارہ جوئی کے دروازے کھلے ہوئے تھے، صرف عدالت سے رجوع کرنے کی دیر تھی۔ لیکن نیاز صاحب یہ کیسے کرتے، مجدّد ان کے داماد تھے، ان کی چہیتی بیٹی شوکت کے شوہر تھے، ان کے عزیز دوست کے بیٹے تھے، جاوید اور جوّاد کے ابّو تھے۔ اگر نیاز صاحب کوئی قدم اٹھاتے تو مرنے کے بعد شوکت کو کیا مُنہ دکھلاتے۔ اور اپنی نواسی نواسوں سے نظریں کس طرح ملاتے، اپنی افتادِ طبع اور دل کے ہاتھوں مجبور رہے۔ دوستوں کے اصرار کے باوجود عدالت کا رخ نہ کیا اور یا بدست دگرے دست بدستِ دگرے، کے مصداق اپنے سوتیلے بیٹوں کے پاس کراچی چلے گئے۔

مالک رام صاحب نے بہت صحیح لکھا ہے کہ " ان کا ہرگز ارادہ نہیں تھا کہ ہندوستان چھوڑ کر پاکستان چلے جائیں، حالانکہ اس کے بہت مواقع پیدا ہوئے لیکن روز بروز ان کی صحت خراب ہوتی گئی۔ کچھ شدید خانگی پریشانیاں لاحق ہوگئیں۔ اب انھیں رہ رہ کر اس بات کا خیال آنے لگا کہ موت تو اٹل ہے اور ایک نہ ایک دن آکر رہے گی۔ میری بیوی اور ان خورد سال بچّوں کا کیا حشر ہوگا۔ اس تشویش نے ان کی صحت پر ناخوشگوار اثر کیا۔ آخر کار انھوں نے فیصلہ کیا کہ ہر پہلو سے یہی بہتر ہے کہ میں پاکستان چلا جاؤں۔"[1]

چنانچہ پاکستان چلے آئے، یہ تھا سانحہ جو سبب ہوا نیاز صاحب کے ہندوستان چھوڑنے کا اور پاکستان آنے کا۔ اس کا کوئی تعلق نہ تو ہندوستان سے غدّاری کا تھا نہ پاکستان کی طرف سے کسی عہدے یا انعام و اعزاز کا، یہ مسئلہ نیاز صاحب کی زندگی کا یکسر نجی اور ذاتی تھا اور شاید وہ اسی لئے اس کو کسی اور تک پہنچانے کے قائل نہ تھے۔

نیاز صاحب کو جس بے بسی کے عالم میں پاکستان کے لئے ہجرت کرنی پڑی وہ ایسا نہ تھا کہ ہشّاش بشّاش آتے۔ نیم جان و پژمردہ آئے تھے۔ چند خاص الخاص کے سوا کسی کو انھوں نے اپنی آمد کی اطلاع نہیں دی، خاموشی سے آکر، ناظم آباد کے ایک فلیٹ میں پڑ گئے، نہ اخبار میں کوئی خبر چھپی نہ کہیں کوئی جلسہ یا استقبالیہ ترتیب دیا گیا۔ مجھے یہ خبر تھی کہ وہ مستقلاً آ رہے ہیں۔ لیکن کب، کس گاڑی سے کس وقت اس کا علم مجھے بھی نہیں تھا،

میں امریکہ چلے گئے۔ ۱۹۷۳ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور وہیں شکاگو کی ایک یونیورسٹی میں پروفیسر ہوگئے۔ اپنے مضمون میں غیر معمولی مہارت رکھتے ہیں۔ بین الاقوامی معیار کے انگریزی رسائل میں ان کے تحقیقی مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ترکِ غذا کے بغیر، موٹاپے کا علاج بھی انھوں نے دریافت کیا ہے۔ اور جدید طب کے موضوع پر ایک بلند پایہ کتاب بھی لکھی ہے۔ یہ کتاب چھپ چکی ہے اور بہترین ٹیکسٹ بک شمار کی جاتی ہے۔

ریاض نیازی ۱۴ فروری ۱۹۵۱ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۷۱ء میں این ای ڈی یونیورسٹی کراچی سے بی۔ای کیا ہے۔ ایک نیم سرکاری ادارے کے ذمہ دار عہدے پر فائز تھے۔ ان دنوں امریکہ میں ہیں۔

[1] "دو صورتیں الٰہی" ص ۲۳۲، مطبوعہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی ۱۹۷۶ء طبع دوم۔

کراچی پہنچتے ہی البتہ انھوں نے یہ دو سطریں مجھے لکھ بھیجیں۔

"گرامی عزیز!

اوّلین فرصت میں مجھ سے آکر مل لیجئے، لیکن کسی سے اس کا ذکر نہ کیجئے کہ میں آیا ہوں۔" [1]

میں نے خط پاتے ہی حاضری دی اور سارے احوال سے مطلع ہوا۔ مجیب انصاری مرحوم، ادبیات کا اور خصوصاً فارسی ادب کا بہت اچھا ذوق رکھتے تھے۔ نیاز صاحب کے عاشقوں میں سے تھے اور دلی ہمدردی رکھتے تھے۔ وزارت مالیات میں افسر اور کراچی میں ایک مدت سے مقیم ہونے کے سبب ممتاز حسن مرحوم[2] سے گہرے مراسم تھے۔ مجیب صاحب نے نیاز صاحب کو ممتاز حسن صاحب کے علاوہ دوسرے اہلِ علم اور صاحبِ اثر و رسوخ حضرات سے ملوایا۔ چند مہینوں میں نیاز صاحب کی زندگی معمول پر آگئی۔ نگار جیسا تیسا، ان کے آنے سے پہلے ہی کراچی سے نکلنے لگا تھا۔ لیکن اس کی آمدنی، ان کی اقتصادی مشکلات کا حل نہ بن سکتی تھی۔ نیشنل میوزیم کراچی کے عربی و فارسی مخطوطات کی وضاحتی فہرست مرتب کرنے پر مامور ہوگئے تو یہ مسئلہ بھی حل ہوگیا۔ یہاں سے انھیں ایک ہزار روپئے مہینہ ملتا تھا، ترقی اُردو بورڈ کے مسودۂ لغت پر نظرِ ثانی کے سلسلے میں بھی انھیں کچھ رقم مل جاتی تھی۔ "جنگ" میں کالم لکھنے لگے تو آمدنی میں اور اضافہ ہوگیا۔ غرضکہ کئی مہینوں کی جدوجہد کے بعد وہ اقتصادی طور پر سنبھلنے اور علمی و ادبی مشاغل کو اطمینان و سکون کے ساتھ اپنانے کے لائق ہوئے۔[3]

---

[1] خط بنام راقم الحروف مرقومہ یکم اگست ۱۹۶۲ء۔

[2] حکومت پاکستان میں مالیات کے سکریٹری اور نیشنل بنک آف پاکستان کے منیجنگ ڈائرکٹر رہے۔ بڑی خوبیوں کے آدمی تھے۔ صاحبانِ علم و ادب کے جیسے قدردان تھے کم دیکھنے میں آتے ہیں۔

[3] یہ مضمون ۱۹۷۹ء میں لکھا گیا اور ۲۷ مئی ۱۹۷۹ء کی شام کو آرٹس کونسل کراچی میں، نیاز فتحپوری کی تیرہویں برسی کے موقع پر، ایک بڑے جلسے میں پڑھا گیا۔ پروفیسر کرار حسین نے بحیثیت صدر اور ڈاکٹر خلیق انجم معتمد انجمن ترقی اُردو ہند نے بطور مہمان خصوصی جلسے میں شرکت کی۔ اُس وقت مجدد نیازی حیات تھے۔ افسوس کہ وہ بھی پچھلے سال اللہ کو پیارے ہوگئے۔

عائشہ خان

—— دنیا کا کون سا شاعر ایسا ہے جس نے عورت کا ذکر نہ کیا ہو۔ کون سا افسانہ ایسا ہے جو عورت کے بیان سے خالی ہو۔ دنیا نے اس سے محبت کی لیکن نیاز نے عورت کو چاہا نہیں بلکہ اس کی پرستش کی۔ اوروں نے اِس سے عشق کیا صرف عورت سمجھ کر، نیاز نے اس کی پوجا کی اسے دیوی سمجھ کر اور اس باب میں انہوں نے اس قدر غلو سے کام لیا کہ لوگوں کو نفسیاتی نقطۂ نظر سے یہ سمجھنے کا موقع مل گیا کہ یہ سب کچھ جنسی ناآسودگی کا کرشمہ ہے۔

خانم ممتاز مرزا

—— سُنتے ہیں مولانا آزاد کا حافظہ اس غضب کا تھا کہ بلا تکلف حوالے پر حوالے مع کتاب کے نام اور صفحہ کے دیتے چلے جاتے تھے۔ لیکن مولانا نیاز کے حافظے کے معجزے بے شک اس ملاقات میں دیکھے۔ یاد نہیں کس نے مولانا سے کوئی سوال پوچھا۔ اس کے جواب میں بلا مبالغہ دسیوں شعرا اور کتابوں کے حوالے دیتے چلے گئے۔

نیاز فتح پوری

فن اور شخصیت

شمس کنول

ذہین اور باصلاحیت انسان گلاب کے پودے کی طرح ہوتا ہے۔ توجہ دیجئے اور اس کی دیکھ بھال کیجئے تو اس کے کانٹوں کی چبھن میں کمی آجائے گی اور رنگ نکھر جائے گا اور اگر نظر انداز کیجئے گا اور ناقدری بھی تو وہ پودا تو گلاب ہی کا رہے گا لیکن اس کے کانٹے نمایاں ہوجائیں گے۔ اور پھر وہ جنگلی پودا بن کر رنگ و بُو سے محروم ہوجائے گا۔ دراصل کسی کی قدرتی صلاحیت برقرار رکھنے کے لئے تحفظ اور سرپرستی کی ضرورت ہوتی ہے مگر ہمارے بزرگوں میں یہ خامی کل بھی تھی اور آج بھی ہے کہ وہ اکثر اچھے اور سچے دانش وروں کے ساتھ سرد مہری سے پیش آتے ہیں نتیجے میں مغل گارڈن کے اکثر گلاب بیکانیر کے ریگ زار کے کیکر بننے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ دراصل ناقدری کی تکلیف کیا ہوتی ہے اور کیسے کیسے دوزخوں سے گزرنا پڑتا ہے یہ کوئی صاحبِ علم اور صاحبِ قلم ہی جان سکتا ہے!

تھے تو وہ گلاب مگر اکثر دیکھنے والوں کو وہ کیکٹس ہی نظر آئے،

یہاں ذکر علامہ نیاز فتح پوری کا ہے ـــــ

میں اپنے عزیز دوست (مرحوم اقبال سہیل کے بھتیجے) افتخار اعظمی کے ہم راہ 'نگار' کے دفتر میں نیاز صاحب سے پہلی بار ملا تھا۔ یہ 1951ء کی بات ہے۔ اُن دنوں میں لکھنؤ یونی ورسٹی میں بی اے کا طالب علم تھا۔ پان ان کے منہ میں تھا، کہنے کو وہ سرخ رو تھے مگر ان کے ملنے میں روکھا پن تھا۔ بعد کی کئی ملاقاتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ زیادہ تر محتاط ہی ہوکر ملتے ہیں اور بہت کم کھلتے ہیں اور اپنے چھوٹوں سے تو بالکل نہیں!

پہلی ملاقات میں مجھ سے دریافت کیا کہ 'بی اے میں آپ کے مضامین کیا ہیں؟'، میں نے اپنے اردو، پولی ٹی کل سائنس اور ایشین کل چر جیسے مضامین کا ذکر کیا۔ اپنے بائیں طرف رکھے ہوئے ریک سے دو کتابیں اٹھائیں، ایک افتخار اعظمی کو دی اور ایک مجھے۔ فرمایا کہ 'نگار' کے لئے اس کتاب پر تبصرہ دیجئے۔ افتخار اعظمی کو دی ہوئی کتاب یاد نہیں کونسی تھی۔ میری کتاب ظ۔ انصاری کی 'ورق ورق' تھی!

نیاز کی تعلیم گھر پر ہوئی۔ اپنے والد کی نگرانی میں انھوں نے قرآن پاک پڑھا، فارسی اور عربی کی تعلیم حاصل کی اور پھر بٹالی اور چٹالی کے مکتب سے ہوکر درسِ نظامی سے بھی گزرے۔ ابتداہی میں نیاز فارسی شعراء میں بیدل سے متاثر ہوئے۔ بیدل کی انا سے ان کی اپنی انا کو بڑھاوا ملا اور نتیجے میں نیاز کی انا دوآتشہ ہوگئی۔ نیاز نے انگریزی زبان قطعی طور پر خود ہی پڑھی اور خاصی استعداد پیدا کرلی اور ترکی بھی انھوں نے خود ہی سیکھی۔ یہ دونوں زبانیں نیاز اس حد تک جان گئے تھے کہ انگریزی فلمیں دیکھتے تھے اور لطف اندوز ہوتے تھے اور انگریزی اور ترکی سے اردو میں رواں اور بامحاورہ ترجمہ کرتے تھے!

نیازؔ اگرچہ علمی وادبی ذوق کے حامل تھے، عالِم تھے اور فنونِ لطیفہ سے بھی شغف رکھتے تھے مگر کئی باتوں نے ان کے علمی وادبی زندگی کے خمیر کو ابتدا ہی میں بگاڑ دیا تھا۔

نیازؔ کے والد کی مسلمانیت میں کٹرپن زیادہ تھا، ان میں رواداری بھی کم تھی۔ اگرچہ وہ فارسی داں تھے اور فارسی شعر و شاعری کا بھی وہ اچھا مذاق رکھتے تھے مگر اس ذوق پر ان کی پتنگ بازی کا شوق غالب آیا ہوا تھا دوسرے یہ کہ مکتب کے ملاّؤں نے نیازؔ کی ذہانت کو نہ پہچانا اور نہ قدر کی۔ چناں چہ نیازؔ کی انا ملاّؤں کے روایتی تکبّر سے ٹکرانے لگی اور نتیجے میں نیازؔ زندگی بھر ملاّؤں سے الرجک رہے۔ نیازؔ کا فطری میلان علم وادب کی طرف تھا مگر حالات کے تحت یا پٹھان ہونے کی بنا پر وہ پولس کی ملازمت کرنے پر مجبور ہوئے یعنی کچھ عرصے ہرن نے اپنی پیٹھ پر گھاس بھی لدوائی اور آخری بات یہ کہ نیازؔ کی ابتدائی زندگی باونی (بندیل کھنڈ)، رام پور، بھوپال اور حیدر آباد (دکن) جیسی ریاستوں میں گزری۔ جب کہ ریاستی ماحول کو گھٹن اور جکڑ بندی کا ماحول مانا گیا ہے جہاں ضمیر کی آزادی کا کوئی سوال ہی کبھی پیدا نہیں ہوا۔ ریاست کی پابندیوں نے ہر آزاد خیال انسان کو بغاوت پر آمادہ کیا ہے۔

نیازؔ کے مخصوص حالات سے قطع نظر عام طور پر ہمارے مذہبی بزرگوں نے اپنی تنگ نظری، تنگ دلی، کوتاہ اندیشی، نادانی اور ناقدری سے کتنے ہی عالموں، دانش وروں، فن کاروں، ریفارمروں اور عارفوں کو منفی راہ پر چلنے پر مجبور کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جب انسان کو اپنے سلسلے میں دوسروں کی سرد مہری اور ناقدری کا احساس زیادہ بڑھ جاتا ہے تو پھر وہ دنیا والوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کرنے کے لئے مختلف طریقے اختیار کرتا ہے چنانچہ نیازؔ جو تھے سو تھے مگر حقیقت یہ ہے کہ مذہبی علماء کے قول وعمل کے ردعمل کا نام نیازؔ فتح پوری تھا!

ایک کامیاب مترجم

آج سے کم وبیش پون صدی قبل اردو قارئین صرف اردو جانتے تھے یا زیادہ سے زیادہ فارسی زبان۔ چنانچہ جو اردو قلم کار ان دنوں اتنے انگریزی سیکھ لیتا تھا کہ انگریزی سے اردو میں صحیح ترجمہ کر سکے تو وہ انگریزی زبان کے افسانے اردو کے قالب میں ڈھال کر اردو قارئین پر اپنے علم و ادب کی دھاک بٹھا دیتا تھا جیسے شوکت تھانوی کی 'سودیشی ریل'، ڈاکٹر ذاکر حسین کی 'ابو خاں کی بکری'، قاضی عبدالغفار کے 'لیلیٰ کے خطوط' اور 'مجنوں کی ڈائری' اور احتشام حسین رضوی کے تقریباً تمام افسانے دوسری زبانوں سے انگریزی ہی کی راہ سے اردو میں لائے گئے۔ سجاد حیدر یلدرم نے تو اردو میں جو کچھ لکھا وہ براہ راست ترکی سے ترجمہ کیا ہوا تھا۔[1] نیازؔ چوں کہ اردو، فارسی، عربی، انگریزی، ترکی اور ہندی سے بھی واقف تھے اس لئے اس سلسلے میں وہ اپنے ہم عصروں میں ممتاز ثابت ہوئے۔ 'ترغیبات جنسی'، نیازؔ کی مشہور تصنیف ہے مگر دراصل وہ ہیولاک کی تصنیف کا چربہ ہے اور اس کو شہاب الدّین نوری کے اقوال سے جِلا دی گئی ہے۔ اسی طرح 'شہاب کی سرگزشت' آسکر وائلڈ کے 'پکچرز آف ڈورین گرے' کا ترجمہ ہے۔ نیازؔ کی 'کیوپڈ سائکی'، یونانی دیومالا سے ماخوذ ہے۔ 'انتقادیاتِ نیاز'، نیازؔ کی ایک اہم تصنیف مانی گئی ہے جب کہ اس کا حصّۂ اوّل ہڈسن کی تصنیف AN INTRODUCTION TO THE STUDY OF LITRA کا قطعی طور پر ترجمہ ہے۔ نیازؔ کی تصنیف 'صحابیات'، مولانا سعید انصاری کی تصنیف 'سیر صحابیات'، سے ماخوذ ہے۔ اس سلسلے میں سید سلیمان ندوی نے نیازؔ سے شکایت بھی کی تھی۔ اسی طرح نیازؔ کی لکھی ہوئی 'تاریخ الدولتین'، مصری اخبار 'الہلال' کے اس وقت کے مدیر کی تصنیف کردہ 'التمدّن الاسلامی' کا اردو روپ ہے۔ یہی نہیں بلکہ 'نگار'، کے اکثر نمبر جن کو نیازؔ نے قطعی طور پر اپنے نام سے پیش کیا ہے ان کا تیار شدہ مواد بھی کسی دوسری ہی جگہ سے حاصل کیا گیا ہے۔ 'نگار' کا جنوری 1938ء کا نمبر جو ہندوستان کی مسلم حکومتوں کی تاریخ سے تعلق رکھتا تھا ایلیٹ کی تاریخ کی مدد سے تیار کیا گیا تھا۔ ملاّ واحدی جیسے صوفی قلم کار نے بھی ایک بار لکھا تھا کہ نیازؔ جب دہلی میں تھے تو روزانہ ایک انگریزی فلم دیکھتے تھے اور روز ہی اس فلم کی بنیاد پر ایک افسانہ یا ایک مضمون ضرور تیار کر لیتے تھے! چناں چہ اب یہ بات زیادہ قرین قیاس ہے کہ دوسرے موضوعات پر بھی نیازؔ کے لکھے ہوئے مضامین طبع زاد نہیں ہیں اور اگر طبع زاد ہیں تو اس طرح کہ ان کا خام مواد

---

[1] آج کے اکثر نوجوان افسانہ نگار بھی انگریزی سے اردو ترجمہ کرنے یا انگریزی سے پلاٹ لے کر اپنے اندازِ تحریر میں لانے اور اردو زبان میں طبع زاد کہہ کر پیش کرنے میں اپنے بزرگ افسانہ نگاروں سے پیچھے نہیں ہیں ——— ش ک

انھوں نے باہر ہی سے حاصل کیا ہے۔ ٹیگور کی 'گیتا نجلی' کا ترجمہ نیاز کے ابتدائی ترجموں میں سے ہے اور نیاز نے اسے ترجمہ ہی کہہ کر پیش کیا ہے اور نیاز کا یہ ترجمہ پسند بھی کیا گیا ہے!

'نگار' نے تقریباً دو درجن نمبر شائع کئے ہیں۔ ان تمام نمبروں کا مواد خواہ کہیں سے بھی حاصل کیا گیا ہو مگر اس سچائی کا اعتراف ضروری ہے کہ ان نمبروں سے تحقیقی کام کرنے والوں نے خوب خوب استفادہ کیا ہے۔ کم سے کم اردو لکھنے پڑھنے والوں کے لئے 'نگار' کا ہر نمبر گائیڈ ثابت ہوا ہے۔ 'نگار' کے 'علوم اسلامی و علماء اسلام نمبر'، 'اسلامی ہند نمبر'، 'داغ نمبر'، 'حسرت نمبر'، 'فرماں روائے اسلام نمبر'، 'ماخذ القران نمبر'، 'تنقیح اسلام نمبر'، 'مومن نمبر' وغیرہ حوالے کے طور پر بڑے کار آمد ثابت ہوتے ہیں۔ اسی سلسلے کی دوسری قابل ذکر بات یہ ہے کہ اردو زبان کی تاریخ میں علم و ادب کے شائق حضرات نے جن چند اردو رسائل کے فائل اپنی ذاتی لائبریری میں محفوظ کئے ہیں ان میں اپنے تحقیقی اور معلوماتی مواد کی بنا پر 'نگار' کا نام سرفہرست ہے!

ناکام انشاپردازی

اردو زبان کا ابتدائی دور مثنوی اور داستان نویسی سے تعلق رکھتا ہے۔ دوسرے دور میں افسانہ نویسی اور مضمون نگاری کی ابتدا ہوئی اور ساتھ ہی ساتھ انشاپردازی بھی ایک فیشن بن گئی۔ محمد حسین آزاد، مہدی افادی، سجاد علی اور مولانا ابوالکلام آزاد کو اردو زبان کے مثالی انشاپرداز کہا جا سکتا ہے۔ نیاز نے بھی انشاپردازی کو اپنایا لیکن ان کا پٹھانی مزاج انشاپردازی جیسی لطیف صنف کے لئے موزوں ثابت نہیں ہوا۔ ثبوت کے طور پر پہلے سجاد علی کی تصنیف کردہ عبارت ملاحظہ ہو:-

"لذت پرست انسان، جس کو فطرت نے حسنِ خیال اور حسنِ عمل سے محروم کر دیا ہے، جس میں نہ ذوقِ گناہ ہے اور نہ جرأتِ ارتکاب لیکن اس کے ساتھ ہی غیر دلچسپ گناہوں سے مانوس رہنا چاہتا ہے وہ مجبوراً تصوف کی طرف مائل ہو جاتا ہے!"

مولانا ابوالکلام آزاد کا انداز یہ تھا کہ:-

"عشق کی شورش انگیزیاں ہر جگہ یکساں ہیں، ہر عاشق کو قیس نہو، مجنوں ضرور ہوتا ہے۔ جب عشق آتا ہے تو عقل و حواس سے کہتا ہے میرے لئے جگہ خالی کر دے!"

اور اب فرق ملاحظہ فرمایئے۔ نیاز کی انشاپردازی کا نمونہ یہ ہے:-

"اب وہ سونا چاہتی تھی یعنی اس کی شرابی آنکھیں جو یوں بھی ہمیشہ نیم خواب ہی رہتی ہیں اب بالکل سونا چاہتی تھیں۔ ساری فضا سو رہی تھی، آسمان و زمیں سو رہے تھے، وہ شاہراہ زریں جس پر چاند کی شعائیں چڑھ اتر رہی تھیں سو رہی تھی!"

'سو رہی تھی'، 'سو جانا چاہتی تھی' اور 'ساری فضا سو رہی تھی' کی تکرار نے جہاں بات کو بدمزا بنا دیا ہے وہاں روانی سے بھی محروم کر دیا ہے۔ ان سطروں کا قاری خود کو کسی سیڑھی پر اترتا اور چڑھتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ ایک نمونہ اور ملاحظہ ہو:-

"راجپوتوں کی لڑکیاں ہیں، بلند و بالا، صحیح توانا، تیوریاں چڑھی ہوئیں، گردنیں تنی ہوئیں، آنکھوں میں تیر، مانگوں میں ہیرا، ابروؤں میں خنجر، بالوں میں عنبر، ہاتھوں میں مہندی، ماتھے پر بندی .... !"

اس مقفیٰ عبارت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ زبان نیاز جیسے علامہ کی نہیں ہے بلکہ کسی ناٹک کار کی ہے۔

نیاز کے لکھے ہوئے بہت سے خطوط پہلے 'نگار' میں چھپے اور پھر کتابی صورت میں (دو حصوں میں) شائع ہوئے۔ مولانا آزاد کے خطوط (غبارِ خاطر) بھی اگرچہ ارسال کئے جانے کے لئے نہیں لکھے گئے تھے مگر جس ہستی (مکتوب الیہ) کے نام وہ لکھے گئے تھے وہ دنیا میں موجود تھی۔ نیاز کے خطوط نہ بھیجے جانے کے لئے تھے اور نہ ان کا کوئی مکتوب الیہ ہی تھا۔ ہر دو بات فرضی تھی۔ دراصل ایک من چلے پڑھے لکھے مرد کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ کوئی اسے اچھا سا خط، لکھے اور اگر لکھنے والا صنفِ نازک ہو تو کیا ہی کہنے ۔ مگر جب یہ خواہش اس جیتی جاگتی دنیا میں پوری نہیں ہوتی تو وہ مجبور ہو کر نہ آئے ہوئے خط کا جواب لکھ ڈالتا ہے۔ یہی بات نیاز کے ساتھ ہوئی۔ البتہ نیاز کے ان خطوط کا یہ مفید پہلو ضرور رہے کہ نیاز نے علمی و ادبی سوالات پیدا کر کے ان خطوں کے ذریعے ان کے جو جوابات دیئے ہیں وہ خطوط کے قارئین کے لئے خاصی معلومات فراہم کرتے ہیں لیکن خط

لکھنے والے کے جذبے کی جرأت اور اس کی قلم بندکی ہوئی بات کی صداقت جو ہونا چاہیئے وہ نیازؔ کے ان خطوط میں نہیں ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے ایک بار لکھا تھا کہ" وہ لکھے ہی اس لئے گئے تھے کہ شائع کئے جائیں اس لئے ان میں خلوص کی گرمی نہیں ہے!"۔ نیازؔ کے ان خطوط کی بات میں بھی تصنع ہے اور زبان میں بھی!

بحیثیت نقاد

نیازؔ تنقید کرنا جانتے تھے۔ وہ ترقی پسند نقادوں کے برخلاف مغربی دانش وروں کے قائم کئے ہوئے تنقیدی اصولوں پر اپنی تنقید کی بنیاد نہیں رکھتے تھے اور وہ متوازن تنقید بھی کر سکتے تھے مگر سیّد ابوالخیر مودودی کے بقول کہ:۔

"وہ معاف کرنا جانتے تو ہیں مگر معاف کر دینا پسند نہیں کرتے۔ وہ طبعاً انتقام جو ہیں اور انتقام پسند بھی، نیازؔ کے مزاج کی یہ کیفیت خصوصیت کے ساتھ اُن کی تنقیدوں سے عیاں ہے!"

نیازؔ کی اکثر تنقیدیں ان کے ذاتی عناد اور ان کی احباب نوازی پر مبنی ہیں۔ مثال کے طور پر ان کی یہ تنقیدی رائے کہ "جوشؔ کی رباعیات انتہائی لچر اور لغو ہوتی ہیں اور فن کے اعتبار سے بے حد ناقص بھی اور سلام سندیلوی کی رباعیاں انتہائی بامعنی اور کلاسیکی معیار کی حامل ہوتی ہیں"، چونکا تو سکتی ہے مگر مانی نہیں جاسکتی۔ نیازؔ کی تنقیدیں کہنے کو تو تنقیدیں ہیں مگر دراصل ان کے بین السطور میں نیازؔ کی اپنی انا چھپی ہوئی ہے۔ وہ علم و ادب کی کسی بھی (افسانہ نگاری، شاعری، انشا پردازی، تنقید، خطوط نویسی وغیرہ) صنف میں اپنی ذات سے کسی دوسری ذات کو افضل نہیں سمجھتے تھے!

لیکن نیازؔ نے ہندستان کے ملاّ اور "ملاّ کے اس مذہب پر جس پر کہ وہ عمل کرتا ہے جو تنقیدیں کی ہیں وہ صحیح اور درست ہیں۔ مثال کے طور پر نیازؔ کا یہ کہنا ہے کہ:۔

"مولویوں کی وہ جماعت جو تصنیف و تالیف سے کوئی تعلق نہیں رکھتی اور صرف تقریر و مواعظ سے جاہل مسلمانوں کو تباہ و برباد کر رہی ہے یقیناً بڑی خطرناک چیز ہے لیکن میرے نزدیک اس سے زیادہ مہلک وہ جماعت ہے جو بدقسمتی سے تصنیف و تالیف کا بھی کچھ ذوق رکھتی ہے اور جو خدا معلوم کب سے غیر صالح ذخیرہ اپنی تحقیقات باطلہ کا فراہم کرتی چلی آرہی ہے۔ ہر چند اس کے اثرات عوام پر تو زیادہ نہیں ہیں لیکن متوسط طبقہ جو کچھ لکھنا پڑھنا جانتا ہے ان کی تصانیف سے بری طرح اثر پذیر ہوتا ہے۔ اور خود چوں کہ اس طبقے میں اہلیت تنقید و تفتیش کی نہیں ہوتی اس لئے وہ ان موٹی موٹی کتابوں سے جن میں ہر چار سطر کے بعد ایک سطر عربی کی ضرور ہوتی ہے اور جن کے فٹ نوٹ میں بیسیوں حوالے خدا معلوم کن کن قدیم و عجیب و غریب کتابوں کے درج ہوتے ہیں مرعوب ہو جاتا ہے۔ حالاں کہ مذہب کو کتابوں سے کیا واسطہ، اطمینانِ نفس کے لئے اس دفتر بے معنی کی کیا حاجت! مولوی آج سے نہیں بلکہ ہمیشہ سے نام ہے اس مخلوق کا کہ جس نے صرف پرانی لکیر کو پیٹا اور خود سمجھ کر مذہب کو کبھی اختیار نہیں کیا، وہ اگر مسلمان ہے تو صرف اس لئے کہ اس کا باپ مسلمان تھا اور اسلام کو وہ اگر سچّا مذہب جانتا ہے تو محض اس بنا پر کہ اس کے اسلاف ایسا کہہ گئے ہیں اس لئے جب کوئی دوسرا اس سے کچھ دریافت کرتا ہے تو وہ تاریخ کی ورق گردانیاں شروع کر دیتا ہے اور کہتا ہے کہ دیکھو فلاں فلاں اکابر و اعظم یہی کہتے چلے آئے ہیں اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ اس صورت میں ہم اپنی عقل سے کام لیں۔ .... اس نوع کے لٹریچر کی اشاعت مذہب کو عمل کے دائرے سے ہٹا کر صرف مقامی حدود کا پابند بنانا چاہتی ہے۔ یہ نکتہ ہمیشہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ درس عمل ہمیشہ عمل ہی کے ذریعے سے کامیاب ہوا کرتا ہے!"

اور اسی قبیل کی نیازؔ کی تنقیدیں نیاز کے لئے زیادہ رسوائی کا باعث ہوئی ہیں!

نفسِ مضمون سے ہٹ کر ایک مختصر سی بات سنئے۔

ہندستان میں جہالت زبر زبر ہے اور غریبی در در۔ خصوصی طور پر مسلمانوں کے گھروں میں یہ لعنتیں بیک وقت پائی جاتی ہیں۔ ان حالات میں مذہب بڑا سہارا ہے اسی لئے عام مسلمان گھروں میں ملاّؤں کا راج ہے۔ ملاؤں سے سر سیّد ہارے اور مولانا آزاد بھی ہارے۔ تو نیازؔ بھلا

کس کھیت کی مولی تھے!

نیاز کا مذہب (سرسید کی طرح) عقلیت پسندی تھا۔ نیاز بھی نہ معجزوں کو مانتے تھے اور نہ آخرت کے قائل تھے۔ وہ ذہنی سکون اور ذہنی اذیت ہی کو جزا اور سزا سمجھتے تھے۔ چوں کہ وہ درسِ نظامیہ سے گزر چکے تھے اس لئے حدیث اور قرآن فہمی کا بھی انھیں زعم تھا چناں چہ وہ کسی مذہبی مسئلے پر بحث کرتے ہوئے حدیث و قرآن ہی کی مدد سے دلیلیں پیش کرتے تھے اِدھر مذہب پر اجارہ داری چونکہ ملّاؤں کی رہی ہے اس لئے نتیجے میں نیاز کو نیک نامی نہیں بدنامی ہی حاصل ہوئی ہے۔

مگر اس امر پر افسوس بھی ہے اور حیرت بھی کہ جو نیاز ہمیشہ ملّاؤں کی ملامت کا نشانہ بنے رہے لیکن نہ جانے کیوں، مولانا عبدالماجد دریاآبادی نے جب یگانہ جیسے عالم و دانش ور (مگر مجذوب بھی) کو اپنی ملائیت کا نشانہ بنایا تو نیاز مولانا دریاآبادی کے ہم نوا بن گئے۔ میں نے مولوی گنج (لکھنؤ) کی ایک سڑک پر علم کی دنیا کی یاس یگانہ جیسی عظیم شخصیت کو جس حال میں دیکھا وہ ناقابلِ بیان ہے اور وہ سب کچھ دریاآبادی اور نیاز ہی کی تحریروں کا ردِعمل تھا۔ وہ منظر جب یاد آتا ہے تو نیاز اور دریاآبادی کی تنگ نظری اور تنگ دلی بھی یاد آتی ہے!

اس کے باوجود کہ نیاز اپنے بزرگوں اور اپنے ہم عصروں کی ناقدری کا شکار ہوئے لیکن برخلاف دوسرے عالموں کے نیاز کو مالی پریشانی کم ہی رہی۔ دراصل وہ عالم ہونے کے باوجود دولت پیدا کرنا جانتے تھے۔ نیاز ایک کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد تھوڑی بہت جائے داد بھی رکھتے تھے اور ایک دو آم کے باغ بھی ——— اپنے طور پر نیاز کے روزگار کی ابتدا محکمۂ پولس کی ملازمت سے ہوئی۔ جن دنوں نیاز ریاست بھوپال کے انسپکٹر جنرل آف پولس کے دفتر میں ہیڈ کلرک تھے ڈاکٹر عبدالرحمان بجنوری نے ایک دن نواب حمیداللہ خاں (جو اپنی ریاست بھوپال کے چیف سیکریٹری تھے) سے کہا کہ "یہ بہت ہی نازیبا بات ہے کہ نیاز جیسا اعلا علمی و ادبی صلاحیتوں کا آدمی آپ کی ریاست میں پولس کے دفتر میں ہیڈ کلرک ہے۔ نیاز کے لئے ادبی خدمات کا وظیفہ مقرر فرما دیجئے!" چناں چہ نواب صاحب نے ڈاکٹر بجنوری کے کہنے پر نیاز کا ڈیڑھ سو روپے ماہ وار وظیفہ مقرر فرما دیا۔ اس کے بعد نیاز خود کمانے کی راہ پر چل نکلے۔ ۱۹۱۹ء میں نواب سلطان جہاں بیگم آف بھوپال کی سال گرہ کے موقعے پر ان کے ذوق کو ملحوظ رکھتے ہوئے نیاز نے ایک کتاب تصنیف کی، نام "گہوارۂ تمدّن" رکھا اور انتساب بیگم عالیہ کے نام کیا:۔

> "مانا کہ لعل و گہر بغیر کسی وصفِ اضافی کے بھی دنیا میں ایک مستقل امتیاز رکھتے ہیں لیکن ان کا حقیقی شرف تو اسی طرفِ کلاہ سے وابستہ ہے جہاں جگ مگانے کے لئے وہ حقیقتاً وضع ہوئے ہیں۔ اس لئے اگر میں ان اوراق کو علیا حضرت بلقیس مرتبت، نوشیرواں صفت، گردوں رکاب، مالا جناب سلطان جہاں بیگم ...... او مہا اللہ یاالعزۃ والکمال فرماں روائے دارالاخیال بھوپال کے اسم گرامی سے منسوب کرنے کی عزت حاصل کرکے مسرور و مفتخر ہوں تو جائے حیرت نہیں، کیوں کہ اربابِ نظر لعل و گہر کو نہیں بلکہ عروجِ طالع لعل و گہر کو دیکھتے ہیں!"

نتیجہ خوش گوار رہا، نیاز انعام و اکرام سے نوازے گئے اور پھر تھوڑے ہی عرصے بعد دس ہزار روپے کی کثیر رقم بھی بیگم عالیہ کی جانب سے نیاز کو عطا ہوئی (ظاہر ہے ۱۹۲۰ء کے دس ہزار آج کے دس لاکھ ہوتے ہیں)۔ اسی رقم سے 'نگار' وجود میں آیا اور پریس بھی خریدا گیا [2]

بھوپال کی نوازش سے نیاز کا حوصلہ بڑھ چکا تھا۔ چناں چہ ہوش بلگرامی کی مدد سے وہ اپنی کمر میں پیٹی باندھ، سر پہ قبّہ رکھ، نظام کے دربار میں بھی، تا بہ رکوع جھک کر سات سلام کر آئے! کہتے ہیں کہ نیاز پر ایک دور قدرے تنگ دستی کا بھی آیا مگر مالک رام کی دی ہوئی رقم سے ان کی خوش حالی

---

[2] یہاں ایک بات یاد آئی۔ معترضہ طور پر سنئے: جن دنوں مولانا ابوالکلام آزاد کے اخبار الہلال سے انگریزی حکومت نے دس ہزار روپے ضمانت طلب کی اور نتیجے میں مولانا کو اپنا اخبار بند کرنا پڑا۔ اسی موقعے پر نظام حیدرآباد نے مولانا آزاد کی مالی اعانت کرنا چاہی مگر ظاہر ہے کہ نظام انگریز کے دوست تھے۔ "ایک لکڑہارے کو جنگل سے لکڑی کاٹ کر، شام میں، بازار میں اس لکڑی کے فروخت ہونے پر جو چند پیسے ملتے ہیں۔ میں بس ایسی ہی کمائی کو اپنے لئے جائز سمجھتا ہوں!" نظام کی پیش کش پر مولانا آزاد کا یہ جواب تھا ——— ش ک

لوٹ آئی۔ یہ تو میرے سامنے کی بات ہے کہ 50-1948ء میں نیاز نے لکھنؤ میں "لکھنؤ ٹاکیز" کے نام سے ایک لمیٹڈ فلم کمپنی قائم کی اور اودھ کے تعلق داروں کو پچیس تیس ہزار روپے کے شیئرز بھی فروخت کئے۔ اور بس۔ بات ختم کر دی لیکن نتیجے میں نیاز کا خستہ مکان پختہ ہو گیا۔ پاکستان جانے والوں میں مسلمانوں کی اکثریت اپنا سب کچھ یہیں چھوڑ گئی۔ اکثر مسلمانوں نے اپنے مکان بھی چھوڑے اور قبرستان بھی مگر نیاز نے اپنے مکان کے بھی اچھے پیسے بھنائے، پریس کے بھی اور اپنی بک ڈپو بھی نسیم بک ڈپو کے مالک نسیم انہونوی کے ہاتھوں اچھے داموں بیچ ڈالی اور صاحبِ حیثیت بن کر پاکستان پہنچے!

نیاز اور عورت

نیاز اگرچہ شاعر برائے نام تھے اور نثر نگار زیادہ مگر پھر بھی ان کے اعصاب پر عورت سوار تھی۔ وہ اکثر فرضی زنانہ ناموں سے غزلیں، افسانے، "باب الاستفسار" کے تحت) سوالات اور خطوط[1] خود ہی لکھتے تھے۔ محترمہ مریم زمانی، نیاز ہی کی پیدا کی ہوئی تھیں جن کا دراصل اس دنیا میں کوئی وجود نہیں تھا۔ نیاز جنسی طور پر کسی حد تک تشنہ تھے اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کھانا کھاتے وقت عورت کے جسم کے اعضاء کے نام لے لے کر چٹخارے لیتے تھے!

اس سلسلے میں 34-1933ء کا یہ واقعہ بیان کرنا بھی ضروری ہے کہ دہلی کے مشہور ادیب و افسانہ نگار فضل حق قریشی نے ازراہِ ادبی دل لگی طاہرہ دیوی شیرازی کے نام سے "ساقی"، "نگار"، اور دوسرے جیدار دو رسائل میں افسانے لکھنا شروع کئے اور غضب یہ کیا کہ ایک بار ایک افسانے کے ساتھ "ساقی" میں طاہرہ دیوی کی تصویر بھی شائع کرادی، ظاہر ہے جو فرضی تھی، نتیجے میں اچھے خاصے معقول، سنجیدہ، عالم فاضل کنوارے اور شادی شدہ مردوں کے خط آنے لگے۔ فضل حق افسانہ تو دہلی سے پوسٹ کرتے تھے مگر خط کے ذریعے رسالے کے ایڈیٹر کو ظاہر یہ کیا جاتا تھا کہ جیسے طاہرہ دیوی کلکتے میں رہتی ہیں، کلکتے ہی سے افسانہ بھیجتی ہیں۔ فضل حق نے کلکتے کے اپنے ایک دوست کے فوٹو اسٹوڈیو کا پتا حاصل کر لیا تھا۔ چناں چہ فضل حق ہی طاہرہ دیوی شیرازی بن کر طاہرہ دیوی کے پرستاروں کے خطوں کا جواب بھی دیتے تھے۔ بہ نفسِ نفیس ملاقات کے بغیر ہی طاہرہ دیوی کے چاہنے والوں کی خاصی تعداد ہو گئی۔ عاشقوں کے اس ہجوم میں روش صدیقی، احمد ندیم قاسمی، مرزا ادیب، رازق الخیری، حکیم محمد یوسف حسن، نسیم انہونوی، عبدالرزاق بسمل، حامد علی خاں، خان عیسیٰ غزنوی، اعجاز صدیقی، عندلیب شادانی، مصطفیٰ کمال شروانی، آغا محمد یعقوب دواشی اور نہ جانے کون کون طاہرہ دیوی کے نام پر اپنا زہد و تقویٰ توڑنے کے لئے تیار ہو گئے۔ لیکن طاہرہ دیوی کی یک طرفہ محبت میں سب سے زیادہ جو رلیشہ خطمی ہوئے وہ حیدر آباد والے پروفیسر نصیرالدین ہاشمی اور "نگار" والے علامہ نیاز فتح پوری تھے۔ نصیرالدین ہاشمی تو طاہرہ دیوی سے شادی کی خاطر اپنی اس بیوی کو طلاق دینے کے لئے تیار ہو گئے تھے جو ان کے دو بچوں کی ماں بھی تھی اور نیاز تو طاہرہ دیوی سے ملاقات کے لئے بذاتِ خود لکھنؤ سے کلکتے پہنچ گئے۔ نیاز نے متعدد فرضی خواتین کو جنم دیا تھا اور اس کے نتیجے میں بہت سے من چلے بے وقوف بھی بنے تھے مگر طاہرہ دیوی کے نام پر وہ خود شکار ہو گئے۔ لیکن سروپ رانی "نگار" نیاز کی جیتی جاگتی محبوبہ تھی۔ سروپ رانی فلم ایکٹریس تھی۔ نیاز نے اس کو "نگار" تخلص عطا کیا تھا اور خود ہی غزلیں کہہ کر اس کے نام سے "نگار" میں شائع کرتے تھے!

پھر ایک بار، معترضہ طور پر، ایک بات سنئے۔

اس عہد کے جاگیردارانہ نظام نے اپنے خواص کو یہ مزاج بخشا تھا کہ مرد اپنی خوب صورت اور وفا شعار بیوی سے، اپنی انا کی خاطر، بے نیاز رہے اور غیر عورت کا نیاز حاصل کرنے کے سر دھڑ کی بازی لگا دے۔ اس سلسلے میں جو مرد نامراد ثابت ہوتے تھے وہ فرضی معاشقوں سے اپنے عاشقانہ مزاج کو آسودگی بخشنے کی کوشش کرتے تھے۔ اختر شیرانی کی سلمیٰ اگر فرضی تھی تو نیاز کی مریم زمانی کا بھی کوئی وجود نہیں تھا۔ جوش ملیح آبادی نے اگر ایک اصلی عشق

---

[1] دراصل خط لکھنے کا مقصد اپنے دل و دماغ کو سکون پہنچانا بھی ہوتا ہے۔ یعنی مثبت انداز میں اپنے دل کی بھڑاس نکالنا۔ اس "بھڑاس" ہی کو مولانا آزاد نے "غبارِ خاطر" جیسا حسین نام دیا ہے۔ ش ک

کیا تو یادوں کے سہارے ایک درجن نقلی معاشقوں کی بارات نکال دی۔ حد یہ ہے کہ سر رضا علی خاں جیسے سنجیدہ اور تعلیم یافتہ قومی رہنما نے بھی ایک اپنے اور آٹھ اپنے دوستوں کے معاشقے بیان کرکے اپنے 'اعمال نامہ' کو ناکردہ گناہوں سے بوجھل بنایا ہے۔ ہر معاشقے کی کہانی جس ڈھنگ سے بیان کی گئی ہے وہ ڈھنگ ہی بتاتا ہے کہ وہ بس کہانی ہی ہے۔ دراصل اپنے ماحول میں انسان کی جو خواہش پوری نہیں ہو پاتی وہ اس کی تکمیل مونگیری لال بن کر اپنے سپنوں میں کر لیتا ہے اور اس طرح وہ تسکین حاصل کرتا ہے!

ہمہ صفت ایڈیٹر

اردو زبان کا یہ المیہ ہے کہ ہر دور میں اردو رسائل کا تمام مواد فکشن اور شعر و شاعری (افسانے، غزلیں، نظمیں) ہی سے متعلق رہا ہے۔ آج کے نناوے فی صدی اردو رسائل بھی افسانوں، غزلوں، نظموں اور ادبی تنقیدوں ہی پر مشتمل ہوتے ہیں۔ سرسید کا رسالہ 'تہذیب الاخلاق' غالباً ہندوستان کا پہلا اردو رسالہ تھا جو صحیح معنی میں ایک بدلا ہوا رسالہ تھا یعنی عام ڈگر سے ہٹ کر تھا اور جس نے یہ بتایا تھا کہ ع اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا' نیاز فتح پوری کا 'نگار' اس سلسلے کی دوسری کامیاب کوشش تھی۔ نیاز نے فکشن اور شعری ادب کے ساتھ ساتھ دل جمعی اور ذمے داری سے تنقید، تاریخ، جغرافیہ، معاشرت، سیاست، سائنس، نفسیات، جنسیات، اقتصادیات اور مذہبیات پر بھی 'نگار' کے توسط سے بھرپور مواد پیش کیا۔ اس اعتبار سے اردو کی وسیع و عریض دنیا میں 'نگار' ایک منفرد رسالہ تھا اور اگر یہ کہا جائے کہ 'نگار' جیسا رسالہ اردو زبان میں پھر کبھی نہیں نکلا تو غلط نہ ہوگا!

'نگار' کے چند شماروں کی فہرست مضامین ملاحظہ ہو:۔

عورت اہلِ فارس کی نظر میں	" "
نیرو : روم کا ایک بادشاہ	" "
۔ کاروبار کی موجودہ سرد بازاری کے اسباب	نومبر 1931
عورت کی آزادی کی انتہا غلامی ہے	" "
جرمنی کی رجعت پسندی ۔	" "
دس میل کی بلندی پر انسانی تصرف و تنفس	" "

(مندرجہ بالا کسی بھی شمارے کی فہرست مضامین میں افسانے، حصۂ نظم اور اداریہ شامل نہیں کیا گیا)

نیازؔ میں تحقیق، کھوج اور نئی معلومات حاصل کرنے کا بے پناہ مادہ تھا ۔ اور اسی طرح جنرل معلومات' نگار' کے قارئین کو فراہم کرنے کا بھی نیازؔ کو شوق تھا ۔ اگر' نگار' کے تمام شماروں سے جنرل معلومات لے کر یک جا کی جائے تو اردو انسائی کلو پیڈیا کی کم سے کم دس جلدیں تیار ہو سکتی ہیں مولانا آزادؔ نے ایک بار کہا تھا کہ' ایک ایڈیٹر کے لئے ضروری ہے کہ ہر موضوع سے متعلق وہ تھوڑی بہت معلومات ضرور رکھتا ہو' ۔ مولانا آزاد کی اس تعریف پر نیازؔ پورے اترتے تھے ۔ اس لحاظ سے نیازؔ کی ذات گہری، تہہ دار اور ہمہ صفت تھی ۔ انھیں رسالہ ایڈیٹ کرنے کا بڑا سلیقہ تھا ۔ وہ یہ خوب جانتے تھے کہ کس موضوع کے مضمون کے لئے خام مواد کہاں سے حاصل کیا جا سکتا ہے ۔

دہلی کے اردو جریدوں کا کل بھی یہی حال تھا اور آج بھی وہی حالت ہے کہ اخبار یا رسالے پر ایڈیٹر کی حیثیت سے نام مسٹر اے کا چھپتا ہے اور عملی ایڈیٹر مسٹر ایکس ہوتا ہے مگر نیازؔ اپنے رسالے کے ایڈیٹر بھی تھے اور رائٹر بھی ۔ یہی نہیں بلکہ اردو جرائد کی تاریخ میں نیازؔ وہ واحد ایڈیٹر ہوئے ہیں کہ جن کو اپنے رسالے' نگار' کے سرورق سے پریس لائن تک، ہر سطر پر کنٹرول رہا ہے ۔ زیادہ مواد ان کے اپنے قلم کا تیار کیا ہوا ہوتا تھا اور باقی مواد کو بھی ان کا قلم چھوتا ضرور تھا اسی لئے ابتدا سے اختتام تک رسالے کا مزاج یکساں رہتا تھا اور کہیں بھی ایڈیٹر کی گرفت ڈھیلی نہیں پڑتی تھی ۔ ایسی فضیلت آج تک نیاز کے سوا کسی دوسرے اردو ایڈیٹر کو حاصل نہیں ہوئی ! [1]

اردو رسالے کو سلیقے سے ایڈیٹ کرنے کی کراماتی صلاحیت نیازؔ کی وہ خوبی اور بڑائی ہے جو ان کے کردار کی جملہ برائیوں، خامیوں اور رسوائیوں پر بھاری ہے !

اپنی بات ختم کرنے سے پہلے یہ بات بھی ضرور عرض کروں گا کہ جس طرح عمل کی دنیا میں جھوٹ نہیں بلکہ سچ نقصان پہنچاتا ہے اسی طرح اظہار رائے کی آزادی کا استعمال انسان کی اپنی نیک نامی اور مقبولیت کو مجروح کرتا ہے ۔ اس لئے کہ دنیا میں مصلحت ناشناس انسانوں کی بہ نسبت مصلحت پسند اور مصلحت آلود لوگوں کی تعداد کہیں زیادہ ہے ۔ نیاز کی شہرت و مقبولیت ان کے کردار یا ان کے علم کی خامیوں سے متاثر نہیں ہوئی بلکہ ان کی خوبیوں نے ان کے نام کو بدنام کیا ۔

نیازؔ کو یہ جان کر یاد مت کیجئے کہ ان کو کھانے میں مونگ کی دال بہت پسند تھی، فرصت کے اوقات میں وہ معمے بھرتے تھے، ریس کورس جاتے تھے یا سنیما دیکھنا بھی انہیں پسند تھا بلکہ یہ جان کر نیازؔ کو کبھی مت بھلایئے کہ نیازؔ خود ایک ہمہ صفت انسان تھے اور ان کی ایڈیٹری ہمہ جہت تھی !

حواشی : ______

نقوش لاہور شخصیات نمبر

---

[1] شیخ عبدالقادر کا' مخزن'، شاہد احمد دہلوی کا' ساقی'، علامہ تاجورؔ کا' شاہکار'، دیانارائن نگم کا' زمانہ'، مولانا صلاح الدین کا' ادبی دنیا'، شبلی بی کام کا' خیام'، دیوان سنگھ مفتوںؔ کا' ریاست دہلی'، راشد الخیری کا' عصمت' وغیرہ جیسے جریدے بھی اپنے مدیران کے پورے کنٹرول میں تھے مگر نیازؔ کی طرح کوئی بھی مدیر اپنے رسالے یا اخبار کو اپنی گرفت میں نہیں لے سکا ۔ دراصل نیازؔ روح تھے اور' نگار' جسم ______ ش ک

" "	آپ بیتی نمبر
نگار کراچی	نیاز نمبر (دو حصّے)
محشرِ خیال	سجاد انصاری
حیاتِ سرمد	مولانا ابوالکلام آزاد
ماہ نامہ نگار لکھنؤ	جولائی 1931ء
"	اگست "
"	ستمبر "
"	اکتوبر "
اعمال نامہ	سر رضا علی خاں
ماہ نامہ گگن بمبئی	جنوری 1964ء
اردو ڈائجسٹ لاہور	سال نامہ 1967ء

" .... "

جوش ملیح آبادی ـــــ حضرت نیاز ان چند لیے گئے استثنائی افراد میں سے ہیں جن کے پیدا کرنے کے معاملے میں یہ دون پرور آسمان ازل سے لے کر ابد تک بخل کرتا چلا آرہا ہے۔

فراق گورکھپوری ـــــ فراقؔ ہوش میں ہے اب تو ایک مدت سے : اتر سکا نہ مگر تیری دوستی کا خمار
یہ میری نذرِ عقیدت سرِ قدوم نیازؔ : صبا کے دوش پہ پہونچے بصورت اشعار

مولانا ارشد تھانوی ـــــ نیاز صاحب کم آمیز ضرور ہیں لیکن مردم بیزار نہیں، دوستوں میں بے تکلف، خوش مزاج اور غیر دوست اصحاب کے لئے شائستہ اخلاق کے سنجیدہ انسان ہیں۔ کوئی ان سے مل کر آزردہ خاطر نہیں ہوتا لیکن اپنی شخصیت کا ان پر اثر بھی نہیں ڈال سکتا۔

مالک رام ـــــ نیاز صاحب کے مزاج میں، گفتار و کردار میں، بات کی بیچ ہے، استواری ہے۔ ان کی دنیوی سوجھ بوجھ بلا کی ہے۔ وہ کسی مسئلے کے حسن و قبح اور مالہٗ وماعلیہ پر پوری طرح غور و فکر کئے بغیر کوئی اقدام نہیں کرتے۔

محمد حسن

تنقید نیازی

حالی، شبلی، آزاد دھوم مچا چکے تھے مگر اردو تنقید کا ہنوز بچپن ہی تھا جب نیاز نے قلم اٹھایا "شخصیات اور واقعات جنھوں نے مجھے متاثر کیا" (مرتبہ جنید احمد) میں نیاز نے اپنے افسانوں کے بارے میں تو اعتراف کیا ہے کہ سجاد حیدر یلدرم کے زیر اثر وہ افسانہ نگار بنے مگر اپنے تنقیدی سرچشموں کا ذکر نہیں کیا ہے۔

نیاز نے عربی فارسی کی تعلیم پائی یعنی وہ دینی مدرسے کے تعلیم یافتہ تھے اور مولوی سے سخت نفرت اور عورت سے رغبت کے باوجود ان کا مزاج مدرسے کا تربیت یافتہ ہی رہا۔ عربی فارسی ادبیات میں تنقید کا خاطر خواہ عروج نہیں ہو سکا گو فصاحت اور بلاغت کے معیار وضع کرنے اور اندازِ بیان اور لفظ و معنی کے رشتے متعین کرنے میں عربی اور فارسی ہی کے عالموں نے پہل کی۔ ان کا زور صرف ہوا تو صرف و نحو پر، قافیے اور ردیف پر، بحر کے ارکان اور ان کی ترتیب پر مگر وہ بات جسے "ورائے شاعری چیزے دگر ہست" کہا گیا ہے ان کی گرفت سے باہر رہی۔

نیاز نے بھی عربی اور فارسی عمائد کی پیروی میں شعر فہمی کا جو معیار وضع کیا اس میں لفظ کی بنیادی اہمیت تھی اور الفاظ کے دروبست پر خاصہ زور دیا گیا تھا۔ بنیادی سوال یہ تھا کہ جو بات شعر میں کہی گئی ہے اس کے لئے مناسب الفاظ چنے گئے ہیں یا نہیں۔ (۲) ان الفاظ کی ترتیب موزوں اور مناسب ہے یا نہیں (۳) الفاظ کے ربط و ترتیب سے کوئی معنوی کھانچا تو واقع نہیں ہوتا اور ان سے وہی مفہوم پڑھنے والے تک پہنچتا ہے یا نہیں (۴) علامتیں اور تلازمے روایت کے مطابق ہیں یا نہیں؟۔

نیاز کی تنقید کے بنیادی معیار یہی رہے ہیں ان میں "کیفیت" کا ذکر نہیں آیا یہ حیرت ناک بھی نہیں کہ اکثر کیفیت تجزیے سے ماورا ہوتی ہے اور اس کی شناخت اور اس کے اجزا کو الگ الگ کرکے دیکھنا دکھانا ممکن بھی نہیں ہوتا لیکن پھر بھی نیاز کی تنقیدی ترجیحات میں 'کیفیت شناسی' کا شامل نہ ہونا اہم ہے خاص طور پر اس وقت جب ان کے معاصرین میں فراق گورکھپوری کی تنقید اپنی ساری توجہ اسی پر صرف کر رہی تھی۔

نیاز کی تین حیثیتیں تھیں ایک ایسے جمالیات پرست ادیب کی جو مغرب کے جمالیات پرست اور فن برائے فن کی روایات میں فروغ پذیر ادبی مزاج کو اردو میں عام کر رہا تھا اور حالی، شبلی، آزاد کی سماجی اصلاح اور فکری وابستگیوں والی تنقید کے برعکس ایک حسن پرست سرمست و سرشار کردار کے بے اختیارانہ وجود کی نیرنگیوں سے ادب کو مانوس کر رہا تھا (مثلاً شہاب کی سرگزشت اور شاعر کا انجام کے ہیرو) دوسری حیثیت تھی نقاد کی جو شاعری کو (افسانے ناول اور نثری اسلوب کو نہیں) کلاسیکی پیمانوں پر ناپ تول کر ان کے ابلاغ کی سطحیں اور سرحدیں مقرر کر رہا تھا اور اس ضمن میں تنقیدی مضامین لکھتا اور اپنے دور کے اہم شاعروں کے کلام پر تبصرے کرتا تھا (مثلاً مالہ وما علیہ کے مضامین میں یا ان کے تنقیدی مجموعے 'انتقادیات' میں) اور تیسری حیثیت تھی۔ نگار کے مدیر نیاز کی جسے دورِ قدیم اور دورِ جدید میں بھولی ہوئی ادبی شخصیتوں کو پھر سے روشناس کرانے کی اور ان کی صحیح قدر شناسی کی فکر تھی۔ اس کی نظیر تھے۔ نگار کے نظیر نمبر، مصحفی نمبر وغیرہ اور معاصر شعرا کے کلام اور اس پر تنقید۔ نگار کے شمارے اس کے گواہ ہیں۔

نیاز کے تنقیدی منصب کی پہچان ان تینوں وسیلوں ہی سے ممکن ہے۔ ان میں آخری وسیلہ سب سے زیادہ اہم ہے نیاز کے مجموعے انتقادیات کی عمر کم ہوگی لیکن نگار کے مصحفی نمبر، مومن نمبر، نظیر نمبر، جگر نمبر، حسرت نمبر، معرکۂ سخن نمبر، اور جدید اردو غزل نمبروں کی عمر اس سے کہیں زیادہ ہوگی آج بھی یہ سب شمارے اہم ہیں۔

نیاز کے شعری ذوق کی کلید ہے مومن نمبر۔ اور مومن شناس یا مومن پرست کی حیثیت سے نیاز پہچانے جاتے ہیں غالب نے کہا تھا "شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے" نیاز مومن کے انتخاب سے "رسوا" ہوئے۔ نیاز اردو کے پہلے نقاد ہیں جس نے مومن کو غالب تک پر ترجیح دی باوجودیکہ

نیاز خود بیدل کے کلام کے شیفتہ تھے اور غزل میں تفکر کی اہمیت سے بے خبر نہ تھے۔

مومن کو غالب پر ترجیح دینے کا جواز نیاز کے نزدیک صرف ایک تھا وہ تھا مومن کا تغزل اور تغزل کی اصطلاح کو نیاز نے خاصے محدود معنوں میں استعمال کیا تھا یعنی عشقیہ عنصر عشق کا رشتہ تصوف سے بڑا پرانا ہے مگر عشق کو انسانی زندگی کی بنیادی قدر کی حیثیت سے پہچاننے کا سلسلہ زیادہ قدیم نہیں فراق نے اس رشتے کو زیادہ وسعت اور گہرائی دے دی۔

اتنی بات البتہ طے ہے کہ عشق اور حسن کے ہزاروں لاکھوں معاملات ہیں۔ ہر ادا نرالی ہر صورت حال انوکھی ہر رخ، ہر زاویہ اپنی مثال آپ، اور غزل نے جہاں اپنے دامن میں عشق کے علاوہ انسانی زندگی کے ہزاروں لاکھوں پہلوؤں کو سمیٹ لیا اور حسن و عشق کی اصطلاحوں میں ایک دنیا سمیٹ لی وہاں خود عشق بھی اپنی ایک دنیا ہے۔ مدتوں تک غزل صرف عشقیہ کیفیات تک محدود رہی اور انہی کو نئے نئے زاویوں سے بیان کرتی رہی عشق کے رمز داں اس پر سر دھنتے رہے اور حسن کی اداؤں کو نئے نئے رخ سے دیکھتے رہے۔

مومن کی شاعری ان اداؤں سے معمور ہے یہاں نیاز کو تعشف اور مولویانہ کھردرے پن اور زہد و پرہیزگاری سے نفرت اور عورت سے رغبت دونوں کا موقعہ ملتا ہے اور اسی لئے "مکتوبات نیاز" ہوں یا مومن کی شاعری دونوں میں ان کی شخصیت کی یہی جھلک نمایاں ہوتی ہے۔ نیاز مومن کے یہاں معاملات حسن و عشق کی نیرنگیاں تلاش کرتے ہیں۔ غالب کے محبوب کے جلوے میں بھی انسانی زندگی کو فکری پہنائیاں دیکھ لیتے ہیں مگر مومن خالص عاشقانہ شاعری کرتے ہیں کبھی کوچۂ محبوب میں سر کے بل جاتے ہیں کبھی "شب وصل رقیب،، کاٹتے ہیں کبھی محبوب کی آواز میں لپکتے ہوئے شعلے کی کیفیت محسوس کرتے ہیں کبھی اس انداز سے اس پر فریفتہ ہوتے ہیں کہ

دم ہی نکل گیا مرا آوازِ پا کے ساتھ

غرض ان کا دائرہ عشقیہ کیفیات سے باہر نہیں۔ انہی تک محدود ہے۔ انداز بیان کا انوکھا پن رمز یہ ہے کہ اشاروں اشاروں میں دل کی بات کہہ جاتے ہیں اور پڑھنے والا ان اشاروں کے سہارے رنگ و صورت، واقعہ اور صورت حال کے نئے مرقعے سجاتا رہتا ہے۔

نیاز اسی رمزیہ انداز اور عشقیہ کیفیت کے قدرداں ہیں اور کم سے کم غزل کی حد تک اسی کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ یہ کسی قدر لازمی بھی تھا۔ غزل کی توسیع کی بات حالی نے کی تھی اور اس کا رشتہ ایک طرف نیچرل شاعری سے جوڑا تھا تو دوسری طرف سماجی اصلاح سے۔ اور نیچرل شاعری سے ان کی مراد تھی کہ جو کچھ سچ سچ شاعر کے دل پر گزرے اسی کا بیان کیا جائے محض روایت کی پیروی میں روایتی محبوب پر جان دینے کے مضامین غزل میں جگہ نہ پائیں۔

نیاز کے دور تک پہنچتے پہنچتے اس کا ردعمل یہ ہوا کہ انسان کو اپنی شخصیت کا عرفان حاصل ہوتا ہے تو محض عشق کے سہارے اور اس لئے عشق میں سو فلسفوں کا فلسفہ اور سو بصیرتوں کی بصیرت ہے اور اس عشق کی بے محابا جھلکیاں ہی صحیح معنوں میں غزل ہیں۔ اس معیار کے مطابق مومن غالب سے بھی کہیں آگے ہیں۔

اسی معیار کی بنا پر نیاز کی تنقید غزل کی درجہ بندی اپنے طور پر کرتی ہے اس میزان پر مصحفی کو پھر سے دریافت کرتی ہے نظیر کی غزل کو اپنی عشق بازی والے پہلوؤں کی طرف توجہ دلاتی ہے (یہ اور بات ہے کہ نگار کے نظیر نمبر میں جو مضامین شائع ہوئے انھوں نے نظیر کو ایک جمہوری اور عوامی شاعر کی حیثیت سے زندہ کر دکھایا) اور جگر کے کلام کی حد بندیوں کا بھی اسی نقطۂ نظر سے احاطہ کرتی ہے۔

یہاں خود نیاز کی تنقیدی حد بندیوں کا ذکر بھی ضروری ہے اول تو نیاز کی تنقیدی نظر بالاستیعاب صرف شاعری اور وہ بھی صرف غزل پر مرکوز ہے۔ اور غزل میں بھی انہیں "تغزل" والی غزل یا عشقیہ کیفیات والی غزل پسند ہے اور وہی ان کے نزدیک درجہ اول کی مستحق ہے وہ خود اچھے نثر نگار ہیں اور اپنے دور کے افسانوی ادب میں ان کا مقام تھا۔ مگر تنقید میں انھوں نے کبھی نثر پر جو کچھ لکھا اس کی اہمیت نہیں دوسرے تنقید میں بھی نیاز کو تاج اتارنے اور خلعت پہنانے کا بڑا شوق ہے جس طرح رسالہ نگار اپنے مزاج کے اعتبار سے غیر روایتی بلکہ روایت شکن تھا اسی طرح نیاز کا تنقیدی مزاج روایت شکن ہے اور عام ڈگر سے ہٹ کر چلنے کی شعوری کوشش کرتا ہے۔

اس کی دو مثالیں کافی ہوں گی ایک جوش ملیح آبادی پر علی اختر حیدرآبادی کی نظموں کو ترجیح دینے کا فتویٰ جو بار بار نیاز جاری کرتے رہے دوسرے جگر مرادآبادی کے کلام کا نقائص نامہ جسے نگار کے جگر نمبر کے طور پر شائع کیا گیا۔ بلاشبہ جوش ملیح آبادی کی نظموں کا مقابلہ علی اختر حیدرآبادی کی منظومات سے ممکن نہیں دونوں میں آسمان زمین کا فرق ہے لیکن نیاز اول تو مزاجاً نظم کو جانچنے پرکھنے سے عاجز تھے دوسرے جوش سے ذاتی رنجش نے تنقید نگار کے

منصب کو جھٹلا دیا یہی صورت جگر نمبر میں پیش آئی۔

بے شک جگر کا کلام شعری عیوب سے پاک نہیں ہے لیکن جس قسم کی غلطیاں اور چھوٹی چھوٹی فروگزاشتوں کی بنیاد پر نیاز نے پوری عمارت بنا ڈالی ہے۔ وہ ان کے ذاتی اختلافات کی چغلی کھاتی ہے۔ اور تنقید نگار کی حیثیت سے ان کی معروضی اور غیر جانبدارانہ حیثیت کو مجروح کرتی ہے۔ جگر کے سلسلے میں نیاز کا یہ رویہ اس لئے اور بھی حیرت خیز ہے کہ اپنے تمام معاصرین میں جگر نیاز کے خالص عشقیہ غزل کے معیار پر پورے اترتے ہیں مگر پتہ نہیں جگر سے نیاز کو کیا خفگی ہوئی کہ ان کی نکتہ چینی کے لئے نگار کا ایک پورا شمارہ وقف کر ڈالا۔

ایسا نہیں ہے کہ جگر پر نیاز کے سبھی الزامات بے بنیاد ہوں لیکن اکثر اعتراضات کلام میں جھول یا الجھاؤ پر ہیں۔ غزل یوں بھی گھٹاؤ اور جڑاؤ کا فن ہے فالتو الفاظ اور بھرتی کے ٹکڑوں کو برداشت نہیں کرتی جگر اپنی غزلوں میں اس قدر ارتکاز پیدا نہیں کر پائے ہیں یوں بھی جگر مشاعروں کے شاعر تھے اور مشاعروں میں غزل کے شعر کا عام فہم ہونا اور فوری طور پر متاثر کرنے کی قوت سے متصف ہونا لازمی ہے۔ پھر بھی جگر پر نیاز کی تنقید رائی کا پہاڑ بنانے ہی کے مترادف ہے۔

نیاز کا شاید سب سے اہم کارنامہ جدید اردو غزل سے متعلق ہے نگار کے دو شمارے اس موضوع سے نکلے اور دونوں تلے اوپر۔ پہلے میں اس دور کے سبھی زندہ غزل گو شاعروں کا ان کے اپنے قلم سے کیا ہوا انتخاب کلام ہے (اس شمارے میں بعض اہم نام چھوٹ گئے ہیں جو نیاز کی فروگزاشت یا ذاتی پسند و ناپسند بھی ہو سکتی ہے اور مدعو شعراء کی اپنی کاہلی اور بے نیازی بھی) دوسرے شمارے میں ان منتخب غزل گو شعرا کے منتخبہ کلام کی روشنی میں ان پر پانچ اہم نقادوں کے تفصیلی تبصرے ہیں ان میں خود نیاز کے علاوہ مجنوں، فراق، کلیم الدین احمد اور آل احمد سرور شامل ہیں۔ اس شمارے میں نیاز کے تبصرے ان کی تنقیدی سمجھ بوجھ پر روشنی ڈالنے کے لئے کافی ہیں۔

نیاز کی تنقید کی عام روش روایتی ہے روایت سے جو انحراف مذہبی فکر کے سلسلے میں نگار اور نیاز دونوں کی پہچان بنا وہ تنقیدی رویے کی پہچان نہیں بن سکا نیاز بنیادی طور پر "طریقۂ راسخ قدما" کے قائل ہیں اس دائرے میں رہتے ہوئے کوئی شاعر کوئی نیا مضمون باندھتا ہے یا کوئی نئی روش اختیار کرتا ہے یا پرانے مضامین کو کسی نئے زاویے سے نظم کرتا ہے تو نیاز دل کھول کر اس کی تعریف کرنے پر آمادہ ہیں لیکن اس دائرے سے باہر قدم رکھنے کو تیار نہیں۔ اس کاوش میں بعض شاعروں کو کھوئے ہوئے تخت و تاج تو واپس مل سکتے ہیں (مثلاً مصحفی مومن اور نظیر اکبر آبادی) مگر تخلیق کا کوئی نیا معیار یا تنقید کی کوئی نئی کسوٹی قائم نہیں ہو سکتی۔

اب ایک نظر تنقیدی طریق کار کی طرف۔ اصلاً نیاز کی تنقید عملی تنقید ہے یعنی ان کا زور کسی شاعر کی کسی ایک غزل یا علیحدہ علیحدہ مختلف غزلوں کے مطالعے پر رہتا ہے اور ان غزلوں کے تقریباً ہر شعر میں لفظ و معنی کے رشتے اور ان کے تناسب اور توازن پر نیاز خاصی تفصیل سے بحث کرتے ہیں کوشش یہ دکھانے کی ہوتی ہے کہ وہ شعر اپنی اس مخصوص غزل کے مخصوص شعر میں کس حد تک مسلمہ شاعرانہ روایت کو کس قدر سلامت روی سے استعمال کرتا ہے نیاز کسی شاعر کی نکتہ چینی کرتے ہیں تو اسے "طریقۂ راسخ قدما" سے گریز کرتے ہوئے یا اس کی خلاف ورزی کرتے ہوئے دکھاتے ہیں۔

دوسرے ان کا انداز تنقید تجزیاتی ہے یعنی ہر شعر کو مختلف شعبوں میں تقسیم کرکے اسکے اندرونی ربط کو پرکھا جائے مثلاً خیال کس حد تک نیا، قابل قبول یا قابل قدر ہے پھر اس کو پیش کرنے کے لئے جو الفاظ استعمال کئے گئے ہیں وہ کس حد تک موزوں اور مناسب ہیں اور کس حد تک حسن ترتیب سے خیال کو پیش کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں پھر اسی حسن ترتیب میں صرف و نحو کے مسائل بھی آتے ہیں قافیہ ردیف بحر حشو اور ایطاء کے قصے بھی درپیش ہوتے ہیں گویا نیاز کے لئے ہر شعر ایک ایسی متناسب تصویر ہے جس کے مختلف حصوں میں موزونیت ہو اور اس سے پوری تصویر کو موزونیت ملتی ہو۔

اس طریق کار میں شاعر کے مجموعی تاثر پر مناسب توجہ نہیں ہوتی جسے تاثراتی تنقید یا بعد کو ترقی پسند تنقید نے اپنانے کی کوشش کی اس اعتبار سے نیاز کی تنقید گویا قدیم اور جدید طرز تنقید کی درمیانی کڑی ہے اور اس کی خوبیاں اور کمزوریاں دونوں ان کے یہاں موجود ہیں۔

نیاز خود شاعر تھے اور اس سے زیادہ شاعرانہ مزاج کے تھے انھوں نے آسکر وائلڈ کے دور کے مزاج کو اردو میں عام کرنا چاہا ادب کو ایک مستقل بالذات ڈسپلن یا خود کفالتی شعبے کی طرح برتنا اور زندگی کا ایسا تصور پیش کیا جو حسن پرستی اور شعری جمالیات پرستی اور جمال آفرینی کے لئے وقف ہو اور ادب میں بھی وہ یہی تصور تلاش کرتے ہیں۔ شاعر کی حیثیت سے البتہ وہ اس احساس کو زبان

اور اس فکر کو آہنگ نہ دے سکے۔ انھوں نے اپنی شعری تخلیقات کو چھپوانے اور عام کرنے کی بھی کوشش نہیں کی صرف بے تکلف احباب کے جلسوں میں سنانے تک ہی انہیں محدود رکھا ان کے دو چار شعر ہی مشہور ہو پائے اور ان کی شاعری یقیناً ان کے اپنے تنقیدی معیار تک پہنچنے میں ناکام رہی۔

لیکن اس کے باوجود نیازؔ کی تنقیدیں ان کے دور کے ادبی مزاج پر اثر انداز ہوتی رہی ہیں اور اس اعتبار سے ان کی ایک تاریخی ہی نہیں تخلیقی اہمیت ہے انھوں نے بھولے ہوئے مگر عہد ساز شاعروں کی طرف توجہ دلائی مصحفیؔ اور نظیرؔ اکبر آبادی کی بازیافت ان کا کارنامہ ہے ان کی تنقیدی رایوں میں تمام تاثرات و تعصبات کے باوجود اہل نظر کو متوجہ کرنے کے لئے خاصے اہم نکات موجود ہیں جو تنقید کی بالادستی کا کبھی کبھی غیر ضروری حد تک اعلان کرتے اور اعتراف کرواتے ہیں:۔

"   "

....

"اگر کار گاہ حیات پر نگاہ ڈالی جائے تو معلوم ہو سکتا ہے کہ عالم کی تمام رونق، دنیا کا سارا ہنگامہ منحصر ہے صرف انسانی خواہشات پر جن کی تکمیل کے لیے وہ اپنی تمام جسمانی و دماغی قوتیں صرف کر دیتا ہے۔ وہ بھوکا ہوتا ہے تو حصول غذا کے لیے کوشش کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتا۔ وہ سردی گرمی محسوس کرتا ہے تو اس کے دور کرنے کے لیے شب و روز محنت کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا اور جب اسے پیاس معلوم ہوتی ہے تو پانی کے لیے وہ دیوانہ وار دوڑتا پھرتا ہے۔ منجملہ انہیں فطری خواہشات کے ایک خواش وہ بھی ہے جو تعلق جنسی یا جذبہ شہوانی سے وابستہ ہے اور اس کے لیے بھی تگ و دو کرنا اس کی عادت ہے۔ لیکن جس طرح فراہی غذا کے سلسلہ میں انسان سد رمق با نان جویں سے بڑھ کر مزعفر و بریانی پر بھی بس نہیں کرتا، حفاظت کے لیے کھدر سے گزر کر حریر و پرنیاں تک پہنچ جاتا۔ تشنگی رفع کرنے کے سلسلہ میں پانی سے شراب انگور تک بڑھ جاتا ہے اسی طرح وہ خواہش جنسی پورا کرنے میں ایک جائز حد سے گزر کر ان بدعتوں تک پہنچ جاتا ہے جو بڑی حد تک غیر فطری، غیر انسانی اور غیر تمدنی ہیں۔ انہیں بدعنوانیوں و بے اعتدالیوں کو روکنا، تعقل " کا کام ہے اور اسی کا استعمال انسان کو دوسرے حیوانات سے ممیز کرتا ہے۔ (نیاز)



خلیق انجم

اردو گھر

راؤز ایونیو نئی دہلی - ۱۱۰۰۰۲

اُردو نثر کی ہمہ گیر شخصیت ۔ نیاؔز فتحپوری

بیسویں صدی کے نصف اول میں اُردو نثر کی سب سے زیادہ ہمہ گیر، ہمہ جہت اور قدآور شخصیت نیاؔز فتحپوری کی نظر آتی ہے۔ نیاؔز اُردو کے واحد ادیب ہیں جو تخلیق، تنقید، تحقیق اور ادبی صحافت، چاروں میدانوں کے شہسوار ہیں اور ہر میدان میں ممتاز اور نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔

نیاؔز فتحپوری نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا۔ ان کا فارسی اور اردو کلام "الہلال"، "نقاد"، "زمانہ" اور "تمدن" جیسے معیاری رسالوں میں شائع ہوتا تھا۔ شعر و شاعری کے میدان میں انھوں نے قصیدہ، مثنوی، قطعہ، رباعی، غزل، نظم غرض کہ ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ دس بارہ سال تک نیاز شاعر بھی رہے اور نثر نگار بھی ـــ لیکن آہستہ آہستہ انھوں نے شاعری ترک کرکے صرف نثر کو ہی اپنا میدان بنالیا۔ یہ اور بات ہے کہ ان کے اندر کا شاعر ہمیشہ زندہ رہا جو ان کی نثر میں اور خاص طور سے ان کی تخلیقی نثر میں قدم قدم پر اپنے وجود کا احساس دلاتا رہا۔

اس زمانے میں نیاز کے علاوہ اور کوئی ایسا ادیب نظر نہیں آتا جس نے بہت اچھی شاعری کی ہو، بہترین افسانے تخلیق کیے ہوں، انشائیے لکھے ہوں، تخلیقی ادب پر بہترین تنقید کی ہو اور اس کے ساتھ ساتھ مذہبی، سماجی، تہذیبی، اخلاقی، معاشرتی، اقتصادی، نفسیاتی اور تاریخی موضوعات پر بھی اعلیٰ درجے کے معلومات افزا اور بے شمار مضامین لکھے ہوں۔

نیاز کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے مذہب کے مختلف مسائل پر مجتہدانہ فکر کا اظہار کرکے مذہبی معاملات میں اور اس کے توسط سے پوری زندگی میں فکر کو جذبے پر، درایت کو روایت پر اور قرآن و حدیث کو مولویوں کی تقلید پر ترجیح دینے کے رجحان کو فروغ دیا اور ادبی، علمی اور مذہبی موضوعات پر مضامین اور مختلف انداز کی تحریریں لکھ کر آزادیٔ رائے اور جرأت فکر کی روایت کو آگے بڑھایا۔

نیاؔز کی شخصیت قاموسی تھی اور اس قاموسی شخصیت کی تشکیل میں برسوں کی ریاضت و مشقت کو دخل تھا۔ انھوں نے مختلف علوم کا مطالعہ کیا تھا۔ وہ کئی زبانیں جانتے تھے۔ اردو، انگریزی، فارسی، عربی اور ہندی کے ساتھ ساتھ انھیں تھوڑی بہت ترکی بھی آتی تھی۔ مذاہب عالم اور خاص طور سے اسلام پر ان کی نظر کافی گہری تھی۔

نیاز کی یہ ہی قاموسی شخصیت پچیس تیس سال تک بہت بڑی طاقت بنی رہی۔ ایک ایسی طاقت جس کے سہارے انھوں نے مذہبی اور ادبی دونوں محاذوں پر اپنے معاصرین سے مسلسل جنگ کی اور شاذ و نادر ہی ناکامی کا منہ دیکھا لیکن یہی قاموسی شخصیت جب اپنا تاریخی رول ادا کرچکی تو شخصیت کی ہمہ جہتی اور ہمہ گیری ہی ان کی کمزوری بن گئی۔ نئی نسل نیاز سے اس حد تک تو متاثر ہے کہ انھیں بیسویں صدی کی ابتدائی چار دہائیوں کا ممتاز ترین ادیب تسلیم کرتی ہے لیکن یہ نسل نیاز کا مطالعہ نہیں کرتی جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ نیاز کا تعلق کسی ایک صنفِ ادب سے نہیں ہے جس کے ساتھ ان کی شناخت بہ آسانی کی جا سکتی ہو۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ہمارے ادبی مورخین اور ناقدین نے نیاز کو نئی نسل کے سامنے صحیح ڈھنگ سے پیش بھی نہیں کیا۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے ۱۹۶۳ء میں دو جلدوں میں "نگار" پاکستان کا قابلِ قدر نیاز نمبر شائع کیا تھا۔ ہندوستان میں کامپٹی کے ڈاکٹر رشید نظیری

اور دہلی کے ڈاکٹر امیر عارفی نے نیاز پر تحقیقی مقالے لکھ کر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگریاں حاصل کی ہیں۔ ان میں ڈاکٹر امیر عارفی کا مقالہ انجمن ترقی اردو (ہند) سے شائع ہو چکا ہے۔

ادیب کی حیثیت سے نیاز کی شخصیت نہ صرف یہ کہ بہت سے خانوں میں بٹی ہوئی ہے بلکہ رنگا رنگ تضادات کی حامل بھی ہے۔ نیاز کے بارے میں کچھ اور کہنے سے پہلے ہندوستانی ذہن پر مغربی فکر کے اثرات کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

آزادیٔ فکر اور جرأتِ اظہار کی روایت فارسی کے اثر سے اردو شاعری میں ابتدا ہی سے موجود تھی۔ فارسی میں اس روایت کی بنیاد ان شاعروں کے ہاتھوں پڑی جنھوں نے حکومتِ وقت کا ساتھ دینے والے علمائے سو کے خلاف بغاوت کی۔ مذہب کی ظاہری رسوم، دیر و حرم اور زاہد کا جو مضحکہ فارسی شاعری میں اڑایا گیا، کافی عرصے تک اس کی بنیاد حقیقت پر تھی۔ صوفیوں اور شاعروں نے آزادیٔ فکر اور جرأتِ اظہار کی بڑی سے بڑی قیمت ادا کی لیکن ایک وقت وہ آیا جب اس حقیقت نے روایت کی شکل اختیار کر لی۔ اُردو نے فارسی شاعری سے یہ رویہ ایک روایت کے طور پر حاصل کیا، زندگی کی حقیقت اور سچائی کے طور پر نہیں۔ اردو شاعری میں ان موضوعات پر جو کچھ کہا گیا اس کی حیثیت ایک غیر مؤثر اور رومانوی احتجاج کی ہے۔ یہ آزادیٔ فکر اس وقت مؤثر اور بامعنی ہوئی جب اس کا اظہار باقاعدہ تحریک کے طور پر نثر میں ہونا شروع ہوا۔

۱۸۰۳ء میں جب دہلی پر انگریزوں نے قبضہ کیا تو بادشاہ تو شاہ عالم ہی رہے لیکن حکومت انگریز کی ہو گئی۔ اس عہد کی مغل حکومت کے بارے میں کہا جاتا تھا ـــــ

"ملک اللہ کا، حکومت بادشاہ کی اور حکم کمپنی بہادر کا۔"

اور شاہ عالم کی بے بسی کا اظہار ان الفاظ میں کیا جاتا تھا ـــــ

"سلطنتِ شاہ عالم از دہلی تا پالم"

مغل حکومت کے زوال اور کمپنی بہادر کے اقتدار نے آہستہ آہستہ ہندوستانیوں کے دماغ پر یہ اثر ڈالنا شروع کیا کہ انگریزوں کی تہذیب، معاشرت اور علوم کو برتری حاصل ہے۔ دہلی کالج کے تراجم اور اردو صحافت کے ذریعے مغربی فکر ہندوستانی ذہن پر اثر انداز ہو رہی تھی لیکن ایک دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ مغربی فکر کی لہریں پانی کے جہاز کے ذریعے سفر کر کے ہندوستان کے مشرقی ساحل یعنی کلکتے اترتی تھیں۔ اس لئے سماج کی فرسودہ، پامال اور نقصاندہ رسوم کے خلاف بغاوت پہلے کلکتے میں شروع ہوئی۔ اگرچہ ہمایوں اور پھر اکبر نے ستی کو غیر قانونی قرار دیا تھا لیکن اس غیر انسانی رسم کے خلاف عوامی سطح پر پہلی آواز راجہ رام موہن رائے نے کلکتے سے بلند کی۔ برہمو سماج کی تحریک ۱۸۲۸ء کے آس پاس شروع ہوئی۔ یہ تحریک مغربی فکر سے متاثر ہو کر ہندو معاشرے کی اصلاح کے لئے شروع کی گئی تھی اور چھوٹی عمر کی شادی کے خلاف احتجاج کرنا اور بیواؤں کی شادی کی تبلیغ کرنا اس عہد کا بہت انقلابی قدم تھا۔ راجہ رام موہن رائے کی تحریک کو ایشور چندر ودیا ساگر نے آگے بڑھایا۔

کلکتے میں یہ سب کچھ ہو رہا ہے لیکن دہلی میں ابھی خاموشی ہے۔ اگرچہ مغربی فکر نے ذہنوں کو متاثر کرنا شروع کر دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قدامت پرستی کے سب سے بڑے نشان بہادر شاہ ظفر دہلی میں موجود تھے اور ان کی ذات فکری انقلاب کے راستے میں رکاوٹ بنی ہوئی تھی۔ اگرچہ ظفر کی حیثیت ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک وظیفہ خوار کی تھی لیکن تہذیبی، معاشرتی، اور سماجی حیثیت سے ظفر مسلمانوں کا آئیڈیل تھے۔ اسی لئے جب تک ظفر رنگون نہیں بھیجے گئے ہندوستان کے مسلم معاشرے نے نئے نظام اور اس کی لائی ہوئی فکری سچائیوں کو قبول نہیں کیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ سرسید بھی جو مسلمانوں کے مسیحا ہیں، ۱۸۵۷ء تک قدامت پسند تھے۔ وہ بھی "آثار الصنادید" تصنیف کر کے اور "آئینِ اکبری" مرتب کر کے مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کی یاد کو تازہ کر رہے تھے۔

غالب جس طرح نئے نظام کا استقبال کر رہے تھے، سرسید کو وہ ناگوار تھا۔ ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب نے سرسید کی آنکھیں کھولیں اور مغربی علوم کی طرف سے ان کا رویہ بدلا۔

سرسید مغرب کے ماہر سیاسیات جان اسٹورٹ مل سے بہت متاثر تھے۔ انھوں نے مل کی بہت سی تحریروں کا اُردو میں ترجمہ کیا۔ آزادیٔ رائے

جو سرسید کا مشہور مضمون ہے وہ دراصل مِل کی کتاب "ON LIBERTY" کا ایک اقتباس ہے۔ سرسید نے جب مسلمانوں کی اصلاح کا کام شروع کیا تو ان کے سامنے کئی کام تھے :

۱۔ مسلمانوں پر الزام تھا کہ ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب میں سارا قصور مسلمانوں کا تھا۔ سرسید نے "اسبابِ بغاوتِ ہند" کے ذریعے ایسٹ انڈیا کمپنی کی خرابیوں اور کوتاہیوں کا بھی ذکر کیا۔

۲۔ سرسید نے ہندوستانیوں کو مغربی تعلیم کی طرف راغب کیا۔

۳۔ فرسودہ، قدیم اور پامال تہذیبی، معاشرتی اور سماجی رسوم کے خلاف احتجاج کیا۔

۴۔ مذہب کی سطح پر سرسید نے تین کام کیئے :

(الف) انھوں نے مسلمانوں کو ان مذہبی رسموں اور روایتوں سے نجات دلانے کی بھرپور کوشش کی جو مسلمانوں کے لئے نقصاندہ تھیں اور جن کا اسلامی تعلیمات سے کوئی واسطہ تھا اور جنھیں ہندوستانی مسلمانوں نے دین کا حصہ سمجھ لیا تھا۔

(ب) دوسرے، انھوں نے کوشش کی کہ خدا اور رسول کے ارشادات کو عقل اور فطرت کے مطابق ثابت کریں تاکہ مسلمان اسلام کی رہنمائی میں دینی اور دنیاوی ترقی کر سکیں۔

(ج) اس سلسلے کا تیسرا اہم کام سرسید نے یہ کیا کہ ہندوستان پر اقتدار حاصل کرنے کے بعد عیسائی مبلغین اسلام پر عیسائیت کی برتری ثابت کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ اسلام پر طرح طرح کے الزام لگائے جا رہے تھے۔ سرسید نے سائنٹفک انداز میں ان اعتراضات کے جواب دیئے۔

یہ مغربی فکر کا فیض تھا کہ محمد حسین آزاد، شبلی، حالی، اسمٰعیل میرٹھی وغیرہ کو غزل کی گھٹی ہوئی فضا سے نکل کر نظم کی کھلی فضا میں سانس لینے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ انیسویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے نظم اور نثر دونوں میں آزادیِ فکر کی روایت قائم ہوگئی۔ یہی وہ زمانہ ہے جب نیاز نے ایوانِ ادب میں شعور کی آنکھیں کھولیں۔

جب نیاز مذہبی، اخلاقی، معاشرتی، سماجی، تہذیبی اور نفسیاتی موضوعات پر قلم اٹھاتے ہیں تو وہ اس روایت کا ارتقائی تسلسل بن کر ہمارے سامنے آتے ہیں جس کی ابتدا سرسید احمد خاں نے کی تھی اور جس کو مولانا حالی، ڈپٹی نذیر احمد، علامہ شبلی اور مولوی ذکاءاللہ وغیرہ نے فروغ دیا تھا۔ موضوعات پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے نیاز ہمیشہ منطقی استدلال، درایت اور آزادیِ فکر کو اہمیت دیتے ہیں۔ انھوں نے مختلف موضوعات پر مضامین کے ذریعے اوہام پرستی کے مقابلے میں سائنسی نقطۂ نظر کی تبلیغ کی۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں عقلیت کا علم بلند کیا۔ روایت شکنی، اختراعیت، جرأت اور اجتہاد فرسودہ روایتوں کے خلاف بغاوت کی، اور مذہب کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنے کی تلقین کی۔

اب نیاز کی شخصیت کا دوسرا پہلو دیکھئے :

سرسید نے جس سائنٹفک نثر کی بنیاد ڈالی تھی، اس کے خلاف ایک خاموش بغاوت مولانا حسین آزاد کی انشا پردازی اور شبلی کی قدرے رنگین بیانی میں نظر آتی ہے اور سرسید اور ان کے رفیقوں کی سائنٹفک نثر کے خلاف ردِ عمل سجاد حیدر یلدرم، مولانا ابوالکلام آزاد، نیاز فتح پوری، مہدی افادی، ناصر علی، ل۔ احمد اکبرآبادی وغیرہ کے یہاں نظر آتا ہے۔ ان سب کی نثر نور و نغمہ ہے، زندگی کی تلخ حقیقتوں سے فرار ہے۔ انشا پردازی اور رنگین بیانی ہے۔ اس نثر میں حقیقت پسندی نہیں بلکہ رومانیت ہے۔ اس میں انفرادیت، انانیت اور اپنی برتری کا احساس دلانے کی کوشش ہے۔ یہ نثر جذباتیت اور رومانیت کی انگلی پکڑ کر چلتی ہے۔

سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتحپوری، میر ناصر علی، حکیم احمد شجاع، مہدی افادی، سجاد انصاری وغیرہ نے مضامین، خطوط، انشائیوں اور افسانوں کے ذریعے ادبِ لطیف کی بنیاد رکھی۔ ان تمام لوگوں کا عقیدہ تھا کہ مسرت اور حسن کا حصول ہی زندگی کا واحد مقصد ہے۔ یہ لوگ حسن کو مقصود بالذات اور غیر ارضی سمجھتے تھے۔

ادیبوں کے اس گروہ نے رنگینیٔ بیان کے لئے بہت ذہنی مشقت کی۔ افسانوں کو دلچسپ بنانے کے لئے مختلف علوم حاصل کئے اور کئی زبانوں میں مہارت پیدا کی۔ لیکن یہ لوگ تخیل اور تصور کی دنیا میں گم، زندگی کی تلخ حقیقتوں کی آگہی کے کرب سے نہیں گزرے۔ یہ لوگ ایک طرف مغربی ادب سے متاثر تھے تو دوسری طرف داستانوں کا ان پر گہرا اثر تھا۔ اسی لئے انہوں نے حقیقت سے زیادہ تخیل کو اہمیت دی۔ سیدھی سادی نثر پر شعریت کو ترجیح دی۔ زندگی کی خوبصورت، رنگین لیکن تخیلی، تصوراتی اور غیر حقیقی جہتوں کو پیش کیا۔

یلدرم نے ترکی انشائے عالیہ کا اُردو میں ترجمہ کیا۔ ان ترجموں اور خاص طور سے یلدرم کی طرز تحریر سے نیاز بہت متاثر ہوئے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں ایک دو سال آگے پیچھے اردو افسانے میں دو روایتیں ایک ساتھ شروع ہوئیں۔ ایک روایت وہ تھی جس کا آغاز یلدرم نے ایک افسانے "نئی پہلی ترنگ" سے کیا۔ یہ اردو کا پہلا افسانہ ہے اور بقول ڈاکٹر فرمان فتحپوری :

"اکتوبر ۱۹۰۰ء میں 'معارف' اعظم گڑھ میں شائع ہوا تھا۔"

دوسری روایت پریم چند کی تھی۔ اس روایت کا آغاز پریم چند نے ۱۹۰۷ء میں "دنیا کا سب سے انمول رتن" نام کا افسانہ اور ۱۹۰۸ء میں "سوز وطن" کے نام سے اپنی پانچ کہانیوں کے مجموعے کی اشاعت کے ساتھ کیا۔ اس روایت کے تحت پہلی بار اردو فکشن داستانی اور تمثیلی فضا سے باہر نکلا۔ پریم چند نے پہلی بار جاگیردار طبقے اور نوآبادیاتی طاقت کے ظلم و ستم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ اردو ادب میں پہلی بار کسان اور مزدوروں کی آواز صدائے درد بن کر سنائی دی۔ تقریباً بیس سال تک یہ دونوں روایتیں ایک ساتھ چلتی رہیں۔ ان میں زیادہ مقبولیت سجاد حیدر یلدرم، نیاز اور ان کے ساتھیوں کو حاصل رہی۔ لیکن آخر کار حقیقت پسندی کی جیت ہوئی۔ پریم چند اور ان کی روایت کے دوش بدوش چلنے والے دوسرے لکھنے والے اُردو فکشن پر چھاگئے۔

نیاز کی افسانہ نگاری پر گفتگو کرنے سے قبل ایک بات کی طرف توجہ دلانی ضروری ہے۔ ترقی پسند نقاد پریم چند سے اُردو افسانے کا آغاز کرتے ہیں۔ جو ظاہر ہے کہ درست نہیں۔ اسی طرح دوسرے نقادوں نے بھی سجاد حیدر یلدرم، نیاز اور اس عہد کے دوسرے لکھنے والوں کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے۔ کچھ دن پہلے گوپی چند نارنگ نے اُردو افسانہ، روایت اور مسائل کے نام سے اردو افسانہ نگاری پر مختلف ناقدین کے مضامین کا مجموعہ شائع کیا۔ ساڑھے سات سو صفحات کی اس ضخیم کتاب میں یلدرم، نیاز اور اس گروہ کے دوسرے مصنفوں کو یکسر انداز نظر کردیا گیا۔ صرف پروفیسر آل احمد سرور نے آٹھ دس سطروں میں ان لوگوں کا سرسری ذکر کیا ہے۔

نیاز کے افسانوں کا تنقیدی مطالعہ کرتے ہوئے سب سے بڑی مشکل پیش آتی ہے کہ نیاز نے طبع زاد افسانے بھی لکھے ہیں اور دوسری زبانوں سے افسانوں کے پلاٹ بھی اخذ کئے ہیں لیکن یہ پتہ نہیں چلتا کہ ان کا کون سا افسانہ طبع زاد ہے اور کون سا ماخوذ۔ سب کا انداز ایک ہی سا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نیاز نے دوسری زبانوں کے افسانوں سے جو پلاٹ اخذ کئے، انہیں بھی اپنے ہی انداز میں ڈھال لیا۔

نیاز کی افسانہ نگاری پر تبصرے کرنے سے پہلے نیاز کے ایک اہم سوانح اور نقاد ڈاکٹر امیر عارفی کا ایک قول نقل کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ امیر عارفی صاحب کا خیال ہے کہ

"نیاز کی ہر تحریر عورت کے حسن کی مداحی اور مولویت سے نفرت کے گرد گھومتی ہے۔"

نیاز نے صدائے شکست، چنگاری، ایثار، رادھا اور بیراگ کا بروگ جیسے معاشرتی اور اصلاحی افسانے بہت کم لکھے ہیں۔ ان کے بیشتر افسانے رومانوی اور جمالیاتی ہیں۔

جن دو طویل افسانوں سے نیاز کو شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی وہ ہیں "ایک شاعر کا انجام" اور "شہاب کی سرگذشت"۔ یہ افسانے دراصل ناول اور مختصر افسانے کی درمیانی کڑی ہیں۔ کیوں کہ انہیں نہ تو ناول کہا جاسکتا ہے اور نہ مختصر افسانہ۔ ان دونوں افسانوں میں وہ تمام خوبیاں اور خرابیاں موجود ہیں جنہیں افسانہ نگار کی حیثیت سے نیاز کی مجموعی خصوصیات کہا جاسکتا ہے۔ "شہاب کی سرگذشت" ایک سوچہتر (۱۷۶)

صفحات پر مشتمل طویل افسانہ ہے۔ اس میں پلاٹ بھی ہے، کردار بھی ہیں۔ قصہ شروع ہوتا ہے اور ارتقا پذیر بھی ہوتا ہے۔ لیکن پلاٹ کمزور ہے اور کرداروں میں جان نہیں ہے۔ اس افسانے کی تخلیق کا ایک ہی سبب معلوم ہوتا ہے کہ نیاز نے نکاح اور شادی کے بارے میں اپنے افلاطونی خیالات کے پیش کرنے کے لئے ایک کمزور سے پلاٹ کا سہارا لیا ہے۔

اس افسانے کے اہم کردار ہیں شہاب، جو ہیرو ہے۔ شہاب کے دو دوست محمود اور طفیل۔ افسانے کی ہیروئن اختر مشہور فلم ایکٹریس ہے اور محمود کی محبوب سکینہ۔

شہاب اور اختر کی ملاقات غیر فطری انداز میں بمبئی کے ایک باغ میں ہوتی ہے۔ پہلی ہی نظر میں اختر، شہاب پر عاشق ہو جاتی ہے۔ پورے افسانے میں عشق کا وہ تصور پیش کیا گیا ہے جو افلاطونی ہے۔ شہاب بار بار اپنے اس عقیدے پر زور دیتا ہے کہ شادی محبت کی قاتل ہے۔ جب شہاب کا دوست سکینہ سے شادی کرنا چاہتا ہے تو شہاب اسے ان الفاظ میں سمجھاتا ہے :

"چونکہ تم اس سے زیادہ کسی سے محبت نہیں کر سکتے اس لئے اس سے زیادہ ناموزوں تمہاری بننے کے لئے اور کوئی نہیں ....
اگر محبت کا نتیجہ صرف نکاح ہونا چاہئے تو میں کہوں گا کہ آگ کا کام بہا لے جانا اور پانی کا کام جلا دینا ہونا چاہئے۔"

شہاب کے لاکھ سمجھانے پر بھی محمود، سکینہ سے شادی کر لیتا ہے۔ اختر تمام کوششوں کے باوجود شہاب کا دل جیتنے میں ناکام رہتی ہے۔ شہاب ایک بیوہ سے، جو تین بچوں کی ماں ہے، شادی کر لیتا ہے اور اس شادی کا جواز یہ پیش کرتا ہے کہ وہ تین بچوں اور ان کی ماں کی مدد کرنا چاہتا ہے جو شادی کے بغیر ممکن نہیں۔

شہاب میں وہ تمام خوبیاں تھیں جو نیاز نے اپنی شخصیت میں پیدا کی تھیں یا کرنا چاہتے تھے۔ شہاب کا تعارف نیاز نے ان الفاظ میں کرایا ہے :

"وہ فطرتاً فلسفی تھا لیکن اس کے ساتھ حد درجہ پاکیزہ ذوقِ ادب اپنے اندر رکھتا تھا اور حیرت ہوتی تھی کہ وہ شخص جو خشک علمی آدمی بن سکتا تھا، اس میں اتنی نزاکتِ خیال اور لطافتِ ذوق کہاں سے آئی۔ وہ کسی دولت مند کا بیٹا نہ تھا، لیکن اس میں شاہانہ استغنا تھا جس طرح وہ بڑی سے بڑی مسرت سے غیر متاثر نظر آتا تھا، اسی طرح سخت سے سخت رنج بھی اس کو افسردہ و مضمحل نہ بنا سکتا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس کے جسم میں اعصاب کے بجائے فولاد کے تار ہیں جن پر کسی چیز کا اثر ہوتا ہی نہیں .... یوں تو کالج میں بھی مذہب کی طرف سے اس کی بے اعتنائیاں کسی سے پوشیدہ نہ تھیں، لیکن اب تو ساری دنیا کو معلوم ہو گیا تھا کہ یا تو وہ اصول مذہب سے بالکل منحرف ہو جانا چاہتا ہے یا وہ کچھ ایسی تاویلیں کرنا پسند کرتا ہے جنھیں کوئی مذہبی شخص نہیں سن سکتا۔"

دوسرا مشہور طویل افسانہ "ایک شاعر کا انجام" ہے۔ اس کا موضوع بھی افلاطونی عشق ہے۔ ان کے ہیرو میں وہ تمام خوبیاں ہیں جو شہاب میں تھیں۔ افسانے کی ہیروئن حمیدہ سے افضال کی ملاقات ریل کے ایک سفر میں ہوتی۔ افضال نے پہلی ہی نظر میں حمیدہ کو اپنا دل دے دیا۔ دوسری لڑکی رقیہ ہے جو افضال پر عاشق ہو جاتی ہے۔ دونوں کی شادی ہو جاتی ہے لیکن کچھ ہی دن بعد رقیہ کا انتقال ہو جاتا ہے۔ افضال پر دیوانگی طاری ہو جاتی ہے۔ اس حالت میں اسے حمیدہ یاد آتی ہے اور وہ اس کی تلاش شروع کرتا ہے۔ حمیدہ اپنے مرنے کی جھوٹی خبر شائع کرا دیتی ہے۔ کچھ دن بعد واقعات سے متاثر ہو کر حمیدہ بھی مر جاتی ہے۔ اس خبر سے افضال ذہنی توازن کھو دیتا ہے۔

۱۔ ان دونوں افسانوں میں ایسے واقعات بیان کئے گئے ہیں جو محض تخیل کی پیداوار ہیں اور جن کا حقیقت سے کوئی زیادہ تعلق نہیں۔ دونوں افسانوں میں بہت سے ایسے واقعات ہیں جو اس عہد کے مسلم معاشرے میں ممکن ہی نہیں۔
۲۔ زندگی کی تلخ حقیقتوں سے فرار ہے۔
۳۔ دونوں کے ہیرو نیاز کے تصوراتی پیکر ہیں۔
۴۔ اندازِ بیان میں شعریت بلکہ تغزل کا رنگ ہے۔ اس کے ساتھ ہی ان میں مبالغہ آرائی ہے۔ رنگینیٔ خیال، شوخیٔ بیان اور جذبات کا تلاطم ہے۔
۵۔ مناظرِ فطرت کے موقعے پیش کئے گئے ہیں۔

۶۔ جذبات نگاری کا فن اپنے عروج پر ہے۔
۷۔ اندازِ بیان میں طنز و مزاح، بذلہ سنجی، شوخی ہے جو اس عہد کے علم مجلسی کا لازمی حصہ سمجھا جاتا تھا۔
۸۔ دونوں افسانے سوفی صدی رومانوی ہیں۔ نیاز سماجی مسائل کو افسانوں کے لئے غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ اس لئے مرد اور عورت کا رشتہ دونوں افسانوں کا بنیادی موضوع ہے۔
۹۔ دونوں افسانوں کی جان عورت ہے اور عورت کے وجود ہی سے افسانوں میں شعریت، رنگینی، خوبصورتی، لطافت اور نغمگی پیدا کی گئی ہے۔
۱۰۔ کہانی میں نشیب و فراز بالکل نہیں ہے۔ پلاٹ صاف اور سپاٹ بلکہ کمزور ہے۔ واقعات کی طرح کردار بھی مصنوعی معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن نیاز نے پہلی بار افسانوں کے کرداروں کا نفسیاتی تجزیہ کیا ہے۔ اس سلسلے میں مجنوں گورکھپوری لکھتے ہیں :

" نیاز کو محض رومان نگار سمجھنا غلطی ہوگی۔ اردو میں وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے افسانے میں نفسیاتی تجزیے اور کردار نگاری کو اہمیت کے ساتھ داخل کیا۔ "

۱۱۔ نیاز کے بیشتر افسانوں کی طرح ان افسانوں کا انجام بھی ٹریجڈی پر ہے۔
۱۲۔ دونوں افسانوں میں ہیروئنیں محبت میں پہل کرتی ہیں۔

بہت سی کوتاہیوں کے باوجود نیاز کے افسانوں کو اپنے زمانے میں غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کی غالبًا وجہ یہ تھی کہ نیاز کی نثر سرسید اور ان کے رفیقوں کی سائنٹفک نثر سے مختلف تھی۔ ڈپٹی نذیر احمد کے اخلاقی اور اصلاحی ناولوں کا زمانہ ختم ہو چکا تھا اور طویل داستانیں پہلے ہی سے اپنی مقبولیت کھو چکی تھیں اور نیاز اور ان کے ساتھیوں کی رنگین بیانی نے پورے اردو ادب کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔

تقریبًا ۱۹۱۰ء سے ۱۹۲۲ء تک نیاز اردو افسانے پر چھائے رہے۔ ۱۹۲۲ء کے آس پاس پریم چند اور ان سے متاثر ہو کر لکھنے والوں کے اثرات اتنی تیزی سے پھیلنے شروع ہوگئے کہ نیاز اور ان کے ساتھی پیچھے جاتے ہوئے دکھائی دینے لگے۔ نیاز کی فنی عظمت اور سوجھ بوجھ کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ ۱۹۲۲ء کے آس پاس انھیں خود اس بات کا احساس ہوگیا تھا کہ اب ان کی افسانہ نگاری بے وقت کی راگنی ہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں :

" اب ہماری اور آپ کی افسانہ نگاری کا دور ختم ہوا۔ پچھلے چند سال کے اندر جو انقلاب اس فن میں ہوا ہے اس کو نبھانے کے لئے جس آزادہ روی اور کھل کھیلنے کی ضرورت ہے وہ ہمیں آپ کو نصیب نہیں۔ اس سے قبل افسانہ نگاری نام تھا صرف خیال سے لذت اندوز ہونے کا، لیکن اب وہ عملی زندگی کی چیز ہے۔ پہلے صرف تصور سے کام چل جاتا تھا جس کے لئے محض فرصت درکار تھی اور اب معاملہ حقائق کا ہے جس کے لئے خاک چھاننا ضروری ہے۔ "

ادبی نقاد کی حیثیت سے بھی نیاز کی اہمیت کچھ کم نہیں ہے۔ انھوں نے مغرب کے ادبی رجحانات سے بہت کچھ سیکھا۔ لیکن تنقید کے معاملے میں وہ سوفی صدی مشرقی رہے۔ جیسا کہ شروع میں کہا گیا کہ نیاز کی شخصیت میں ایک تضاد ہے۔ وہ بیک وقت رومانی بھی ہیں اور عقلیت پسند بھی۔ وہ جذبات اور تاثرات کی رو میں بہتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور منطقی استدلال سے بھی کام لیتے ہیں۔ نیاز کے افسانوں اور انشائیوں میں اگر رومانیت اور جذباتیت کارفرما ہے تو ان کے علمی اور مذہبی مضامین میں منطق ہے۔ منطق اور جذباتیت کے ساتھ ساتھ چلتے نظر آتے ہیں۔ بلکہ پلہ جذبات ہی کا بھاری رہتا ہے۔ نیاز کی تنقید عام طور سے زبان کے صحیح اور غلط استعمال تک محدود رہتی ہے جہاں لفظوں، ترکیبوں اور محاوروں کے غلط استعمال پر اعتراض کرتے دکھائی دیتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ نیاز ہیئت پرستی کے نظریئے کے ایسے قائل ہیں کہ ہیئت کے مقابلے میں مواد کو اہمیت نہیں دیتے یا اسے کمتر سمجھتے ہیں۔ وہ دراصل لفظ اور معنی کے موزوں ترین امتزاج پر زور دینا چاہتے ہیں اور اس کے لئے فنکار کو لفظ کا نبض شناس ہونا چاہیئے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے نیاز کی تنقید نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے کیا خوب کہا ہے :

" اُردو تنقید میں نیاز کی حیثیت منفرد ہے اور اس انفرادیت کی بنیاد خاص بھی لفظیاتی تنقید ہے لیکن لفظیاتی تنقید ایک مغالطہ انگیز ترکیب ہے۔ اس سے یہ بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ نیاز شاعری اور ادب میں لفظوں کو معنی کے روابط

سے آزاد سمجھتے ہیں اور تجربہ و اظہار کی جداگانہ ہستی کے قائل ہیں۔ یہ خیال صحیح نہیں اور صورتحال اس کے بالکل برعکس ہے۔ نیاز کا مسلک یہ ہے کہ تجربے کی یہ تقدیر ہے کہ وہ اپنے لئے صحیح قالب اظہار اختیار کرے اور اگر کسی تجربے کو صحیح قالب اظہار نہیں ملتا تو اس کا سبب یہ ہے کہ شاعر وسائل اظہار یعنی زبان و بیان کو کوئی منقطع اور مستقل چیز نہیں سمجھتے۔ صحتِ زبان و بیان پر ان کا اصرار اس وجہ سے ہے کہ اس کے بغیر تجربے کا صحیح اظہار ممکن ہی نہیں۔"

(نگار، نیاز نمبر (۱۹۶۳ء) ص۲۱۰)

بیسویں صدی کے نصف اول میں اردو کی ادبی صحافت میں سب سے زیادہ ممتاز اور نمایاں نام نیاز کا ہے۔ نیاز اور ان کے ساتھیوں ل۔ احمد اکبرآبادی، محمود اکبرآبادی، ملک حبیب احمد خاں، شاہ دلگیر اور مقدس اکبرآبادی وغیرہ نے مل کر کچھ رقم جمع کی اور آگرے سے "نگار" کا اجراء کیا۔ نگار غالباً اردو کا واحد ادبی رسالہ ہے جو پہلی اشاعت ہی سے خودکفیل ہوگیا تھا۔ ۲۲ر فروری ۱۹۲۲ء کو پہلا شمارہ شائع ہوا تھا اور نیاز صاحب کی زندگی تک یعنی ۱۹۶۶ء تک یہ پرچہ انتہائی پابندی سے شائع ہوتا رہا۔ اور ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی کوششوں کی وجہ سے آج تک آب و تاب کے ساتھ جاری ہے۔ دسمبر ۱۹۲۲ء تک نگار آگرے سے شائع ہوا، اور پھر بھوپال سے' جہاں نیاز رہتے تھے' شائع ہوتا رہا۔

نیاز صاحب کی ہمہ جہت شخصیت کو "نگار" کی شکل میں اپنے خیالات کے اظہار کا بہت بڑا وسیلہ مل گیا۔ اس لئے انھوں نے "نگار" کو صرف ادب تک محدود نہیں رکھا بلکہ مختلف موضوعات پر معلومات کا خزانہ بنا دیا۔ اس میں ادبی، سماجی، ثقافتی، تہذیبی، تاریخی، سائنسی، نفسیاتی اور جنسی موضوعات پر تحریریں شائع ہوتی تھیں۔ نگار میں شائع ہونے والی یہ تحریریں آج بھی پڑھنے والوں کی معلومات میں اضافہ کرتی ہیں۔

"نگار" کے اجراء کے بعد بہت جلد نیاز کو اردو کے مشہور شاعروں اور ادیبوں کا تعاون حاصل ہوگیا۔ تقریباً ایک سال بعد "نگار" میں کچھ مستقل عنوانات شروع کئے گئے۔ نیاز نے "نگار" کا اداریہ "ملاحظات" کے عنوان سے لکھنا شروع کیا۔ ملاحظات کے تحت وہ سیاسی، اقتصادی، سماجی اور ثقافتی مسائل پر لکھتے تھے۔ "معلومات عامہ" کے تحت فلسفیانہ، نفسیاتی، ثقافتی اور سائنسی موضوعات پر مضامین لکھے۔ باب الاستفسار کے عنوان سے علمی، تاریخی، ادبی، مذہبی جیسے موضوعات پر سوال جواب ہوتے۔ "نگار" کے بیشتر مضامین خود نیاز کے لکھے ہوئے ہوتے تھے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ نیاز پہلے ایڈیٹر ہیں جو صرف اپنے قلم کے زور پر پورا رسالہ مرتب کر سکتے تھے۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے "نگار" صرف ادبی پرچہ نہیں تھا۔ اس کا تمام تر انداز وہی تھا جو نیاز کی شخصیت تھی۔ علم و فن کے بہت سے شعبوں کی جھلکیاں "نگار" میں نظر آتی ہیں۔ باب الاستفسار سے نیاز کے علم کی گہرائی اور ہمہ جہتی کا اندازہ ہوتا ہے۔ بعض لوگ اعتراض کے طور پر کہتے ہیں کہ سوالوں کا جواب دینے کے لئے نیاز صاحب انسائیکلوپیڈیا دیکھا کرتے تھے۔ اگر بعض معاملات میں انسائیکلوپیڈیا ہماری مدد کر سکتا ہے تو آخر ہم ادھر کیوں نہ رجوع کریں۔ اور اگر ہم ایسا نہ کریں تو پھر انسائیکلوپیڈیا کا مصرف کیا ہے۔ اس لئے نیاز پر یہ اعتراض بہت فضول معلوم دیتا ہے۔

ٹکلکرسٹ اور اس کا عہد اور ہندوستانی اخبار نویسی کے مصنف عتیق صدیقی مرحوم نے کچھ عرصے "نگار" میں کام کیا تھا۔ انھوں نے ایک دفعہ مجھے بتایا کہ اگر قاری کوئی ایسا سوال کرتا تھا، جس کا جواب دینا مشکل ہوتا تو نیاز سخت ذہنی تکلیف میں گرفتار ہو جاتے۔ طرح طرح کی کتابیں دیکھتے، کچھ نہ ملتا تو ٹہلتے اور دماغ پر زور دیتے، دوستوں کو خط لکھ کر سوال کا جواب مانگتے۔ آنے جانے والوں سے اس موضوع پر گفتگو کرتے۔ جب تک سوال کا جواب نہ پا لیتے، انھیں چین نہ آتا۔ اس طرح انھوں نے تیس چالیس سال اپنے قارئین کی بے مثال خدمت کی۔

نیاز کو مولویوں کی ذات سے جتنا بیر تھا، اتنا شاید زندگی میں کسی اور چیز سے نہیں تھا۔ عجیب بات یہ ہے کہ وہ طرح طرح سے مولویوں کے بارے میں اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں۔ انھیں اس میں بہت لطف آتا تھا۔ مولویوں کے بارے میں ان کا ایک فقرہ بہت مشہور ہے کہ

"سانپوں کی قسمیں بتائی جا سکتی ہیں، مولویوں کی نہیں۔"

اس بات کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں، لیکن ان کے اس فقرے میں شوخی اور بذلہ سنجی تو ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ نیاز مولوی حضرات کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنا چاہتے ہیں اور شاید اسی لئے نیاز کے بعض معترضین کہا کرتے تھے کہ نیاز صرف نگار کی اشاعت میں اضافہ کے لئے اور تجارت کو

چمکانے کے لئے مذہب اور مولویوں پر اعتراض کیا کرتے تھے۔

اس سلسلے میں میرا خیال ہے کہ نیاز نے مولویوں کے بارے میں جو کچھ لکھا اس میں اس نفرت کا بہت بڑا دخل ہے جو کٹھ ملائیت کے خلاف ان کے دل میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اور یہ نفرت بچپن ہی میں ان کے دل میں بیٹھ گئی تھی جس کے ذمہ دار ان کے ایک استاد مولانا نور محمد تھے جن کے حالات نیاز نے "نگار" کے نیاز نمبر میں خود بیان کئے ہیں۔

نیاز، جب فتحپور کے مدرسہ اسلامیہ میں تعلیم پا رہے تھے۔ اس مدرسے میں ان کے استاد تھے 'مولانا نور محمد' ـــ ان مولانا کا قصہ خود نیاز نے نگار کے نیاز نمبر میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔ نیاز بتاتے ہیں کہ مولانا مذہبی عقائد میں بہت کٹّر تھے۔ طلبہ پر بہت سختی کرتے تھے، سخت جسمانی ضرر پہنچانے سے بھی دریغ نہ کرتے۔ اس مدرسہ میں ایک حفظخانہ تھا جس میں بچوں کو ذہنی اور جسمانی اذیت پہنچا کر قرآن شریف حفظ کرایا جاتا تھا۔ نیاز ایک ایسے نو عمر طالب علم تھے جو ذہین اور حسّاس ہونے کے ساتھ ساتھ نئے راستوں کا متلاشی بھی ہوتا ہے اور جو اپنی زندگی میں پہلے پہل پیش آنے والے تمام تجربات اور مشاہدات پر چوں وچرا کے سوالیہ نشان لگاتا ہوا چلتا ہے اور مولانا نور محمد ٹھہرے ان تمام چیزوں کے دشمن ـــ نیاز کی عمر اس وقت تیرہ چودہ سال تھی۔ اس عمر میں اگر بچّہ بہت ذہین ہو اور استاد اس کی صحیح رہنمائی نہ کرے تو بچّہ بہت سی نفسیاتی اُلجھنوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ مولانا نور محمد کے اس رویّے نے نیاز کو روایتی قسم کی مذہبیت سے باغی کر دیا۔ ذرا عمر اور بڑھی تو سرسید کی تحریروں نے اس باغیانہ جذبے کو اجتہاد کا رنگ دے دیا۔

ہندوستان میں جس مفکر نے بھی مذہب کو عقلی انداز میں دیکھا اور منطقی استدلال کی کسوٹی پر کسا اُسے کافر، مرتد اور ملحد کے خطابات سے نوازا گیا۔ سرسید اور نیاز دونوں کے ساتھ یہی ہوا۔ نیاز لکھتے ہیں:

> "غضب خدا کا، میں سو بار کہہ چکا ہوں کہ خدا کی عظمت اور اس کی قوت و قدرت کا اس طرح قائل ہوں کہ شاید ہی کوئی دوسرا ہو، ہزار بار لکھ چکا ہوں کہ رسول کی صداقت و بلندی فطرت پر جس طرح ایمان میں لایا ہوں، شاید ہی کوئی دوسرا ایمان لایا ہو، لیکن باوجود اس اقرار کے بھی میں کافر ہوں، ملحد ہوں، مرتد ہوں ـــ پھر اگر اسی اقرار و عقیدہ کا نام کفر و الحاد ہے ع
>
> نازم بہ کفر خود کہ بہ ایماں برابر است "

نیاز کا عقیدہ تھا کہ اسلام نئی زندگی کے ہر تقاضے کو پورا کر سکتا ہے اور کر رہا ہے۔ اُردو میں سرسید اور پھر نیاز نے تاریخی تنقیدی شعور کا بھرپور استعمال کرکے اپنے عہد کی فکر کو اسلامی عقائد اور نظریات کے مطابق کیا۔ اگر تفصیلی جائزہ لیا جائے تو مولانا آزاد اور نیاز کی فکری آزادی کافی حد تک سرسید کی مرہون منّت ہے۔

نیاز کی حق گوئی، بے باکی، آزادیِ فکر اور جرأتِ اظہار نے ان کے معاصرین اور نئی نسل کو بہت متاثر کیا۔ قاضی عبدالودود جیسے محقق نے ایک دفعہ مجھے بتایا تھا کہ ان کی تحریروں میں جو تشکیک اور بغیر کسی سے ڈرے سچی بات کہنے کا رجحان ملتا ہے، اس میں نیاز فتحپوری کی تحریروں کو بہت دخل ہے۔

اُردو ادب کو نیاز کی سب سے بڑی دین یہ ہے کہ انھوں نے مذہب کے روایتی تصور کو توڑ کر عقلی تصور کی بنیاد رکھی اور اس کے سہارے انھوں نے اخلاقیات کے ایک نئے نظام کی تشکیل کی۔ آزادیِ رائے، وسعتِ نظر اور جرأتِ فکر کی تبلیغ کا کام سرسید نے شروع کیا تھا۔ نیاز نے سرسید کی اس تحریک کو بہت آگے بڑھایا ہے۔

نیاز نے اگر ایک طرف علم کے کئی شعبوں میں معلومات کے انبار لگائے ہیں، فکر انگیز مضامین لکھ کر پڑھنے والوں کو سوچنے اور خود اپنا راستہ

تلاش کرنے کی ترغیب دی ہے تو دوسری طرف صاحبِ طرز ادیب کی حیثیت سے انہوں نے اسلوب کی ساحرانہ قوت سے سینکڑوں جادو جگائے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ نیاز نے ممتاز شاعروں کی زبان پر جو اعتراضات کئے ہیں اور اپنے عہد کے بڑے شاعروں کی جس طرح گرفت کی ہے اس سے نئی نسل کو کافی رہنمائی ہوتی ہے اور لوگوں کو الفاظ کے استعمال کا سلیقہ آیا ہے۔

نیاز کبھی پامال اور فرسودہ راہوں پر نہیں چلے۔ انھوں نے اپنی انفرادیت اور انانیت کے اظہار کے لئے ہمیشہ نئے راستے بنائے۔ ان نئے راستوں کے مثبت اثرات بھی تھے اور منفی بھی۔ مثبت اثرات نے نیاز کو منفرد شخصیت رکھنے والا صاحبِ طرز ادیب بنایا اور منفی اثر یہ تھا کہ انھوں نے محض اپنی انفرادیت کو برقرار رکھنے کے لئے بہت سی چونکا دینے والی باتیں کہیں۔ مثلاً مومن کے بارے میں لکھتے ہیں :

"اگر میرے سامنے اُردو کے تمام شعرائے متقدمین و متاخرین کا کلام رکھ کر (بہ استثنائے میر) مجھ کو صرف ایک دیوان حاصل کرنے کی اجازت دی جائے تو میں بلا تامل کہہ دوں گا کہ مجھے کلیاتِ مومن دے دو اور باقی سب اٹھا لے جاؤ۔"

ظاہر ہے کہ اس بیان میں محض چونکا دینے والی بات تو ہے لیکن اس میں کوئی وزن نہیں ہے۔ تاہم نیاز کی تنقیدوں نے دو تین نسلوں کی ذہنی تربیت میں حصّہ لیا ہے اور یہی ان کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔

نیاز کی ادبی شخصیت ابھی تک ایک ایسے نقاد کی منتظر ہے جو اُن کے تاریخی رول کو ان کے عہد کے صحیح سیاق و سباق میں پیش کر کے ان کی ادبی خدمات کا منصفانہ جائزہ لے سکے اور نیاز کی ان تحریروں کا ایک ایسا جامع انتخاب ہمارے سامنے لائے جن کی معنویت آج بھی برقرار ہے اور جن کی مدد سے نئی نسل اُردو ادب میں نیاز کے تاریخی رول کو بہتر طریقے سے سمجھ سکے۔

کوثر چاندپوری ——— نیاز صاحب کی شخصیت میں گوشے اور پہلو بہت ہیں۔ وہ ہشت پہل نہیں صد پہل شخصیت کے مالک ہیں۔ ہر پہلو اور گوشہ ایک مستقل شخصیت کی حیثیت رکھتا ہے اور ہر شخصیت پکار کر کہہ رہی ہے :

"ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا"



پروفیسر عنوان چشتی

نیاز فتح پوری کی تنقید نگاری

زندگی اور سماج کے ہر کام کے لئے تنقیدی شعور ناگزیر ہے۔ جب کوئی شخص اپنے کاموں کے ہجوم سے کسی ایک کام کا انتخاب کرتا ہے اور دوسرے کو ملتوی یا مسترد کرتا ہے تو اس انتخاب کے پس پردہ تنقیدی شعور کارفرما ہوتا ہے۔ خود شاعر بھی اپنے بہت سے تخلیقی تجربوں میں سے کسی ایک جمالیاتی تجربے کی شعوری یا غیر شعوری طور پر پیش کش کرتا ہے۔ اسی طرح افسانہ نگار، نقاد، اور دوسرے فنونِ لطیفہ سے متعلق افراد بھی اسی جذبۂ تنقید سے کام لیتے ہیں۔ تنقید کے جذبے کی کارفرمائی زندگی اور سماج کے غیر ادبی کاموں کی طرح ادبی کاموں میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ میں نے ایک جگہ لکھا تھا۔

> "تنقید کے اصول ادب اور تخلیق سے اخذ کئے جاتے ہیں اور پھر ادب و فن کی تفہیم تجربے اور قدر شناسی کے لئے انہی پر آزمائے جاتے ہیں۔ اس لئے کسی نے ٹھیک کہا ہے کہ ادب کے لئے تنقید سانس کی طرح ناگزیر ہے۔ زندگی کی طرح ادب میں، تنقید کی ناگزیریت سے مجالِ انکار نہیں۔ مگر اسی کے ساتھ تنقید تلوار کی دھار پر چلنے کا فن اور سچ بولنے کا ہنر بھی ہے۔ تنقید کے ایک طرف تنقیص اور دوسری طرف تحسین ہے۔ اور تنقید ان دونوں کے درمیان، دونوں میں شریک مگر دونوں سے الگ ہے۔ یہاں تعصب اور تاثر کا گذر نہیں۔ اس راہ میں توازن اعتدال اور احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو تحسین کا رشتہ جانب داری، تنقیص کا تعلق تعصب سے قائم ہو جاتا ہے۔ یہ دونوں صورتیں ادب اور تنقید دونوں کے لئے مضر بلکہ مہلک ہیں۔ تنقید اپنے محرم کے سچ بولنے کا مطالبہ کرتی ہے۔ روزمرّہ کے معاملات ہوں یا ادبی تنقید، سچ بولنا ایک ہمت طلب اور صبر آزما کام ہے۔ اس کارِ خیر کو انجام دینے کے لئے مصلحت اور مفاد سے بالاتر ہونا پڑتا ہے۔ سچ یعنی اثباتِ حق اور نفیٔ باطل سے زندگی اور ادب دونوں میں نئے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی اعتدال، توازن، ہم آہنگی اور احتیاط کا آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلنے لگتا ہے اس کو بھی نگاہ میں رکھنا پڑتا ہے۔ تنقید ہر حالت میں سچ بولتی ہے تلوار کی دھار پر چلتی ہے نئے سوالوں کو جنم دیتی ہے خود زخم کھاتی ہے۔ اس طرح ادب اور تخلیق کو نئی زندگی عطا کرتی ہے۔ نئی زندگی کا لطف اٹھانے کے لئے فن کار اور قاری کو اپنے ذہن و ضمیر کے دریچے تازہ ہوا کے لئے کھلے رکھنے پڑتے ہیں اور اپنی انا کے شعور میں سچائی کی روح افزا سرگوشی کو سننے اور انگیز کرنے کی صلاحیت اور استعداد سے کام لینا پڑتا ہے کہ یہیں سے نقاد، فن کار اور قاری کا سچا رشتہ شروع ہو جاتا ہے۔"
>
> (حرفِ برہنہ ص ۷)

اس اقتباس کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ ادبی تنقید ادب کے کھرے کھوٹے کو پرکھنے کا نام ہے۔ کھرے اور کھوٹے کی پرکھ کی بنیاد تجزیاتی

طریقۂ کار ہے۔ تجزیاتی طریقۂ کار کے نتیجے میں جو کچھ حاصل ہوتا ہے اس کو تنقیدی کاوشوں کا ماحصل قرار دیا جاسکتا ہے۔ تحقیق کی طرح تنقید کے بھی دو رخ ہو سکتے ہیں۔ پہلا استقرائی اور دوسرا استخراجی ۔ تنقید کے مزاج سے استخراجی طریقہ زیادہ ہم آہنگ ہے۔ اس طریقے کے تحت کسی طے شدہ نتیجے تک پہنچنے کے لئے بیجا کاوش نہیں کرنی پڑتی ۔ بلکہ تجربے کے نتیجے میں جو کچھ حاصل ہوتا ہے وہی تجزیے اور تنقید کا ماحصل ہوتا ہے ۔ اس کو نتائج تنقید بھی کہہ سکتے ہیں۔ بعض لوگوں نے یہاں یہ نکتہ بھی اٹھایا ہے کہ نقاد کا کام محض تجزیہ ہے اس کو اقدار کے تعین اور اخذ نتائج سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہئے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ نقاد، ادبی پرکھ کے معاملے میں آزاد ہے چونکہ تنقید ایک آزاد، خود مکتفی اور مکمل فن ہے۔ اس لئے نقاد کا کام اخذِ نتائج اور اقدار کا تعین کرنا بھی ہے ۔

چوں کہ ادبی نقاد اپنے وسیع مطالعے کی بنیاد پر ایک عالم اور دانشور ہوتا ہے۔ اس لئے وہ ادب اور زندگی کو دیکھنے اور پرکھنے کے لئے کسی خاص نقطۂ نظر سے کام لیتا ہے۔ جس کی بنیاد پر تنقید نگاروں کو متعدد تنقیدی دبستانوں سے وابستہ کیا جاسکتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے تنقید کے متعدد دبستان ہیں جن کے اپنے حدود و امکانات ہیں۔ میں نے اپنی کتاب "تنقید سے تحقیق تک"، کے مقدمے میں کئی تنقیدی دبستانوں کی خوبیوں اور خرابیوں اور ان کے حدود و امکانات کو اس طرح بیان کیا تھا۔

> "تاثراتی تنقید — مغرب میں تاثراتی تنقید کو تخلیقی تنقید بھی کہا گیا ہے۔ اس میں تاثرات کی بازآفرینی کو بنیادی اہمیت حاصل ہے اور ہر تخلیق کو ذوقِ سلیم کے معیار پر، ذاتی پسندیدگی و ناپسندیدگی کی روشنی میں پرکھا جاتا ہے۔ تاثراتی تنقید کا طریقۂ کار عقلی نہیں وجدانی ہے۔ جس میں تخلیق سے زیادہ تاثر کی اہمیت ہے۔ اردو کے بیشتر قدیم و جدید نقادوں کی تنقیدیں اسی رنگ میں رنگی ہوئی ہیں۔ اردو تنقید کا قدیم دبستان — یہ دبستان عروضی، فنی اور لسانی نکات پر مشتمل ہے۔ جس کا سلسلہ عربی و فارسی کے علم معانی، علم بیان اور علم بدیع سے ملتا ہے۔ اردو میں استاد شاگردی کی رسم، کتب عروض و بلاغت اور تذکروں سے اس رجحان کو فروغ ملا۔ اس دبستان کے نقاد صحتِ زبان و بیان اور احترام و عروض و فنِ شعراء پر اصرار کرتے ہیں۔ یہ رجحان استاد شاعروں اور کلاسیکی نقادوں کے یہاں آج تک ملتا ہے۔ مولانا عبدالحق، نیاز فتحپوری، اثر لکھنوی، اختر تلہری، رشید حسن خان، ابر احسنی اور جوش ملسیانی وغیرہ کے یہاں یہ رجحان نظر آتا ہے۔ — جمالیاتی تنقید۔ جمالیات فلسفۂ حسن و فن کا نام ہے۔ اس میں ایک طرف حسن اور فن کی حقیقت و ماہیت اور دوسری طرف تخلیق حسن و فن کے محرکات اور اُن سے اثر پذیری کے اسباب کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ اس لئے جمالیات کے دائرے میں فلسفہ اور جمالیات کے بعض اہم گوشے آتے ہیں۔ جمالیاتی تنقید، انہیں اصولوں کی روشنی میں فن اور تخلیق کی گرہیں کھولتی ہے۔ اور فن میں حسن کے عناصر کی نشاندہی کرکے اس کیفیت کو نمایاں کرتی ہے۔ جس سے تسکینِ نفس ہوتی ہے۔ جمالیاتی تنقید میں قدرِ عظمت پر قدرِ حسن کو فوقیت ہے۔ یہ مواد سے زیادہ ہیئت اور اسلوب پر زور دیتی ہے — نفسیاتی تنقید۔ نفسیات کے دائرے میں، انسان کی شخصیت اور اس کے فکر و عمل کی تمام جہتیں شامل ہیں۔ چونکہ فن اور ادب بھی انسانی ذہن کے مخصوص عمل کا نتیجہ ہے۔ اس لئے نفسیات کے دائرے میں آتا ہے۔ نفسیاتی نقادوں نے فرائڈ، اڈلر اور ینگ کے نظریوں کی روشنی میں فن اور فنکار کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ نفسیاتی تنقید میں ۔ تخلیقی محرکات، تخلیقی عمل اور شاعر کے ذہن کی پراسرار کیفیت سے بحث کی جاتی ہے۔ مگر براہ راست فن سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ مارکسی یا سماجی تنقید — مارکسی تنقید کو سماجی تنقید، سائنٹفک تنقید اور ترقی پسند تنقید بھی کہتے ہیں۔ اس کا رشتہ قدیم تاریخی تنقید سے مل جاتا ہے۔ اردو میں تاریخی

تنقید کی پرچھائیاں ملتی ہیں۔ البتہ مارکسی یا سماجی تنقید نمایاں انداز سے نظر آتی ہے۔ مارکسی تنقید میں ادب کو مارکسی کے اصولوں کی روشنی میں پرکھا جاتا ہے۔ مارکسی نقاد کی نظر میں مادہ ہی اصل حقیقت ہے جو متحرک اور نمو پذیر ہے۔ شعور بھی مادے کی ہی ترقی یافتہ شکل ہے۔ سماج مختلف طبقوں میں بٹا ہوا ہے۔ یہ تقسیم معاشی بنیادوں پر ہے۔ اس لئے سماج کی تبدیلیاں پیداوار اور طریقۂ پیداوار کی تبدیلیوں سے وابستہ ہیں۔ مارکسی تنقید میں ادب اور فن کو مادی اور معاشی آئینے میں دیکھا جاتا ہے اور اس کو خالص شعوری عمل قرار دے کر اجتماعی، سماجی اور افادی قدروں کو اُجاگر کیا جاتا ہے۔ سماجی تنقید میں مارکسی تنقید کے اصولوں کے ساتھ روحِ عصر یا تاریخیت کے عنصر کو بھی شامل کیا جاتا ہے۔ فنکار زمان و مکاں کے کسی نہ کسی دائرے میں سرگرم کار رہتا ہے۔ اس کی شخصیت کی تشکیل میں خارجی ماحول کا زبردست ہاتھ ہوتا ہے۔ تنقید کے اس دبستان میں قدرِ حسن پر قدرِ عظمت کو فوقیت دی جاتی ہے۔ سماجی اور مارکسی تنقید ادب کی جمالیاتی قدروں سے زیادہ، اس کے مواد اور سماجی قدروں پر زور دیتی ہے۔"

(تنقید سے تحقیق تک ص ۷)

ان نظریوں کے علاوہ تشریحی، اسلوبیاتی، صوتیاتی تنقید کے رجحانوں کا بھی ذکر کیا جاسکتا ہے۔ اور بعض نقادوں نے شکاگو اسکول کی تنقیدات کے زیرِ اثر تنقیدیں لکھی ہیں۔ بعض نقادوں نے اپنے لئے بالکل جداگانہ راہیں نکالی ہیں۔ اردو میں تنقیدی دبستانوں کے علاوہ اور بہت سے چھوٹے چھوٹے تنقیدی رجحانات بھی ملتے ہیں۔ اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ بعض اہم نقادوں نے ایک سے زیادہ تنقیدی دبستانوں سے استفادہ کرکے تنقیدیں لکھی ہیں۔ ان کو انتخابی یا امتزاجی تنقید کا نام بھی دیا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ ادبی تنقید کا ایک اور مشہور دبستان "اردو تنقید کا کلاسیکی دبستان" کے نام سے جانا جاتا ہے۔ میں نے اس نقطۂ نظر کی مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھا تھا۔

"اردو کی کلاسیکی تنقید کا انحصار عربی و فارسی شعریات پر ہے۔ اور عربی و فارسی شعریات کا دائرہ علم بدیع و بیان اور معانی کے ساتھ علم عروض و قوافی پر محیط ہے۔ اساتذۂ سخن نے ان علوم کی روشنی اور اپنے تجربے کی وساطت سے بعض اصول وضع کئے تھے۔ اور جن پر دبستانِ دہلی اور دبستانِ لکھنؤ کے اساتذۂ فن اور ثقہ شعراء نے عمل کیا تھا۔ یوں تو یہ اصول بلاغت کی کتابوں سے لے کر، عروض اور قواعد کی کتابوں تک بکھرے ہوئے ہیں اور اصلاحِ سخن کی روایت میں ان کی عملی تعبیر نظر آتی ہے۔ لیکن حسرت موہانی کی کتاب نکاتِ سخن ان اصولوں کی اہم دستاویز ہے۔ اس کے علاوہ صفدر مرزاپوری کی شاطۂ سخن (دو حصے) عبدالعلیم شوق سندیلوی کی اصلاحِ سخن، سیماب اکبر آبادی کی دستور الاصلاح، عبدالعلیم آسی کی تذکرۂ معرکۂ سخن، ابراحسنی کی اصلاح الاصلاح ...... اور جوش ملسیانی کی کتاب آئینۂ اصلاح اس دبستان کی عملی تنقیدوں کی بنیاد کو استوار کرتی ہے۔ یاس یگانہ کی کتاب گلدستۂ چراغِ سخن، کلب حسین خاں نادر کی تلخیص معلی، اور نظم طباطبائی کی کتاب تلخیص عروض و قافیہ بھی اس میدان میں مشعلِ راہ ہیں۔ اردو میں اس نوع کا وافر ذخیرہ موجود ہے۔"

(عروض اور فنی مسائل ص ۱۰۹)

اردو میں اس دبستانِ نقد کا جواز یہی ہے کہ یہ دبستان ہماری زبان کے مزاج سے ہم آہنگ ہے۔ اور یہ بطور خاص ہیئت کی صحت اور اس کے جمال آفریں عناصر پر اصرار کرتا ہے۔ یہ معانی کے ساتھ اندازِ پیش کش اور بادۂ گلرنگ کے ساتھ جامِ جہاں نما کو بھی جمال آفریں بناتا ہے۔ اس دبستان کے تین ذیلے

دائرے ہیں۔ (لسانی، فنی اور عروضی)۔ اردو تنقید کے قدیم دبستان کا نقاد ان تینوں کی صحت پر اصرار کرتا ہے اور ذیلی طور پر شاعری کے داخلی معائب پر بھی نظر ڈالتا ہے۔ اس پس منظر میں نیاز فتحپوری کی تنقید کا جائزہ لینا، ان کی تنقید نگاری کا مزاج متعین کرنے میں مددگار ہوگا۔

نیاز فتحپوری کے تنقیدی نقطۂ نظر کا تعین کرنے کے لئے ان کی تنقیدوں کا تجزیہ کرنا اور ان سے اخذ نتائج کرنا ضروری ہے۔ یہ بات محتاجِ ثبوت نہیں کہ نیاز فتحپوری کے دورِ حیات اور عہدِ قلم میں داغ دہلوی اور امیر مینائی کے شاگردوں اور شاگردوں کے شاگردوں کا ہجوم تھا، جو عربی فارسی شعریات سے ماخوذ اور شاعروں کے ذاتی تجربوں پر مبنی ان تنقیدی اصولوں کو مانتے تھے۔ جنھیں اصلاحِ زبان اور اصلاحِ سخن کی تحریک نے پرورش کیا تھا اور جس کو عرفِ عام میں اردو تنقید کا قدیم دبستان کہا جاتا ہے۔ اس تنقیدی دبستان کے علمبرداروں میں (نیاز کے دور میں) مولوی عبدالحق، جعفر علی خاں اثر، اختر علی تلہری کے علاوہ دوسرے تنقید نگاروں اور استاد شاعروں کا نام لیا جا سکتا ہے۔ نیاز فتحپوری، مولوی عبدالحق، جعفر علی خاں اثر، اور اختر علی تلہری اردو تنقید کے دبستاں کی کسی نہ کسی حد تک نمائندگی کرتے ہیں۔ جہاں تک اردو تنقید کے قدیم دبستان کے اصولوں کا تعلق ہے، کہا جا سکتا ہے کہ یہ دبستان تین ذیلی دائروں (لسانی، فنی اور عروضی) پر مشتمل ہے۔ نیاز فتحپوری کی تنقیدی تحریروں میں اس مثلث کا ہر ایک زاویہ صحت اور دل ربائی کے ساتھ نظر نہیں آتا۔ لیکن انھوں نے قدیم اردو تنقید کے دیگر میلانات یعنی تاثراتی وجمالیاتی تنقید کو اپنی تنقیدی تحریروں کی بنیاد میں کھپانے کی کوشش کی ہے۔ جن میں شاعری کو ذوقی اور وجدانی چیز سمجھنے کے علاوہ شعر کی پرکھ میں ذاتی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کو معیار بنانا بھی شامل ہے۔ نیاز کی نظریاتی تنقید کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ (الف) عام ادبی نظریات (ب) ہیئتی اور فنی نظریات۔ ذیل میں نیاز فتحپوری کے نظریاتی تنقید کے چند ادبی اصول پیش ہیں۔

۱۔ "کسی خیال پر تنقید کرنے کے لئے سب سے پہلے اصولِ فطرت پر نظر ڈالنی چاہئے اور یہ دیکھنا چاہئے کہ وہ خیال کس حد تک درمیانی منازل طے کرتا ہوا فطرت کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔"

● اصولِ فطرت اور درمیانی منازل سے کیا مراد ہے؟۔ اس میں سراسر تکلف اور ابہام ہے۔

۲۔ "اس (نقاد) کو صرف اپنی رائے ہی پر اعتماد کرنا چاہئے اور یہ سمجھ لینا چاہئے کہ میں جو کچھ کہتا ہوں وہی صحیح ہے۔"

● یہ نری ادعائیت ہے۔

۳۔ "یہ بالکل صحیح ہے کہ شاعر پیدا ہوتا ہے اور یہ بھی غلط نہیں کہ اس کی وہبی قوت کا نشو و نما ماحول سے بڑی حد تک متاثر ہوتا ہے۔"

● یہ رائے متضاد عناصر کا مجموعہ ہے۔

۴۔ "دنیا میں کسی کتاب کے متعلق یہ گفتگو کرنا کہ یہ اخلاق پر اچھا اثر ڈالتی ہے یا برا، لایعنی سی بات ہے۔"

● دوسری جگہ اس کے برعکس رائے دی ہے۔

۵۔ "اگر کوئی تنقید ہو سکتی ہے تو صرف یہ کہ وہ (شاعری) اچھی لکھی گئی ہے یا بری۔ اس لئے کسی شاعری کے متعلق یہ گفتگو کرنا کہ اس کی شاعری اخلاق کو خراب کرنے والی ہے میرے نزدیک درست نہیں۔"

● اس کے برعکس رائے ملتی ہے۔

۶۔ "یہ کہنا کہ حسن اور آرٹ کو محض حسن اور آرٹ کی حیثیت سے دیکھنا چاہئے اور اس کے اخلاقی اور غیر اخلاقی ہونے کو نظر انداز کر دینا چاہئے، کوئی معنی نہیں رکھتا۔"

۷۔ "ادبیات اور خصوصیات کے ساتھ شاعری کو پرکھنے کے لئے مقررہ اصولوں کے علاوہ اس قوتِ فیصلہ سے بھی کام لینا پڑتا ہے جس کا تعلق صرف ذوق و وجدان سے ہے۔"

● قوتِ فیصلہ میں خاص انانیت اور ادعائیت ہے۔

۸۔ "الغرض تغزل کا تعلق، میرے نزدیک ان جذباتِ محبت سے ہے جو گوشت پوست سے پیدا ہوتے ہیں اور

جن کے پورا ہونے کی تمنا ہر محبت کرنے والے کو ہوتی ہے۔"

- تغزل کو خالص جنسی اور جسمانی حدوں میں قید کر دیا ہے۔

۹- "سب سے پہلے میں کسی شاعر کے کلام پر گفتگو کرنے سے قبل یہ دیکھتا ہوں کہ وہ فطرت کی طرف سے شاعر بنا کر بھیجا گیا ہے یا وہ اپنے آپ کو شاعر کی حیثیت سے پیش کرنے میں فطرت سے جنگ کرتا ہے۔ اس کا فیصلہ کرنے کے بعد میں یہ دیکھتا ہوں کہ قدرت نے اس کے دماغ کو کس نوع کی شاعری کے لئے وضع کیا تھا۔ اور ماحول نے کس حد تک اس کی فطری افتاد کی موافقت یا مخالفت کی۔ آخری نتیجے کے لحاظ سے وہ کامیاب ہوا یا ناکام۔"

- شاعری کے قدیم وہبی نظریہ کی بازگشت ہے۔

۱۰- "غزل اوباشی ہی لکھ سکتا ہے۔"

- نعوذ باللہ۔

۱۱- "ادبیات میں اہم ترین بات اس کی "جذباتی قیمت" ہے۔"

- جذباتی یا رومانی شاعری کھری شاعری تو ہو سکتی ہے مگر بڑی شاعری نہیں ہو سکتی۔

۱۲- "محبت یا عشق فی الحقیقت ایک شدید قسم کا احساس پسندیدگی ہے اور اسی احساس و تاثر کا نام شعر ہے۔"

- جذبۂ عشق کو شاعری قرار دے کر دیگر عناصر کی نفی کی ہے۔

۱۳- "ایک شاعر کا کمال یہ ہے کہ جو تاثرات اس کے دل میں پیدا ہوتے ہیں ان کو ایسے الفاظ و انداز سے ظاہر کرے کہ دوسرا بھی وہی کیفیت اپنے اندر محسوس کرنے لگے۔"

- محض انداز بیان پر زور دیا ہے۔

۱۴- "تغزل میں اصل چیز صرف جذبات نگاری ہے اور ان کے مقابلے میں الفاظ کو کوئی اہمیت حاصل نہیں ہے۔"

- کیا تغزل کی بنیاد محض جذباتیت پر ہے؟

۱۵- "میں ایک حد تک اس کا مخالف ہوں کہ غزل کو حکمت و فلسفہ سے بھی کوئی تعلق ہے کیوں کہ میرے نزدیک تغزل بالکل چیز ہی دوسری ہے اور اس کو عقلیات اور حکمیات سے متعلق کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی یہ کہے کہ عشق کا علاج علم الحقائق سے بھی ہو سکتا ہے تغزل نام ہے محبت کی گفتگو کا۔ الفت کے راز و نیاز کا۔ حدیث عشق کا۔ واردات قلبی کے اظہار کا اور اس میں دیکھنے کی چیز صرف یہ ہے کہ اصلیت کتنی ہے۔ جوش کس حد تک پایا جاتا ہے۔ اور سادگی بیان کا کیا رنگ ہے۔ پھر اس کے ساتھ یہ بھی دعویٰ کرنے کی بات ہے کہ ایک ہی جذبے کو کس کس اسلوب سے پیش کیا گیا ہے اور درد و تاثر کی کتنی کیفیت اُس میں پائی جاتی ہے۔"

- اس میں تغزل کی موافقت مگر تصوّف، فلسفہ اور حکمت کے موضوعات کی بیجا مخالفت ہے نیز حالی کے افکار کی بازگشت ہے۔

۱۶- "(شاعر) قدرت و عالم انسانی کے درمیان ایک ایسی کڑی ہے جو اخلاق مادّی کو تزکیہ تام کے بعد روحانیت سے ملا دیتا ہے پھر جس شاعر میں تزکیۂ روح، پاکیزگی جذبات زیادہ ہوگی اُسی قدر خوبی سے وہ اس خدمات کو انجام دے سکے گا۔

- یہاں شاعر کی تقدیس اور تطہیر پر زور ہے یہ رائے اوباشی کے خلاف ہے۔

۱۷- "نقاش ہو یا بت تراش، شاعر ہو یا ادیب اس کی تمام فنکاریاں اس کی ذات کے لئے نہیں دوسروں کے لئے ہیں۔"

- یہاں شاعری کا رشتہ سماج سے جوڑا ہے۔ یہ نظریہ شاعری اور ادب کو ذوقی وجدانی نہیں سماجی بناتا ہے۔

۱۸۔ "آرٹ بڑی خود سر، بڑی سرکش اور بڑی خود پرست چیز ہے اور وہی آرٹسٹ بہترین آرٹسٹ ہو سکتا ہے جس میں سب سے زیادہ انانیت پائی جائے۔ ایک آرٹسٹ اپنے انفرادی و طبعی تقاضے کے سوا زمانہ کیا خدا کے تقاضے کی بھی پرواہ نہیں کرتا۔"

- شاعر کی زمانیت کو بیجا خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔

۱۹۔ "ہم کو کسی تصنیف پر نقد کرنے کے لئے پورا مواد جمع کر کے اس کا تجزیہ اور اس کی دلکشی اور لذّت اندوزی کی صراحت کرنا چاہئے۔"

- کیا تنقید دلکشی اور لذّت اندوزی کی صراحت کا نام ہے۔ یہ تو صرف تاثراتی تنقید میں جزوی طور پر ممکن ہے۔

۲۰ "ایک آزاد نقاد کے لئے بہتر طریقہ یہی ہے کہ وہ اپنے آپ کو کسی اسکول کا پیرو نہ سمجھے بلکہ وہ خود اپنی قوتِ تمیز سے کام لے کر حسن و قبح کا فیصلہ کرے۔"

- ادعائیت ہے۔

نیاز فتحپوری کے تنقیدی اصولوں کا جائزہ لینے سے چند نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ جن کو ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

۱۔ نیاز فتحپوری شاعری کو ذوقی اور وجدانی چیز تصور کرتے ہیں۔ اور اس کے کھرے اور کھوٹے کی پرکھ میں اپنی ذاتی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کو معیار قرار دیتے ہیں۔ اس بنیاد پر ادعائیت پسند نظر آتے ہیں۔

۲۔ وہ شاعری میں "جذباتی قدر" کو بنیادی قرار دیتے ہیں۔ اور ادراکی نیز تخیلی اقدار کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نیاز فتحپوری شاعری کے تخلیقی عمل اور اس کے مدارج سے پوری طرح آگاہ نہیں تھے۔

۳۔ اگرچہ نیاز فتحپوری نے تغزل کی تعریف نہیں کی اور نہیں بتایا کہ تغزل شاعری کا جوہر ہے یا انداز بیشکش ہے وہ تغزل کا ایک محدود تصور پیش کرتے ہیں۔ ان کی نگاہ میں محض حسن و عشق اور ہجر و وصال کے جذبات اور کیفیات کے اظہار کا نام ہی تغزل ہے، جس کی بنیاد پر انھوں نے مومن کی شاعری کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے یا خواجہ میر درد کے اردو دیوان کو "جانِ محبت" قرار دیا ہے۔ نیاز فتحپوری تغزل کے اتنے دلدادہ تھے کہ انھوں نے حکمت، فلسفہ اور تصوف کے مضامین کو بھی غزل کے موضوعات سے قطعاً خارج کر دیا تھا۔ وہ اپنے مذہبی افکار کی بنیاد پر تصوف کو مسترد نہیں کرتے بلکہ اپنی افتادِ طبع کی بنا پر محض اس تغزل کو پسند کرتے تھے جو جنسی اور جذباتی شاعری کا جوہر ہے۔ انھوں نے تصوف دشمنی کے زعم میں جگر کی شاعری کو مسترد کیا ہے اور غالب کی صوفیانہ شاعری کے لئے لکھا ہے کہ وہ "مناجات" ہو کر رہ گئی ہے۔ علم و تنقید کی دنیا میں ایسی ادعائیت پسندی کام نہیں دیتی۔ انھوں نے تغزل پسندی کے جوش میں یہاں تک لکھا کہ غزل اوباش رشاعر ہی لکھ سکتا ہے۔ اگر یہ بات صحیح ہوتی تو عربی، فارسی اور اردو کے بہت سے ثقہ اور شریف شعراء کو بزمِ سخن سے خارج کرنا پڑتا ــــ۔

۴۔ نیاز فتحپوری نے ایک جگہ اصلیت، سادگی اور جوش کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے یہ تینوں تنقیدی اصطلاحیں حالی کے "مقدمۂ شعر و شاعری" سے اخذ کی ہیں۔ حالی نے شعر کے لئے شرطوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ شعر میں اصلیت، سادگی اور جوش جیسی خصوصیات ہونی چاہئیں۔ حالی کی طرح نیاز فتحپوری نے بھی ان تینوں تنقیدی اصطلاحوں کی وضاحت نہیں کی۔ انھوں نے صرف اتنا ہی کہا ہے کہ شاعری میں اصلیت کتنی ہے۔ جوش کس حد تک پایا جاتا ہے اور سادگیٔ بیان کا کیا رنگ ہے۔ نیاز فتحپوری کے اس ادھورے اور خام کار تنقیدی تصور کو حالی کی کورانہ تقلید ہی کہا جا سکتا ہے۔

۵۔ نیاز فتحپوری کے تنقیدی افکار میں تضاد کا پہلو بھی نکلتا ہے۔ انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ کسی شاعر کے متعلق یہ گفتگو کرنا کہ کسی کی شاعری اخلاق کو خراب کرنے والی ہے میرے نزدیک درست نہیں۔ دوسری جگہ انھوں نے لکھا ہے کہ حسن و آرٹ کے اخلاقی اور غیر اخلاقی ہونے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے کہیں فن یا آرٹ کی اخلاقی حیثیت کو مسترد کیا ہے اور کہیں تسلیم کیا ہے۔ ان کی فکر کے ایسے تضادات اور بھی نظر آتے ہیں۔ وہ شبلی کی طرح یہ مانتے ہیں کہ شاعری ذوقی اور وجدانی چیز ہے۔ اور یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ شاعر اور شاعری کا نشو و نما اس کے اپنے ماحول میں ہوتا ہے

اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ نیازؔ کے تنقیدی افکار پر حالی اور شبلی کے تنقیدی افکار کی دھندھلی چھائی ہوئی ہے۔ اور یہ کہ وہ ایک ادعائیت پسند نقاد ہیں۔ جن کے نظریات پر کہیں کہیں تاثراتی تنقید کا رنگ نظر آتا ہے۔ ان کی تنقیدیں بکھرے بکھرے خیالات پر مشتمل ہیں۔ جن کا دائرہ بہت محدود ہے۔

نیازؔ فتحپوری کی نظریاتی تحریروں میں ایسے بیانات بھی مل جاتے ہیں، جن کو نیازؔ فتحپوری کے لسانی، اسلوبی اور فنی تصورات کہا جاسکتا ہے۔ نیازؔ فتحپوری کی تنقیدی بصیرت کے ادراک کے لئے ایسے تصورات کا تجزیہ کرنا اور ان سے اخذِ نتائج کرنا ضروری ہے۔ نیازؔ نے لکھا ہے۔

(۱) "معمولی سی بات کو طرزِ ادا کی خصوصیت سے دلچسپ بنا دیا، یہی ہے اصلِ شاعری اور اسی کو کہتے ہیں معنی آفرینی"

- طرزِ ادا کو اصلِ شاعری قرار دیا ہے۔

(۲) "اس میں شک نہیں کہ معنی آفرینی معمولی ذہانت کے انسان کا کام نہیں لیکن اس راہ سے اکثر و بیشتر شعراء بہک جاتے ہیں۔ اور (انہیں) "نزاکتِ تخیل کا غلو" "اہمال نویسی" کی طرف لے جاتا ہے۔"

- معنی آفرینی کی مشکل کا ذکر کیا ہے۔

(۳) "نظم نگاری کا کمال یہ ہے کہ موضوع کی خصوصیات اور اس کے لوازم کو ہر جگہ پیشِ نظر رکھا جائے اور کوئی لفظ یا ترکیب ایسی نہ آئے جو معناً موضوع کے حقیقی پس منظر کے منافی ہو۔"

- نظم نگاری کے لئے محض موضوع کی خصوصیت اور لوازم کو بنیاد قرار دیا ہے۔

(۴) "یہ سمجھنا کہ شعر نام ہے صرف مقفیٰ و موزوں کلام کا، درست نہیں۔ یہ تعریف دراصل کلام مرسل یا نظم کی ہے۔ شعر کی نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص شاعر ہو لیکن اچھا ناظم نہ ہو۔ یا یہ کہ ناظم ہو لیکن اچھا شاعر نہ ہو۔ شعر نام ہے محض تاثراتِ نفسی کے اظہار کا۔ اور کلام مرسل نام ہے نتائجِ مشاہدہ کے اظہار کا۔ اس لئے شعر قیاس و برہان سے بلند ہوتا ہے۔ اور کلام مرسل اس کا پابند ہے۔ بہ الفاظِ دیگر یوں سمجھ لیجئے کہ کلام مرسل اس کا پابند ہے۔ اور شعر نفس و قلب کا، جیسے ہم حقائقِ غیر ظاہرہ کی صورِ ظاہرہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ نظم صرف ایک ڈھانچہ یا قالب ہے۔ جس میں شاعرانہ احساسات، ڈھلے جاتے ہیں اور جب یہ ڈھانچہ اتنا ہی اچھا ہوتا ہے جتنے احساسات تو اس سے معیاری شعر وجود میں آتا ہے۔

- اس رائے میں شعر کی خارجی ہیئت کا انکار اور اس کی داخلی ہیئت پر زیادہ زور دیا ہے۔

نیازؔ فتحپوری نے حالیؔ اور شبلیؔ کی طرح، طرزِ ادا، اسلوب اور اندازِ پیش کش کو سراہا ہے۔ ان کے خیال میں طرزِ ادا، معنی آفرینی اور نزاکتِ تخیل کا غلو شاعری کی بنیادی خصوصیات ہیں۔ بلکہ وہ تو طرزِ ادا کو اصلِ شاعری قرار دیتے ہیں۔ انھوں نے شعر اور نظم میں امتیاز کرتے ہوئے لکھا ہے کہ شاعری موزوں اور مقفیٰ کلام کا نام نہیں ہے۔ وہ تو کلامِ موزوں اور مقفیٰ کو نظم اور تاثراتِ نفسی کو شعر خیال کرتے ہیں۔ انھوں نے واضح طور پر لکھا ہے کہ شاعری کی خارجی ہیئت یا فنی انداز محض نظم ہے جبکہ اس کی داخلی ہیئت، معنی و مواد شاعری ہے۔ جس کو انھوں نے احساسات یا تاثراتِ نفسی کا نام دیا ہے۔ نیازؔ فتحپوری کی یہ رائے قدیم تصورِ شاعری کا سستا ایڈیشن ہے۔ ورنہ سچ یہ ہے کہ شاعری کے لئے جتنا خارجی پہلو ضروری ہے، اتنا ہی داخلی۔ خارجی پہلو میں ہیئت، اسلوب اور تکنیک نیز ان کے سارے عناصر شامل ہیں۔ داخلی پہلو میں ادراک، احساس، فکر، جذبہ اور تخیل سب کچھ شامل ہے۔ بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ سارا شعوری اور غیر شعوری مواد، تجربات اور تخلیقی تجربے کی بنیادی جہت یا خصوصیت بھی شعر کا حصہ ہے۔ اس لئے میکس مولر نے کہا تھا کہ ہر خیال اپنا خارجی پیکر خود اپنے ساتھ لاتا ہے۔ یہ خارجی داخلی، یا اوپری اور اندرونی جہات کی تقسیم محض اضافی ہے۔

یوں تو نیازؔ فتحپوری نے زیادہ تر غزل گو شاعروں پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ لیکن انھوں نے کہیں کہیں نظم نگاری پر بھی رائے دی ہے۔ انھوں نے تصورِ نظم پر روشنی ڈالنے میں محض نظم کے اندازِ پیش کش کا خیال رکھا ہے۔ انھوں نے نظم نگاری کے لئے موضوع کی خصوصیات اور اس کے لوازم کا خیال رکھنے پر زور دیا ہے اور الفاظ کو موضوع کے مطابق برتنے پر اصرار کیا ہے۔ یہ بھی محض نظم نگاری کی خصوصیت نہیں۔ بلکہ مجموعی طور پر شاعری کی خصوصیت ہے کیا اس بات سے انکار کیا جاسکتا ہے کہ غزل کے شعر میں بھی الفاظ کو مفہوم کے عین مطابق ہونا چاہئے۔ اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ نیازؔ فتحپوری نظم

نگاری کے سلسلے میں واضح خیالات نہیں رکھتے تھے۔ بلکہ وہ بقولِ درد اس جہاں سے سرسری گزرتے تھے۔ انھوں نے نظم نگاری کی تعریف نہیں کی۔ اس کے تخلیقی عمل سے بحث نہیں کی۔ اور وقت کے ساتھ بدلتے ہوئے نظم کے تصورات کا جائزہ نہیں لیا۔ انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ تصورات میں تکرارِ خیال۔ توسیعِ خیال، ارتقائے خیال، خیال کے پھیلاؤ اور ڈرامائی علامیت وغیرہ کی کیا اہمیت ہے؟ میں نے ایک جگہ نظم اور شعرِ غزل کے تخلیقی عمل میں امتیاز کرتے ہوئے لکھا تھا۔

"غزل اور نظم کے تخلیقی عمل میں نازک سا امتیاز ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو دونوں میں ایک ایسی غیر تخلیقی یکسانیت ہوتی۔ جو قاری کے ذہن پر بار گزرتی۔ غزل کا تخلیقی ارتکاز اگر "نقطہ ہے" تو نظم کا "دائرہ" غزل کا ہر شعر ایک اکائی ہوتا ہے، جو اپنے وجود میں سمٹ کر ایک نقطہ بن جاتا ہے۔ اس میں گہرائی ہوتی ہے اور معانی کی پرتیں ایک دوسرے میں تحلیل ہو جاتی ہیں اور اپنے وجود کی اتھاہ گہرائیوں میں گم ہو کر ایک جمالیاتی نقطہ کی تشکیل کرتی ہیں۔ اس کے برعکس نظم کی ہیئت خود کار اور نامیاتی ہوتی ہے۔ جس کا ایک مصرع دوسرے مصرع سے اشتراکِ عمل کرتے ہوئے تخلیقی تجربے کا ایک "دائرہ" سا بناتا ہے۔ اس میں گہرائی ہوتی ہے۔ اور معانی خون کی طرح گردش کرتے ہوئے چاروں طرف پھیل جاتے ہیں" ——— شاعری اگرچہ زمانی فنِ لطیف ہے لیکن غزل کا شعر، نظم کے مقابلے میں زیادہ زمانی ہوتا ہے۔ بہ الفاظِ دیگر نظم کی پھیلنے یعنی نقطے سے دائرہ بننے کی خصوصیت اس کو مکانی انداز بھی عطا کرتی ہے۔ نظم کے مطالعہ و تنقید میں تخلیقی عمل کے اس نازک امتیاز کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔"

(لمحہ لمحہ پیاس۔ ص۔ ۷)

اس لئے یہ نتیجہ اخذ کرنا قرینِ قیاس ہے کہ شاعری کو محض ذوقی اور وجدانی چیز سمجھنے والے، طرزِ ادا اور اسلوب کو اصلِ شاعری تصور کرنے والے نیاز فتحپوری نے نظم کی تنقید کا حق ادا نہیں کیا۔ اس ضمن میں ان کی معلومات محض سامنے کی سنی سنائی باتوں سے زیادہ نہ تھیں۔ ان کے لسانی، ہیئتی اور فنی تصورات واضح اور وسیع نہ تھے۔ بلکہ محدود اور مجروح انداز کے تھے۔

نیاز فتحپوری کے تنقیدی نظریات کے مطالعہ کے بعد، ان کی تنقید کے عملی منظر نامے پر بھی ایک نگاہ ڈال لینی چاہیے۔ جس کو نیاز کے نظریے کا اطلاقی پہلو کہا جا سکتا ہے۔ یا عملی تنقید کا نام دیا جا سکتا ہے۔ چوں کہ ادب، شاعری اور تنقید کے سلسلے میں نیاز کے تصورات، ادھورے اور الجھے ہوئے ہیں۔ اس لئے ان کی عملی تنقید پر ان کے تنقیدی تصورات کا ایسا ہی عکس دکھائی دیتا ہے۔ پھر بھی انھوں نے زیادہ تر، شاعری کے خارجی، ہیئتی، اور اسلوبی پہلو سے سروکار رکھا ہے۔ اردو تنقید کا کلاسیکی دبستاں بھی اس پہلو سے بحث کرتا ہے۔ اس کا دائرہ لسانی، فنی اور عروضی پہلوؤں پر مشتمل ہے۔ نیاز نے اپنے "محرکِ تنقید" پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کے "سنگِ بنیاد" کی طرف خود ہی اشارہ کر دیا ہے۔

"میں نے یہ سلسلہ صرف اس لئے قائم کیا ہے کہ لوگ اشعار کے حسن و قبح کو خود سمجھنے کی کوشش کریں۔ اور محض اس لئے کہ کسی بڑے شاعر نے ایسا لکھ دیا ہے۔ غلط کو صحیح اور قبیح کو حسن نہ قرار دیں۔"

(مالہ و ما علیہ ص ۱۲۳)

اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ نیاز فتحپوری کی تنقیدوں کا محرک صحیح اور غلط کے درمیان امتیاز کرنا اور حسن و قبح نیز کھرے کھوٹے کو الگ الگ کرنا ہے یہی اساسِ تنقید ہے۔ اب صرف یہ دیکھنا ہے کہ یہ اساس کتنی مضبوط اور کتنی پائیدار ہے؟

عروضی پہلو

نیاز فتحپوری نے فراق گورکھپوری کی ایک غزل کے ۱۲ اشعار دیئے ہیں۔ مطلع ہے

جسے لوگ بتاتے ہیں زیر زمیں جسے کہتے ہیں عرشِ بریں پر ہے
وہ جہنم بھی دنیا ہی میں ہے، وہ جنت بھی تو زمیں پر ہے

غزل کے باقی اشعار مالہٗ و ماعلیہ (ص ۱۶۱) پر دیکھے جا سکتے ہیں۔

نیازؔ فتحپوری کے اعتراضات کا خلاصہ یہ ہے۔

۱) " فراقؔ چوں کہ فن شعر سے کم واقف ہیں۔ اس لئے وہ متداول بحروں کے علاوہ جب کسی بحر میں خواہ وہ چھوٹی ہو یا بڑی، کوئی غزل کہتے ہیں تو اکثر اشعار خارج از تقطیع کہہ جاتے ہیں۔ یہ غزل جس بحر میں کہی گئی ہے وہ مشکل ہے اور زحافات کی کافی رعایتوں کے بعد اس میں کہنا آسان نہیں۔ اس لئے اس کے اکثر مصرعے ناموزوں ہیں اور لفظوں کو دبا کر پڑھنے کے بعد بھی تقطیع سے خارج رہتے ہیں۔"

۲) " جب ہم محض تغزل کے نقطۂ نظر سے اس کو دیکھتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے۔"

۳) " پوری غزل غیر حاضر طبیعت کا نتیجہ ہے اور اسی لئے تصنع اور آورد سے خالی نہیں۔"

۴) " اس غزل میں " ابہامات " نقصِ بیان کی وجہ سے ہیں۔"

(مالہٗ و ماعلیہ ص ۱۶۲)

نیازؔ فتحپوری کی عروضی رائے مندرجہ ذیل اجزا پر مشتمل ہے۔

۱۔ فراقؔ عام طور پر متداول بحروں میں شاعری کرتے ہیں۔

۲۔ متداول بحروں کے علاوہ جب فراقؔ نیاز کے نقطۂ نظر سے غیر متداول بحروں میں شعر کہتے ہیں۔ خارج از بحر کہتے ہیں۔ جس کو نیاز نے خارج از تقطیع کہا ہے۔

۳۔ یہ غزل، جس بحر میں کہی گئی ہے، وہ مشکل ہے۔ اس کے زحافات بہت ہیں۔ اس بحر میں شعر کہنا آسان نہیں۔

۴۔ فراقؔ کی غزل کے مصرعے لفظوں کو دبا کر پڑھنے کے بعد بھی خارج از تقطیع ہو جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں میرے سامنے یہ سوالات ہیں۔

۱۔ " متداول بحروں " سے کیا مراد ہے؟۔۔۔ اگر اس سے عام بحریں مراد ہیں تو فراقؔ کیا، ہر شاعر (بشمول میر و غالب) نے عام بحروں میں زیادہ غزلیں کہی ہیں۔ " متداول بحر " کوئی عروضی اصطلاح نہیں۔ یہ ترکیب، ایجادِ نیاز ہے اور اپنے متعین منطقی مفہوم سے ناآشنا ہے۔

۲۔ فراقؔ نے ہر جگہ نامطبوع بحروں میں خارج از بحر اشعار لکھے ہیں۔ لیکن انھیں متداول یا غیر متداول بحر میں کہنا درست نہیں۔

۳۔ فراقؔ کی زیرِ بحث غزل " خامکاری " کا نتیجہ ہے۔ لیکن نیاز کی حاضر طبیعت اور غیر حاضر طبیعت کی اصطلاحیں، پرانے اور فرسودہ ذوقِ سخن کی یاد دلاتی ہیں۔ غالباً نیازؔ نے غیر حاضر طبیعت کہہ کر تخلیقی تحریک کے فقدان کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اور انھوں نے جس کا لازمی نتیجہ تصنع اور آورد قرار دیا ہے۔

۴۔ اس غزل میں ابہامات سے اور نقصِ بیان سے کیا مراد ہے۔؟ ابہام غنائی شاعری خاص طور پر غزل کے رمزیہ اور ایمائی اسلوب کی جان ہے۔ نثر کے لئے وضاحت اور شاعری کے لئے ابہام حسن ہے۔ نقصِ بیان محض بحر سے خارج ہونا نہیں ہے۔ اس میں خلافِ سلاست و بلاغت اجزا اور عناصر ہوتے ہیں۔ جن کو معائبِ سخن کہتے ہیں۔ نیاز نے نقصِ بیان کی طرف اشارہ تو کر دیا ہے مگر یہ نہیں لکھا کہ ان کی اس سے کیا مراد ہے۔؟

نیازؔ فتحپوری عروض سے کس حد تک واقف تھے۔ اس کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ انھوں نے اس بحر کا نام تک نہیں لیا۔ جس میں فراقؔ کی غزل ہے۔ فراقؔ کی غزل کے مطلع کا پہلا مصرع بحرِ متدارک میں ہے۔ جس کا وزن یہ ہے۔

نام بحر: بحرِ متدارک مثمن مخبون مخبون مخبون مخبون

وزن: فعِلن فعِلن فعِلن فعِلن (ع ہر جگہ متحرک ہے)

غزل کے باقی مصرعے بھی بحر متدارک کے اسی وزن یا اس بحر کے کسی رعایتی وزن میں ہونے چاہئیں۔ لیکن فراقؔ کی غزل میں ایسا نہیں ہے۔ پوری

غزل کا عروضی تجزیہ طول کلامی کا سبب ہوگا۔ اسی لئے اس سے صرف نظر کررہا ہوں۔ نیازؔ کی اتنی بات درست ہے کہ فراق نے اس بحر میں خارج از بحر مصرع لکھے ہیں۔ لیکن انھوں نے یہ بات عروضی تجزیے کے بعد نہیں لکھی بلکہ محض ذوقِ وجدان کی بنیاد پر کہی ہے اس لئے یہ نتیجہ نکالنا درست ہے کہ نیازؔ فتحپوری کا عروضی علم محض واجبی واجبی تھا۔ لگے ہاتھوں یہ بھی عرض کردوں۔

۱- بحر متقارب اور بحر متدارک کے اوزان کا اجتماع ایک غزل یا ایک نظم میں درست نہیں۔

۲- بحر متدارک میں زحاف تخلیق کا عمل نہیں ہوتا بلکہ زحاف تسکین اوسط کا عمل ہوتا ہے۔ دونوں کا عمل ایک ہی ہے۔ لیکن دونوں کے مقام ورود میں نازک سا امتیاز ہے۔ جس سے اہلِ علم وخبر واقف ہیں۔

۳- ایک ہی غزل یا نظم میں بحر متدارک کے جملہ رعایتی اوزان کا اجتماع درست ہے۔

نیازؔ فتحپوری کی عروضی رائے کے باقی عناصر بھی اسی نوعیت کے ہیں۔ ان کی یہ بات درست ہے کہ اس بحر (متدارک) کے آداب کا لحاظ رکھنا اور سارے عروضی لوازمات کے ساتھ غزل کہنا آسان نہیں ہے۔ لیکن انھوں نے حروف کے دبنے کی جگہ لفظوں کو دبنے اور خارج از بحر کی جگہ خارج از تقطیع کی خود ساختہ اصطلاحات کا استعمال کرکے ثابت کردیا کہ وہ بحر عروض کے باقاعدہ شناور نہیں تھے بلکہ ان کی معلومات محض سرسری تھیں۔

لسانی پہلو

نیازؔ فتحپوری نے اپنی تنقیدوں میں لسانی اعتراضات کئے ہیں۔ اور اس ضمن میں، انھوں نے لفظ، تراکیب روزمرہ اور محاورے کی صحت پر زور دیا ہے۔ اردو میں اصلاح زبان کی تحریک سے جو مزاج بننا شروع ہوا تھا، اور اصلاحِ سخن کی تحریک نے جسے پرورش کیا تھا۔ ناسخ وذوق کی شکل میں اس نے دبستان کی شکل اختیار کرلی تھی۔ داغ وامیر اور ان کے شاگردوں نے اس دبستان کے بام ودر کو اپنی فنی اور لسانی کاوشوں سے سجایا تھا لکھنؤ کے دبستان شاعری کے اساتذہ نے لسانی صحت پر خاص طور پر زور دیا ہے۔ اس لئے نیازؔ فتحپوری، کچھ تو اپنی افتادِ طبع، کچھ اپنی مشرقی تربیت اور کچھ ماحول کے اثرات کی وجہ سے اردو تنقید کے قدیم دبستان سے وابستہ ہیں اور اپنی تنقیدوں میں لسانی صحت کا خاص اہتمام کرتے ہیں۔ یہاں چند مثالیں پیش کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

(۱) علی سردار جعفری کی نظم "انفرادیت" کا ایک شعر ہے۔

بڑھ رہا ہے کرّۂ گیتی کا شوقِ انتظار
ہے ہوا بے چین دامن میں چھپانے کے لئے

نیازؔ کا اعتراض: "(اس) شعر میں کرّہ بہ تشدید لایا گیا ہے۔ حالانکہ صحیح تلفظ بغیر تشدید کے ہے۔ اگر اس کے بجائے یعنی کرۂ گیتی کے مادرِ گیتی ہوتا تو بہتر تھا۔

(مالہ وماعلیہ ص ۴۲)

صحیح تلفظ کُرہ ہے کُرّہ نہیں۔ اس عیب کا نام "تغیّر" ہے اور یہ معائبِ سخن میں "منع نحو" کے تحت آتا ہے۔ نیازؔ فتحپوری کی رائے درست ہے۔

(۲) محوی صدیقی لکھنوی کا شعر ہے۔

اچھا ہوا نہ آئے ہم اس کی گفتگو میں
ناصح، تری گلی سے جنت کو لے چلا تھا

نیازؔ کا اعتراض: "محاورہ باتوں میں آنا ہے نہ کہ گفتگو میں آنا۔"

(مالہ وماعلیہ ص ۶۷)

یقیناً "صحیح محاورہ" باتوں میں آنا" ہے۔ اور محاورے میں تحریف درست بھی نہیں ہے۔ لیکن محوی صدیقی نے اپنے شعر کی حد تک محاورے میں تحریف نہیں کی ہے۔ تخلیقی فنکار کو اتنی آزادی تو ملنی ہی چاہئے۔

(۳) ماہر القادری کا شعر ہے۔

اور غم کے چند لمحے بھی مصیبت ہوگئے
عیش کی راتیں پلک جھپکی نہ تھیں کہ کٹ گئیں

نیاز کا اعتراض: "پہلے مصرعے میں کہ (کافِ بیانیہ) کے ہوگیا ہے۔ جو بالکل غلط ہے"

(مالہ وما علیہ ص ۱۳۰)

اعتراض درست ہے۔ ثقہ اساتذہ کہ کو "کہ" وزن پر لکھتے ہیں "کے"، (فاع) کے وزن پر نہیں۔ کہ میں ہ کا سقوط سلاست پیدا کرتا ہے۔

(۳) جگر مرادآبادی کا شعر ہے۔

ہر لحظہ اک سرورِ میسر لئے ہوئے — خود زندگی ہے بادہ کو ترسے ہوئے

نیاز کا اعتراض: "(اس) مطلع میں "میسر"، کا استعمال درست نہیں۔ اگر یہ لئے ہوئے سے متعلق ہے تو میسر لینا کوئی محاورہ نہیں۔ اگر "سرورِ میسر" کے معنی "سرورِ حاصل" کے ہوں تو لئے ہوئے کے ساتھ وہ بالکل بیکار ہے۔ عربی میں میسر غنی کے معنی میں آتا ہے۔ اردو میں اس کا استعمال ہمیشہ "حاصل شدہ" کے مفہوم میں کیا جاتا ہے۔

(مالہ وما علیہ ص ۱۵۰)

سرورِ میسر کی ترکیب واقعی قابلِ غور ہے۔ اس غزل کے قوافی ہیں۔ برابر نشتر وغیرہ سرور کے بعد میسر شاید جبریہ قافیے کے طور پر استعمال ہوا ہے۔

جہاں تک فنی پہلو کا تعلق ہے۔ نیاز فتحپوری کی تنقیدوں میں اس کا ذکر برائے نام آتا ہے۔ عروضی پہلو کا حال معلوم ہے۔ اس لئے لے دے کر، نیاز فتحپوری کی تنقید "لسانی پہلو"، تک محدود ہے۔ انھوں نے انتقادیات اور مالہ وما علیہ میں جتنے اعتراضات کئے ہیں، ان کی نوعیت زیادہ تر لسانی ہے۔ اس لئے نیاز فتح پوری اردو تنقید کے قدیم دبستان کے نمائندہ نقاد قرار نہیں دیئے جا سکتے۔ انھوں نے اس دبستان کی جزوی نمائندگی کی ہے۔

نیاز فتحپوری کا ذہنی رشتہ، ایک طرف تاثراتی نقادوں سے اور دوسری طرف اردو تنقید کے قدیم دبستان سے ملتا ہے۔ مگر یہ رشتہ کلی نہیں جزوی ہے۔ انھوں نے ادب اور تنقید کو ذوقی اور وجدانی چیز کہا ہے۔ اور اس قوتِ امتیاز کو فیصل مانا ہے۔ جس کی پرورش ذوق اور وجدان کے سائے میں ہوئی ہے اس لئے نیاز فتحپوری کی تنقیدی تحریروں میں ایک طرف تاثراتی تنقید کے اثرات دکھائی دیتے ہیں اور دوسری طرف ادعائیت نظر آتی ہے۔ چونکہ نیاز فتحپوری کی تنقیدی تحریروں کی بنیاد تعقل اور سائنٹی فک اصولوں پر نہیں ہے۔ اس لئے ان تحریروں میں تجزیے سے زیادہ تاثر شعور سے زیادہ جذبے اور تعقل سے زیادہ وجدان کی کارفرمائی ہے — جہاں نیاز فتحپوری نے اس دائرے سے باہر قدم رکھا ہے وہاں وہ شبلی نعمانی اور حالی کی تنقیدی تحریروں کے جادو کی زد میں آگئے ہیں۔ شبلی کی طرح نیاز فتحپوری نے بھی شاعری کو ذوقی اور وجدانی چیز کہا ہے۔ یہ زبان اور اصطلاحات شبلی کی ہیں۔ جہاں نیاز نے اصلیت، سادگی اور جوش کا ذکر کیا ہے۔ وہاں ان کے پردے میں حالی بولنے لگتے ہیں۔ ان کا اپنا کارنامہ صرف یہ ہے کہ انھوں نے اردو تنقید کے قدیم دبستان کے صرف ایک پہلو (لسانی پہلو) کو سامنے رکھ کر اپنی تنقیدی تحریریں لکھی ہیں۔ انھوں نے عروضیات و شعریات کے مباحث سے دامن بچا کر محض بعض لسانی صداقتوں کے سہارے اپنے تنقیدی نقطۂ نظر کو عملی جامہ پہنایا ہے۔

نیاز فتحپوری کا مثبت کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اردو تنقید کے سر سے سماجی اور عمرانی عناصر کا بوجھ اتار کر، اس کو تخلیقی بنیادوں سے قریب کیا ہے۔ کام ان سے پہلے شبلی نے بھی کیا تھا۔ شبلی نے حالی سے زیادہ اردو شاعری اور تنقید کی تخلیقی حیثیت کو نمایاں کیا ہے۔ ان کے بعد یہی کام نیاز فتحپوری نے انجام دیا ہے۔ لیکن وہ اس ترنگ میں اتنے آگے نکل گئے کہ غزل جیسی پاکیزہ صنف کو اوباش شاعر کی تخلیق گردانے لگے اور زندگی کے حقائق پر جنسی اور جسمانی شاعری کو فوقیت دینے لگے۔

مولانا، مسٹر اور علامہ ـــــ

نیاز فتحپوری

• انور ظہیر خاں

خار دگل کی صفات کو اگر کسی ذاتِ خاص میں دیکھنا ہو تو نیاز فتحپوری سے بہتر کوئی اور شخصیت نہیں ہوسکتی ہے۔ یہاں کوہ کی بلندی اور وادی کے نشیب کا تفاوت نگاہ کی ڈور اور دل کے دامن کو اپنی طرف کھینچتا ہے ـــــ غرض بیسویں صدی کے اوائل سے نصف صدی سے زائد عرصے تک اُردو دنیا کی متضاد اور متنوع ہستی کا نام نیاز فتحپوری ہے جو بیک وقت مولانا، مسٹر اور علّامہ تینوں کو اپنے میں سموئے ہوئے ہیں۔ ایسی شخصیتیں بہت کم گزری ہیں کہ جو قدامت اور جدّت، مشرق اور مغرب روایت اور درایت کا خوشگوار امتزاج ہوں۔ نیاز مرحوم کی یہ خوبی ہے کہ جس دم جو کلاہ چاہیئے ان کے سر پر رکھ دیجئے۔ لطف یہ ہے کہ ہر طرح کی کلاہ پھبتی ہے۔ اور حق یہ ہے کہ وہ ہر حیثیت سے حق ادا کر دیتے ہیں ـــــ نیاز کی یہ خوبی بھی ہے اور خامی بھی کہ وہ کبھی خطِ مستقیم میں سفر کرتے ہیں اور کبھی خطِ منحنی میں ـــ ان کے یہاں بیک وقت اعتراف اور انحراف کے رویّے ملتے ہیں۔ وہ کٹھ ملائیت کے مخالف بھی ہیں اور کبھی خود کٹھ حجتی پہ اُتر آتے ہیں۔ وہ اپنی بات کی تائید بھی چاہتے ہیں لیکن کبھی خود ہی تردید کرنے لگتے ہیں۔ ان کا دل کلاسیکی ہے لیکن ذہن جدّت کی طرف مائل ہے۔ وہ کہیں ٹھہرتے نہیں، کسی شخص سے اُن کا دل نہیں ملتا، کسی شئے سے جی نہیں بھرتا، وہ فطرتاً سیماب صفت ہیں اور مزاجاً تشکیکیت پسند۔ ابو الکلام اور عبدالماجد تو تشکیک سے ایمان تک پہنچے لیکن نیاز نے اپنا ذہنی سفر ان کے برعکس طے کیا' وہ حرم سے میکدے تک گئے مگر لغزشِ پا میں پابندیٔ آداب کے قائل رہے، وضع داری برقرار رکھی، گھر کا راستہ کبھی نہیں بھولے۔ یہ تینوں بزرگ معاصر تھے، بڑے طنطنے اور دبدبے کے آدمی تھے۔ یہ لوگ اپنے نظریوں سے زیادہ اپنی منفرد تحریروں میں زندہ ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے نظریاتی خلوص میں ادھ کچری یا ناپختہ فلسفیت کی فضا ہے۔ جہاں تک نیاز کی بات ہے انھوں نے ایقان اور گمان کے بین بین زندگی گزاری ہے۔ یہیں سے ان کے یہاں وہ نظریہ پیدا ہوتا ہے جو پڑھے لکھوں کے نزدیک سائنٹفک کا درجہ رکھتا ہے۔ لیکن ان کے اس نظریے پر کبھی کبھی جذباتیت، کٹھ حجتی خانصاحبیت کی دھند بھی چھائی نظر آتی ہے۔ جس کے پیچھے معنی کا چہرہ کج فہموں اور کم بینوں کو دکھائی نہیں دیتا۔ پھر ان کی شخصیت اپنے دور کی ایک اختلافی شخصیت بن کے رہ جاتی ہے

داد، بیداد، دوستداری اور دشمنی' عیال داری اور زبان و ادب کی خدمت گزاری کے درمیان اور دوران یوں زندگی بسر کرنا کہ کرتے پائجامے پر کہیں داغ نہ نظر آئے، جینے کا وہ ڈھب کہ جسے دیکھ کر اپنے خوش ہوں اور رشک کریں' غیر ناخوش ہوں اور جل بھن جائیں۔ اس طرح جینے کا ہنر سب کو کہاں آوے ہے؟ نیاز کو اس طرح زندگی کرنا آتا تھا۔ اس لئے عمر بھر رنجشوں، چپقلشوں، مخاصمتوں، طعنوں تشنوں' بد عاؤں، کفر کے فتوؤں، گالیوں اور مار ڈالنے کی دھمکیوں کے درمیان جی گئے۔ لوگوں کی گردنیں جھکا دیں اور خود سربلند رہے۔ جھکی اور ٹیڑھی گردنوں کے بیچ یہ سربلندی بھی بڑی بات ہے۔ حالانکہ "معافی نامہ" کی نوبت بھی آئی تو نیاز محمد خاں نے بر سرِ عام بمقام امینہ باد (لکھنؤ) بھرے جلسے میں معافی نامہ بھی پڑھ کر سُنا دیا اور ثابت کر دیا کہ وقت کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے جو شان لچک پیدا کرنے میں ہے وہ ٹوٹ جانے میں نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ معافی دنیا دار نیاز نے مانگ لی مگر وہ اپنے عقیدے سے دستبردار کبھی نہیں ہوئے۔ البتّہ وہ تحریریں کہ جنھیں پڑھ کر لوگ ناچتا ہوا شعلہ بن جاتے تھے نیاز نے ان پر باقاعدہ اپنے قلم کی سان نہیں رکھی' بس ذرا سا مس کر دیا، شخصیت کی آنچ میں تپایا

نہیں، نظریئے کی حدت کو شدت سے شامل نہیں کیا۔ تھوڑا سا خام رہنے دیا۔ جبکہ چیز وہی تھی، خریدار بھی وہی تھے لیکن تھوڑی سی شکل بدل دی، چنانچہ خرید و فروخت کا معیار بدل گیا۔ دراصل نیاز بیسویں صدی کے ہندوستان میں اٹھارہویں اور انیسویں صدی کی یوروپین روایات کو آناً فاناً عام کرنا چاہتے تھے۔ ظاہر ہے یہ ایک بڑا مشن تھا اور ایک ہستی کے بس کا روگ بھی نہیں تھا۔ لیکن نیاز اگر پورے طور پر کامیاب نہیں تو پورے طور پر ناکام بھی نہیں ہیں۔ خصوصاً برصغیر کے مسلمانوں میں عقلیت پسندی اور سائنٹیفک رجحان پیدا کرنے میں نیاز کا بہت بڑا حصہ ہے۔ وہ کسی چیز کے رد و قبول میں جوش کے بجائے ہوش کو ترجیح دیتے تھے (حالانکہ کہیں کہیں توازن قائم نہ رکھ سکے)۔ وہ مذہب کے معاملے میں موروثی مذہب کے نہیں عقلی مذہب کے قائل تھے۔ یہی سبب ہے کہ انھوں نے مذہب کو پورے ہوش و گوش اور چشم بینا کے ساتھ دیکھا بھالا اور جانچا پرکھا تھا۔ لوگوں سے بھی وہ اسی بات کا تقاضا کرتے تھے جس میں ان کی انتہا پسندی شامل رہتی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ نیاز غیر متوازن شخصیت کا نام ہے جسے مذہب بُلاتا ہے اور عقل دامن پکڑ کے کھینچتی ہے۔ مذہب و عقل کی یہ آویزش و پیکار نیاز کی ذات میں تا عمر جاری رہی۔ لوگوں کی پیشانی پر بل بھی آئے، مزہ بھی لیا اور سبق بھی۔ لکیر کے فقیر بنے رہنے والوں کو چھوڑ کر لوگ یہی چاہتے تھے کہ "چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسدؔ" اس لئے کہ یہ چھیڑ اُردو والوں کی جذباتیت کو کم کر رہی تھی، انھیں عقل کی عینک سے مذہب کے افہام و تفہیم کا راستہ بتا رہی تھی۔ اس سے لوگوں نے عقلیت و مذہبیت میں توازن پیدا کرنا سیکھا اور یار دوستوں کو سکھایا جس کی شروعات مرزا نوشہ نے کی تھی اور جس کی باقاعدہ بنیاد سرسید احمد خاں نے ڈالی تھی۔ نیاز نے غالب کی اُس متحرک مگر بے مہار عقلیت اور سرسید کی فعال مذہبی عقلیت کی توسیع کی ہے۔ یہ کام نیاز نے اپنی اکیلی جان سے انجام دیا۔ واضح رہے کہ غالب کی عقلیت میں ایک طرح کی آزادہ روی تھی جس پر آوارگی کا شائبہ بھی ہوتا ہے۔ سرسید و حالیؔ نے ان کی روایت کی ترتیب و تہذیب کی اور اس میں ترمیم و اضافہ کیا تاکہ برے اثرات نہ پیدا ہوں۔ سرسید کو عاقل اور قابل ساتھی مل گئے تھے سو ان کا کام آسان بھی ہوا اور پھیلا بھی تیزی سے۔ نیاز نے یہ کام تن تنہا کیا اس لئے اس میں ایک فرد کا ہمہمہ تو ہے لیکن ایک تحریک کی شان نہیں۔ تحریک فرد سے نہیں افراد سے پیدا ہوتی ہے اور آگے بڑھتی ہے۔ نیاز کو ہم قلم، ہم قدم، ہم خیال، ہم رنگ اور ہمہ رنگ اشخاص نہیں ملے۔ یہی سبب ہے کہ ان کا شرارہ شرارہ ہی رہا شعلہ نہ بن سکا کہ وہ دیر تک روشن رہتا اور کچھ دور دور اُس کی لپٹ جاتی۔

سرسید کی سلاست پسندی، اخلاق پرستی، اصلاحی جوش اور مقصدیت کے ردِّ عمل کے طور پر رُومانی تحریک کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ رومانی تحریک کا بنیادی مزاج، مسلک اور رجحان، اندیشہ ہائے دور دراز نہیں آرائشِ خمِ کاکُل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس تحریک سے جو شخصیتیں وابستہ رہیں وہ اپنی بے پناہ صلاحیتوں کے باوجود کوئی ٹھوس اور جامع نظریہ نہ دے سکیں۔ یہ سارا عمل گنگار پر عمارت بنانے کے مترادف تھا۔ ظاہر ہے کہ گنگار پر عمارت کا تصوّر ہی مضحکہ خیز ہے، حیرت زا بھی اور اندوہناک بھی۔ ان کی نظروں میں خیالوں کے شیش محل زیادہ مستحکم اور حسین تھے اور جہد و عمل کے روپ نگر بے معنی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں سادگی نہیں پرکاری ہے۔ دیواریں پھلانگنے کا حوصلہ تو ہے لیکن ان کی حسرتِ تعمیر نہیں۔ وقتی جوش تو ہے مگر دیرپا توانائی نہیں، کسی نہ کسی طرح کی مقصدیت تو ہے مگر لاسمتیت کا شکار ہے۔ نیاز کا دامن ان کی عقلیت کے باوصف کسی نہ کسی طور اس تحریک، ماحول اور نظامِ فکر کے کھونٹے سے بندھا رہا ہے۔

یہ نیاز کی شخصیت کا بہت بڑا تضاد ہے کہ وہ ایک طرف رومانی ہیں اور دوسری طرف عقلیت پسند، وہ قدیم و جدید ادب کو کھنگالنے، عربی، فارسی اور ہندی زبان و ادب کے منظر و پیش منظر سے آگہی رکھنے، ترکی اور انگریزی ادبیات و شعریات کے سیاق و سباق سے باخبر ہونے، تنقیدی بصیرت و بصارت سے مالا مال رہنے کے باوجود خیال سے زیادہ جذبے پر، روح سے زیادہ مادّے، مواد سے زیادہ فن پر توجہ دینے پر اصرار کرتے ہیں۔ اِسی لئے وہ رُومانی تحریک کے ستون ہوتے ہیں اور تاثراتی و جمالیاتی تنقید کے خانوادے کے معتبر و محترم رکن۔ نیاز کی ادبی و تنقیدی تحریروں میں یوروپ کے رُومانی، جمالیاتی اور تاثراتی ادیبوں اور نقادوں مثلاً لان جائی نس (Longinus)، والٹر پیٹر

(Walter Pater) ، کروچے (Croche) ، آسکر وائیلڈ (Oscar Wild) اور اسپنگرن (Spungarn) کے اثرات واضح طور پر نہ سہی لیکن کہیں کہیں مبہم شکل میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ گھوم پھر کر جن کا کعبہ تقریباً ایک ہی ٹھہرتا ہے فرق یہ ہے کہ یہ سب مختلف دروازوں سے اس میں داخل ہوتے ہیں۔ اس طرح نیاز کا تعلق یورپ کے اس ادبی اور تنقیدی دبستاں سے ہو جاتا ہے جس نے تاثراتی اور جمالیاتی رجحان کو عام کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

نیاز کی ناقدانہ فکر و نظر سے انکار ناممکن ہے۔ لیکن وہ کسی تخلیق میں حظ و مسرت کو تلاش کرتے ہیں۔ اس میں فن کے اصول و فروع سے بحث کرتے ہیں، مگر فن کار کی نفسیات سے اس فن پارہ کا کیا رشتہ ہے، سماج کے کس پہلو کو وہ آئینہ دکھا رہا ہے۔ اس سے نیاز بے نیاز نظر آتے ہیں۔ اس طرح وہ محض جمالیاتی اور تاثراتی نقاد بن کے رہ جاتے ہیں۔ خود نیاز کا خیال ہے :

"جب میں کسی شاعر کے کلام پر انتقادی نگاہ ڈالتا ہوں تو اس سے بحث نہیں کرتا کہ اس کے جذبات کیسے ہیں بلکہ صرف یہ کہ اس نے ان کے ظاہر کرنے میں کیا اسلوب اختیار کیا اور وہ ذہن سامع تک ان کو پہنچانے میں کامیاب ہوا ہے یا نہیں۔ بیان خواہ حسن و عشق کا ہو یا نہر کی ین چکی کا اس سے غرض نہیں۔ دیکھنے کی چیز صرف یہ ہے کہ شاعر جو کچھ کہنا چاہتا ہے وہ واقعی الفاظ سے ادا ہوتا بھی ہے یا نہیں۔"

——— (نیاز فتحپوری، انتقادیات۔ جلد ۱، ص ۳۳۹)

یہ اقتباس نیاز کے نظریۂ شعر و تنقید کو سمجھنے میں بنیادی حیثیت کا حامل ہے۔ نیاز نے فنِ تنقید پر کوئی مستقل کتاب تو نہیں لکھی ہے لیکن "انتقادیات" اور "مالہ و ماعلیہ" کی شکل میں ان کے جو تنقیدی مضامین کے مجموعے ہیں ان میں ان کے تنقیدی نظریات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ :

"وہ چیزوں کی حسن و خوبی کی تلاش میں اپنے وجدان اور تاثر کو اہمیت دیتے ہیں۔"

——— (ڈاکٹر شارب ردولوی، جدید اردو تنقید، اصول و نظریات ص ۳۰۲)

یہی وہ راستہ ہے کہ جس پر چل کر وہ جمالیاتی اور تاثراتی تنقید کے علمبردار بن جاتے ہیں حالانکہ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے لکھا ہے کہ :

"آخر میں آکر وہ ادب اور شعر کی سماجی اہمیت کے بھی قائل ہو گئے، لیکن تاثراتی اندازِ بیان بھی ان سے نہیں چھوٹا۔"

——— (ڈاکٹر عبادت بریلوی، اردو تنقید کا ارتقا ص ۳۳۲)

اس طرح کا خیال ڈاکٹر امیر عارفی نے بھی ظاہر کیا ہے کہ :

"نیاز تاثراتی دنیا سے نکلنا چاہتے ہیں لیکن وہ آخر تک تاثراتی طرزِ تنقید سے اپنے آپ کو آزاد نہ کر سکے۔"

——— (ڈاکٹر امیر عارفی، نیاز فتحپوری ص ۳۰)

بہرحال نیاز کے خیال میں تبدیلی یقیناً آئی لیکن اس کا کوئی عملی ثبوت نہیں ملتا ہے۔

نیاز نے "نگار" میں اپریل ۱۹۴۳ء سے "مالہ و ماعلیہ" کے زیرِ عنوان شعراء کا فنی نقطۂ نظر سے محاکمہ اور محاسبہ شروع کر دیا جو تقریباً چار سال جاری رہا۔ اس سلسلے کے تحت بعضوں کو کوتاہ قد بتایا اور بعضوں کو قد آور ثابت کیا۔ لکھتے ہیں :

"اس مہینے سے نگار میں ایک نئے باب کا آغاز ہوتا ہے۔ اس سے مقصود عہدِ حاضر کے مشہور شعراء کے کلام پر انتقادی نگاہ ڈالنا اور اس کے حسن و قبح کو متعین کرنا ہے۔"

——— (نیاز، مالہ و ماعلیہ، نگار، اپریل ۱۹۴۳ء)

ایک مقام پر انھوں نے لکھا ہے :

"جس طرح ایک نقاشی کا کمال یہ ہے کہ وہ خطوط کے امتزاج سے اصل منظر آپ کے سامنے لے آوے۔ اس طرح

ایک شاعر کا کمال یہ ہے کہ جو تاثرات اس کے دل میں پیدا ہوتے ہیں ان کو ایسے الفاظ و انداز سے ظاہر کرے کہ دوسرا بھی وہی کیفیت اپنے اندر محسوس کرے ۔" (نیاز، انتقادیات، حصہ دوم، ص ۶۲)

گویا نیاز کہنا یہ چاہتے ہیں کہ خیال تو آس پاس بکھرے پڑے ہیں، ہاتھ بڑھایئے اور اُٹھا لیجئے۔ پھر غیب سے بھی مضامین خیال میں آتے ہیں لیکن علم زبان و بیان، مطالعے اور مجاہدے، صحبت اور مشق سے حاصل ہوتا ہے۔ یہاں بزرگوں اور اساتذہ کے فیضانِ نظر کے ساتھ اپنا دامنِ نظر بھی وسیع ہونا چاہیئے۔ اسی لئے انھوں نے فنکاروں کی سخت گرفت کی ہے۔ یہاں تک کہ بعض اساتذۂ قدیم اور ماہرین فن کے کلام پر اصلاحی مشورے بھی دیئے ہیں جس سے معاصرین کی پیشانی پر بل پڑ گئے اور جب نیاز نے ان کی خبر لے ڈالی تو وہ جز بز ہوئے اور سنبھل بھی گئے۔ اب تازہ واردانِ بساطِ ادب تو حد درجہ محتاط ہو گئے کہ یہاں ایک برگزیدہ، سرد و گرم چشیدہ، اور بے باک ہستی کسوٹی لے کر بیٹھی ہے۔ ذرا بھی کھوٹ دل میں آئی، فن میں ملاوٹ کی گئی تو "نگار" کی عدالت میں حاضری اور باز پرس لازمی ہو جائے گی، جواب دیتے نہ بن پڑے گا، کئے کرائے پر پانی پھر جائے گا، نئی منزلوں کی آرزو اور جستجو خاک میں مل جائے گی اور ادب کی محفل سے مداخلتِ بے جا کے جرم میں بے دخل کر دیئے جاؤ گے۔ اسی لئے ڈاکٹر ظ۔ انصاری رقمطراز ہیں :

" نیاز کی نہایت مہذّب مگر کٹیلی تنقید سے ان کا کوئی ہمعصر نہیں بچا۔ نہ جوش، نہ جگر، نہ فراق نہ اثر۔ لیکن یہی وہ اہلِ نظر تھے جو نیاز کے علم و استعداد، قلم اور علم کو ہمیشہ نظر میں رکھتے اور اس سے بے نیاز نہیں رہتے تھے۔ نیاز نہ ہوتے تو نہ جانے کتنی فکر انگیز بحثیں نہ ہوتیں اور کتنی گمراہیاں سند کا درجہ حاصل کر کے سر پر چڑھ جاتیں ۔"

—— (ظ۔ انصاری، کتاب شناسی ص ۱۱۸-۱۱۷)

وہ مزید تحریر کرتے ہیں :

" اچھے مصنّف اور اچھی تنقید میں راہبر اور راہزن کا نہیں بلکہ ہمسفری کا رشتہ ہے۔ ایک دوسرے کو سہارا ملتا ہے۔ ہیاؤ کھلتا ہے۔ ذوق صیقل ہوتا رہتا ہے۔ یوں نہ ہو تو کھوٹے سکّے چلا کریں اور جوہری لُٹ جائیں ۔" (ایضاً)

نیاز کی منہ پھٹ، بے لاگ شخصیت اور ان کی تنقیدی بصیرت و خدمت کا اس سے بہتر تجزیہ اور کیا ہو گا؟

نیاز نے جہاں بعض فنکاروں کو سربلند و سرخرو کیا وہیں بعضوں کو سرنگوں اور بے آبرو بھی کرنا چاہا۔ جلالی اور جمالی دونوں خصوصیات ان میں بدرجۂ اتم تھیں۔ ان کی پسند و ناپسند کا معیار بس یہ تھا کہ خوش ہوئے تو "شاہ" نے نواز دیا، ناراض ہوئے تو سخت و سست کہہ دیا یا بددعا دے دی —— سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کی بددعائیں تاثیر سے خالی کیوں تھیں یا وہ بددعا کے لہجے میں دُعا دیتے کہ اس طرح جتنی گردنیں ان کے قلم کی دھار کے نیچے آئیں سرفراز ہو گئیں۔ انھوں نے اثر اور جگر، جوش و سیماب، ماہر اور اصغر کو رگیدا، محفلِ ادب میں ہم تخ ہوئی، دوستداری نے طرفداری دکھائی، حریفائی نے ناک بھوں چڑھایا، الہنے بھی دیئے گئے کہ یہ کیا طُرفہ تماشہ ہے مگر نیاز کی فنِ شعر سے کماحقہ واقف شخصیت، ضدی، اڑیل اور انتقامی فطرت کب کسی کو خاطر میں لاتی تھی، انھیں جو لکھنا تھا سو لکھ گئے۔ لیکن وہ ہستیاں بھی ایسی ویسی تھوڑے ہی تھیں کہ "نیازی وار" پر ڈھیر ہو جاتیں۔ وہ دبانے سے اور اُبھریں، اُن کے رُتبے میں بٹہ نہیں لگا۔ اتنا ضرور ہوا کہ محتاط ہو گئیں۔ البتہ کہنے والے یہ کہتے ہیں کہ نیاز کے اس رویّے سے ان کی تنقیدی بصیرت مشکوک ہو گئی، اس لئے کہ شاعری میں لفظ اور ادائیگی ہی سب کچھ نہیں ہے۔ خیال بہرحال مقدم ہے —— مجھے اس اعتراض پر نہ تعجب ہے اور نہ افسوس؟ ناچیز مشورہ یہ ہے کہ یہاں نیاز کی رگوں میں اس لہو کے رقص و رم کو دیکھنا چاہیئے جو خاں صاحبی تھا، ان کے اس ماحول پر نگاہ ڈالنی چاہیئے جس میں ان کی افتاد پرداخت ہوئی، جہاں شعر کے تجزیے کے اصول و معیار خالصتاً مشرقی تھے، ان کی اس معرکہ آرا، ہنگامہ پرور، اضطراب آسا اور ضدی شخصیت کی تحلیلِ نفسی کرنی چاہیئے جو لوگوں کو ذرا کم گانٹھتی تھی، جس نے زمانے کو خوش کم رکھا اور خود زمانے سے ناخوش زیادہ رہی، جس نے لوگوں کو ہدفِ ملامت بنایا لیکن خود ملامت کا نشانہ بنی۔

نیاز بیسویں صدی کے تیسرے دہے سے تین دہائیوں سے زائد عرصے تک اپنے نقد و تبصرے اور تحلیل و تجزیے کی بدولت اُردو ادب پر ایک سخت گیر، بے جھجک اور اپنی پسند کا بے لاگ اظہار کرنے والے نقاد کی حیثیت سے چھائے رہے حالانکہ ان کی تنقیدات ان کی شخصیت کی طرح غیر متوازن ہیں، مگر ہر جگہ نہیں۔ انھیں ایک طرف اصغر کی متصوفانہ شاعری "جھاڑ پھونک" والی معلوم ہوتی ہے، جوش محض الفاظ کے انبار لگانے والے نظر آتے ہیں۔ تغزل کی کمی کی وجہ سے سیماب کا کلام "بے نمک" محسوس ہوتا ہے تو دوسری طرف شیفتہ کے "گلشنِ بے خار" میں میاں نظیر کو "طبقۂ جہلا" کا شاعر قرار دینے اور صاحبِ آبِ حیات کے استاد ذوق کو غالب کے سامنے بانس پر چڑھانے اور مومن کو نظرانداز کر جانے سے جو غلط فہمی پیدا ہوئی، نیاز نے اس کا ازالہ کیا۔ نظیر کا مرتبہ متعین کیا پھر دیکھتے ہی دیکھتے ترقی پسندوں نے میاں نظیر کو اُردو کا اوّلین عوامی شاعر ثابت کر دکھایا۔ واقعہ بھی یہی ہے کہ نظیر ۱۸ ویں اور ۱۹ ویں شتابدی کا پہلا اور آخری عوامی شاعر ہے۔ گو کہ نیاز نے اُسے دوسرے پہلوؤں سے دیکھا ہے لیکن اوّل اوّل لوگوں کو اس کی جانب متوجہ کرنے کا کریڈٹ نیاز ہی کو جاتا ہے۔ انھوں نے مومن کو "اسلوب اور ندرتِ بیان کا بادشاہ" کہہ کر اس کی انفرادیت اُجاگر کی مگر یہاں ہاتھ سے توازن کا "دامن چھوٹا جاتا ہے"۔ انھیں مومن کے مقابل غالب بھی بس یوں ہی سے نظر آتے ہیں۔ غرض انھوں نے مومن کو اہمیت تو جتائی لیکن مدلّل مداحی کی صورت میں عظیم الشان سلطنتِ مغلیہ اپنے دمِ آخریں میں صرف قلعۂ معلّیٰ میں محصور ہو کے رہ گئی تھی۔ ظفر اسی کی طرح سمٹا سمٹایا شاعر تھا۔ نیاز نے اُسے نئے زاویے سے پرکھا، اس کی افسردگی اور دلکشی کو آئینہ کیا۔ اس طرح بہت سے شاعروں کے فن پر اپنے مخصوص انداز میں روشنی ڈالی، پرانے شعرا کی بازیافت کی، نئے شاعروں کے معیار و قدر کی جستجو کی، زبان و بیان، روزمرّہ اور محاورے پر گرفت کی تاکہ کج روی، سہل انگاری اور بے احتیاطی راہ نہ پا سکیں ورنہ شاعری کا معیار گر جائے گا۔ ظاہر ہے شاعری صرف لفظوں کا آرٹ نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے مگر اس میں لفظوں کی اہمیت سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا ہے۔ لفظ وسیلہ ہوتے ہیں جذبے اور تخیّل کی ترسیل و ابلاغ کا۔ اسی لئے ان کے یہاں لفظ اور اسلوب پر اتنا زور ملتا ہے۔ مختلف طرح کی تنقیدوں کے ساتھ لفظیاتی یا اسلوبیاتی تنقید کو بے مایہ نہیں سمجھنا چاہیے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے لکھا ہے:

> "...... نیاز اُردو انتقاد کی تاریخ میں امتیازی مقام رکھتے ہیں اور ان کا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے "ناتمام" اور "نارسا" شاعری میں سخت گرفت کی ہے۔ انھوں نے اس سہل انگاری کے خلاف احتجاج کیا ہے جو شاعر کو اس کے فن کے بارے میں کام چور بنا دیتی ہے۔ شاعری کے چمن میں "سبزۂ بیگانہ" کی نمود نیاز کو ایک آنکھ نہیں بھاتی ــــ اور "سبزۂ بیگانہ" سے مراد وہ کھردری بے ساختگی ہے جو شاعری کے خلاف آواز بلند کر کے اُردو ادب پر بڑا احسان کیا ہے"
>
> ــــ (نگار (نیاز نمبر) حصہ اوّل، مرتبہ: فرمان فتح پوری ص ۲۱۴)

یہ بہت بڑا کام تھا جو نیاز نے کیا۔ جب جب تنقید نگار نیاز کا محاسبہ اور محاکمہ کیا جائے گا وہ اسی صورت میں ابھریں گے اور اسی زاویے سے ان کی پرکھ ہوتی رہے گی۔

"تہذیب الاخلاق"، "مخزن" اور "نگار" یہ ایک ہی زنجیر کی کڑیاں ہیں، ایک دوسرے سے گتھی اور ایک دوسرے کو سہارا دیتی ہوئی تہذیب الاخلاق نے لوگوں کے اخلاق کی تہذیب کی، ذہنوں کو صیقل اور رُوح کو بالیدہ کیا۔ علمی، مذہبی، سیاسی، معاشی، ثقافتی، تعلیمی اور ادبی بصیرت و بصارت عام کی، مخزن نے علمی اور ادبی مذاق کو جلا بخشی، نگار نے زندگی کے ہر شعبے کی ترجمانی کی اور آس پاس بکھرے ہوئے مسائل و موضوعات کو کڑی نظر سے دیکھا، تنقیدی زاویے سے پرکھا اور لوگوں کو جتایا کہ یہ ہے اعلیٰ پائے کا علمی اور ادبی ذوق و شعور۔ ان رسالوں کو محض "رسالہ" کہہ کر گزر جانا ادبی اور تحقیقی بددیانتی ہوگی۔ امر واقعہ یہ ہے کہ یہ رسالے اپنے وقتوں میں ایک تحریک نہ سہی لیکن ایک رجحان بن کر اُبھرے اور ایک زمانے کو متاثر کیا۔

"تہذیب الاخلاق" کے ذریعے سرسید اور ان کے رفقاء نے جس "عقلیت اور جدید فکر و نظر کی بنیاد رکھی" نیاز فتح پوری نے اسی

روایت کو آگے بڑھایا اور اس کی توسیع کی۔ یہ گراں قدر کام انھوں نے تقریباً چالیس سال تک انجام دیا۔ گویا اپنی عمر عزیز کے بہترین ماہ و سال اس کے لئے تج دیئے۔ نیت کے خلوص، ارادے کی پختگی اور حوصلے کی گرمی سے شیشہ چٹخ جاتا ہے، زنجیریں پگھل جاتی ہیں اور انسان ماہ و سال کی گردش پر غالب آجاتا ہے سو نیاز کی پیشانی سے ٹپکا ہوا پسینہ رائیگاں نہیں گیا۔ زمین میں جذب نہیں ہوا، سیاہی کی بوند بن کر موئے قلم سے نگار کے صفحات پر بکھر گیا اور نیاز کو امر کر گیا۔

واقعہ یہ ہے کہ سرسید کے گرد ان کے لائق و فائق رفقا اور علم و عمل سے آشنا نیاز مندوں کا حلقہ تھا۔ "مخزن" والے سر عبدالقادر کے ہم قدم اور ہم رکاب ڈاکٹر دین محمد تاثیر اور ڈاکٹر سر محمد اقبال جیسے لوگ تھے۔ لیکن نیاز کا جگر دیکھئے کہ انھیں کسی سہارے کی ضرورت نہیں۔ فن کاروں کی نگارشات موصول ہوتی ہیں تو ٹھیک اور نہیں ہوتی ہیں تو ٹھیک۔ اتنا دم خم ہے کہ نگار چھاپہ خانے سے نکلے گا اور وقت پر نکلے گا۔ یہ نیاز کی اکیلی ذات ہے کہ جو بیک وقت ناقد، محقق، افسانہ نگار، مذہبی اسکالر، مضمون نویس، مبصر، انشائیہ نگار اور ایڈیٹر ــــ سب کے فرائض بخوبی انجام دے رہی ہے۔ کیا مجال کہ رسالہ پایۂ اعتبار و وقار سے گرے کہ حریفوں کو انگشت نمائی کا موقعہ ہاتھ آئے۔ نیاز نے ایسے یادگار اور خاص نمبر نکال دیئے کہ جو دستاویز کا درجہ رکھتے ہیں۔ مولوی عبدالحق نے دکن کے ادبی دفینوں کو تحقیق کے ناخن سے کریدا، تنقید کی نگاہ سے پرکھا اور انھیں چھاپہ خانے سے گزار کر منظر عام پر لانے کا فریضہ انجام دیا۔ اس طرح ہماری قدیم اُردو (دکنی اردو) کے فن پاروں اور فنکاروں کو تابندگی بخشی۔ نیاز نے نظیر و مصحفی، مومن و ظفر اور ریاض و حسرت وغیرہ کے خاص نمبر نکال کر دوسرے فنکاروں پر وقتاً فوقتاً مضامین لکھ کر انھیں معتبر و مؤقر بنایا۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ نگار کے خاص نمبروں کی بدولت لوگ صاحبِ کتاب ہوکر سربلند و سرخرو، نیک نام و شادکام ہوگئے۔ واقعی کیا شخص تھا اور کیسے کیسے کام کر گیا!

عام طور پر علمی اور ادبی رسالے نکالنا گھاٹے کا سودا ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ وہ شاخ ہے جو برگ و بار نہیں لاتی۔ حسرت موہانی نے "اردوئے معلّی" کے لئے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا۔ جریدہ کی ادارت، علمیت اور ادبیت سے کسی کو انکار کی جرأت نہیں ہوسکتی، لیکن وہ بھی سرسبز نہ ہوسکے۔ مگر کچھ لوگ ایسے بھی گزرے ہیں کہ جب کوئی Product بناتے ہیں تو اس کے لئے منڈی بھی ڈھونڈ نکالتے ہیں اور خریدار بھی لے آتے ہیں۔ محمد طفیل نے "نقوش" کی کچھ اس طرح اپنے خون پسینے سے آبیاری کی کہ اس کے پھلوں سے مُنہ کا مزہ بدلا، پیٹ بھی بھرا۔ پھولوں سے زندگی کو سجایا، سنوارا اور اس کے سائے میں دم بھی لیا۔ کہا جاتا ہے کہ عالم و فاضل پیسے کمانے کے معاملے میں "بے ہنرا" ہوتا ہے۔ نیاز علم و فضل کے باب میں دیو پیکر شخصیت کا نام ہے۔ لیکن وہ "نقد زر" کے حصول میں اکھڑ اور بدسلیقہ نہ تھے چنانچہ "نگار" شائع کرتے رہے علمی آن بان اور ادبی وزن و وقار کے ساتھ۔ مگر کیا مجال کہ سبھاؤ اور رکھ رکھاؤ میں کوئی فرق آیا ہو۔ وضع داری اور طرحداری برقرار رہی۔ تن کے اُجلے اُجلے کپڑے اُجلے ہی ہوتے گئے اور من کی دھول (غبارِ خاطر)، ذہن کی روشنی، قلم کی روشنائی کورے کاغذ پر فن بن کر بکھرتی اور پھیلتی گئی جو علم و فن اور ادب و شعر کے متوالوں کو نیاز سے بے نیاز نہیں رکھ سکتی۔

خطوط میں ذہن کے دریچے کھلتے ہیں اور دل کے کواڑ باز ہوتے ہیں۔ دنیا کے مشاہدے، زندگی کے تجربے اور کتب کے مطالعے کا نچوڑ ہوتا ہے۔ لیکن علمیت، قاموسیت یا بقراطیت کے انداز میں نہیں بلکہ روزمرہ کی زبان میں روزمرہ کی باتیں سامنے والے (مخاطب یا مکتوب الیہ) سے کی جاتی ہیں۔ ڈرائنگ روم میں تو پھر بھی محتاط رہنا پڑتا ہے۔ سینہ کے دفینے دائیں بائیں آگے پیچھے دیکھ کر، گرد و پیش سے باخبر ہوکر کھولے جاتے ہیں۔ مگر شبستانِ تنہائی میں جو بے تکلفانہ، بے نیازانہ اور بے حجابانہ فضا ہوتی ہے۔ خطوط اسی فضا یا ماحول کے مماثل ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر جانسن نے کہا تھا:

"انسان کے مکتوبات میں اس کی رُوح برہنہ ہوجاتی ہے۔"

اصل خطوط ایک پیمانہ ہوتے ہیں جن سے انسان کے نفس اور نفسیات کی پیمائش و فہمائش کی جاسکتی ہے۔ چنانچہ مکاتیب غالب میں ہم "پورے غالب" کو دیکھ سکتے ہیں۔ شبلی کے "نامہ ہائے شوق" میں "الفاروق"، "المامون"، "سیرۃ النبی"، "شعرالعجم"، "الکلام" اور "علم الکلام" والے شبلی سے مختلف شبلی جھلک رہے ہیں ــــ مگر نیاز کا معاملہ ان کے بالکل برعکس ہے۔ نیاز کی مختلف تحریریں ان کی رومانیت، جذباتیت اور عقلیت

کی غمازی کرتی ہیں۔ یہ بات ان کے خطوط میں بھی ہے لیکن خطوں میں گھریلو فضا نہیں ہے۔ معلوم پڑتا ہے کہ کلف کیا کُرتا یا مُجامہ زیب تن ہے، اچکن کے بند گلے تک لگے ہوئے ہیں، پَیر موزے میں ملفوف ہیں، جُوتے کسے بندھے ہوئے ہیں اور مخاطب گو کہ پڑھا لکھا اور با ذوق ہے لیکن اس پر اپنی ہمہ دانی کا رعب جمایا جا رہا ہے۔ واضح رہے کہ خطوط داب دبدبے، تصنّع، علمیت، ادبیت، شعریت اور لئے دئے رہنے والے ماحول میں نمو اور نمود نہیں پلتے۔ یہاں زبان و ذہن، نظر و جگر، جذبہ و قلم کو ڈھیل دینی چاہئے تاکہ دل کا غبار بے اختیار رقم ہو سکے۔ اگر ایسا نہیں کیا جاتا تو گویا خطوط علم کا پشتارہ بن کے رہ جاتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ "خط لکھا نہیں جاتا بس ہو جایا کرتا ہے"۔ مگر قصداً اور کہیں کہیں جبراً لکھا ہے اس لئے ان کے خطوط عالمانہ ہیں شعریت سے بھرپور ہیں۔ ان میں فلسفہ و مذہب اور شعر و ادب کی عقدہ کشائیاں ہیں۔ گرچہ ان میں زمین و زماں کے قصّے، زندگی کے مسئلے مسائل بھی ہیں۔ صداقت بھی ہے مگر دم یخت نہیں، خلوص ہے مگر ادھ کچرا، جذبات ہے مگر تولیدہ اور نیم بالیدہ۔ دلگی بھی ہے مگر دل کی لگی نہیں ہے، پرکاری ہے مگر وہ سادگی نہیں جس سے خطوط میں بانکپن پیدا ہوتا ہے۔ غرض کتابی باتیں ہیں جو کتابوں کے ساختہ پرداختہ لوگوں سے کی جا رہی ہیں ـــــ خواہ قاضی عبدالغفار کی "لیلیٰ کے خطوط" ہو، مولانا ابوالکلام آزاد کی "غبارِ خاطر" ہو یا "مکتوباتِ نیاز" ـــــ یہ سب خطوط کے پیرائے میں مضامین ہیں۔ مختلف مسائل و موضوعات پر جن میں انشا پردازی کا رنگ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ خطوط کہیں کہیں "انشائیہ" سے قریب ہو جاتے ہیں۔

ایک اچھی کہانی کی خوبی یہ ہے کہ کہانی کار کے جادو نگار قلم سے افسانہ، صداقت، اور صداقت، افسانہ بن جائے۔ پریم چند کے "کفن"، "شطرنج کے کھلاڑی"، کرشن کے "کالو بھنگی"، "مہالکشمی کا پُل"، منٹو کے "دھواں"، "کالی شلوار"، "لو"، بیدی کے "کوٹ"، "لاجونتی" سریندر پرکاش کے "بجوکا"، "بازگوئی"، سلام بن رزاق کے "کام دھینو"، انور خان کے "کوّوں سے ڈھکا آسمان" وغیرہ کی خوبی یہی ہے۔ نیاز کی افسانہ نگاری کھچڑی کا اُبال تھی۔ آہستہ آہستہ پانی بخارات بن کے اُڑتا گیا۔ کھچڑی گل جانے، پانی کے جل جلنے یا اُڑ جانے کے بعد دم کھا گئی۔ یہاں دم کھانے سے مراد نیاز کی افسانہ نگاری کا دم توڑ جانا ہے۔ شہاب کی "سرگزشت"، "کیوپڈ اور سائیکی"، "شاعر کا انجام"، "حمرا کا گلاب" نیاز کے اور اس دور کے نمائندہ افسانے ہیں۔ بے شک ان میں جذبات کی دھوپ چھاؤں ہے۔ رومانیت کا زیر و بم ہے اور زبان پر دسترس کا جوہر بھی مگر یہ افسانوی صداقت سے بے بہرہ ہیں۔ ان میں خواب آسا، تعبیر نا آشنا زندگی کی توجیہہ نہیں ہے۔ افسانہ خلا میں پیدا نہیں ہوتا۔ زمین و زماں اور زندگی کی کوکھ سے جنم لیتا ہے۔ حقیقی افسانہ اس "تثلیث" کا ہاتھ پکڑ کے، اس سے آنکھ ملا کر اور سینہ رگڑ کے چلتا ہے تاکہ وہ اس "تثلیث" کے وجود کو محسوس کرتا رہے اور اسے اپنے ہونے کا احساس دلاتا رہے۔ مگر نیاز کے یہاں بس رومانی رویّہ ہے، زندگی کا اکہرا پن ہے۔ ہشت پہلو اور ہمہ رنگ زندگی کی تفسیر و ترجمانی نہیں جبکہ ان کی افسانہ نگاری کے پچھواڑے داستان اور کہانی کی درمیانی کڑی (ناول) کی جھنکار "توبۃ النصوح"، "فسانۂ آزاد" اور "امراؤ جان" ادا کی شکل میں گونج رہی تھی۔ پریم چند نے اس جھنکار یا روایت سے اپنے فن کا رشتہ جوڑا اور نئی روایت بنائی جو کل بھی تازہ اور توانا تھی اور آج بھی ہے۔ نیاز Flowery Language اور Fantasy کے پھیر میں پڑ گئے۔ حالانکہ اس کے لئے "ادبِ لطیف" کا میدان موجود تھا۔ مجنوں بھی اس راہ پر چلے تھے مگر جلد ہی سنبھل گئے۔ پھر تاثراتی تنقید کی راہ سے مارکسی اور سائنٹفک تنقید تک پہنچے۔ نیاز نے بھی ان کا رُخ موڑا مگر تاثراتی اور جمالیاتی تنقید میں پھنس کر رہ گئے۔ جو وقت بچا وہ اِدھر اُدھر منہ مارنے، مذہب کی نئی توجیہات، مذہبی علماء سے تکرار و تصادم میں صرف ہوا۔ حالانکہ ان کی مساعی ضائع نہیں گئیں۔ آج بھی تعلیم یافتہ نسل میں ان کے نقوش و اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔

بہرحال نیاز سمجھ گئے تھے کہ پریم چند کی افسانہ نگاری کا چلن عام ہو رہا ہے۔ بہت جلد ہم اور ہمارے افسانے out of date قرار دے دئے جائیں گے۔ لہٰذا انھوں نے اپنی "افسانہ طرازی" کا دفتر لپیٹ دیا اور قلم کا رُخ دوسری سمتوں میں موڑ دیا۔ قصّہ اور کردار نگاری کے اعتبار سے نیاز کے افسانے بے جان ہیں۔ ان میں نری جذباتیت ہے حقیقت نگاری نہیں۔ زبان کے داؤ پیچ ہیں سادگیٔ بیان نہیں۔ اس طرح کی افسانہ نگاری اس دور (۱۹۱۰ء تا ۱۹۳۰ء) کا غالب رجحان تھا۔ یہ افسانے ایک رجحان یا اسلوب کے طور پر یادگار ہیں اور اُردو افسانے کی تاریخ میں حوالے کی چیز سمجھے جائیں گے۔

لوگوں کا خیال ہے کہ نیاز "ابوالکلامی نثر" کے رسیا تھے۔ یہ کہنے والے اس پہلو پر غور نہیں کرتے کہ دونوں کا زمانہ اور ماحول ایک ہے۔ دونوں کا ادبی سفر رومانی تحریک کے سائے سائے جاری رہا، دونوں کے فکری اور ادبی ڈانڈے کہیں نہ کہیں ملتے ضرور ہیں۔ دونوں کو عربی اور فارسی پر عبور ہے۔ اس لئے بعض جگہوں پر نیاز کی نثر میں "ابوالکلامی نثر" کا دھوکہ ہوتا ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ دونوں کا دائرۂ کار جُداگانہ ہے، دونوں مختلف دوکانوں سے قلم، قلمدان اور روشنائی حاصل کرتے ہیں۔ جہاں نیاز کی پائے نگاہ میں زنجیر پڑ جاتی ہے ابوالکلام وہاں سے سرسری گزر جاتے ہیں۔ اور جہاں ابوالکلام اپنے قدم جماتے ہیں نیاز بے نیازانہ بڑھ جاتے ہیں۔ دونوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ ابوالکلام کے یہاں جلال، افتخار اور سکوت کا عالم زیادہ ہے اور نیاز کے یہاں جمال، وقار اور اضطراب کی کیفیت۔ آزاد کے یہاں خاموشی بولتی ہے، نیاز خاموشی کو زبان دیتے ہیں۔ ایک کی شیروانی کے بٹن گلے تک بند ہیں لیکن من اور تن کی گرمی کو صبر و سکون سے جھیل رہا ہے۔ دوسرے کے کرتے کا گریباں ادھ کھلا ہے۔ پائجامے کے پائینچے بھی چوڑے ہیں مگر فضا میں آکسیجن کی کمی کا شاکی ہے۔ ایک مزاجاً سنگ و آہن ہے، دوسرا فطرتاً سیماب صفت، ایک درگزر کرنے والا، دوسرا گرفت کرنے والا۔ ایک کے یہاں شیشہ چٹختا ہے تو وہ ایک جلوے سے کئی جلوے پیدا کر لیتا ہے، دوسرا شیشہ ڈھالتا ہے اور اس میں جامِ جم کا سماں لے آتا ہے۔

لوگوں کا ایک خیال یہ بھی ہے کہ نیاز کے یہاں سجاد حیدر یلدرم اور رابندر ناتھ ٹیگور کا اسلوب و آہنگ ملتا ہے۔ دراصل یلدرم انگریزی، فارسی اور ترکی زبانوں سے بخوبی واقف تھے اور ٹیگور تو بنگالی کے ساتھ ساتھ انگریزی کے بھی شاعر تھے۔ جہاں تک نیاز کی بات ہے تو وہ ان مذکورہ زبانوں پر بشمول عربی اور ہندی دسترس رکھتے تھے۔ نیاز ان بزرگوں کا دامن پکڑ کے کچھ دور گئے ضرور مگر پھر مڑ گئے اور مڑتے مڑتے انھیں تبرّکاً جو کچھ ملا ہے اس کی بنیاد پر لوگ کہتے ہیں کہ ان کے یہاں "یلدرمی" اور "ٹیگوری" اثرات ملتے ہیں۔ واضح رہے کہ ان اثرات میں تقلید بیجا کی جھلک نہیں ہے کہ جو خودی کو ناکارہ بنا دیتی ہے۔ یہاں اقتدا سے زیادہ اجتہاد کا رنگ ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس "اجتہاد" کے اثرات دور رس اور دیرپا نہیں۔ نیاز کی نثر بہت اعلیٰ پائے کی نثر نہیں ہے۔ ان کی نثر میں آمد نہیں آورد کی فضا ہے۔ بینترے بازی زیادہ ہے اور جگر کاوی کم۔ استعاروں اور تراکیب کی چمک ہے لیکن خلوص کی آنچ نہیں۔ آراستگی ہے بے ساختگی نہیں۔ عربی اور فارسی کی قاموسیت اور تعبیراطیت بگھارنا مقصود معلوم ہوتا ہے۔ لکھنا اس لئے چاہتے ہیں کہ مجبور ہیں، دل کا غبار نکلے تو کیسے؟ الفاظ کے ٹھٹ اس لئے لگاتے ہیں کہ گویا کسرتی بدن، تیل پلائی مونچھوں والے لٹھ لئے دوار پر کھڑے دھمکیاں دے رہے ہیں۔ عزیز احمد نے جوش کے متعلق لکھا تھا "وہ الفاظ کی آڑھت کرتا ہے" نثر میں نیاز نے بھی ہر جگہ نہ صحیح مگر اکثر یہی کیا ہے۔ ان کی تحریروں میں توازن اور سلامت روی کی کمی ہے۔ بس ہٹو بچو کا انداز ہے۔ وہ ابر بن کے چھاتے ہیں، گرجتے ہیں، کڑکتے ہیں لیکن برستے نہیں۔ پیاسی زمینیں اساڑھ کا بادل سمجھ بیٹھتی ہیں۔ مگر جلد ہی یہ طلسم ٹوٹ جاتا ہے۔ سرابِ خاک، سرابِ خاک ہی موج معتبر نہیں۔

نیاز کا اسلوب مہدی افادی، سجاد انصاری اور میر ناصر علی سے قدرے مختلف ضرور ہے لیکن منفرد و بلند نہیں۔ "عورت" ان تینوں کا محبوب و مرغوب موضوع ہے۔ نیاز بھی اسی کوچے کے آدمی ہیں لیکن ان کے یہاں تینوں کی سی نزاکتِ خیال اور لطافتِ بیان نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ الفاظ کو تراشتے نہیں، ان کو آنکتے ہیں، بے دھڑک استعمال کر جاتے ہیں۔ تکرار و خطابت سرکار، دربار اور بازار میں کتنے ہی گل کھلائیں لیکن تحریر کا عیب ہیں۔ نیاز کی تحریریں اس عیب سے پاک نہیں۔ میری ان باتوں کو تصدیق ڈاکٹر محمد حسن کی اس رائے سے ہوتی ہے :

> "...... جس (نثر) میں جادو ہے، مگر توانائی نہیں، سیلاب رنگ و نور ہے، گہرائی اور عظمت نہیں، رنگینی ہے صلابت نہیں۔ اچھی نثر کا بنیادی معیار ہی یہ ہے کہ اس میں سلاست ہو، ربط و تسلسل ہو۔ وہ آئینہ نہ ہو کہ اس کے حسن میں نگاہیں اُلجھ کر رہ جائیں۔ شیشہ ہو جس سے نگاہیں پار ہو کر اس مفہوم تک پہنچ سکیں، جو اس کے ذریعے ادا ہوا ہے۔ نیاز کی نثر جذبے کا پیکر ہے، رعنائی فکر کا نہیں، اسی لئے وہ اپنی ساری رنگ آمیزی کے باوجود گذرے ہوئے کل کی یادگار ہے، آنے والے کل کا نشان نہیں ہے۔" (محمد حسن : شناسا چہرے۔ ص ۱۲)

بہر حال نیاز کی نثر بہت بلند و منفرد نہ بھی لیکن اس میں شعریت اور ادبیت ہے، زندگی اور زندہ دلی ہے، ان کی طبع کی بانکی شخصیت کا بانکپن ہے جس نے اردو نثر کو سہارا دیا ہے۔

سوال یہ ہے کہ نیاز کا اپنا رنگ کیا ہے اور کہاں ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ نیاز کی ورق گردان خواہ کتاب کی ہو، زندگی یا دنیا کی۔ رائیگاں نہیں گئی۔ ان کی عرق ریزی اور ذہانت نے ہر جگہ چھاپ چھوڑی ہے (گو دیرپا اور توانا نہ سہی)۔ وہ جب خواہ مخواہ کی علمیت نہیں بگھارتے، دور کی کوڑی نہیں لاتے، سامنے کی بات کرتے ہیں، زبان کی علویت میں تھوڑی سی عوامیت شامل کر دیتے ہیں۔ اپنی نظر اور نظریئے میں روایت اور درایت، قدامت اور جدت کا خوشگوار امتزاج پیدا کرتے ہیں، ذہن و دل کو مصافحہ اور معانقہ پر مجبور کرتے ہیں، وہاں "نیازیت" دیکھی جا سکتی ہے۔

نیاز ایک ماہر لسانیات اور لغت داں تھے۔ انھوں نے جہاں نئی ترکیبیں تراشیں، نئی اصطلاحیں وضع کیں وہیں بعض ثقیل اور بھدی تراکیب و اصطلاحات پر انھیں روکا اور ٹوکا بھی گیا۔ حالانکہ ترکیبوں اور اصطلاحوں کے ضمن میں نیاز کی خدمات مہدی افادی اور قاضی عبدالغفار کی خدمات کے مقابلے میں وسیع اور وقیع ہیں۔ وہ ترکی اور انگریزی پر ماہرانہ دسترس رکھتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے ترکی ادب کی جن نگارشات کا ترجمہ کیا ہے ان پر طبع زاد کا گماں ہوتا ہے۔ انھوں نے انگریزی سے بھی استفادہ کیا اور اردو والوں کو فیض پہنچایا۔

وہ بڑے دل گردے کے آدمی تھے۔ جو سوچ لیتے تھے وہ کر گزرتے تھے۔ جو کہہ دیتے تھے اس پر اٹل رہتے تھے۔ مذہبی مباحث کو چھیڑا۔ مگر ان پر ادبیت اور علمیت کا غلاف یوں چڑھا دیا کہ ساحل سے سمندر کا نظارہ کرنے والی نگاہیں موجوں کے پیچ و تاب کو نہ سمجھ سکیں۔ اور منطق و استدلال کا اتنا لدان کر دیا کہ ہلکے پھلکے ذہن والے وہاں تک پہنچ ہی نہ سکے۔ نوبت طنز و تعریض سے دشنام طرازی تک پہنچی مگر نیاز گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوئے۔ البتہ ان کی جذباتیت اور علمیت کو ایندھن ملا۔ چنانچہ یہ خوب بھڑکیں۔ ان کے بھڑکنے پر لمبی داڑھی، اونچی پگڑی اور ڈھیلی ڈھالی عبا قبا والے چراغ پا ہو گئے۔ لیکن نیاز موم کے بنے تھوڑے ہی تھے کہ پگھل جاتے۔ لوگوں نے انھیں دبانا چاہا تو وہ اور بے باک ہو گئے۔ طرہ یہ کہ ذرا آزاد اہلِ فکر و نظر نے ان کی تحسین کی تو ان کے اشہب قلم کو بیک وقت شہہ بھی ملی اور مہمیز بھی۔ پھر کیا تھا رَن میں بڑی دھول اڑی مگر خیر گزری کہ خون خرابہ نہیں ہوا۔

سرسید اور ان کے رفقاء میں مختلف علوم پر کسی کی معلومات کا دائرہ سب سے وسیع تھا تو وہ مولانا شبلی نعمانی تھے۔ ان کے بعد یہ ہمہ جہتی، مختلف علوم سے آگہی جن چند لوگوں کو نصیب ہوئی ان میں نیاز فتح پوری بھی تھے۔ انھیں اپنے علم پر اعتماد تھا کہ انھوں نے بُت، تراشے لیکن پرستش نہیں کی۔ بتوں نے جب پرستش کا سوال اٹھایا تو نیاز نے انھیں اپنے قلم کی ضرب سے سرنگوں کر دیا۔ وہ ہنر آذری اور شیوۂ بت شکنی دونوں سے واقف تھے، انھیں دلبری سے زیادہ قاہری عزیز تھی۔

وہ لگ بھگ آٹھ دہائیوں تک جیئے، ہزاروں صفحات سیاہ کر دیئے۔ جتنا لکھا اس سے کئی گنا اپنی نظروں سے پی گئے۔ علم کا پینا اور وہ بھی ڈگڈگا کے پینا آسان نہیں ہے۔ بڑا حوصلہ اور جگر چاہیئے۔ معدہ اگر قوی نہیں ہوگا تو بد ہضمی یقینی ہے اور علم کی بد ہضمی بے راہ روی کے کوچے تک لے جاتی ہے جہاں آزادہ روی کو تو برداشت کیا جا سکتا ہے لیکن آوارگی بڑی بلا ہے۔ تن کے کپڑے اُتروا دیتی ہے۔ بے داغ زندگی داغ داغ ہو جاتی ہے۔

اپنے علم، لگن اور شوق کی بدولت انھوں نے تقریباً چھ دہائیوں تک لکھا۔ کیا مجال کہ اپنے قلم کا بھاؤ منڈی میں مندا ہونے دیا ہو۔ ان کی دوکان پر نظر ڈالیئے تو وہ Standard Quality ہے اور ہر طرح طرح کا مال Well - decorated کا دستیاب ہے۔ گویا ایک General Store ہے۔ منہ کھولئے، من پسند چیز لیجئے۔ نفسیات، جنس، سیاست، فلسفہ، تاریخ، مذہب، ادب۔ کس کس پر ان کی نظر تھی۔ گہری اور کڑی نظر۔ کن کن دفینوں کے راز ان کا قلم اگلتا تھا کہ حیرت ہے اور رشک بھی۔ ایسے لوگ مدتوں میں پیدا ہوتے ہیں اور جب اس جہاں سے سدھار جاتے ہیں تو مدتوں جام و پیمانے دل گرفتہ و دلگیر رہتے ہیں۔

"خدا نمبر" (نگار کا ایک نہایت اہم تہذیبی رسالہ)

اور قدیم مذاہب کی روایت

از: تنویر احمد علوی

"نگار" کا ہر شمارہ یوں تو خوب سے خوب تر کی جستجو کی طرف ایک روشن لکیر کی طرح اشارہ کرتا نظر آتا ہے لیکن اس کے خصوصی شمارے اپنی ایک الگ اہمیت رکھتے ہیں۔ ان میں بھی "خدا نمبر" اپنی معنویت اور تلاش و تعبیر کے نقطۂ نظر سے غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔

یہ خاص شمارہ ۱۷۵ صفحات پر مشتمل ہے ان میں وہ صفحات بھی شامل ہیں جن میں کچھ تشبیہی، تصویری علامتیں اور نقوش موجود ہیں اور جن کی مدد سے بات کو پوری طرح سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے اور تصویر و تصور کے باہمی رشتوں کا کچھ اندازہ ہوتا ہے۔

یہ فکری سچائیاں اور نظری ہیولے ارتقا سے مذاہب کے مختلف مرحلوں کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ نیاز صاحب نے ترجمے اور ترجمانی کے وسیلہ سے گاہ گاہ سادہ نگاری اور کہیں کہیں تقابلی مطالعہ کے زیر اثر مذہبی عقائد کے پس منظر میں موجود اس انسانی تجسس اور تجربے کو پیش کیا ہے جس کے ساتھ تاریخ کے نقوش قلم کی رہنمائی اور ذہن بشری کے نشاناتِ قدم کی گواہی میسر ہے۔ بنی نوع آدم نے اپنے اس پُراسرار سفر کو کیسے شروع کیا اور ان بھول بھلیوں میں راہ تلاش کرتا ہوا اس کا متجسس ذہن کیسے آگے بڑھا اس کی کہانی طلسم ہوش ربا سے کچھ کم دلچسپ نہیں۔

مذہبی فکر کے طلوع میں مادے اور روح کی "ثنویت" کو ایک بنیادی حقیقت مان کر چلنا ہوگا۔ اس ضمن میں فلپائن سے لے کر مشرقی مجمع الجزائر، نیوگنی، آسٹریلیا، سماٹرا اور جزائر انڈمان نکوبار کی نیگریٹو یا نیگرائڈ کے لوگوں کے عقائد کو سامنے رکھا گیا ہے جو انسان کے مادی یا جسمانی وجود سے الگ روح کو ایک "سایہ" تصور کرتے ہیں۔ یہ ہمزاد کی طرح زندہ انسانوں کے ساتھ رہتا ہے اور مدت کی تاریکیوں میں بالآخر کہیں غائب ہو جاتا ہے۔ ہمزاد بھی اس کے بعد کوئی رشتہ باقی نہیں رہتا۔

روح کے ساتھ تخلیق کا تصور بھی انسان کی سوچ کو ہمیشہ اپنی طرف متوجہ کرتا رہا اور اس کی راہوں میں نت نئے چراغ اس کی رسائیوں سے روشن ہوتے رہے۔ زمین کے پیڑ پودے، پھل پھول، چرند و پرند انسان کے فکر کو مہمیز کرتے رہے اور یہیں سے اس نے ماں اور تخلیق میں بنیادی رشتہ قائم کیا۔ باپ اس کے لئے ایک زمانے تک ایک نامعلوم حقیقت بنا رہا۔ اس کے بارہ میں اس نے سوچا بھی تو کچھ اس انداز سے کہ وہ اس دنیا کو یا پھر اس کے وجود موجود کو تخلیق کر کے پھر کسی پردۂ اسرار میں چلا گیا۔ ہندو فلاسفی میں خلاق عالم کے بارہ میں یہ تصور بھی پایا جاتا ہے کہ وہ عالم کو پیدا کر کے کہیں "شونیہ" میں غائب ہو گیا۔

قدیم قبائل اور قدیم تر انسانی معاشرے میں عورت اور مرد کے مابین "زن و شو" کا رشتہ بھی ذہن کے ان دھندلکوں میں سفر کا باعث ہوا جس نے نتیجتہً مادرانہ سوسائٹی کو پیدا کیا جس کے تصورات اور ان کی وابستہ تصویریں قدیم معاشرتی نظام میں بکھری ہوئی ہیں۔ عورت اور مرد کی ہم وجودیت کا تصور بھی اب یہ کہئے کہ کافی قدیم ہو چکا ہے۔ لنکا اور جنوبی ہند میں "اردو ناریشور" کی ایسی مورتیاں ملتی ہیں جو ایک مکمل

وجود ہے اور جس میں عورت اور مرد ایک پیکر وجود کا حصہ ہیں۔ اسی لئے "شکتی" کے concept کو جنم دیا اور "کنڈلی شکتی" کو مردانہ اور زنانہ قوائے تولید کی بجائی کو اس سے وابستہ کیا۔

انسان صدیوں تک عناصر وجود کو عورت ہی کے صنفی تصورات سے نسبت دیتا رہا۔ آسمان بھی ایک قدیم مصری تصویر میں چاند ستاروں سے سجی ہوئی "عورت" ہے جو سورج کو نگل کر پھر اپنے رحم " WOMB " سے پیدا ہوا۔ چاند اور سورج کو بھی علامات تخلیق کے طور پر نسوانی وجود ہی مانا گیا ہے۔

ایک اور قدیم مصری تصویر میں عورت قوس قزح جیسے ایک افقی نیم دائرہ کی شکل میں ہے۔ مرد تختۂ زمیں کی طرح افتادہ دراز ہے اور "ہوا کا دیوتا" ان دونوں کے مابین ایک رشتۂ اتصال پیدا کر رہا ہے۔ ایک اور تصویر میں "شجر" موجود ہے اور اس کے تنے سے لپٹا ہوا سانپ بھی۔ عورت اور مرد بے لباس ہیں اور اس شجر ممنوعہ کو چھولینا چاہتے ہیں۔

تخلیق کا مسئلہ اور اس سے وابستہ علاقوں کا تصور اپنی تصویروں کے ساتھ بہت پیچیدہ، پُراسرار اور پُرکشش ہے اور اسی سے اگر دیکھا جائے تو آسمانی باپ اور مادر ارض کا concept پیدا ہوا ہے۔ چاند اور سورج بھی اسی رشتے سے غیبی قوتوں کا مظہر بنے رہے ہیں۔

افزائش نسل اور زرخیزی کا تصور زندہ انسان کی سب سے پرقوت خواہش تھی۔ اس کی پُرکشش پیروی اس نے اپنے فطری جذبے کی نمود کے ماسوا اپنے دُور و نزدیک کے ساتھی جانوروں میں بھی دیکھی ہوگی۔ آگے چل کر فطرت کے مختلف مظاہر اور پُراسرار مناظر کے باہمی رشتوں کی تعبیر اس نے اسی روشنی میں کی۔ جنسی جذبے کی پرستاری اور جنسی سچائیوں کی پرستش کی رسوم اس میں اسی خواہش کی پیدا کردہ ہیں۔

جیسا کہ اس سے پیشتر اشارہ کیا جا چکا ہے مادر ارض کا تصور بیک وقت جنسی بھی ہے اور معاشرتی بھی جو آسمانی باپ کے مقابلہ میں ممکن ہے۔ قدیم تر ہوا اس لئے کہ "مادرانہ نظام" انسان کی معاشرتی تاریخ میں "پدرانہ نظام" سے پہلے فروغ پذیر ہوا۔ قدیم اقوام میں آسمان کو بھی عورت تصور کیا جاتا تھا۔ چین، جاپان اور منگولیائی نسل کے لوگ سورج کو دیوی مانتے تھے۔

قدیم عرب فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں تصور کرتے تھے۔ لات و منات، عزیٰ بھی تینوں نسائی بت تھے۔ ہندوستان میں مادرانہ نظام کی روایت زیادہ فعّال رہی۔ درگا، کالی، منسا، سرسوتی، لکشمی اور پاروتی اس کی مختلف الجہت مثالیں ہیں۔

آریائی نسل کا بنیادی رجحان پدرانہ سماج کی طرف رہا لیکن (ہندوستان کے علاوہ) یونان اور روم جیسے آریائی تہذیب کے بڑے مراکز میں بھی ہم دیویوں کے بارہ میں زیادہ پُرکشش تخیّل و تمثیل کے مظاہرے دیکھتے ہیں۔

حیوانات تہذیبی سفر میں انسان کے ساتھی رہے ہیں۔ حیوان یا جانداروں کی شمولیت کے بغیر انسانی تہذیب و تاریخ کے کسی دور کی تصویر بھی مکمل نہیں ہوتی۔ دیوتاؤں، دیویوں اور انسانی صورت و سیرت کے مابین حیوان قدر مشترک کے طور پر موجود رہے ہیں۔ کہیں وہ "سواری" ہیں اور کہیں وجودی ہیئتوں کا حصّہ ہیں۔

کیلٹک نسل کے لوگوں میں حیوانات کی پرستش نیز درختوں اور دریاؤں کی پوجا کا ذکر کرتے ہوئے 'نگار' کے اس خصوصی شمارے میں لکھا گیا ہے :

> "حیوان پرستی اور شجر پرستی ان کی نمایاں خصوصیات تھیں۔ مقدس جانور دیویوں سے منسوب تھے یا خود دیویاں ان جانوروں کی سرپرست مان لی گئی تھیں مثلاً Apona گھوڑوں کی دیوی تھی۔ Anotio ریچھوں کی دیوی تھی اور Damina بھیڑ بکریوں کا۔ درختوں میں شاہ بلوط کی پرستش کی جاتی تھی۔" (صفحہ ۵۶)

ٹیونانی (Tutons) قومیں سویڈن، ناروے، ڈنمارک اور ان سے متصل علاقوں میں آباد ہیں۔ ان میں آئس لینڈ کو بھی شمار کیا

جانا چاہیئے۔

سلہ God جو عیسائی اقوام میں آسمانی خدا کے معنی میں آتا ہے یونانی نظامِ عقائد میں بُت یا شبیہہ کے معنی میں آتا تھا، مسیحیت کے اثرات نے اس کے معنی و مفہوم کو بدل دیا۔ یونانی دیومالا کے مطابق ـــــ

"کائنات ایک درخت کی صورت میں ہے۔ اس کی جڑوں میں موت کا ملک ہے۔ وسطی حصہ میں انسانوں کی دنیا ہے اور اوپر کے حصہ میں بہشت۔ وہاں بارہ دیوتا اور چھبیس دیویاں رہتے ہیں۔ سب سے بڑا دیوتا یا اُن کا معبودِ اعلیٰ اوڈن ہے۔ وہ ابتداءً ہوا کا دیوتا تھا۔ بعد میں موت کا دیوتا بھی مانا گیا۔" (صفحہ ۵۳)

ہوا کا دیوتا قدیم مصری دیومالا کا ایک فعّال دیوتا ہے جو آسمان و زمین کے مابین سررشتۂ تخلیق کا محرّک ہے۔ اوڈن شعر و شاعری اور سحر و افسوں کا دیوتا بھی ہے۔ جادو ٹونا اور سحر و طلسم قدیم مذاہب اور اُن کی روایات میں ایک موثر جزو کے طور پر شریک ہے، یہاں شاعری و ساحری کی طرف اشارہ کردینا کافی ہوگا۔ کہانت کے ادارے کا سحر و افسوں سے خصوصی طور پر تعلق رہا ہے۔

اوڈن کی بیوی فریجلہے جو دیوتاؤں کی ماں اور حاملہ عورتوں کی محافظ خیال کی جاتی ہے۔ طوفان برق و باد کی صورت میں آسمان کا دیوتا اپنے قہار روپ میں سامنے آتا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ اس کے رتھ کو بکریاں کھینچتی ہیں۔ ان کے خیال سے جب خیر و شر کے دیوتاؤں اور دانوؤں کے مابین جنگ ہوگی تو ہر شئے فنا ہوجائے گی۔ (صفحہ ۵۴)

قدیم امریکی تصورِ مذہب بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ یہاں چاند، سورج اور دوسرے اجرام سماوی کے بارہ میں جو تصورات پائے جاتے ہیں ان کو ہم مذہب کی کچھ ارتقاری کڑیوں کے زمرے میں رکھ سکتے ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ان لوگوں نے علم نجوم و ہیئت میں بڑی ترقی کی اور ان کی بنائی تقویم کو "گریگوری کیلنڈر" سے بھی کچھ زیادہ بہتر خیال کیا جاتا ہے۔ خدا نمبر میں ان کا تعارف کراتے ہوئے لکھا گیا ہے :

"آج بھی ان کی بنائی ہوئی رصدگاہ موجود ہے۔ اپنی تقویم کے ذریعہ وہ ۵۰ لاکھ سال تک حساب کر سکتے ہیں۔ مذہب سے بھی یہ گہری دلچسپی رکھتے تھے جیسا کہ ان کے بنائے ہوئے عالیشان مندروں اور بے شمار بتوں سے ظاہر ہوتا ہے۔" (صفحہ ۵۸)

ان میں آفتاب کی پرستش کا بھی رواج تھا جو دنیا کی بہت سی قدیم تہذیبوں اور مذہبوں میں الوہیت کی ایک اساسی علامت کے طور پر موجود ہے۔ اس کے مقابلہ میں ایک خدا اور ظلمت بھی ہے جو گہرے غاروں کی تاریکیوں میں رہتا ہے جسے "چمگادڑ دیوتا" کے روپ میں جانا جاتا ہے۔ چاند کو، وہ بہت سے دیوی دیوتاؤں اور انسانوں کا پدر آسمانی مانتے تھے۔

بارش کے دیوتا کو بھی بڑی اہمیت حاصل تھی جس کے لئے ایک مقدس کنوئیں میں کنواری لڑکیوں اور حسین دوشیزاؤں کو بطور قربانی ڈالا جاتا تھا اور وہ خوش خوش اپنے آپ کو اس "مقدس" نذر کے لئے پیش کرتی تھیں کہ اس طرح دیوتاؤں کی "پاک دُلہنیں" بننے کا انہیں موقع نصیب ہوگا۔ "عروس النیل" اسی کی دوسری صورت تھی۔ جذبہ دیوی پانی کو بھینٹ دینا تھا۔ ممکن ہے "ستی کی رسم" کے پس منظر میں بھی ایسا ہی کوئی Conc موجود ہو کہ وہ بھی ایک انسانی قربانی ہے۔

"کلغی دار سانپ" بھی ان کے بڑے دیوتاؤں میں تھا۔ بعض حکمران خاندان خود کو ناگ دیوتا کی اولاد بھی کہتے تھے جیسا کہ سامری کے واقعہ سے ظاہر ہے۔ مصر میں بھی سانپ کو تہذیبی اور مذہبی اہمیت حاصل تھی۔ حضرت یوسفؑ کو بھی کنوئیں میں پھینک دینے کی روایت مقدس صحیفوں میں موجود تھی اگرچہ اس کی نوعیت مختلف ہے لیکن اس سے کنوئیں کو انسانی بھینٹ دینے کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے۔

۔یونان میں صحت کی دیوی "ہائی جیا" سانپ کو دودھ پلاتی ہوئی دکھلائی گئی ہے۔ قدیم عراقی تاریخ کے ایک بادشاہ "سناشرب" کے پیالہ کو دو پھن دار سانپ اپنے حلقہ میں لئے ہوئے ہیں۔ ہندوستان میں ناگ پوجا آج تک چلی آتی ہے اور فطرت کے عمل تخلیق میں اس کی شرکت کا تصور بھی ہندو دیو مالا کی اہم علامات میں سے ہے۔ قدیم امریکی صحیفات کا ایک اہم پہلو ایک ایسے بڑے دیوتا کا "تصوری وجود" بھی تھا جس کی الوہی شخصیت سب دیوتاؤں کی جامع تھی۔ اس طرح ان کے یہاں "ثنویت" اور "تثلیث" کے ساتھ عقیدۂ توحید کی بھی ایک شکل موجود تھی۔

مایا قوم کی تہذیب کے زوال کے بعد ازٹیق نسل کے قبائلی نظام اور تہذیب کا علاقائی طور پر عروج ہوا۔ "خدا نمبر" کی فراہم کردہ اطلاعات کے مطابق ۱۵۱۹ء میں جب اسپین کے لوگ وہاں پہنچے تو ان کی تہذیبی اور عقائد و افکار کی صورت کچھ ایسی ہی تھی جہاں قدیم مصری اور سمیرین تہذیب نے اُسے چھوڑا تھا، ہر لحاظ سے نہ بھی بعض اعتبارات سے دونوں میں بڑی مماثلت اور غیر معمولی مشابہت تھی۔

ان کے یہاں سب سے زیادہ پُرقوت ہُوا کا دیوتا تھا جسے وہ سورج سے نسبت کے ساتھ "آئینۂ آتشیں" کہتے تھے۔ یعنی "سورج کا آئینہ"۔ ان کا عقیدہ تھا کہ ہوا کا دیوتا کے پاس (جو سب دیوتاؤں سے زیادہ حرکت و حرارت والا ہے) ایک ایسی صیقل شدہ ڈھال ہے جس کے وسیلہ سے وہ ساری دنیا کو دیکھ سکتا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو اسی طرح کے عقیدہ سے "جام جہاں نما" کا تصور پیدا ہوا۔

ع وندراں آئنہ صد گونہ تماشا کرد

یہ لوگ بھی انسانی قربانی کے قائل تھے اور اپنے نوجوانوں کے علاوہ جن کو وہ پھولوں سے سجاتے خوبصورت ہار اور گجرے پہنائے رکھتے وہ بنسری بجاتا اور اس پر طرح طرح پُرکشش راگ گاتا، اور حسیناؤں کے دل لبھاتا کہانیوں کے شہزادے کی سی زندگی گذارتا اور آخر ایک دن وہ اسی طرح بنسی بجاتا ہوا بڑے مندر کے دوار پر جاتا ہر سیڑھی پر ایک راگ پورے والہانہ انداز سے پیش کرتا اور اسے توڑ دیتا یہاں تک کہ مندر کی بارہ سیڑھیاں اسی طرح شکست نغمہ دنے کے ساتھ طے کرتا اور آگے بُت کے قدموں پر سر رکھ دیتا اور مندر کا بڑا پروہت ایک تیز چھرے سے اس کا سینہ چاک کر دیتا۔

دشمن قبیلوں سے جوان العمر اور نوخیز لڑکوں کو پکڑ کر یہ لوگ لاتے اور دیوتاؤں کو ان کے خون کی نذر پیش کی جاتی۔ خدا نمبر میں لکھا گیا ہے کہ ان کی کھوپڑیوں سے بنائے ہوئے ایک اہرام نما مینار میں ایک لاکھ چھتیس ہزار سروں کی کھوپڑیاں نکلی تھیں۔ (صفحہ ۵۸)

ان کی دیو مالا کے مطابق جنگ کا دیوتا ایک پاکیزہ کردار بیوہ عورت کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ وہ ایک بار پہاڑ پر دُعا مانگنے گئی تھی کہ اس کی گود میں آسمان سے پھولوں کا خوبصورت گچھا گرا۔ وہ اسے پاکر بہت خوش ہوئی اور اسے مندر کی طرف لے کر چلی۔ بعد میں اسے احساس ہوا کہ اُسے "آسمانی حمل" رہ چکا ہے۔ [۱]

یہ لوگ بھی سانپ کو ایک دیوتا کے روپ میں مانتے تھے لیکن یہ سانپ جو دیوتا کا سَوروپ تھا اپنے پجاریوں کا خون چاٹتا تھا۔ اس کے پروہت، اپنی زبانوں اور کانوں میں سوراخ کر کے ان سے خون نکالتے اور ناگ دیوتا کے منہ پر ملتے۔

"پیرو" ریاست میں آباد لوگ خود کو سورج دیوتا کی اولاد کہتے تھے اور اس کے مندر پر انھوں نے سونا چاندی اور دوسری قیمتی اشیاء کے ڈھیر جمع کر رکھے تھے جس کو اہلِ اسپین نے لوٹا تو بے شمار دولت ہاتھ آئی۔ یہی بہت سے دوسرے مندروں اور معبدوں کی کہانی بھی ہے اور ہندوستان میں تو یہ کہانی بہت بار دہرائی گئی۔

سمیرین قوم وادی دجلہ و فرات کی قدیم ترحکمران قوم اور مہذب نسل تھی۔ قدیم آریاؤں کی طرح وہ بھی فطرت کے مظاہر کی پرستار

---

[۱] بیوہ یا کنواری عورت کے بطن سے جنم لینے کے واقعات تاریخ و تہذیب کے ولددوں میں شامل ہیں اور ان کے حمل کو آسمان یا دیوتاؤں ہی سے نسبت دی گئی ہے۔ نگار کے "خدا نمبر" میں بھی اس کی طرف اشارے موجود ہیں۔

تھی۔ اس کے عروج کا زمانہ تین ہزار قبل مسیح سے ڈھائی ہزار قبل مسیح تک تسلیم کیا جاتا ہے۔

مظاہر فطرت کی پرستاری سے ذہنی طور پر وابستہ اقوام و قبائل ان سے تخیلی رشتوں کو شدہ شدہ تمثیلی رشتوں میں بدل دیتے ہیں اور عناصر و ارواح کا تصور دیوی دیوتاؤں میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ سمیرین قوم بھی بہت سے دیوی دیوتاؤں کی قائل تھی، اسی کے ساتھ وہ خیر و شر کے بنیادی تصور کو پرتقدیس اور غیر مقدس ارواح میں بدل دیتی تھی۔ ایرانی فلسفہ کی تنویث "اہرمن ویزداں" اسی کا ارتقائی روپ ہے۔

اس کے ماسوا ان کا سب سے بڑا دیوتا یا پُراسرار قوتوں سے آراستہ خداوند آسمان، دوسرا بڑا فعّال دیوتا، ہواؤں اور طوفانوں کا دیوتا "اِن لل" تھا۔ تیسرا دیوتا یا دیوی پاتال کی تاریک اور بھیدوں بھری دنیا پر حکومت کرنے والی روح "اننا" تھی۔ قدیم عراق کے مذہبی تصوّرات و تخیلات کی بنیاد ایک ایسی تثلیث پر تھی جو آسمان جدِ ہوا اور تحت الثریٰ سے متعلق تھی۔ مصر کی ایک قدیم تصویر سے بھی ذہن اسی طرف منتقل ہوتا ہے جس کا ذکر سطور بالا میں کہیں آچکا ہے۔ آسمان چاند ستاروں سے سجی ہوئی "عورت" ہے جو اپنے حسین و جمیل نسوانی وجود کو ایک افقی نیم دائرہ میں پھیلائے ہوئے ہے۔ درمیان میں ہوا کا دیوتا ہے اور زمین پر دراز انسانی وجود مرد ہے۔ اس تثلیث میں تخلیق کی کہانی چھپی ہوئی ہے۔

"خدا نمبر" میں یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ قدیم عراق میں بھی پہلے مادرانہ نظام ہی رائج تھا۔ وہ ایک ایسی دیوی کو بھی مانتے تھے جو مقدس پہاڑوں کی دیوی تھی۔ یہ شیو کی اردھانگنی پاربتی سے مشابہ ایک تمثیلی کردار ہے جو ہمالیہ کی بیٹی ہے۔ اس تہذیب میں مادرِ ارض یا مریم فطرت کا ایک ایسا تصور بھی پایا جاتا تھا جس میں ایک خوبصورت عورت اپنے سڈول پستانوں کو اس طرح دونوں ہاتھوں میں سنبھالے ہوئے ہے جیسے وہ اپنے دیوتا کو دو مقدس اثمار پیش کر رہی ہو اسے زمین کی نسوانی کشش سے آراستہ مورتی کہا جا سکتا ہے جو دراصل تخلیق کی دیوی ہے۔ اور جس کے مقدس سینہ سے شہد و شیر کے چشمے اُبلتے ہیں۔ ایک دوسری خوش تراش تصویر میں اس کے ہاتھوں میں ایک "مقدس ظرف" ہے جس سے پانی کی دو دھاریں اِدھر اُدھر نکل کر گر رہی ہیں۔ اس میں "ارضی" علامات چھپ گئی ہیں۔ تیسری مورتی میں اس کی جگہ ایک پاکیزہ صورت و پاکیزہ سیرت دیوتا نے لے لی ہے جس کے ہاتھ میں تین پنکھڑیوں والا پھول ہے۔ اسی کے ساتھ ایک ایسا "ظرفِ حیات" ہے جس سے پانی کی دھاریں بہتی نیچے آرہی ہیں اور نیچے رکھے ہوئے ظروفِ آب اس سے بھر کر چھلک رہے ہیں۔ یہاں شیو کی مورتی یاد آتی ہے جس کی جٹاؤں سے گنگا نکل رہی ہے اور بہتی ہوئی جٹاؤں سے نیچے اتر رہی ہے۔ یہ لوگ سات ستاروں کو مانتے تھے۔ ان ستاروں کے الگ الگ سات رنگ بھی تھے۔ علم نجوم میں یہ رنگ بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ اور ستاروں کے زیرِ اثر ہفتوں میں بھی یہ لوگ سات ستاروں کا معبد بھی بناتے تھے۔ اور اس کے سات منزل نما کھنڈ ہوتے تھے۔ ہر منزل کسی ایک ستارے یا دیوتا سے منسوب ہوتی تھی۔ چین میں اس سے ملتا جلتا معبد "ہفت آسمان" ہوتا تھا۔

حضرت ابراہیمؑ سے متعلق واقعہ سے اس کا اظہار ہوتا ہے کہ ستاروں سے آگے بڑھ کر ذہن اس حقیقت کے بھی متلاشی تھے جو ان سچائیوں سے بالاتر ایک سچائی تھی۔ سمیرین تہذیب کے اثرات بابل نینوا کی مصلی اور حکاّدی تہذیبوں میں بھی ملتے ہیں۔ بابلی تہذیب کا ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ اس کے دیوی دیوتا متنوع الصفات ہوتے تھے۔ مثلاً جب ستارہ زہرا قریبِ شام طلوع ہوتا تھا تو وہ جنس و جذبے کی دیوی کے روپ میں مانا جاتا تھا، اور طلوع سحر کے وقت اُسے جنگ کا دیوتا سمجھا جاتا تھا جس کے یہ معنی ہیں کہ یہ تبدیلِ صفات اس کی جنس کبھی ستاروں کی ذات و صفات کا یہ تغیر تہذیبی آویزشوں کی طرف بھی اشارہ سنج ہے اور مختلف نسلوں کی آمیزشوں کی طرف بھی ذہن کو مائل کرتا ہے۔ اس معنی میں ضمیّات کا مطالعہ زیادہ فکر انگیز اور خیال آفریں ہوجاتا ہے۔

انسان نے دیوتاؤں کے کردار اور اپنے عالم سیر و مظاہرِ حیات سے ان کی نسبت کے بارہ میں فکر فرمائیوں کے سلسلہ کو جاری رکھا۔ تفہیم و تعبیر اور تخیئل و تمثیل کی عجوبہ کاریاں اس کے اپنے ذہنی سفر کی تاریخ اور اس راہ سفر کے طرفہ موڑ ہیں۔

قوموں کے مذہبی افکار میں اُن کی زندگی اور ماضی و موجود کی انگنت پرچھائیاں منعکس ہوتی ہیں۔ کن حقائق سے وہ زیادہ متاثر ہوئے اور کن سانحات کی یاد اُن کے شعور و لاشعور کا جزو بن گئی۔ ان کی دُعاؤں اور مناجاتوں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ

وہ اپنے دیوتاؤں کو کن قوتوں سے متصف کرتے تھے :

" میرا حکم زمین پر رواں ہوتا ہے تو زمین ہریالیوں سے ڈھک جاتی ہے اور اشجار پھولوں سے لد جاتے ہیں ۔ گھوڑوں سے اصطبل اور غلّوں سے کھلیان بھر جاتے ہیں ۔" (خدا نمبر ص ۱۱۵)

اسی تصوّر و تصویر کا ایک رُخ یہ بھی ہے :

" جب وہ سمندروں کی طرف رُخ کرتا ہے تو سمندر پیچھے ہٹ جاتے ہیں ۔ جب وہ ہواؤں کی طرف رجوع ہوتا ہے تو قیامت خیز آندھیاں رُک جاتی ہیں ، دریاؤں کی طغیانی سمٹ جاتی ہے ۔ (ایضاً)

اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اس کائنات آب و گل میں کسی برتر قوت کے اثر و نفوذ کے قائل تھے ۔
سومیریا والوں کے نزدیک انسان دیوتاؤں کی پسندیدہ مخلوق ہے ۔ یہی تصوّر نسلی اعتبار سے یہود اور بعض دوسری قدیم قوموں میں آیا اور ان کے تہذیبی رویّوں میں بدل گیا ۔

" .... "

رئیس احمد جعفری ـــــــــ میں ان کے انداز فکر سے اختلاف کرسکتا ہوں اور بارہا کر چکا ہوں ۔ میں ان کے افکار و خیالات ، تحقیق و نظریات اور داعیات سے اختلاف کرسکتا ہوں اور مجھے اعتراف ہے کہ میں نے ایسا کیا بھی ، لیکن جس چیز سے کبھی انکار نہیں کرسکتا وہ ہے ان کی عالی ظرفی اور مقام انسانیت !!



نیاز فتحپوری — ایک خدا پرست دہریہ؟

★ شیخ سلیم احمد۔ ۱۵۰، بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی ۔ ۱۱۰۰۱۳

نیاز فتحپوری آزادیٔ خیال کے بہت بڑے علمبردار تھے۔ انھوں نے عقلیت پسندی اور روشن خیالی کے چراغ روشن کئے۔ ان کی تعلیم و تربیت سخت مذہبی ماحول میں ہوئی تھی مگر اس کے باوجود وہ اپنی فکر و نظر میں ایک جدید ترین انسان تھے۔ ہندوستان کی تاریخ میں ان جیسی ہمہ جہت اور روشن خیال شخصیت نظر نہیں آتی۔ صرف سرسید کو ان کے مدِ مقابل پیش کیا جا سکتا ہے۔

نیاز کی تحریریں پڑھ کر اٹھارہویں صدی کے ان آزاد خیال (FREE THINKERS) یورپی مفکرین کی یاد آتی ہے جن کے انقلابی خیالات نے کاروانِ تہذیب کو آگے بڑھایا۔ یہ لوگ خدا پرست (DEIST) کہلاتے تھے جن کا کہنا تھا کہ مذہب کے الہامی تصوّر کو تسلیم کئے بغیر صرف مظاہرِ فطرت کے مطالعے سے خدا کو تسلیم کیا اور اخلاقی قدروں پر عمل پیرا ہوا جا سکتا ہے۔ خدا کو ماننے اور نیک بننے کے لئے رسمی و روایتی مذہب کی ضرورت نہیں۔ ان میں ایک نام تھومس پین کا تھا جو متذکرہ معنی میں نہ صرف خدا پرست تھا بلکہ اس نے کلیسا و عیسائیت پر شدید حملے کئے۔ نیاز فتحپوری اور تھامس پین میں کئی قدریں مشترک تھیں۔ دونوں روایتی معنی میں مذہب کے پیروکار نہ ہوتے ہوئے بھی خدا پرست تھے۔ دونوں نے مذہبی قوانین کو عقلیت کی کسوٹی پر پرکھا۔ دونوں نے اپنے زمانہ میں کٹر ملّائیت کے خلاف آواز بلند کی۔

تھومس پین (۱۷۳۷ - ۱۸۰۹) انگلینڈ میں پیدا ہوا تھا۔ اس کی زیادہ تر زندگی امریکہ اور فرانس میں گذری۔ عقلیت پسندی اور آزادیٔ فکر کی تاریخ میں اس کی تحقیقات سنگِ میل کا درجہ رکھتی ہیں۔ اس کے نظریات نے روشن خیالی کے بے شمار چراغ روشن کئے۔ اس کی شہرہ آفاق تصنیف "عہدِ عقلیت" (AGE OF REASONING) دہریوں کی بائبل کہلاتی ہے۔ امریکہ کی جنگ آزادی کے رہنماؤں نے اس کے نظریات سے فائدہ اٹھایا اور انھیں اس لڑائی کو جیتنے میں مدد دی۔ امریکہ میں معتوب ہوا اور بھاگ کر فرانس آ گیا۔ وہاں بھی اس کے خلاف ہنگامے ہوئے تو وہ انگلینڈ چلا آیا۔ یہاں بیٹھ کر اس نے "حقوق انسانی" (RIGHTS OF MAN) کے نام سے کتاب لکھی جس کے خلاف احتجاج ہوا۔ اس کے پُتلے کو جلایا گیا۔ کتاب پر پابندی عائد کر دی گئی۔ وہ انگلینڈ سے بھاگ کر پھر فرانس آیا۔ یہاں وہ پھر مصیبت میں گرفتار ہوا۔ اسے جیل میں ڈال دیا گیا۔ جیل میں اس نے "عہدِ عقلیت" کتاب لکھی جس نے اسے امر بنا دیا۔ اس کتاب نے امریکہ و یورپ میں انقلاب پیدا کر دیا۔

اس کتاب میں پین نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ہر قسم کی غلطیوں کے خلاف سب سے بڑا ہتھیار عقل ہے، وہ ہمیشہ اسے استعمال کرتا رہا ہے اور کرتا رہے گا۔ اس کی زندگی اس قول کی عملی تصویر تھی۔ نیاز بھی اس قول پر عمل پیرا نظر آتے ہیں۔

نیاز فتحپوری اور تھومس پین کے درمیان زماں و مکاں کا کافی فاصلہ ہے مگر دونوں کی فکر ایک ہے۔ دونوں کے طرز استدلال میں بھی مماثلت پائی جاتی ہے۔ نیاز کی شاہکار کتاب "من و یزداں" پین کی "عہدِ عقلیت" دونوں اپنے طرز اور مفہوم میں بہت کچھ مشابہت رکھتی ہیں۔

تھومس پین کی موت کے تقریباً سو سال بعد ہندوستان میں سرسید (۱۸۱۷ - ۱۸۹۸) نے آزادیٔ فکر کی شمع روشن کی۔ انھوں نے بھی نیاز کی طرح الہامی و روایتی مذہبی مفروضوں کو عقل و فطرت کی کسوٹی پر پرکھا۔ سرسید نے جنت و دوزخ کے جغرافیائی تصوّر کو ردّ کیا۔ نیاز بھی جنّت و دوزخ کو ملّاؤں کی خیالی دُنیا کہتے تھے۔ نیاز ہی کی طرح وہ جبرئیل کے وجود کو بھی فرضی سمجھتے تھے۔

سرسید عقلیت پسندوں کے دستے کے ہراول کا درجہ رکھتے ہیں مگر وہ نیاز سے ایک قدم پیچھے تھے۔ اگرچہ نیاز کی طرح ان کی پرورش بھی سخت مذہبی ماحول میں ہوئی تھی، اپنی فکر و نظر میں دونوں جدید ترین ذہن رکھتے تھے۔ سرسید اور نیاز میں فرق یہ ہے کہ اول الذکر نے اپنے نظریات کو پھیلانے کے لئے عملی اقدام بھی کئے۔ انھوں نے جدید تعلیم کے ادارے قائم کئے بلکہ مذہب میں ان کی دخل اندازی کی وجہ بھی یہی تھی کہ وہ اپنی تعلیمی تحریک کو تقویت پہنچانا چاہتے تھے۔

مگر نیاز فتحپوری عقلیت پسندی میں سرسید سے بہت آگے تھے۔ انہوں نے ملّائیت و مولویت کے خلاف بھرپور اور مکمل جہاد کا اعلان کیا۔ چوالیس سال تک وہ یہ جنگ لڑتے رہے۔ وہ باقاعدہ کسی درسگاہ سے فارغ نہیں تھے مگر انھوں نے ذاتی مطالعے سے تمام اسلامی علوم پر دسترس حاصل کی اور مولوی کو اسی کے ہتھیاروں سے شکست دی۔

ہم نے یورپ کی مذہبی فکری تحریکوں کی طرف اشارہ کیا۔ مسلمانوں کی مذہبی اور اصلاحی تحریکوں اور یورپ کی تحریکوں میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ یورپ کے عالموں وادیبوں و دانشوروں کے خیالات سے وہاں ایک انقلاب آیا۔ روشن خیالی کے بہت سے چراغ جلائے گئے۔ ان کے خیالات نے تحریکوں کی صورت اختیار کی۔ سماج و معاشرہ کی کایا کلپ ہوئی۔ انسان کی سوچ میں تبدیلی آئی۔ کلیسا کے جبر و استبداد سے انسان کو چھٹکارا ملا۔ اس کے برعکس مسلمانوں کی تاریخ میں اوّل تو اس قسم کے انقلابی نعرے بہت کم سننے کو ملتے ہیں مگر اکّا دکّا سرسید و نیاز جیسے انقلابی منکرین پیدا بھی ہوئے تو ان کی آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی۔ لکیر کے فقیروں کی تعداد گھٹنے کی بجائے بڑھتی گئی۔ مسلمانوں کے فکر و رویّے میں کوئی بڑی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ دوسرے یہ کہ ہندوستان میں زیادہ تر مسلم پیشواؤں نے پیچھے کی طرف لوٹ جانے کی دعوت دی۔ تاریخ کے ہر مشکل موڑ یا کسی عظیم سیاسی مصیبت کے موقع پر یہی کہا گیا کہ ہمارا حشر اس لئے ایسا ہوا چونکہ ہم نے ماضی سے اپنے رشتے توڑ لئے ہیں۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی تمام تحریکیں بالاستثنیٰ سرسید کی تعلیمی تحریک سب کا نعرہ یہی تھا ــــ لوٹ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو۔

سرسید مذہبی اجتہاد کی جس کڑی کو ادھورا چھوڑ گئے تھے نیاز فتحپوری نے اسے مکمل کیا اور ہندوستانی مسلمانوں کو آگے کی طرف دیکھنا سکھایا۔ یہی نیاز کا کارنامہ ہے۔

نیاز فتحپوری (۱۸۸۴ـ ۱۹۶۶) کو جو زمانہ ملا وہ ایک طوفان خیز اور زرخیز دور تھا۔ افکار کی دُنیا میں بڑی ہلچل تھی۔ جنگ آزادی لڑی جا رہی تھی۔ سیاسی اقتدار کی اس حصہ داری میں مسلم رہنما بھی اپنا حصہ بٹانے میں مصروف تھے۔ بساطِ سیاست پر کانگریس و مسلم لیگ کی قد آور شخصیتیں جلوہ گر تھیں۔ اردو زبان و ادب کا گلستان ابھی ہرا بھرا تھا اور اس کے افق پہ درخشندہ ستارے جگمگا رہے تھے۔ ابوالکلام آزاد، ابوالاعلیٰ مودودی، آزاد سبحانی، اسلم جیراجپوری، سید سلیمان ندوی، حسین احمد مدنی، عبدالماجد دریا آبادی، شبیر احمد عثمانی، خواجہ کمال الدین (احمدی)، مسعود علی ندوی، اشرف علی تھانوی، خواجہ حسن نظامی، شبلی نعمانی، سید عبدالباری فرنگی محلی اور بے شمار دوسری بلند پایہ شخصیتیں نیاز فتحپوری کی ہم عصر تھیں۔

ادب کے میدان میں منشی پریم چند، احمد شاہ بخاری، رشید احمد صدیقی، سجاد حیدر یلدرم، عبدالحلیم شرر، عبدالحق، قاضی عبدالغفار، اقبال، اختر شیرانی، فراق، حسرت موہانی، جوش ملیح آبادی، حفیظ جالندھری، نوح ناروی وغیرہ ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ رسائل و جرائد شائع ہو رہے تھے جن میں علمی و ادبی بحثوں کا بازار گرم تھا۔

نیاز فتحپوری بھی تاریخ سازی کے اس عمل میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنے عہد کے سیاسی، مذہبی، ادبی اور تہذیبی منظر نامے پر گہرے نقوش چھوڑے۔ آیئے مختصراً ان کے مذہبی افکار کا جائزہ لیں۔

نیاز فتحپوری کی سب سے معرکۃ الآرا کتاب "من و یزداں" ہے۔ یہ ان مذہبی مضامین کا مجموعہ ہے جو اُن کے رسالے "نگار" میں وقتاً فوقتاً چھپتے رہے ہیں۔ یہ کتاب نیاز کے مذہبی نظریات کی بھرپور ترجمانی کرتی ہے جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے۔ یہ خدا اور بندے، خدا اور کائنات اور بندے اور کائنات کے مابین تعلق کی وضاحت کرتی ہے۔ چھ سو سے زائد صفحات پر پھیلی یہ ضخیم کتاب مذہبی انسائیکلوپیڈیا ہے۔ نیاز نے اسے "مذہب انسانیت کا آخری صحیفہ" قرار دیا ہے اور معنون کیا ہے " ان بے شمار انسانوں کی یاد سے جو مذہب کے نام پر

ذبح کئے گئے" کتاب کے اندرونی صفحات میں کیا قیامت بپا ہوگی اس کی دھمک ان فقروں میں سُنی جاسکتی ہے۔

نیاز فتحپوری منکر نہیں تھے۔ انھوں نے اسلامی شریعت کی کسی بنیادی شرط سے انکار نہیں کیا۔ مگر وہ شاید پھر بھی سب سے بڑے منکر تھے۔ انھوں نے مولویوں کے پیش کردہ پورے اسلام سے انکار کردیا۔ وہ ایک ذہین انسان تھے۔ مولویوں کے حملے سے بچنے کے لئے شاید انھوں نے ایک ڈھال بنائی تھی کہ بظاہر ان کی کسی بات سے انکار نہ کرو کہ شریعت و قانون کی عدالت سے ان کے خلاف گردن زدنی کا حکم نافذ کرادیں گے۔ اسی مصلحت کوشی سے ان کی جان بخشی بھی ہوگئی۔ کہ یہی علمائے ظاہر کا شیوہ رہا ہے۔ مگر نیاز کے پاس ان کی سب سے بڑی ڈھال عقل تھی۔ دلائل و براہین تھے۔

نیاز اسلام کے بنیادی عقائد کو تسلیم کرتے تھے۔ وہ بہت بڑے خدا پرست تھے۔ توحید، رسالت، ختم رسالت اور زندگی بعد الموت (معاد) کو مانتے تھے مگر جب ان کی تشریح کرتے تو مولویوں کی تفسیر سے اختلاف کرتے اور اس کے لئے دلیلیں و شواہد پیش کرتے جن کی وجہ سے علماء تلملا اُٹھتے۔ آخر کار ان کی تحریروں کے خلاف ملک گیر ہنگامے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ لکھنؤ میں ان کے خلاف ایک بڑا جلسہ ہوا جس میں نیاز کو معافی مانگنی پڑی۔ مگر اس کے بعد اپنے رسالے میں اس معافی کی تردید بھی کردی۔ جب ذرا شور کم ہوا تو پھر اپنی ڈگر اختیار کرلی۔ نیاز کی معافی کو ان کی کمزوری سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا ہے مگر یہ ان کی دور اندیشی و مصلحت تھی۔ یہ زمانہ مذہبی تشدّد کا تھا۔ "رنگیلا رسول" کتاب کا مصنّف جیپال ایک مسلمان کے ہاتھوں قتل کیا جاچکا تھا۔ ایک مسلمان بھی ایک مذہبی اختلاف کا شکار ہوچکا تھا۔ اس لئے انھوں نے سوچا ہوگا بلا وجہ کیوں موت کو دعوت دو۔ نیاز ڈرنے والے لوگوں میں سے نہیں تھے۔ ان کے خلاف اس طوفانِ بد تمیزی کے زمانے میں بھی تن تنہا کھلے دروازے اپنے دفتر میں بیٹھے پُرسکون کام کرتے رہتے تھے۔ البتہ رامپوری چاقو ان کی دراز میں رکھا رہتا تھا۔

نیاز فتحپوری انسان اور کائنات کو اپنی فکر کا محور بناتے ہیں۔ خدا کے وجود کے لئے دلائل پیش کرتے ہیں۔ پھر انسان اور کائنات سے اس کا رشتہ متعین کرتے ہیں۔ بڑے بڑے دہریہ خدا کے وجود سے متعلق ان کی بات کو ماننے پر مجبور رہے۔ وہ اسے ایک قوت قرار دیتے ہیں۔ ایک کل جس نے نظامِ عالم کو چلانے کے لئے چند اصول و ضوابط بنا دیئے ہیں اور انہیں کے تحت سب کچھ ہو رہا ہے۔ مگر نیاز کے فکری فریم ورک میں خدا بھی زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ ان کی توجہ کا اصل مرکز انسان اور کائنات ہی ہیں۔ نیاز مذہب کے پورے رسمیاتی ڈھانچے کو رد کر دیتے ہیں۔ کیونکہ وہ سب انسان اور فطرت کے خلاف ہے۔

قرآن میں خدا کو ایک بے نیاز ہستی قرار دیا گیا ہے۔ علماء بھی خدا کی اس صفت کی تبلیغ کرتے نہیں تھکتے۔ نیاز سوال کرتے ہیں کہ جب خدا بے نیاز ہے تو اس کی رضا حاصل کرنے یا اس کی خوشنودی حاصل کرنے کا کیا مطلب؟ یا انسان کے برے کاموں سے اس کے ناراض ہونے کے کیا معنی؟ یہاں رسمی عبادات نماز و روزہ، حج و زکوٰۃ، پوجا پاٹ سب بے معنی ہو جاتی ہیں۔ اس لئے کہ خدا کی ذات تو بندے کے ہر فعل سے بے نیاز ہے۔ نیاز اس نکتہ کی مزید وضاحت کرتے ہیں :

"عبادت خواہ کسی صورت میں ہو بے کار ہے اگر وہ ہمارے اخلاق و اعمال پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ اس لئے نتیجہ یہ نکلا عبادت کا مدعا اپنے اندر تبدیلی پیدا کرنا ہے اور اسی کو خدا کی خوشنودی سے تعبیر کیا گیا ہے تاکہ لوگ اس طرف متوجہ رہیں اور عبادت کو ترک نہ کردیں۔"

یعنی اس سرزمین پر انسان کی فلاح اصل ہے، خدا کی خوشنودی حاصل کرنا نہیں ہے۔ اس توضیح کے بہت دوررس نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ مسلمانوں
اس نظریے سے جو ان کی عملی زندگی کا احاطہ کئے ہوئے ہے خود مسلمانوں کو تو نقصان پہنچا ہی ہے، عالم انسانیت کا بھی زبردست زیاں ہوا۔ اس دنیا میں
بلندی حاصل کرنے اور دوسروں کے کام آنے کے بجائے وہ ایک سعی لاحاصل میں مصروف ہوگیا جس سے خدا کو بھی کچھ فائدہ نہیں پہنچا۔ اگر مسلمان اپنی
اس دُنیا کی زیادہ خدمت کرتے تو خدا زیادہ خوش ہوتا۔

نیاز فتحپوری نے اپنے اس موقف کی مزید وضاحت کی :

"میری جنگ مذہب و اہلِ مذہب سے یہ نہیں ہے کہ میں سرے سے مذہب کو بری چیز سمجھتا ہوں بلکہ اختلاف صرف اس بات پر ہے کہ وہ (مولوی) مذہب کی بنیاد حیات بعد الموت کو قرار دیتے ہیں اور میں کہتا ہوں کہ مذہب کا مدعا ہماری اسی زندگی کو

سنوارنا ہے۔ اگر یہ زندگی اور یہ دُنیا بالکل مہمل چیز ہے اور اصل حیات وہی ہے جو موت کے بعد شروع ہونے والی ہے تو میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس کے پیدا کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔"

نیاز اسلام میں عبادت کے اجتماعی افادیت کے پہلو کو مانتے ہیں مگر مسلمانوں نے اسے بھی انفرادی مفاد میں تبدیل کرلیا ہے۔ اجتماعی عبادت، اجتماعیت واتحاد واتفاق پر زور دیتی ہے مگر مسلمانوں میں سب سے زیادہ نفاق اور خودغرضی ہے۔ نیاز کے ذہن پر انسانی فلاح وبہبود اس درجہ حاوی ہے کہ وہ پانچ وقت کی نمازوں کو ہی فضول قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر ہفتے میں ایک بار ہی مسجد میں جمع ہوں اور مسلمان بچّوں کی تعلیم اور غریبوں کی ترقی وبھلائی کے لئے کچھ سوچیں تو وہ پانچ وقت کی نماز سے بہتر ہے۔

ایک سوال جو مفکرین اسلام کے ذہنوں کو ہمیشہ پریشان کرتا رہا ہے اور ابھی تک وہ اس کا تسلّی بخش جواب نہیں دے سکے۔ وہ یہ ہے کہ کیا صرف کلمہ گو مسلمان چاہے وہ کتنا ہی فاسق وفاجر کیوں نہ ہو جنت میں جائے گا اور ایک کافر جس نے کلمہ نہیں پڑھا، اس کے اعمال کتنے ہی صالح کیوں نہ ہوں، دوزخ کا ایندھن بنے گا۔ ایسا کیوں؟ اسی سے جڑا ہوا یہ سوال بھی ہے کہ سچائی پر صرف مسلمانوں کی ہی اجارہ داری کیوں؟ نیاز نے نگار کے ذریعہ یہ سوال اپنے زمانہ کے علماء سے کیا تھا۔ زیادہ تر علماء نے جواب دینے سے گریز کیا۔ کچھ نے گول مول جواب دیا مگر کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ ایک صالح کافر ناجی ہے۔ نیاز فتحپوری نے تمام جوابات کا اثباتی تجزیہ کرتے ہوئے قرآن وحدیث کی روشنی میں یہ ثابت کیا کہ ایمان کا مفہوم ہی عمل صالح ہے اور بڑی جرأت کے ساتھ فیصلہ سُنایا۔" ایک بدکار مسلمان قطعاً ناری ہے اور نیکو کار برہمن یقیناً ناجی ہے۔"

لیکن سوال یہ ہے کہ قرآن میں جابجا کفر وشرک کا ذکر ہے اور کافر ومشرک کے ناری ہونے کا اعلان کیا گیا ہے۔ نیاز نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ شرک کے معنی بت پرستی نہیں۔ دوسرے کفر وشرک بذات خود معصیت نہیں۔ یہ انسان کا عمل ہے جو اسے نیک وبد بناتا ہے۔

نیاز رُوح کے وجود پر بھی تفصیلی بحث کرتے ہیں جس کا تعلق حیات بعد الموت سے ہے اور جس کا ہم اوپر بھی ذکر کر چکے ہیں۔ اسی سے وابستہ سوال جنت و دوزخ کا ہے۔ نیاز نے ان سب باتوں کی تشریح کی ہے۔

نیاز رُوح کے الگ سے وجود کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ نہ ہی روایتی حیات بعد الموت کے اس طرح قائل تھے جس طرح مولوی پیش کرتے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ نظریہ مولویوں کا خود ساختہ ہے۔ شریعت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ ان کی رائے میں جنّت و دوزخ خود انسان کے اندر ہے۔ کوئی بھی اچھا کام ایسا نہیں جس کا انعام اس دنیا میں ہی نہ ملتا ہے اور کوئی برا کام ایسا نہیں جس کی سزا انسان کو یہاں نہ بھگتنا پڑتی ہو۔ آدمی بُرا کام کرکے جس کرب و پریشانی میں مبتلا رہتا ہے وہ اس کی سزا ہے۔ وہی اس کا جہنم ہے۔ اچھا و نیک کام کرکے آدمی کو جو اطمینان قلب حاصل ہوتا ہے وہ اس کا انعام ہے۔ وہی اس کی جنت ہے۔ یہ ایک دل کو لگنے والی بات ہے۔

مگر مولویوں کی پیش کردہ شریعت میں اس تشریح کی کوئی گنجائش نہیں کیونکہ ان کے مفاد کے خلاف تھی ان کے کاروبار کا تمام تر دارو مدار جنت و دوزخ کے اسی تصور پر ہے۔ نیازؔ بقول غالبؔ یہ چاہتے تھے :

طاعت میں تا رہے نہ مئے وانگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دے کوئی لے کر بہشت کو

نیاز صاحب وحی کے روایتی تصوّر کو بھی نہیں مانتے تھے۔ ان کی نگاہ میں کسی ایسے فرشتے کا وجود بھی نہیں تھا جو وحی لے کر آتا تھا۔ نہ ہی قرآنی آیات کلام خداوندی ہے۔ وہ کہتے تھے وحی کسی پر بھی نازل ہوسکتی ہے۔ اس کا تعلق انسان کی اپنی ذہنی قوت وصلاحیت اور اس کے وجدان سے ہے۔ وہ قرآن کو پیغمبر اسلام کا کلام کہتے تھے اور یہ کہ عظمتِ رسول کا تقاضا ہے کہ اسے انہیں کا کلام سمجھا جائے۔ نیاز کے مطابق چند آفاقی یا عالمگیر قدروں کا نام دین ہے اور تمام دنیا کا دین ایک ہے۔ مذہب مختلف ہو سکتا ہے۔ ترک رسوم کو وہ اسلام کے نام سے منسوب کرتے تھے اور کہتے تھے بقول غالبؔ ع "ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں" اصل اسلام ہے۔

نیازؔ فتحپوری خدا کے وجود کو مظاہر فطرت کے ذریعہ سمجھتے تھے۔ خدا ہے یا نہیں اس کا جواب وہ اس طرح دیتے ہیں :

" اس کا جواب سورج کے طلوع وغروب سے چاہو، چاند کے آب و تاب سے پوچھو، آبشاروں کی روانی اور

دشت و صحرا کی ویرانی سے دریافت کرو۔ پہاڑوں کے سکوت اور دریاؤں کے شور سے طلب کرو۔"

نیاز نے اسلام کو قرآن کی روشنی میں ذاتی مطالعہ اور غور و فکر سے سمجھا تھا۔ اس لئے جن نتائج پر وہ پہنچتے ہیں وہ ان کے اپنے ہیں۔ پیغمبرِ اسلام نے خدا کا جو تصوّر پیش کیا اس کے بارے میں لکھتے ہیں :

" ریگستان عرب سے انسانِ کامل کا ظہور ہوا اور اُس نے نہایت مختصر و سادہ الفاظ میں خدا کے وجود کا وہ فلسفہ بیان کیا جو اس سے قبل کسی نے بیان نہ کیا تھا۔ اس نے ثنویت و تثلیث کی تردید کی۔ اس نے تجسم و تشکیل کو غلط ٹھہرایا۔ اس نے کثرت و انتشار کو محو کیا۔ تفریق و افتراق کی راہوں کو بند کیا اور اس نے بتایا کہ خدا تمام مکانیات و زمانیات سے بے نیاز ہے۔ مادیات کی دنیا سے علیحدہ ہے اور تمام نسبتوں اور اضافتوں سے منزّہ ہے جو عقول انسانی کو کسی وجود کے سمجھانے کے لئے متعین کی جاتی ہے۔"

نیاز نے وحدانیت کے نظریئے سے بھی بحث کی ہے۔ ان کی رائے میں علماء نے خدا کو جن ننانوے ناموں سے موسوم کیا ہے، ان سے ایک مطلق العنان بادشاہ کا تصوّر اُبھرتا ہے۔ ان میں بعض نام تو ایک دوسرے کی ضد ہیں جیسے رحیم و قہار۔ خدا کے ان ناموں سے انسانی خصوصیات کا اظہار ہوتا ہے جس کا مطلب ہے خدا بھی انسانوں کی طرح جذبات رکھتا ہے۔ وہ بھی غصہ ہوتا ہے۔ خوش ہوتا ہے۔ خوش ہو کر رحم کرتا ہے۔ غصہ ہو کر قہر نازل کرتا ہے۔ انہی ناموں میں خدا کا ایک نام "کل" ہے جسے مولویوں نے نظر انداز کر دیا یا اس کا بہت کم ذکر کرتے ہیں اور اس حقیقت و اہمیت پر غور نہیں کیا۔ نیاز کے نزدیک یہی ایک نام ہے جس سے وحدانیت کی تشریح ہوتی ہے۔ خدا کل ہے یعنی سرِ دیا پی۔ انگریزی میں کل کو OMNIPOTENT کی اصطلاح سے بھی سمجھا جا سکتا ہے۔

مولانا نیاز فتحپوری میں حریت فکر کے یہ سوتے کہاں سے پھوٹے تھے؟ وہ اصطلاحی و روایتی معنی میں مولانا نہیں تھے۔ ان کے پاس کسی دارالعلوم کی سند نہ تھی لیکن صحیح معنوں میں عالم دین تھے اور ریاضت و محنت اور ذہانت سے تمام دینی علوم پر دسترس حاصل کی تھی اور مولوی سے اسی کے فیلڈ میں اسی کے ہتھیاروں سے معرکہ کیا تھا۔ انگریزی تعلیم بھی وہ باقاعدہ حاصل نہیں کر سکے تھے۔ انہوں نے دسویں کلاس تک اسکول میں پڑھا تھا لیکن کئی زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔

نیاز کا خاندان کوئی علمی گھرانہ نہیں تھا۔ ان کے والد محمد امیر خاں جو ایک پیش کار تھے کے زمانے سے ان کے گھر میں تعلیم کا رواج ہوا۔ محمد امیر خاں نے فارسی سیکھی تھی۔ فارسی میں شعر بھی کہتے تھے۔ وہ وسیع المشرب اور رنگین مزاج انسان تھے۔ یہ خصوصیات بھی نیاز کو اپنے والد سے ورثہ میں ملی تھیں۔ انھوں نے تین شادیاں کیں۔ نیاز کی والدہ کے بارے میں کہا جاتا ہے وہ ایک طوائف زادی تھی۔ ان کا خاندان بھی اعلیٰ نسب خاندان نہ تھا۔ وہ مسلمانوں کے برادری طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔

مسلمان گھرانوں اور مدرسوں میں جس طرح ابتدا ہی سے بچوں کے ذہنوں میں اسلامی شعار اور عقائد کو بلا سوچے سمجھے پیوست کرایا جاتا ہے نیاز کا ذہن اس سے آزاد تھا۔ یہ اسلامی روایات انہیں خاندانی ورثہ میں بھی نہیں ملی تھیں۔ ان کا ذہن ایک کورا کاغذ تھا۔ اور انھوں نے اپنی فکر سے اس پر جو چاہا لکھا۔

فتح پور میں دینی مدرسوں کے ماحول نے نوجوان نیاز کے ذہن پر بہت خراب اثر ڈالا تھا۔ جس مدرسے میں انہیں داخلہ دلایا گیا تو وہاں اساتذہ اور طلبا دونوں کے ذہنوں پر قفل لگے تھے۔ انھیں اس ماحول میں گھٹن محسوس ہوتی تھی۔ انھوں نے حافظ خانوں کا ماحول دیکھا تھا جہاں معصوم بچے ملّاؤں کے ظلم برداشت کرتے تھے اور صبح سے دوپہر تک قرآنی آیات کو ہل ہل کر رٹتے رہتے تھے۔ نیاز کو اس منظر سے بھی نفرت تھی۔ ان حافظ خانوں کے بارے میں ایک جگہ نیاز نے لکھا ہے :

" کبھی کبھار میں والد سے کہہ دیا کرتا تھا کہ اگر قرآن کا حفظ کرانا اس حد تک ضروری ہے کہ بچے کے جسم و دماغ دونوں کو مجروح اور بیکار کر دیا جائے تو قرآن سے انکار ہی بہتر ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ حافظ خانے سے مجھے واسطہ نہیں پڑا۔"

نیاز فتحپوری ایک سچے ہندوستانی تھے۔ ہندوستان سے محبت کرتے تھے۔ انھوں نے تقسیم ملک کی مخالفت کی۔ وہ تحریک خلافت کے بھی

خلاف تھے۔ اپنے نظریات میں پکے کانگریسی تھے۔ وہ جداگانہ انتخاب کو مسلمانوں کے حق میں مضر خیال کرتے تھے۔ ان کی تحریروں سے ان کے اشتراکی رجحان کا بھی پتہ چلتا ہے۔ وہ پین اسلام ازم (PAN ISLAMISM) کے بھی مخالف تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

"اس وقت تمام دنیا کے مسلمان ایک رشتے سے وابستہ نہیں ہیں اور نہ ایسا ہونا ممکن ہے۔ لیکن اس کا علاج پان اسلام ازم سے ممکن ہے نہ فلسطین میں کسی یونیورسٹی کے قیام سے بلکہ اس کا تعلق احساس و طنیت سے ہے۔ افسوس ہے ہندوستان کا بد نصیب مسلمان اس احساس سے محروم ہے اور اب تک یہ سودا اس کے دماغ سے نہیں نکلا کہ وہ ہندوستان میں حکمراں ہو کر آیا تھا۔"

ایسا کیوں ہے۔ ہندوستانی مسلمان اپنے وطن کو وطن کیوں نہیں سمجھ سکا۔ اس کی ذمہ داری بھی مولویوں اور ان کی تعلیم پر ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"ہندوستان میں صدیوں تک قیام کرنے کے بعد یہ اجنبیت کیوں ہے۔ اس کا سر رشتہ بھی علمائے مذہب ہی کے ہاتھ میں ہے جنہوں نے سرزمین ہند کو دارالحرب و کفرستان اور یہاں رہنے والے کو ہمیشہ کافر کہہ کر اختلاف و دشمنی کی وسیع خلیج حائل کر دی۔ درحالانکہ نہ ہندوستان کفرستان ہے اور نہ ہندو کافر و مشرک... ایک ہندو مندر میں جا کر بت کے سامنے جھک جاتا ہے تو کافر ہے۔ لیکن ایک مسلمان مسجد میں جا کر محراب کے سامنے سر بسجود ہو جاتا ہے تو کافر نہیں۔ ایک ہندو پتھر کی مورتی کو بوسہ دیتا ہے تو شرک ہے لیکن ایک مسلمان طوافِ کعبہ کے وقت سنگِ اسود کو چومتا ہے تو مشرک نہیں۔ کیوں؟"

نیاز فتحپوری اپنے زمانے کے سب سے بڑے مجتہد و مجدد تھے۔ ان کے نظریات سے ہندوستانی مسلمانوں کا پورا اسلامی نظام تعلیم منقلب نظر آتا ہے۔ آج کے زمانہ میں نیاز کے مذہبی افکار کی کہیں زیادہ اہمیت و ضرورت ہے۔ مسلمان اپنی مذہبی فکر اور تعلیمی ڈھانچہ میں بنیادی تبدیلی کئے بغیر ترقی کی راہ پر گامزن نہیں ہو سکتا۔ نیاز فتحپوری نے اس ترقی کے دروازے ہمارے لئے کھول دئے تھے۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری ——— نیاز علماء کی تقلید نہیں کرتے۔ قرآن اور حدیث پر ایمان رکھتے ہیں۔ ان کا اسلام خالص اسلام ہے۔ وہ نہ شیعی ہیں نہ سنّی، نہ مقلد ہیں نہ غیر مقلد، نہ دیوبندی ہیں نہ بریلوی، نہ قرآنی ہیں نہ اہل حدیث، وہ محض مسلمان ہیں۔

پروفیسر آل احمد سرور ——— حالی، سلیم اور عبدالحق کے بعد نیاز ہمارے بڑے نقّادوں میں سے ہیں۔ بلکہ ادبی شعور کی گہرائی کے لحاظ سے وہ سلیم اور عبدالحق سے بلند ہیں۔

نیاز فتح پوری

لسانی مزاج اور تشکیل اسلوب

ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ

شعبۂ لسانیات

علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

نیاز فتح پوری (۱۸۸۴–۱۹۶۶ء) اردو کے ایک صاحبِ طرز انشا پرداز، طرح دار ادیب اور جید عالم تھے۔ اردو زبان پر فن کارانہ قدرت رکھنے کے ساتھ ساتھ انھیں عربی، فارسی اور ترکی زبانوں پر بھی کامل عبور حاصل تھا۔ علاوہ ازیں انگریزی زبان سے بھی ان کی واقفیت کچھ کم نہ تھی۔ فارسی کا ذوق انھیں اپنے والد سے ورثے میں ملا تھا جو نہ صرف فارسی کے کلاسکی ادب کے دلدادہ تھے، بلکہ فارسی میں شعر بھی کہتے تھے۔ فارسی کا ابتدائی درس نیاز فتح پوری نے گھر پر ہی اپنے والد سے لیا تھا (۱)۔ بعد میں انھوں نے مدرسۂ اسلامیہ، فتح پور میں درسِ نظامی کی کتابیں باقاعدہ طور پر پڑھیں اور اس مدرسے کے مدرسِ اعلیٰ مولانا نور محمد سے عربی کی تعلیم حاصل کی (۲)۔ آگے چل کر انھوں نے عربی میں اتنا کمال پیدا کر لیا کہ اپنی پہلی بیوی کے انتقال پر عربی میں مرثیہ لکھا (۳)۔ انھوں نے بہت سے افسانے بھی عربی زبان سے اردو میں ترجمہ کیے جو رسالہ "نگار" میں شائع ہوئے۔ ترکی زبان پر انھیں اتنی قدرت حاصل تھی کہ وہ براہِ راست ترکی سے اردو میں ترجمہ کر سکتے تھے (۴)۔ ترکی ادب کا انھوں نے بہت گہرا مطالعہ کیا تھا۔ ترکی کی مشہور شاعرہ نگار بنتِ عثمان سے وہ اتنے متاثر تھے کہ فروری ۱۹۲۲ء میں انھوں نے آگرہ سے جب اپنا رسالہ جاری کیا تو اس کا نام بھی "نگار" رکھا۔ انہوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ترکی سیکھنے کا مجھ پر جنون سوار تھا (۵)"۔ نیاز نے اپنی ادبی زندگی کی اٹھان میں سجاد حیدر یلدرم سے بہت اثر قبول کیا۔ یلدرم اس زمانے میں تراجم کے ذریعے اردو میں انشائے عالیہ کے نمونے پیش کر رہے تھے۔ عربی فارسی کی طرح نیاز نے انگریزی کی تعلیم بھی ابتدا ہی سے حاصل کی تھی اور اس میں اتنی صلاحیت پیدا کر لی تھی کہ مدرسۂ اسلامیہ، فتح پور کی انگریزی شاخ کے تین مرتبہ ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔ بعد میں اپنے مطالعے کی بنیاد پر انگریزی ادیبوں سے انھوں نے کافی اثر قبول کیا جن میں وکٹر ہیوگو، ہیزلٹ اور اوسکر وائلڈ کے نام خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ الغرض نیاز فتح پوری کے لسانی مزاج کی تشکیل و ارتقاء میں ان زبانوں کا نہایت اہم رول رہا ہے۔

کسی شخص کے لسانی مزاج کا انحصار اس کی اپنی زبان کی اہلیت یا شعور پر قائم ہوتا ہے جسے لسانیاتی ادب کی اصطلاح میں Linguistic Competence کہا جاتا ہے یہ اصطلاح سب سے پہلے مشہور امریکی ماہر لسانیات نوام چامسکی (Noam Chomsky) نے استعمال کی تھی جس سے کسی شخص کی اپنی زبان کا علم مراد لیا جاتا ہے۔ بعد میں اس نظریے کو ایک دوسرے امریکی ماہر لسانیات ڈیل ہائمز (Dell Hymes) نے چیلنج کیا اور کہا کہ کسی شخص کے لیے محض اپنی زبان کا علم، اہلیت یا شعور ہی کافی نہیں، بلکہ مخصوص سماجی سیاق و سباق میں اسے اپنی زبان کو برتنے اور بروئے عمل لانے کا شعور بھی آنا چاہیے کیوں کہ زبان ایک سماجی مظہر (Social Phenomenon) ہے جسے سماجی سیاق و سباق سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ ڈیل ہائمز نے اپنے اس نظریے کو Communicative Competence یعنی ترسیلی شعور یا اہلیت کا نام دیا ہے۔ لسانی مزاج کی تشکیل میں ان دونوں نظریات کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

نیاز فتح پوری نے خالص مشرقی ماحول میں آنکھیں کھولیں۔ ہوش سنبھالا تو مذہبی طرز کی تعلیم پائی جس پر عربی اور درس نظامی کی گہری چھاپ موجود تھی۔ والد کی صحبت و تربیت نے ان کے اندر فارسی کا گہرا ذوق پیدا کیا۔ چناں چہ یہ دونوں زبانیں ان کے لسانی مزاج کا اٹوٹ اور امٹ حصہ بن گئیں۔ آگے چل کر ان کے اندر فارسی کا ذوق اور زیادہ نکھرا۔ ۱۲۔ ۱۳ برس کی عمر میں شاعری شروع کی (۶)۔ عنفوان شباب میں لکھنو کا رنگین ماحول ملا جس کے اثرات نہ صرف ان کے ذہن و دماغ اور فکر پر مرتب ہوئے، بلکہ ان کے لسانی مزاج کی تشکیل میں بھی ان کا نمایاں حصہ رہا ہے۔ خود انھیں کی زبانی لکھنو کی ایک طوائف کے "دربار" کا حال سنیے جہاں ان کے والد نے انھیں "بالکل آزاد" چھوڑ دیا تھا :

> "شام کو چودھراین کا مکان بالکل دربار نظر آتا تھا جس میں شہر کے اکثر خوش ذوق لوگ شریک ہوتے تھے۔ اور اس محفل میں چودھراین کی حیثیت ایک معلم کی سی ہوتی تھی جس کی گفتگو اور انداز نشست و برخاست سے لوگ صحیح لکھنوی تہذیب سیکھتے تھے، اس محفل میں شعرخوانی، داستان گوئی، لطائف و ظرافت، ضلع جگت، رقص و سرود، سبھی کچھ ہوتا تھا اور جو لوگ یہاں سے لوٹتے تھے تو موسیقی کا صحیح ذوق یا زبان کا صحیح استعمال، گفتگو کا خاص انداز، لب و لہجہ کی شیرینی، نشست و برخاست کا انداز اور خدا جانے کن کن باتوں کا درس لے کر لوٹتے تھے"۔ (۷)

کسی شخص کا لسانی مزاج نہ تو پہلے سے طے شدہ (pre - determined) ہوتا ہے اور نہ خلقی و موروثی، بلکہ یہ کلیتہً اکتسابی اور ماحول کا زائیدہ ہوتا ہے جس کی تحصیل پہلے غیر رسمی پھر رسمی (جب وہ پڑھنا لکھنا سیکھتا ہے) طور پر عمل میں آتی ہے۔ کسی شخص کے لسانی مزاج کی تشکیل میں اس کا عہد، معاشرہ، تہذیب، ماحول، علمی و ادبی روایات، تعلیمی پس منظر، گرد و پیش کے افراد نیز ثانوی زبانیں (جو وہ شعوری طور پر سیکھتا ہے) اہم رول ادا کرتی ہیں۔ نیاز فتح پوری کے لسانی مزاج کی تشکیل میں بھی ان تمام عوامل کی کارفرمائی رہی ہے۔

لسانی مزاج کی اصل، عام اور سادہ صورت روزمرہ کی گفتگو اور عام بول چال میں دیکھی جا سکتی ہے۔ ہر وہ شخص جو اپنی مادری زبان پر قدرت رکھتا ہے ایک مخصوص لسانی مزاج کا بھی حامل ہوتا ہے۔ لیکن صحیح معنوں میں اس کا ارتقا ادبی زبان کی شکل میں ہی ہوتا ہے۔ یہ لسانی مزاج کی تخلیقی اور فن کارانہ صورت ہے۔ یہ وہی لسانی مزاج ہے جو کسی ادیب کو صاحبِ اسلوب بناتا ہے۔ اس کی انفرادیت کا ضامن ہوتا ہے اور اسے دوسرے ادیبوں سے ممتاز کرتا ہے۔ کسی ادیب یا شاعر کے اسلوب کی تشکیل میں اس کے تخلیقی اور فن کارانہ لسانی مزاج کی ہی کارفرمائی ہوتی ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ کسی ادیب کا اسلوب اس کے تخلیقی اور فن کارانہ لسانی مزاج کا ہی دوسرا نام ہے تو بیجا نہ ہوگا۔ جب ہم میر کا اسلوب، غالب کا اسلوب یا میرامن کا اسلوب کہتے ہیں تو اس سے میر، غالب یا میرامن کے لسانی مزاج کی تخلیقیت ہی مراد لی جاتی ہے۔ روزمرہ کی گفتگو یا عام بول چال کی زبان کی ایک خصوصیت یہ بیان کی گئی ہے کہ یہ Automatized ہوتی ہے یعنی اس میں ترسیل و ابلاغ کا عمل برجستہ بہ سرعت اور غیرارادی طور پر سرانجام پاتا ہے اور زبان تحت الشعور کا حصہ بن جاتی ہے لیکن ادبی زبان میں اس کے بالکل برعکس عمل ہوتا ہے اسی لیے اسے De - automatization کا نام دیا گیا ہے۔ اس کا زبان کے تخلیقی استعمال سے گہرا تعلق ہے۔ زبان کے تخلیقی استعمال میں ادیب کی شعوری کوششوں کو خاصا دخل ہوتا ہے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ زبان کے تخلیقی استعمال سے جو اسلوب تشکیل پاتا ہے وہ اس زبان کے بنیادی اسلوب سے مختلف ہوتا ہے۔ بنیادی اسلوب میں ایک قسم کا لسانی توازن پایا جاتا ہے جب کہ تخلیقی زبان لسانی توازن کے انحراف کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوتی ہے۔ لسانی توازن کو ہم لسانی نارم (Linguistic Norm) سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ ادبی زبان میں ہمیشہ لسانی نارم سے انحراف (Deviation) پایا جاتا ہے جب کہ بول چال کی زبان بنیادی اسلوب سے قریب تر ہوتی ہے اور اس میں لسانی نارم کی پابندی کی جاتی ہے، لیکن اس میں زبان کے تخلیقی استعمال کے امکانات بہت کم ہوتے ہیں۔ جہاں تک کہ اردو کے بنیادی اسلوب کا تعلق ہے عام خیال یہ ہے کہ یہ ایک "مفروضہ" ہے۔ کیوں کہ اردو کے کسی بھی مصنف کے اسلوب کو اردو کا بنیادی اسلوب نہیں قرار دیا جا سکتا۔ ہاں اگر کسی مصنف کا اسلوب کسی حد تک عام فہم، سادہ، سلیس اور آسان ہے تو اسے بنیادی

اسلوب کے قریب تر ضرور کہا جاسکتا ہے ۔ اس ضمن میں سرسید، حالی، شبلی اور مولوی عبدالحق کی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں جن کے اسالیب کو اردو کے بنیادی اسلوب سے قریب تر کہا جاسکتا ہے ۔ ان مصنفین کے برعکس اگر ہم مولانا محمد حسین آزاد، مرزا رجب علی بیگ سرور، مولانا ابوالکلام آزاد اور نیاز فتح پوری کی تحریروں کو دیکھیں تو ہمیں ایک بالکل دوسرا اسلوب نظر آئے گا جسے پیچیدہ، مرصع، رنگین اور آراستہ اسلوب قرار دیا جاسکتا ہے ۔ یہ اردو کے بنیادی اسلوب کے برعکس ہے ۔ پروفیسر محمد حسن کا یہ خیال تو درست ہے کہ "سرسید نے جس سلیس اور سادہ نثر کو رواج بخشا تھا اسے نیاز نے مرصع اور رنگین بنادیا" ۔ لیکن ان کی یہ بات محل نظر ہے کہ ایسا سرسید کے رد عمل کے طور پر ہوا (۸) ۔ نیاز کے اسلوب میں جو صنعت گری اور حسن کاری پیدا ہوئی اس کے دو محرکات ہیں ۔ اول ان کی حسن پرستی اور جمالیاتی احساس، دوم ان کا مخصوص لسانی مزاج جس کی تشکیل ایک خاص ماحول میں ہوئی تھی ۔

نیاز فتح پوری کے دلکش، رنگین، مرصع اور آراستہ اسلوب کو ذہن میں رکھتے ہوئے انھیں اردو نثر کا جوش کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا ۔ کیوں کہ نیاز کے یہاں الفاظ کی وہی گھن گرج پائی جاتی ہے جو جوش ملیح آبادی کے یہاں ہے ۔ دونوں کے یہاں زبان کا تاثراتی (Expressive) استعمال اپنی بلندی پر ہے ۔ دونوں کے یہاں مرعوب کرنے والا انداز بھی ملتا ہے ۔ دونوں کو الفاظ کے استعمال پر زبردست قدرت حاصل ہے ۔ دونوں زبان کی رنگینی اور آراستگی پر زور دیتے ہیں اور دونوں عربی فارسی کے الفاظ و تراکیب کا بکثرت استعمال کرتے ہیں ۔ نیاز فتح پوری اپنی کتاب "ماله وما علیه" میں جوش کی ایک نظم پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "یہ نظم صرف خوش نما الفاظ و دلکش تراکیب اور خوبصورت تشبیہوں کا مجموعہ ہے جن سے شاعر کے اچھے آرٹسٹ ہونے پر تو حکم لگایا جاسکتا ہے لیکن ان کی مفکرانہ حیثیت پر اس سے کوئی روشنی نہیں پڑتی" ۔ جن لوگوں نے نیاز کے افسانوی مجموعوں، انشائیوں، مکاتیب اور دیگر تحریروں کا مطالعہ کیا ہے وہ اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتے کہ خود نیاز کے یہاں "خوش نما الفاظ و دلکش تراکیب اور خوب صورت تشبیہوں" کی کمی نہیں ۔ باعتبار اسلوب، نیاز، ابوالکلام آزاد سے بھی بے حد قریب ہیں ۔ آزاد کے مجموعہ مکاتیب "غبار خاطر" اور "مکتوبات نیاز" میں بے شمار اسلوبیاتی مماثلتیں پائی جاتی ہیں ۔ نیاز فتح پوری نے رنگین ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں، حسن پرستی ان کا شعار تھا، اور احساس جمال ان کی کمزوری ۔ پھر بنیادی طور پر وہ افسانہ نگار تھے ۔ لہذا ان سے سادہ و سہل نثر کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی ۔ لیکن ابوالکلام آزاد کی نثر غیر افسانوی ہوتے ہوئے بھی سادگی اور سلاست سے کوسوں دور ہے ۔ نیاز اور آزاد دونوں کی نثر میں آراستگی، صنعت گری، رنگینی اور پیچیدگی ایک عام بات ہے ۔ دونوں اپنی نثر میں فارسی الفاظ و تراکیب کی گہری آمیزش سے کام لیتے ہیں اگرچہ فکری اعتبار سے دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں ۔

نیاز فتح پوری کے اسلوب کی ان کے تمام ہم عصروں نے جی کھول کر داد دی ہے ۔ جوش نے اپنی تمام تر مخالفتوں کے باوصف نیاز کو "خالق طرز انشاء پرداز" کہا ہے (۹) ۔ فراق گورکھپوری نے انھیں "بلند پایہ اسٹائلسٹ (Stylist) " کے نام سے یاد کیا (۱۰) ۔ مجنوں گورکھپوری نے ان کے اسلوب کی انفرادیت کو "تخلیقی اسلوب" کا نام دیا اور کہا کہ "نیاز فطرتاً ایک صاحب اسلوب ہیں" ۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ "نیاز کا بڑے سے بڑا منکر بھی ان کے اسلوب کی ساحرانہ قوت سے مبہوت ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا .... نئی نسل کو نیاز سے جو ترکہ ملا ہے وہ اسلوب ہے، ایسا اسلوب جو طرح طرح کی توانائیاں اپنے اندر لیے ہوئے ہے (۱۱)" ۔ ل ۔ احمد اکبرآبادی نے ایک جگہ یہ لکھا کہ "اس دور میں نیاز صاحب اردو کے مسلمہ ادیب و انشاپرداز اور بلاشبہ اعلیٰ طرز نگارش کے مالک ہیں (۱۲)" ۔ مالک رام نے ان کی نثر کو "بانکی البیلی نثر" کہا (۱۳)" ۔ محمد حسن نے نیاز فتح پوری پر اپنے ایک مضمون میں لکھا کہ ان کی "نثر میں جادو تھا (۱۴)" ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نیاز فتح پوری ایک صاحب طرز انشاپرداز تھے ۔ ان کا اسلوب اپنے اندر ایک انفرادی اور جداگانہ شان رکھتا ہے ۔ نیاز کی تحریروں کو پڑھ کر ہم ایک ایسے جمالیاتی تجربے سے گزرتے ہیں جہاں نغمگی، رنگینی، دلآویزی اور حسن کاری سب کچھ ہے ۔

اسلوب کا تعلق ادب میں زبان کے استعمال سے ہے ۔ چوں کہ ادب کا ذریعہ اظہار زبان ہے، لہذا اظہار کے نت نئے طریقوں، طرز بیان کی جدتوں اور نئے لسانی سانچوں کی تشکیل سے ہی اسلوب کی تشکیل عمل میں آتی ہے ۔ یہ تمام اسلوبیاتی وسائل زبان کی صوتی، صرفی، لغوی، نحوی اور معنیاتی

سطح پر بروئے کار لائے جاتے ہیں۔ زبان کا ادبی یا اسلوبیاتی استعمال ایک طرف طرز بیان میں اثریت کا موجب بنتا ہے تو دوسری طرف اظہار میں جدت اور معنی میں اضافے کا سبب بھی قرار پاتا ہے۔ نیاز فتح پوری کی تحریریں جن میں ان کے افسانوی مجموعے، انشائیے، مکاتیب، تنقیدی مقالات، مذاکرات اور ان کی کتاب "**مالہ وماعلیہ**" شامل ہے، زبان کے اسلوبیاتی استعمال کے بڑے اچھے اور اچھوتے نمونے پیش کرتی ہیں جن کا تجزیہ ذیل میں محدود طور سے صوتی اور نحوی سطح پر کیا جاتا ہے :

(الف) صوتی

۱۔ صوتی رمزیت

صوتی سطح پر نیاز فتح پوری کے اسلوب کی ایک نمایاں خصوصیت صوتی رمزیت (Sound Symbolism) ہے جس میں الفاظ کی اصوات سے ان کے معانی کا اظہار ہوتا ہے، مثلاً —

- "زبیدہ میں ناگن کا بل تھا اور لہروں کا لوچ، گلبن کی لچک تھی اور سنبل کا پیچ و خم"۔ (۱۵)

(لام کی آواز جو اس جملے میں چھ بار استعمال ہوئی ہے، حرکت کے مفہوم کو بخوبی ادا کرتی ہے، بالخصوص بل، لہروں، لوچ اور لچک جیسے الفاظ میں)

- "ساکن سطح آب، سنسان صحرا، خاموش شب ماہ، برف پوش چوٹیاں"۔ (۱۶)

یہاں س[ص] ش اور خ کی صفیری (Fricative) آوازوں سے ماحول کے سکوت و سکون کی عکاسی کا کام لیا گیا ہے۔

- "جس کے ایوان خانے میں کنیزوں کے ریشمی ملبوسات کی سرسراہٹ ہمیشہ محسوس ہوتی رہتی تھی"۔ (۱۷)

(یہاں "سرسراہٹ" ایک Onomatopoeic یعنی صوت رمزی لفظ ہے جس میں س کی دونوں اصوات اس آواز کی نقالی کر رہی ہیں جو لباس کے سرکنے، ہلنے یا جسم سے مس ہونے سے پیدا ہوتی ہے۔ ایک اور قریب الواقع لفظ "ملبوسات" بھی ہے جو اگرچہ صوت رمزی لفظ نہیں ہے لیکن اس میں پائی جانے والی اس کی آواز "سرسراہٹ" کی س کے ساتھ مل کر صوت رمزی کیفیت کو دوبالا کر رہی ہے۔ انگریزی میں اس کی خوبصورت مثال ٹینی سن کی ایک لائن " And murmuring of innumerable bess." ہے۔

۲۔ تجانس صوتی

تجانس صوتی (Alliteration) کی مثالیں بھی نیاز کی تحریروں میں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ اس میں کسی جملے یا فقرے کے دو یا دو سے زیادہ قریب الواقع الفاظ ایک ہی مصمتے سے شروع ہوتے ہیں، مثلاً

- "اگر میری زلفوں کی تاب سے وہ بچ گیا تو نگاہوں کے تیر سے کیوں کر جانبر ہو سکے گا"۔ (۱۸)
- "جمنا اپنی نیلگوں چادر میں چاند کا مکھڑا چھپانے کی کوشش کر رہی تھی اور ناکام ہو کر ساحل پر سر پٹک رہی تھی"۔
- "اور یہ لانبی گھنی پلکوں کو تو دیکھو جیسے سیاہ ریشم کے باریک و نرم ریشے کسی نے سلیقے سے جما دیے ہوں"۔ (۱۹)
- "چاندنی رات تھی، خانقاہ کے نیچے بہنے والی ندی میں چاند نے چراغاں کر رکھا تھا"۔ (۲۰)

۳۔ قافیہ بندی

نیاز کے اسلوب نثر کی ایک نمایاں خصوصیت جملوں اور فقروں میں قافیوں کا التزام ہے۔ وہ اپنی تحریروں میں بڑی خوب صورتی کے ساتھ مقفیٰ

الفاظ استعمال کر جاتے ہیں جس سے شعر کی سی دلکشی پیدا ہو جاتی ہے ۔ چند مثالیں دیکھیے :

○ "راجپوتوں کی لڑکیاں ہیں، بلند بالا، صحیح و توانا، تیوریاں چڑھی ہوئی، گردنیں تنی ہوئی، آنکھوں میں تیر، مانگوں میں عبیر، ابروؤں میں خنجر بالوں میں عنبر، ہاتھوں میں مہندی، ماتھے پر بیندی، اب آپ سے کیا کہوں کیا چیز ہیں" ۔ (۲۱)

○ "وہ جام و مینا کی سرگوشیاں، وہ صحن چمن میں درختوں کی گل پوشیاں، وہ ہلکی ہلکی پھوار، وہ رندانِ بدمست کی ہنگامہ "بادہ بیار"، آہ کیا پوچھتے ہو !" ۔ (۲۲)

○ "محبت کو تم جنون و دیوانگی کہتے ہو، لیکن غزل گوئی کو بڑی فرزانگی ! قربان جائیے اس عقل و فراست کے" ۔ (۲۳)

○ "نسیم ! دیکھتے ہو ان چھوٹے چھوٹے بلبلوں کو جو شہاب ثاقب کی طرح نیچے سے اوپر کی طرف بیتابانہ دوڑتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔ ایک معمولی انسانی زندگی کا بھی یہی فلسفہ ہے ۔ ایک بے اختیارانہ صعود، ایک مضطربانہ اقدام، ایک والہانہ استعلاء اور ایک مجنونانہ تگ و دو" ۔ (۲۴)

○ "تجھے کیا خبر کہ جب تو سو جاتی ہے تو کیا ہو جاتی ہے" ۔ (۲۵)

○ "اس کی رنگینی طبع اکتسابی نہیں، بلکہ یکسر وہبی ہوتی ہے اور اسی لیے وہ کبھی موقع پر چوکتا نہیں اور ہونٹوں پر آئی ہوئی بات کو روکتا نہیں" ۔ (۲۶)

○ "اے بادلوں کی طرح اپنی خانہ بدوش آوارگیوں میں گم رہنے والے صحرائیو، کیا مجھے بھی تم اپنے نشہ وارفتگی میں کبھی شریک کر سکتے ہو جس سے تم نے صحرا کے ذروں کو مخمور اور پہاڑوں کی وادیوں کو معمور کر رکھا ہے" ۔ (۲۷)

(ب) نحوی

۱۔ عکس ترتیب یا تقلیب (Inversion)

ترتیبِ الفاظ (Word-order) اردو کی ایک اہم نحوی خصوصیت ہے ۔ اردو میں الفاظ بہ اعتبار فاعل / مفعول / فعل ترتیب دیے جاتے ہیں ۔ مثلاً احمد (فاعل) اخبار (مفعول) پڑھتا ہے (فعل) ۔ چامسکی کے نظریہ نحو کے مطابق کسی جملے کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ۔ فقرۂ اسمیہ (Noun Phrase) اور فقرۂ فعلیہ (Verb Phrase) ۔ مثلاً احمد (فقرۂ اسمیہ) اخبار پڑھتا ہے (فقرۂ فعلیہ) ۔ ترتیب الفاظ کی اس مقررہ صورت سے انحراف کو عکس ترتیب یا تقلیب کہتے ہیں ۔ یہ ایک طرح کی اسلوبیاتی جدت ہے جو بعض مصنفین کے یہاں اکثر دیکھنے کو ملتی ہے نیاز فتح پوری کی تحریروں میں بھی اس طرز اسلوب کے نمونے اکثر و بیشتر پائے جاتے ہیں ۔ ان کے یہاں عکس ترتیب کے زیادہ تر وہ نمونے ملتے ہیں جن میں فقرۂ فعلیہ، فقرۂ اسمیہ سے پہلے آتا ہے ۔ مثلاً

○ "ایک کیفیت تھی بدن میں سنسنی کی، دماغ میں نشے کی، خون میں سرعتِ دوران کی، روح میں بالیدگی اور احساس میں اس شگفتگی کی جو صبح نسیم کے چھو جانے کے بعد کلی میں پیدا ہونے لگتی ہے" ۔ (۲۸)

○ "زندگی نام ہے صرف ریگ زار کی سی وحشت کا، بے آب و گیاہ سرزمین کی سی خشکی کا" ۔ (۲۹)

○ "جو کسی زمانے میں مخصوص تھا صرف جمیل مناظر قدرت کے مطالعے کے لیے" ۔ (۳۰)

○ "لیکن مجھ سے پوچھیے تو میں کہوں گا کہ وہ صرف کیفیت ہے روح کی، پیام ہے قلب کا" ۔

عکس ترتیب سے جملے کی معنیاتی ساخت میں اگرچہ کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی تاہم تھوڑا زور اور جذباتی تاثر ضرور پیدا ہو جاتا ہے ۔

۲۔ ساختی متوازیت

ساختی متوازیت (Constructional Parallelism) کے نمونے وہاں پائے جاتے ہیں جب دو یا دو سے زیادہ جملے یا جملے کے قریب الواقع اجزا نحوی ساخت کے اعتبار سے متوازی (Parallel) ہوں یعنی ان میں نحوی مماثلت یا مطابقت پائی جاتی ہو۔ ساختی متوازیت میں بالعموم الفاظ اور حروف (حروف عطف، حروف ربط وغیرہ) کی تکرار پائی جاتی ہے۔ لیکن خالص ساختی متوازیت کا انحصار ان چیزوں پر نہیں ہوتا بلکہ جملوں یا فقروں کے نحوی سانچوں اور شکلوں کی تکرار پر ہوتا ہے۔ ساختی متوازیت جزوی بھی ہو سکتی ہے اور کلی بھی۔ جزوی ساختی متوازیت کسی جملے کے دو یا دو سے زیادہ متواتر اجزا کی نحوی تکرار سے تشکیل پاتی ہے جب کہ کلی ساختی متوازیت میں ایک جملہ دوسرے متواتر جملے یا جملوں سے مکمل طور پر نحوی مطابقت رکھتا ہے۔ کلی ساختی متوازیت کو "توازن" (Balance) بھی کہتے ہیں۔

متوازیت نیاز فتح پوری کے نثری اسلوب کی ایک ایسی نمایاں خصوصیت ہے جس سے کوئی بھی قاری صرف نظر نہیں کر سکتا۔ ان کی ہر تحریر میں خواہ وہ افسانہ ہو یا انشائیہ، تنقید ہو یا تبصرہ، مکاتیب ہوں یا ملاحظات، متوازی ساختوں کے نمونے قدم قدم پر مل جائیں گے۔ وہ اس خوبصورتی کے ساتھ متوازی ساختے (Parallel Constructions) تشکیل دیتے ہیں کہ پڑھنے والا مسحور ہو جاتا ہے۔ نیاز کے اسلوب نثر کا یہ ایک بہت بڑا امتیاز ہے جس کی طرف ہر قاری کی توجہ فوراً مبذول ہو جاتی ہے۔ نیاز کے متوازی ساختے خواہ جزوی ہوں یا کلی، اپنے اندر شعر کی سی نغمگی اور دلکشی رکھتے ہیں اور غالباً انھیں کے لیے "شعر منثور" کی ترکیب استعمال کی گئی ہے۔

(الف) جزوی ساختی متوازیت

- "وہ گھنٹوں مندر کے اندر تنہا بیٹھا رہتا، کسی فکر میں مستغرق، کسی خیال میں منہمک"۔ (۳۱)
- "میرے نزدیک محبت نام ہے ایک بے غرض انہماک کا، ایک خود فراموش محویت کا"۔ (۳۲)
- "کیسی کیسی چاندنی راتیں آئیں اور ختم ہو گئیں، کیسی کیسی متوالی گھٹائیں آئیں اور گزر گئیں، لیکن ایک دن بھی "کھل کھیلنے کا" بہانہ تم نے ہاتھ نہ آنے دیا"۔ (۳۳)
- "عورت .... ایک روشنی ہے جسے، ہم چھو سکتے ہیں، ایک نکہت ہے جس سے، ہم گفتگو کر سکتے ہیں، ایک حلاوت ہے جو ہاتھوں سے چکھی جا سکتی ہے، ایک موسیقی ہے جو آنکھوں سے سنی جا سکتی ہے"۔ (۳۴)
- "ساحل قلابہ کی تاریکی میں صرف ایک ہی روشنی جگمگا رہی تھی۔ کہاں "میرے پہلو میں، میری آغوش میں، میری نگاہ کے سامنے، میرے لبوں سے نزدیک اور میری روح کے اندر"۔ (۳۵)
- "یہ تو نے کیسے جانا کہ میں طرف تیرے جسم کا پرستار ہوں، صرف تیری صورت کا شیدائی ہوں"۔ (۳۶)
- "یہ صبح و شام اپنے صحیح فرائض زندگی کو بھول کر گھنٹوں تک سنورنے والیاں، یہ اپنے بیباک تبسموں، اپنی دلبر نگاہوں، اپنی جری و شوخ چتونوں سے دنیا کو مالوف کر دینے کی آرزو رکھتے ہوئے خود کسی سے محبت نہ کر سکنے والیاں"۔ (۳۷)
- "وہ وقت جس کی آرزو میں میری عمر کے سترہ سال ایک ایک دن کر کے گزر گئے تھے، وہ ساعت جس کا تخیل مجھے پہروں کالج میں مست رکھتا تھا، وہ گھڑی جس کے انتظار میں لاکھوں تمنائیں دل میں خوابیدہ تھیں، آئی"۔ (۳۸)

(ب) کلی ساختی متوازیت

- "ہوا کا ہر ہر جھونکا خم کے خم لیے پھرتا ہے اور کوئی پینے والا نہیں۔ مینہ کا ہر ہر قطرہ نغمہ جاں سے لبریز ہے اور کوئی اس کا سننے والا نہیں"۔ (۳۹)
- "بجلی چمکتی تھی اور تمہارا تبسم نگاہوں میں پھر جاتا تھا۔ سرو شمشاد ہوا سے جھومتے تھے اور تمہاری رعنائیاں آنکھوں کے سامنے آجاتی تھیں۔

ساغر میں شراب چھلکتی ہوئی دیکھتا تھا اور تمہاری آنکھوں کا تصور ستانے لگتا تھا" ۔ (۴۰)

○ "ہوا آتی ہے اور میری آنکھوں میں اپنی گرمی چھوڑ جاتی ہے ۔ نسیم چلتی ہے اور میرے کانوں میں اپنی ٹھنڈی سانسیں بھر جاتی ہے!! کہر منتشر ہوتا ہے اور اپنے سیاہ کفن سے مجھے ڈھک لیتا ہے!! بادل اٹھتا ہے اور مجھ پر برہم ہو کر برس پڑتا ہے" ۔ (۴۱)

○ "اس کا صحیح و توانا جسم، جس کے اندر شباب نے اپنا مخصوص رنگ بھر کر یکسر بتنائے رنگین بنا دیا تھا!! اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں، جن سے زہرہ ہر وقت افسوں کرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی!! اس کا سڈول جسم، جس کے ہر عضو سے بہار کا شگفتگی کا مفہوم پیدا تھا" ۔ (۴۲)

"کیا شبنم سبزۂ پامال سے دریافت کر کے اس کو نہال کرتی ہے!! کیا آبِ نیساں صدفِ تشنہ کام سے پوچھ کر اس کی پیاس بجھاتا ہے!! کیا نسیم صبح کلیوں سے استمزاج کر کے ان کو شگفتہ کرتی ہے!! کیا بارش کا چھینٹا کھیتوں سے اجازت طلب کر کے ان کو سیراب کرتا ہے" ۔ (۴۳)

ساختی متوازیت ایک جذبہ انگیز طرز بیان ہے ۔ اس کا مقصد جذبے کو ابھارنا ہے ۔ متوازی ساختوں کے ذریعے یہ کام کئی طرح سے لیا جاتا ہے کہیں ان چیزوں سے گنتی یا ترتیب کا کام لیا جاتا ہے ۔ کہیں یہ مترادفات کا کام انجام دیتے ہیں اور کہیں ان سے بیان میں وضاحت پیدا کی جاتی ہے ۔ ان سب سے قطع نظر متوازی ساختے عبارت میں ایک ایسا آہنگ یا پیٹرن پیدا کر دیتے ہیں جو صرف شعر میں پایا جاتا ہے ۔ اسی لیے نیاز کی نثر کو "مترنم نثر" یا "شعر منثور" بھی کہا گیا ہے ۔

۳۔ عکس متوازیت (Chiasmus)

یہ ساختی متوازیت کا عکس یا تقلیب ہے ۔ جب دو متواتر جملے یا ان کے اجزا ایک دوسرے کا معکوس یا مقلوب ہوں تو اسے عکس متوازیت کہتے ہیں ۔ اس میں نہ صرف الفاظ و تراکیب کی ترتیب الٹ جاتی ہے بلکہ اکثر نحوی سانچوں میں بھی تبدیلی واقع ہوتی ہے ۔ نیاز فتح پوری کے اسلوبِ نثر کی یہ بھی ایک اہم خصوصیت ہے ۔ مثالیں :

○ "تیری آواز صدائے ساز ہے یا صدائے ساز تیری آواز" ۔ (۴۴)

○ "ایک مرد عورت کو یہی سکھاتا ہے کہ اسے ایک بیوی کیسے بننا چاہیے اور ایک عورت مرد کو یہ سکھاتی ہے کہ اسے ایک اچھا شوہر کیسے بننا چاہیے" ۔ (۴۵)

○ "جوانی میں بوڑھا ہو جانا اتنا مشکل نہیں جتنا بڑھاپے میں جوان ہونا" ۔ (۴۶)

○ "کیا عرض کروں وہ کیا بات تھی، بات کیا تھی ایک کیفیت تھی بدن میں سنسنی کی، دماغ میں نشے کی ...." ۔ (۴۷)

○ "بمبئی کا بہترین حسن اور حسن کی بہترین خود آرائیاں ...." ۔ (۴۸)

عکس متوازیت کا استعمال ساختے کے دوسرے حصے پر جو پہلے حصے کا معکوس ہوتا ہے، زور پیدا کرنے کے لیے کیا جاتا ہے ۔ لیکن بعض اوقات اس سے نئے معنی بھی پیدا ہوتے ہیں اور معنیاتی تبدیلی بھی واقع ہوتی ہے ۔

۴۔ تکرار

تکرار Repetition زبان میں جذباتی طرز پیدا کرنے کا ایک موثر ذریعہ ہے ۔ اس کا استعمال اس وقت ہوتا ہے جب متکلم کسی جذباتی کیفیت سے دوچار ہوتا ہے ۔ تکرار سے متکلم کی ذہنی کیفیت کا بھی پتا چلتا ہے ۔ جب متکلم کا دل جوش اور جذبے سے معمور ہوتا ہے تو الفاظ کے اتار چڑھاؤ، جملوں اور فقروں کی ترتیب اور ادائیگی، نیز گفتگو کے عام انداز اور لب و لہجے میں تو فرق آتا ہی ہے، الفاظ، تراکیب اور فقروں کی تکرار بھی واقع ہوتی ہے ۔ تکرار کا جذباتی اور تاثراتی زبان سے گہرا تعلق ہے ۔ جوش اور جذبے کے اظہار کے علاوہ تکرار سے بیان میں شدت پیدا کرنے کا کام بھی لیا جاتا ہے ۔ اس سے غصہ، عمل کی یکسانیت، تھکن، بیزاری اور مایوسی کا بھی اظہار ہوتا ہے ۔ نیاز فتح پوری کی تحریروں بالخصوص ان کے انشائیوں اور

افسانوں میں تکرار کے نت نئے پیرائے ملتے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں :

- "نہیں، میں نہیں سننا چاہتی، اپنے سوال کا جواب تجھ سے نہیں چاہتی"۔ (۴۹)
- "مردانہ جذبات ! میں نہیں سمجھی۔ کس قدر عجیب بات ہے، ایک عورت میں مردانہ جذبات ؟ صاف صاف کہہ، یہ مردانہ جذبات کیسے ہوتے ہیں۔ میں سننا چاہتی ہوں کہ وہ کیا کیفیت ہے جو صرف مردوں میں مخصوص سمجھی جاتی ہے۔ لیکن ہاں تو نے ایک عورت ہو کر یہ کیسے معلوم کیا کہ وہ جذبات مردانہ ہیں ؟ مردانہ ! مردانہ !! اف کس قدر مکروہ، کیسا قابل نفرت لفظ ہے"۔ (۵۰)
- "ہمارے ملک میں عورتیں مردوں ہی کے ساتھ تعلیم پاتی ہیں۔ اس لیے وہ مردوں ہی کی طرح سوچتی ہیں، مردوں ہی کی طرح بولتی ہیں اور مردوں ہی کی طرح اپنی زندگی بسر کرتی ہیں"۔ (۵۱)
- "میں کانپ رہا تھا، میرے جسم کا ایک ایک ریشہ کانپ رہا تھا"۔ (۵۲)
- "میں تیرے حسین تحائف واپس کرتا ہوں کہ یہ تیرے ہی حسین جسم کے لیے موزوں ہیں"۔ (۵۳)

"ماضی کی داستان بھی کس قدر پر لطف داستان ہے"۔ (۵۴)

"ساون کی وہ سیاہ رات، رات کی وہ امنڈ پڑنے والی تاریکی، وہ پہاڑوں اور جنگلوں کو ہلا دینے والی گرج اور پھر اس کے تاریک پردے سے فطرت کا وہ زہرہ گداز تبسم برق، یہ معلوم ہوتا ہے کہ اب اس رات کی کبھی صبح نہ ہوگی"۔ (۵۵)

نیاز فتح پوری کے یہاں تکرار کی ایک ترادفی شکل بھی ملتی ہے جس میں مترادف الفاظ و تراکیب اور فقروں کے استعمال سے مفہوم کی تکرار پیدا کی جاتی ہے۔ اسے ترادفی تکرار (Synonymical Repetition) کہہ سکتے ہیں۔ نیاز کے یہاں اس کے بڑے اچھے نمونے پائے جاتے ہیں۔ مثلاً

- "میرے دماغ کا وزن کیوں ہلکا ہو رہا ہے، میں اپنے آپ کو کیوں سبک محسوس کر رہی ہوں"۔ (۵۶)
- "تف ہے تمہاری جوانی پر اور حیف ہے تمہارے شباب پر"۔ (۵۷)
- "میں تجھے کیسے پوجوں ؟ اپنے جذبہ پرستاری کی آگ کو کیوں کر ٹھنڈا کروں ؟"۔ (۵۸)
- "وہ اپنی نگاہوں کے افسوں اور باتوں کے جادو سے سب کو مسحور کیا کرتی تھی"۔ (۵۹)

"میں یہ دیکھ کر خوش ہوتا ہوں کہ تو دولت مند ہے، میں یہ معلوم کر کے مسرور ہوتا ہوں کہ تو ذہین و قابل ہے"۔ (۶۰)

- "حقیقت یہ ہے کہ اسے اپنے حسن پر بڑا غرور تھا، بڑا پندار تھا"۔ (۶۱)

۵- شماریت

نیاز فتح پوری کے اسلوب کی ایک خصوصیت شماریت (Enumeration) بھی ہے۔ یہ بیان کا ایک طرز ہے جس میں مختلف اشیاء یا افعال (Actions) کا ایک ایک کر کے نام گنایا جاتا ہے جس سے ایک زنجیر سی بن جاتی ہے۔ اس سے جملے کی نحوی ترتیب میں کوئی فرق نہیں آتا۔ جن اشیاء کا ایک ایک کر کے نام لیا جاتا ہے وہ بالعموم ایک ہی زمرے یا قبیل سے تعلق رکھتی ہیں اور ان میں ایک قسم کی معنیاتی ربط پایا جاتا ہے اور یہ کسی بھی طرح تسلسل بیان کو مجروح نہیں ہونے دیتا۔ چند مثالیں

- "یہ شمعدان، یہ گلدان یہ دروازوں کے پردے، یہ دیواروں کے نقش و نگار، الغرض ہر چیز مجھ سے دور ہٹتی ہوئی معلوم ہوتی ہے"۔ (۶۲)
- "تمام احاطہ۔ در و دیوار، محراب، زینہ، چھت، ستون غرض اس عمارت کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جہاں پھول ہی پھول نہ نظر آتے ہوں"۔ (۶۳)

○ "لکھنو کی شاعری میں الفاظ کی طلسم بندی، کنگھی، چوٹی، انگیا، آنچل، آرسی، سرمہ، بے معنی صنائع و بدائع اور اسی قسم کی بہت سی سطحی وغیرہ سنجیدہ خصوصیات کے پیدا ہونے کا سبب بھی تھا"۔ (۶۴)

○ "اسی کے ساتھ چہرہ کا غازہ، رخسار کی گلگونی، لبوں کی سرخی، آنکھوں کی گہری سرمگینی، بالوں کی متموجی آرائش، یہ بھی کوئی غیر معمولی چیز نہ تھی ......"۔ (۶۵)

○ "میں نے دیکھا کہ موجیں ہٹ گئیں، مچھلیاں چلی گئیں، آفتاب نے کیچڑ کو خشک کر دیا اور ہوا پتیاں اڑا لے گئی"۔ (۶۶)

۶- تضاد (Antithesis)

نیاز فتح پوری اشیاء یا مظاہر کو ایک خاص انداز سے بیان کرنے کے لیے ان میں اور دوسری اشیاء یا مظاہر میں مماثلت یا تناسب کے علاوہ تضاد بھی تلاش کرتے ہیں۔ تضاد منطقی بھی ہوتا ہے اور اسلوبیاتی بھی۔ منطقی تضاد کسی بھی طرح کے دو لفظوں میں جو ایک دوسرے کی ضد ہوں دیکھا جاسکتا ہے۔ انھیں متضاد الفاظ (Antonyms) کہتے ہیں۔ مثلاً خیر و شر، نیک و بد، لیل و نہار، صبح و شام، زمین و آسماں یا آگے پیچھے، اوپر نیچے، دائیں بائیں وغیرہ۔ اسلوبیاتی تضاد متضاد الفاظ کے خالی خولی استعمال سے نہیں پیدا ہوتا، بلکہ ان کے استعمال میں جدت سے پیدا ہوتا ہے۔ اور اس کا تعلق زیادہ تر عبارت کے سیاق و سباق سے ہوتا ہے۔ اسلوبیاتی تضاد بالعموم متوازی ساختوں (Parallel Constructions) کی طرز پر ڈھالا جاتا ہے، لیکن یہ کوئی کلیہ نہیں ہے۔ متوازی ساختوں کی وجہ سے عبارت میں ایک مخصوص قسم کا آہنگ یا پیٹرن پیدا ہو جاتا ہے۔ اسلوبیاتی تضاد کا ایک مقصد دو چیزوں میں تقابل بھی ہے جس کی بہترین مثال نیاز فتح پوری کے اس جملے میں پائی جاتی ہے۔ یہ جملہ متوازیت کی بھی ایک اچھی مثال پیش کرتا ہے۔

○ "اُدھر سورج ڈوب رہا تھا اور اِدھر ایک بدر کامل طلوع ہو رہا تھا"۔ (۶۷)

اس جملے کے نہ صرف دونوں متوازی ساختے ایک دوسرے کی ضد ہیں بلکہ ان کے ہر ہر لفظ میں تضاد پایا جاتا ہے (بہ استثناء "ایک") صرف دونوں طرح کے الفاظ کے قواعدی زمرے مشترک ہیں۔

اُدھر	←----→	اِدھر
سورج	←----→	بدر کامل
ڈوب رہا تھا	←----→	طلوع ہو رہا تھا
ادھر سورج ڈوب رہا تھا	←---→	ادھر (ایک) بدر کامل طلوع ہو رہا تھا

تضاد کی ایک اور عمدہ مثال ذیل کی عبارت میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ پوری عبارت کلی ساختی متوازیت کا بھی ایک بہترین نمونہ ہے جس کا ہر متوازی ساختہ اپنے اندر ایک تضاد رکھتا ہے جسے حرفِ عطف "اور" سے جوڑا گیا ہے۔

○ "گویا ایک زریں شعاع تھی جو دفعتاً نمودار ہوئی اور پھر چھپ گئی۔ ایک ابتسام لطف تھا جس نے طلوع کیا اور پھر فوراً ہی تاریکیوں میں پوشیدہ ہو گیا۔ ایک نور فکر تھا جو ایک لمحہ کے لیے چمکا اور بحر عدم میں ڈوب گیا۔ ایک معطر پھول تھا جو تھوڑی دیر اپنی نکہت سے سکر پیدا کر کے مرجھا گیا۔ ایک نغمۂ محبت تھا جو ایک ساعت کے لیے متوج میں آیا اور پھر بادیہ سکون میں غائب ہو گیا"۔ (۶۸)

(ج) معنیاتی

جب ہم کلام کرنے کے لیے لفظوں کا انتخاب کرتے ہیں تو انھیں آپس میں جوڑنا اور ترکیب دینا بھی پڑتا ہے، لیکن یہ عمل اتنا آسان نہیں،

کیوں کہ ایک لفظ کو دوسرے لفظ کے ساتھ ترکیب دیتے وقت ہم پر بہت سی پابندیاں عائد ہو جاتی ہیں، مثلاً ہمارا لسانی شعور یہ کہتا ہے کہ "لمبا سانپ" اور "اونچا درخت" کی ترکیبیں بالکل درست ہیں۔ اس کے برعکس اگر ہم "اونچا سانپ" اور "لمبا درخت" کہیں تو یہ معنیاتی اعتبار سے بے میل اور بے قاعدہ سمجھا جائے گا کیوں کہ ہم جانتے ہیں کہ جسامت کے اعتبار سے جو چیز عمودی یعنی "کھڑی ہوتی" ہے اس میں اونچائی ہوتی ہے اور جو افقی یا "پڑتی" ہوتی ہے اس میں لمبائی۔ اس رو سے لمبا سانپ، لمبی پنسل یا لمبی رسی کہنا درست ہوگا اور اونچا سانپ، اونچی پنسل یا اونچی رسی کہنا نادرست۔ انتخاب الفاظ کے سلسلے میں عائد اس پابندی کو "انتخابی پابندی" کہیں گے۔ اگر کوئی شخص ان پابندیوں یا ضابطوں کی خلاف ورزی کرتا ہے تو وہ لسانی نارم (Norm) سے انحراف کا مرتکب ہوتا ہے۔ انتخابی پابندیاں ہمیں معنیاتی اعتبار سے دو بے میل (Incompatible) الفاظ یا کلموں کو باہم ترکیب دینے سے روکتی ہیں۔ اسے ایک اور مثال کے ذریعے بھی سمجھا جاسکتا ہے "ہنسنا" ایک انسانی عمل یا عادت ہے، مثلاً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ بچہ ہنس دیا، لڑکے ہنسنے لگے یا مجھے ہنسی آگئی۔ لیکن بے جان چیزوں کے لیے لفظ "ہنسنا" استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ مثلاً ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ کرسی ہنسنے لگی۔ یا کمرے کو ہنسی آگئی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ انتخابی پابندیوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہم کرسی، کمرہ اور اسی قبیل کے اور بہت سے اسماء کے ساتھ لفظ "ہنسنا" اور اس کی تصریفی شکلوں کو ترکیب نہیں دے سکتے۔ اگر ہم ایسا کرتے ہیں تو یہ انتخابی پابندیوں یا ضابطوں سے انحراف تصور کیا جائے گا۔ اور زبان میں بے قاعدگی (Anomaly) کا موجب قرار پائے گا۔ لیکن ادب بالخصوص شاعری میں اس قسم کے انحرافات کو پسندیدہ نظروں سے دیکھا جاتا ہے اور انھیں اظہار کی جدت، انوکھے پیرایۂ بیان، الفاظ کے نئے تلازمات اور نئے لسانی سانچوں کی تشکیل سے تعبیر کیا جاتا ہے (۶۹)۔ اور یہ چیزیں کسی مصنف یا شاعر کے اسلوب کی انفرادیت کی ضامن قرار پاتی ہے۔ مثلاً پرکاش فکری کا یہ مصرعہ دیکھیے۔

میرے کمرے کو ہنسی آئے گی تھوڑی دیر میں

یہاں شاعر نے کمرہ (بے جان اسم) کو فعل ہنسی (انسانی عمل یا عادت) کے ساتھ ترتیب دیا ہے جو انتخابی پابندی کی مبینہ خلاف ورزی ہے۔ "کمرے" اور "ہنسی" کی ترکیب معنیاتی عدم مطابقت کی وجہ سے بے میل ہو گئی ہے جس کے نتیجے میں زبان میں انحراف پیدا ہو گیا ہے لیکن مذکورہ مصرعہ میں یہ چیز اظہار کی جدت اور انوکھے پیرایۂ بیان کی حامل ہے۔ اردو میں انتخابی پابندیوں (Selectional Restrictions) سے انحراف کی چند اور مثالیں دیکھیے۔

ہنستی ہوئی گئی ہے صبح، پیار سے آرہی ہے شام

(جمیل الدین عالی)

اداس شام دریچوں میں مسکراتی ہے

(پروین شاکر)

حد افق پہ شام تھی خیموں میں منتظر

(وزیر آغا)

یادیں رہ جاتی ہیں ڈسنے کے لیے

(شہریار)

تمام رات بنے خواب اس کی یادوں کے

(انور سدید)

پتیوں کے لحافوں میں دبکی ہوئی سو رہی تھی ہوا

(راہی معصوم رضا)

مذکورہ نمونے شاعری سے پیش کیے گئے ہیں جہاں انتخابی پابندیوں سے انحراف ایک عام بات ہے ، بلکہ شعری زبان کا ایک وصف ہے۔ نیاز فتح پوری نے نثر میں انتخابی ضابطوں سے انحراف کر کے شعر جیسی دلکشی پیدا کر دی ہے ۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں جو زیادہ تر ان کے افسانوا اور انشائیوں سے لی گئی ہیں :

- "میری آنکھیں نازک حنائی انگلیوں کو چوم رہی تھیں" ۔ (۶۰)
- "ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سمندر بیدار ہو کر آہستہ آہستہ آنکھیں کھول رہا ہے" ۔ (۶۱)
- "پھول کنار راہ میں مسرور نظر آتے تھے" ۔ (۶۲)
- "چاند چادر سیمیں پھیلا کر اس پر اترنے کی کوشش کر رہا تھا" ۔
- "جمنا اپنی نیلگوں چادر میں چاند کا مکھڑا چھپانے کی کوشش کر رہی تھی" ۔
- "جب رات زیادہ بلند ہو چکی" ۔ (۶۳)
- "چاندنی رات تھی ، خانقاہ کے نیچے بہنے والی ندی میں چاند نے چراغاں کر رکھا تھا" ۔ (۶۴)
- "شہزادی ریحانہ .... ساحل بحر پر کھڑی دیکھ رہی تھی کہ جب آفتاب سمندر کے اندر سے تازہ تازہ نہا کر باہر نکلتا ہے تو کائنات کی ہر چ اس کی پذیرائی کس طرح کرتی ہے" ۔ (۶۵)
- "سمندر ہنس کر لہریں لیتا ہے اور ساحل پر اپنی زرد شعاعیں پھیلاتا ہے ۔ لہریں بے معنی نظمیں بچوں کو سنایا کرتی ہیں ، جیسے ماں پالنا ہلاـ وقت ۔ سمندر بچوں کے ساتھ کھیلتا ہے" ۔ (۶۶)
- "ایسا محسوس کرتا ہوں کہ میری آنکھوں سے اس وقت موسیقی نکل نکل کر تمام وادی میں گونج رہی ہے" ۔ (۶۷)

حواشی

۱۔ نیاز فتح پوری لکھتے ہیں : "میرے والد فارسی کے بڑے مشہور شاعر و انشاپرداز تھے ۔ غزل سے انھیں بہت کم دلچسپی تھی ۔ صرف قصائد لکھتے تھے ، اور وہ ؟ نعت و منقبت میں ۔ صہبائی کے شاگرد تھے اور غالب کی فارسیت کے شیدائی ۔ اس وقت فارسی تعلیم کا رواج کافی تھا اور صبح کو میرا مکان ایک اچھا خاا درس گاہ ہو جاتا تھا جہاں زیادہ تر پختہ عمر کے لوگ میرے والد سے فارسی پڑھنے آجاتے تھے" ۔ (دیکھیے نیاز فتح پوری ، "والد مرحوم ، میں اور نگار" مشمو نگار پاکستان (نیاز نمبر) حصہ اول ، سالنامہ ۱۹۶۳ ، ص ۳۱)

نیاز نے عربی اپنے وطن (فتح پور) کے مدرسۂ اسلامیہ میں مولانا نور محمد صاحب سے پڑھی جو عربی کے عالم تھے اور صرف و نحو ، فقہ و حدیث اور منطق وغیرہ میں کامل دستگاہ رکھتے تھے ۔ وہ لکھتے ہیں ۔ "میں مدرسۂ اسلامیہ میں عربی کا درس نظامی حاصل کر رہا تھا اور گھر پر والد سے فارسی پڑھتا تھا ..... اور عربی میں درس نظامی کا بڑا حصہ ختم کر کے اس حد تک پہنچ گیا تھا جب صرف و نحو اور منطق کی ضروری تعلیم کے بعد اونچی تعلیم شروع ہوتی ہے" ۔ (دیکھیے ایضاً ، ص ۳۱)

بہ حوالہ امیر عارفی ، نیاز فتح پوری (نئی دہلی ۔ انجمن ترقی اردو (ہند) ۱۹۷۷ء) ، ص ۵۱

محمد اسحاق صدیقی نے امیر عارفی کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے یہ کہا کہ "میں نے ترکی زبان کے کچھ سبق نیاز صاحب سے پڑھے تھے ۔ نیاز صاحب کو ترکی زبان پر خاصا عبور تھا (دیکھیے امیر عارفی ، محولہ کتاب ، ص ۱۰۶)

۵- نیاز فتح پوری "والد مرحوم"، میں اور نگار "مشمولہ نگار ستان (نیاز نمبر) حصہ اول، سالنامہ ۱۹۶۳ء، ص ۳۹
۶- نیاز جس زمانے میں مدرسۂ اسلامیہ، فتح پور میں زیر تعلیم تھے تو اس وقت ان کی عمر ۱۲، ۱۳ سال کی تھی۔ اس زمانے میں انھیں شعر کہنے کا بھی شوق پیدا ہو گیا تھا۔ وہ "فارسی میں کبھی کبھی اور اردو میں اکثر" شعر کہا کرتے تھے۔
۷- نیاز فتح پوری، "والد مرحوم، میں اور نگار" مشمولہ نگار پاکسان (نیاز نمبر) حصہ اول، سالنامہ ۱۹۶۳ء ص ۳۶۔
۸- دیکھیے محمد حسن کا مضمون "نیاز فتح پوری" مشمولہ شناسا چہرے از محمد حسن (کراچی : غضنفر اکیڈمی پاکستان ۱۹۷۸ء)، ص ۹-۲۰
۹- جوش ملیح آبادی "حضرت نیاز فتح پوری" مشمولہ نگار پاکستان (نیاز نمبر) حصہ اول، ص ۴۲
۱۰- فراق گورکھپوری "آشفتہ بیانی میری" مشمولہ نگار پاکستان (نیاز نمبر) حصہ اول، ص ۴۵۔
۱۱- مجنوں گورکھپوری "جدید اردو نثر، نیاز فتح پوری اور نئی نسل"، مشمولہ نگار پاکستان (نیاز نمبر) حصہ اول، ص ۱۰۱-۱۰۴۔
۱۲- ل۔ احمد اکبرآبادی "نیاز فتح پوری کی ادبیت" مشمولہ ایضاً، ص ۹۵
۱۳- مالک رام "نیاز اور نیاز مند" مشمولہ ایضاً، ص ۵۸
۱۴- محمد حسن، محولہ بالا مضمون، ص ۹
۱۵- نیاز فتح پوری "یکے از عوازی مصر" مشمولہ مذاکرات نیاز یا مقالات (لکھنو نگار بک ایجنسی، ۱۹۴۲ء) ص ۱۳۔
۱۶- نیاز فتح پوری "از ماہ تا بہ ماہی" مشمولہ مذاکرات نیاز یا مقالات، ص ۴۴۔
۱۷- نیاز فتح پوری "شبنمستان کا قطرۂ گوہریں" مشمولہ شبنمستان کا قطرہ گوہریں اور دوسرے افسانے (کراچی ادارہ ادب العالیہ، ۱۹۶۰ء)، ص ۳۔
۱۸- نیاز فتح پوری 'قربان گاہ حسن' مشمولہ ایضاً، ص ۸۷۔
۱۹- نیاز فتح پوری 'شبنمستان کا قطرہ گوہریں' مشمولہ ایضاً، ص ۱۳۔
۲۰- نیاز فتح پوری 'درس محبت' مشمولہ ایضاً، ص ۴۶۔
۲۱- نیاز فتح پوری "مکتوبات نیاز" حصہ اول (لکھنو نگار بک ایجنسی ۱۹۴۴ء) بار دوم، ص ۱۲۳۔
۲۲- ایضاً، ص ۱۷۸۔
۲۳ ایضاً، ص ۱۹۔
۲۴- نیاز فتح پوری "تاملات نیاز"، ص ۱۰۔
۲۵- نیاز فتح پوری "ایک شب کی قیمت" مشمولہ نگارستان (۱۹۳۹ء)، ص ۷۶۔
۲۶- نیاز فتح پوری، انتقادیات، حصہ اول (حیدرآباد دکن عبدالحق اکیڈمی ۱۹۴۴ء)، ص ۲۵۸۔
۲۷- نیاز فتح پوری 'برسات' مشمولہ نگارستان (۱۹۳۹ء)، ص ۸۵۔
۲۸ نیاز فتح پوری 'شبنمستان کا قطرہ گوہریں' مشمولہ شبنمستان کا قطرہ گوہریں اور دوسرے افسانے، ص ۲۷۔
۲۹- ایضاً، ص ۱۹۔
۳۰- نیاز فتح پوری 'درس محبت' مشمولہ ایضاً، ص ۴۴۔
۳۱- ایضاً، ص ۶۷۔
۳۲- نیاز فتح پوری، شہاب کی سرگزشت (لکھنو نگار مشین پریس)، ص ۱۳۔
۳۳- نیاز فتح پوری، مکتوبات نیاز (حصہ اول)، ص ۱۵۹۔
۳۴- نیاز فتح پوری "عورت" مشمولہ نگارستان (۱۹۳۹ء)، ص ۸۲۔
۳۵- نیاز فتح پوری "از ماہ تا بہ ماہی" مشمولہ مذاکرات نیاز یا مقالات، ص ۲۶۔

۳۶- نیاز فتح پوری "درس محبت" مشمولہ شبنمستان کا قطرۂ گوہریں اور دوسرے افسانے، ص ۴۸-
۳۷- نیاز فتح پوری، شہاب کی سرگزشت، ص ۲۶-
۳۸- نیاز فتح پوری، ایک شاعر کا انجام (لکھنو نگار مطبع پریس)، ص ۴۰۳-
۳۹- نیاز فتح پوری، مکتوبات نیاز (حصہ اول)، ص ۱۱۱-
۴۰- ایضاً، ص ۱۷۸-
۴۱- نیاز فتح پوری، تاملات نیاز، ص ۸۱-۸۲-
۴۲- نیاز فتح پوری "درس محبت" مشمولہ شبنمستان کا قطرۂ گوہریں اور دوسرے افسانے، ص ۶۸-
۴۳- نیاز فتح پوری، مکتوبات نیاز (حصہ اول)، ص ۱۰۱-
۴۴- نیاز فتح پوری "ایک رقاصہ سے" مشمولہ نگارستان، ص ۷۲-
۴۵- نیاز فتح پوری، تاملات نیاز، ص ۲۴-
۴۶- نیاز فتح پوری، مکتوبات نیاز (حصہ اول)، ص ۱۳۲-
۴۷- نیاز فتح پوری "شبنمستان کا قطرۂ گوہریں" مشمولہ شبنمستان کا قطرۂ گوہریں اور دوسرے افسانے، ص ۲۷-
۴۸- نیاز فتح پوری، شہاب کی سرگزشت، ص ۱۲۶-
۴۹- نیاز فتح پوری "شبنمستان کا قطرۂ گوہریں" مشمولہ شبنمستان کا قطرۂ گوہریں اور دوسرے افسانے، ص ۲۴-
۵۰- ایضاً، ص ۲۴
۵۱- ایضاً، ص ۱۴-
۵۲- نیاز فتح پوری "یکے از عوازی مصر" مشمولہ مذاکرات نیاز یا مقالات، ص ۱۵
۵۳- نیاز فتح پوری "قربان گاہِ حسن" مشمولہ شبنمستان کا قطرۂ گوہریں اور دوسرے افسانے، ص ۹۰-
۵۴- نیاز فتح پوری "چاند کا سفر" مشمولہ مذاکرات نیاز یا مقالات، ص ۹۹-
۵۵- نیاز فتح پوری "برسات" مشمولہ نگارستان، ص ۸۵-
۵۶- نیاز فتح پوری "شبنمستان کا قطرۂ گوہریں" مشمولہ شبنمستان کا قطرۂ گوہریں اور دوسرے افسانے، ص ۱۰-
۵۷- نیاز فتح پوری، مکتوبات نیاز (حصہ اول)، ص ۱۴۴-
۵۸- نیاز فتح پوری "درس محبت" شبنمستان کا قطرۂ گوہریں اور دوسرے افسانے، ص ۶۸-
۵۹- نیاز فتح پوری "قربان گاہِ حسن" مشمولہ ایضاً، ص ۸۶-
۶۰- ایضاً، ص ۸۹-۹۰-
۶۱- ایضاً، ص ۶۲-
۶۲- نیاز فتح پوری "شبنمستان کا قطرۂ گوہریں" مشمولہ ایضاً، ص ۱۱-
۶۳- نیاز فتح پوری "از ماہ تا بہ ماہی" مشمولہ مذاکرات نیاز یا مقالات، ص ۴۰-
۶۴- نیاز فتح پوری "لکھنو و لکھنویات" مشمولہ ایضاً، ص ۱۳۴-
۶۵- نیاز فتح پوری "یکے از عوازی مصر" مشمولہ ایضاً، ص ۱۰-
۶۶- نیاز فتح پوری "تاملات نیاز" ص ۸۲-
۶۷- نیاز فتح پوری "از ماہ تا بہ ماہی" مشمولہ مذاکرات نیاز، ص ۲۵-

۶۸- نیاز فتح پوری "طائر خاموش پر ایک آنسو" مشمولہ تاملات نیاز، ص ۱۳۱-

۶۹- تفصیلات کے لیے دیکھیے مرزا خلیل احمد بیگ، "اسلوب تعریف، توضیح اور تشکیل" مشمولہ زبان، اسلوب اور اسلوبیات، از مرزا خلیل احمد بیگ (علی گڑھ : ادارہ زبان و اسلوب، ۱۹۸۳ء)

۷۰- نیاز فتح پوری "از ماہ تا بہ ماہی" مشمولہ مذاکرات نیاز، ص ۲۷-

۷۱- نیاز فتح پوری، نگارستان، ص ۱۱-

۷۲- نیاز فتح پوری، عرض نغمہ (لکھنو . نسیم بک ڈپو، ۱۹۶۲ء)، ص ۶۰تہ

۷۳- نیاز فتح پوری "درس محبت" مشمولہ شبنمستان کا قطرہ گوہریں اور دوسرے افسانے" ص ۴۶-

۷۴- ایضاً، ص ۴۶-

۷۵- نیاز فتح پوری "کہکشاں کا ایک سانحہ" مشمولہ نگارستان، ص ۹۵-

۷۶- نیاز فتح پوری، عرض نغمہ، ص ۷۰-

۷۷- نیاز فتح پوری "برسات" مشمولہ نگارستان، ص ۸۷-

" .... "

برہم ناتھ دت ـــــــ نیاز فتحپوری اپنے اس انسانی جامے میں ایک فرد واحد نہیں بلکہ "انجمن نابغہ ہائے روزگار" ہیں۔ بڑائیوں اور خوبیوں کا وہ مرقع جو فانی انسانوں کو غیر فانی بنا دیتا ہے۔ ان کے متعلق بہ ارتجال حقیقت گزاری یہ کہا جا سکتا ہے کہ قدرت نے انسانی ارتقاء کی تمام منزلیں مارنے کے بعد ان کی تخلیق کی۔

منظور حسین شور ـــــــ میرے نزدیک شوپنہار کا یہ خیال اپنی جگہ بہت درست ہے کہ مفکرین اور دانشمند تین قسم کے ہوا کرتے ہیں۔ ایک وہ جن کی تب و تاب کا دوام شہاب ثاقب کی طرح عارضی ہوتا ہے۔ دوسرے وہ جن کی تابانی سیاروں کی طرح نسبتاً زیادہ بادوام ہوتی ہے اور تیسرے وہ جن کی تابانی کا دوام عرصۂ عالم پر ثوابت کی طرح ہمیشہ کے لئے ثبت ہوتا ہے۔ نیاز صاحب کی حیثیت تیسری قسم کی مفکر کی ہے۔

نظیر صدیقی ـــــــ نیاز صاحب سے زیادہ مختلف الحیثیات اہل قلم اُردو میں کوئی اور غالباً نہ تھا نہ ہے۔ ان کا نام لیتے ہی ذہن میں کئی نیاز ابھر آتے ہیں، ان کے متعلق یہ نہیں سوچنا پڑتا کہ وہ کیا کچھ ہیں بلکہ یہ کہ وہ کیا نہیں ہیں۔

محمد خورشید عاصم

نیاز کا اُسلوبِ نگارش

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

دُنیا کی تقریباً اڑھائی ارب آبادی میں شاید ہی دو انسان ایسے ہوں جو آپس میں کلی مناسبت و مشابہت رکھتے ہوں۔ یہ طبائع، عادات اور بہ حیثیتِ مجموعی شخصیتوں کا اختلاف رنگا رنگی عالم کا باعث ہے۔ ادب جو زندگی کا آئینہ دار اور جذبات کا عکاس ہے طبائع کا تفاوت اس میں بھی سرایت کر جاتا ہے۔ یہی باعث ہے کہ ہر شاعر و ادیب اپنے ایک مخصوص رنگ کا مالک ہوتا ہے۔ ہر شاعر کا شعر اور ہر نثر نگار کی نثر اگر بہ نظرِ امعان دیکھا جائے تو دوسروں سے مختلف دکھائی دیتی ہے۔ میرؔ، سوداؔ، غالبؔ، ذوقؔ اور مومنؔ وغیرہ اپنی اپنی جگہ ایک منفرد شان کے مالک ہیں۔ حالیؔ، شبلیؔ، محمد حسین آزادؔ وغیرہ اپنے اپنے مقام پر ایک جداگانہ عظمت و وقار رکھتے ہیں۔ ایک کا اسلوب دوسرے سے الگ ہے اور یہ چیز ہمعصر ہونے اور ایک ہی ماحول سے تعلق رکھنے کے باوجود ظہور پذیر ہوتی ہے۔

ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کا ایک مشہور مقولہ ہے کہ "ہم ادب سے ادیب کی شخصیت کا پتہ چلا سکتے ہیں" اسی مطلب کو ابوالفضل نے انشا کے دفترِ سوم میں بڑی خوبی سے ادا کیا "خویشتن راز نقش تا بہ نقاش باید رسانید"۔ ظاہر ہے کہ ادب کا بغور مطالعہ کرنے سے ادیبوں کی متحرک شخصیتوں، ان کے احساسات، جذبات، مطمحِ نظر، معیار ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ یہ تمام باتیں ادیب کے اُسلوبِ بیان پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کسی ادیب کی عبارت رنگین ہوتی ہے، کسی کی سادہ۔ کسی کی تحریر رواں ہوتی ہے کسی کی سُست۔ کسی کے اسلوب میں ایک ولولہ و ہنگامہ ہوتا ہے اور کسی کے ہاں نرمی و سکوت، کہیں تشبیہات و استعارات کا زور دکھائی دیتا ہے اور کہیں محاورات و ضرب الامثال کی بھرمار نظر آتی ہے۔ بعض جگہ کسی وصف کی افراط ہے اور بعض جگہ تفریط اور بعض مقامات پر حیرت انگیز اعتدال پایا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ بالارادہ نہیں ہوتا، یہ طبعی چیز ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو جو چاہتا محمد حسین آزادؔ کی نثر اور غالبؔ کے سے شعر لکھنے پر قادر ہوتا۔ وجہ یہ ہے کہ اسلوب یا انداز الفاظ میں نہیں بلکہ بیان کرنے والے کی شخصیت میں پنہاں ہوتا ہے جیسے محمد حسین آزادؔ نے کہا ہے "انھیں اوصاف سے سوداؔ سوداؔ اور میر تقی میرؔ صاحب ہیں ورنہ جس کا جی چاہے یہی تخلص رکھ لے۔ خالی سوداؔ ہے تو جنون ہے اور خالی میرؔ ہے تو گنجفہ کا محض ایک پتہ"۔[1]

"اسٹائل" کا مادہ یونانی لفظ Stilus ہے نہ کہ Stylus جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے۔ ایک نوکدار آلہ کسی دھات یا لکڑی یا ہاتھی دانت کا ہوتا تھا جس کے ذریعہ سے قدیم یونان میں موم کی لوحوں پر حروف اور الفاظ کندہ کئے جاتے تھے۔ امتدادِ زمانہ سے وہ آلہ جس سے نقش بٹھایا جاتا تھا خود ان نقوش یعنی جملوں یا عبارت کا مفہوم ادا کرنے کے لئے استعمال ہونے لگا۔ اور ایک عمل جو ابتداءً میکانکی تھا رفتہ رفتہ ذہنی یا تصوراتی بن گیا۔ ان نقوش کو اسٹائلس کے دوسرے کُند حصے سے سدھارا جاتا۔ ادب میں یہیں کانٹ چھانٹ، دماغ سوزی اور باریک بینی خود ادیب کی اپنی ذات کی پرکھ بن جاتی ہے۔ وہ اپنا جائزہ لیتا ہے اور غور کرتا ہے کہ جو کچھ اُسے کہنا تھا کہہ سکا اور حقیقت کا جو نقش اُس کے دل میں مرتسم تھا وہ تحریر میں بلا کم و کاست منتقل ہو گیا کہ نہیں۔ اسی دیدہ ریزی پر کسی پارۂ ادب کی خوبیوں اور نوک پلک سے درست ہونے کا انحصار ہوتا ہے....."[2]

---

[1] آبِ حیات۔ ص ۳۔ [2] اقبال اور انداز بیان، آثر لکھنوی، روزنامہ امروز ۲۱ اپریل ۱۹۵۳ء

اسلوبِ بیان ہر مصنف، ادیب یا شاعر کی شخصیت کی عکاسی کرتا ہے۔ لکھنے والے کی شخصیت جن احساسات، جذبات اور خیالات کا مجموعہ ہوتی ہے۔ ان کی جھلک ایک ایک لفظ ایک ایک فقرے اور بیان کی تمام اداؤں میں موجود ہوتی ہے۔ ادب میں زندگی اور حرارت، خونِ جگر کے بغیر ناممکن ہے۔ اور خونِ جگر صرف اس صورت میں منتقل ہو سکتا ہے جب ادیب کا حقیقی احساس اور جذبۂ صادق الفاظ کا جامہ پہن کر صفحۂ قرطاس پر نمودار ہو جائے۔ یعنی ہر نیا لفظ اور ہر نیا فقرہ یا مصرع شخصیت کی گہرائیوں سے ابھر کر نگاہوں کے سامنے آئے۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر ہم ادب کو ادیب سے علیحدہ نہیں کر سکتے اور جب ہم یہ چاہتے ہیں کہ ادب کے عناصر معلوم کریں تو لازمًا ہمیں ان عناصر کو بھی سامنے رکھنا پڑتا ہے جن سے ادیب کی انفرادیت کی تشکیل ہوئی تھی۔ احساس اور جذبہ ادب کی اساس میں ہر ادیب کے احساسات و جذبات مختلف ہوتے ہیں۔ جو چیزیں ایک کے نزدیک محبوب ہوں ضروری نہیں کہ دوسرا بھی ان کے ساتھ اسی قسم کا لگاؤ رکھے۔ یہ اختلاف قدرتی طور پر اسٹایل میں بھی اختلاف پیدا کر دیتے ہیں اور پھر ہر ادیب یا شاعر کی اپنی شخصیت کی تشکیل مختلف عناصر سے ہوتی ہے۔ اس میں ابتدائی زندگی تعلیم و تربیت 'احباب اور متعلقین کی شخصیتیں' سیر و سفر اور مطالعہ کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں، لکھنے والی کی شخصیت میں جس قدر وسعت' جس قدر عمق اور جس قدر پیچیدگی ہوگی اس کا اسلوب اپنی انفرادیت کے لحاظ سے اتنی ہی زیادہ وسعت اور گہرائی کا حامل ہوگا اور اس کے زاویے اتنے ہی متنوع اور مختلف ہوں گے۔

اسی اصول کو سامنے رکھتے ہوئے، جب ہم نیاز کی نثر نگاری اور ان کے اسلوب پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ دوسرے نثر نگاروں کی نثر سے اتنی ہی مختلف ہے جتنی خود نیاز کی شخصیت دوسروں کی شخصیت سے متفاوت ہے۔ نیاز کے خیالات' ان کے اندازِ فکر اور طبعی رجحانات پر گزشتہ مضمون میں کچھ روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی تھی۔ یہ دھندلے سے نقوش ایک دھندلی سی تصویر ہمارے روبرو لا رکھتے ہیں جس کی مدد سے ہم پوری طرح نہ سہی لیکن کچھ نہ کچھ نیاز کو پہچاننے کے قابل ہو جاتے ہیں اور اس کے نتیجہ کے طور پر اُن کے اسلوب کو سمجھنے پر بھی قادر ہو سکتے ہیں۔
سب سے بڑی چیز جو ہمیں محسوس ہوتی ہے وہ نیاز کی تشکیکیّت ہے وہ ہر چیز کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں اور حقیقت کی جستجو میں سرگرداں و پریشان ہیں۔ اُن کی طبیعت میں ایک اضطرابِ مسلسل ہے اور خلجانِ لامتناہی، یہی پیچ و تاب اور یہی سوز و ساز ان کی طبیعت کا بڑا اہم جزو قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ احساسات میں ایک تحرک ہے اور جذبات میں تموّج۔ نظر دور دور تک پہنچتی ہے مگر کہیں نہیں ٹھہرتی۔ دماغ سوچتا ہے لیکن یہ عمل بھی بہت سریع ہے۔ یہ تیز روی اور اضطراب ہی انھیں سکون و راحت سے صحیح طور پر لذّت اندوز ہونے کے قابل بناتا ہے۔ جنھوں نے خزاں کے ستم نہیں اُٹھائے وہ بہار کی قدر و قیمت کیا جانیں۔ جنھوں نے موجوں کے تھپیڑے نہیں کھائے وہ ساحل کی عافیت بخشی سے کماحقہ کس طرح آگاہ ہو سکتے ہیں، نیاز کی یہ بے سکون طبیعت مواقع راحت کو خوب پہچانتی ہے۔ یہی باعث ہے کہ حسن، جوانی، خوشبو، بہار، برسات، سبزہ، ساحل، سمندر، محافل، رقص و سرود وغیرہ کا ذکر وہ ڈوب کر کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی صحرا گزیدہ کسی شیریں اور شفاف چشمے پر پہنچ گیا۔ اس بے سکونی اور تلاش سکون کا تصادم و اختلاف ان کے طرز و اسلوب کا خلاق ہے۔
ان کی اس طبعی جولانی و بے قراری سے ان کی عبارت میں روانی اور بہاؤ بہت ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کہیں کہیں عبارت ناہموار ہو گئی ہے۔ تاہم بحیثیتِ مجموعی یہ صفت اور خاصیت شروع سے آخر تک جاری و ساری دکھائی دیتی ہے۔ خواہ وہ کوئی افسانہ لکھ رہے ہوں یا ناول تحریر کر رہے ہوں' کوئی خط قلمبند کر رہے ہوں یا مذہب پر بحث و تمحیص ہو رہی ہو، عبارت اسی طرح رواں ہوتی ہے اور لطف یہ ہے کہ یہ روانی اپنے اندر ایک ہنگامہ رکھتی ہے۔ پڑھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے کہ ایک تند و تیز موّاج دریا ہے۔ جو پہاڑوں سے ٹکراتا، کہیں آبشاریں بناتا، کہیں دلآویز نغمے الاپتا، کہیں سرسبز وادیوں اور خوش رنگ پھولوں کو آئینہ دکھاتا اور کہیں اپنے کناروں کو توڑتا چلا جاتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ نیاز قلم ہاتھ میں لیتے ہیں اور خیالات و جذبات کا ایک طوفان اُمنڈ آتا ہے، جس کا مقابلہ ہر صاحبِ قلم نہیں کر سکتا۔ لیکن نیاز اس پر قادر ہیں' وہ جس تیزی کے ساتھ سوچتے ہیں اور جس طرّاری سے خیالات اُن کے سامنے آتے ہیں، اسی سرعت اور اسی افراط سے وہ حوالۂ قلم کرنے پر قادر ہیں۔ پیچیدہ سے پیچیدہ معاملے کو وہ جس طرح محسوس کرتے ہیں اسی طرح لکھ بھی دیتے ہیں۔ پڑھنے والے کو شاید ہی کبھی یہ گمان ہوا ہو کہ عبارت اُن کے مفہوم کو

اداکرنے سے قاصر رہی ہے۔ یا ان کے الفاظ تشنۂ مطالب ہیں۔ بلکہ بعض اوقات تو ان کے قلم کی روانی اور جولانی کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خود مطالب عبارت کے پیچھے پیچھے بھاگے چلے آرہے ہیں۔ کوئلرکوچ کے نزدیک "مشکل باتوں کو آسان طریق پر نثر میں بیان کردینا بہت بڑا کمال ہے۔"

اس روانی کے ساتھ ساتھ نیاز کے اُسلوب میں ایک دلکشی بھی ہے۔ اس دلکشی کے کئی اسباب ہیں۔ سب سے بڑی وجہ ان کی رومانیت پسندی ہے جو شاید ان کے طبعی اضطراب اور بے سکونی کے ردعمل سے پیدا ہوئی تھی۔ جیسا کہ شروع میں اشارہ کیا گیا ہے۔ بعض اوقات لکھتے لکھتے کھو جاتے ہیں اور دور اپنے رنگین خیالات کی وادیوں میں محو سیر و تماشا نظر آنے لگتے ہیں۔ نیاز کا لکھا ہوا کوئی منظر خواہ وہ بمبئی کا ساحل ہو یا حیدرآباد کی کوئی دلنواز شام یا روہیلکھنڈ کی کوئی پہاڑی ہو یا کسی مصری زبیدہ کا تذکرہ ہو یا بارش، کہسار، سمندر، سبزہ زار، طلوع آفتاب و مہتاب وغیرہ کا بیان ہو، ان چیزوں کا ذکر ان کی تحریر میں ایک ولولہ پیدا کردیتا ہے وہ اس بیان میں ایک کیف آور مستی محسوس کرتے ہیں۔ بالخصوص عورت، اُس کا حُسن، اُس کی محبت، اُس کی جوانی، اُس کا لباس اور پیکر ان کی رومانی تحریروں کا بہت بڑا حصّہ ہوتے ہیں۔ عورت کا معاملہ من حیث مجموع ان کے ہاں بہت حسین پیچیدگیوں اور پیچیدہ حُسن آفرینیوں کا حامل ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ عورت کی عظمت، اس کی اہمیت اور اس کے زندگی بخش وجود کو کما حقہ نہیں سمجھ سکے ہیں۔ حالانکہ وہ اس کی تعریف میں رطب اللسان ہیں اور اس کی دلنوازیوں اور جان آفرینیوں کے قصیدہ خواں ہیں۔ وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ عورت گلشنِ رنگ و بو ہے اور ہستی کے دھڑکتے ہوئے دل کی راحت، لیکن اس کے باوجود یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ عورت کے متعلق اور بھی بہت کچھ جاننا چاہتے ہیں، اسے اور بھی زیادہ اچھی طرح سمجھنے کی خواہش ان کے دل میں موجزن ہے۔ اور پھر زیادہ الفاظ میں، بسیط تر ذکر اور بیان کے ذریعہ وہ اس کو پیش کرنا چاہتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جو داد وہ عورت کو دیتے ہیں خواہ وہ کتنی ہی فراخدلانہ اور مخلصانہ کیوں نہ ہو تاہم ان کے دل کو تسکین نہیں ہوتی، انھیں اس سے زیادہ الفاظ کی ضرورت ہے۔ اور اگرچہ ان کے پاس الفاظ ہیں، لیکن اس احساس کی بے پایانی کا کیا علاج کہ ہر لحظہ ایک نیا رنگ ہے اور ہر رنگ میں ایک نئی ترنگ۔ یہی عناصر مل جل کر ان کے اسلوب پر اثر انداز ہوتے ہیں، یعنی عبارت میں ایک دلکشی اور دلآویزی پیدا ہوجاتی ہے۔ بعض مثالیں ملاحظہ ہوں :۔

"ادھر چاند کی دیوی اپنی مینائے سیمیں سے ہلکے رنگ کی شرابِ زرّیں چھلکاتی ہوئی نمودار ہو رہی تھی اور سطح آب پر سایہ کی تاریکی جو مشرق کی جانب سمٹی جارہی تھی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سمندر بیدار ہوکر آہستہ آہستہ آنکھیں کھول رہا ہے۔"[1]

"وادیِ قاف میں سفید پھولوں کی کثرت سے ایک طوفانِ عریانی بپا تھا۔ فرطِ تعطّر سے پنکھڑیاں جا بجا شق ہوگئی تھیں۔ چاند چادرِ سیمیں پھیلا کر اس پر اُتر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ چھوٹی چھوٹی موجیں جن میں ضیائے ماہ بس کر رہ گئی تھی۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ نقرئی زنجیریں ہیں اور حباب گھونگھرو کے دانے، جو صبا کے سبک و نازک پاؤں سے فرشِ آب پہ ہنگامِ رقص نکل کر رہ گئے ہیں، کرۂ آب یا دشتِ نیلوفریں جو کلی کہیں کھل کر رہ گئی تھی اور اس کے اندر قطرۂ آب جگمگا رہا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ناہیدِ فلک کا بُت کسی بتوالے میں رکھا ہے۔"[2]

"کل سے بارش ہو رہی ہے اور یہاں کی وادیاں معلوم ہوتا ہے کہ ان میں زمرّد حل کرکے بھر دیا گیا ہے۔ ہوا کا ہر ہر جھونکا خم کے خم لئے پھرتا ہے اور کوئی پینے والا نہیں۔ مینہہ کا ہر ہر قطرہ نغمۂ جان سے لبریز ہے اور کوئی اس کا سُننے والا نہیں۔"[3]

"تمام کائنات پر ایک سکون مطلق طاری تھا۔ جمنا اپنی نیلگوں چادر میں چاند کا مکھڑا چھپانے کی کوشش کر رہی تھی اور ناکام ہو ہو کر ساحل پر سر پٹک رہی تھی۔ متحرک امواجِ آب میں فشرِ ضیا کا وہ عالم تھا گویا حوریں اپنی زلفوں کی افشاں دھونے کے لئے پانی میں اتر آئی ہیں۔"[4]

---

[1] نگارستان ص۱۰۔ [2] مکتوبات حصہ اوّل ص۱۱۱۔ [3] مکتوبات، حصہ اوّل ص۱۰۔ [4] مکتوبات، حصہ اوّل ص۱۱۱۔

" چاند بلند ہوکر تمام سطح آب پر ایک روشن سفر کرتی، ایک متواتر چلبل پیدا کر چکا تھا۔ لیکن لہروں کا خرامِ ناز ایک ایسا خرام خاموش تھا جس کو ہماری نگاہیں تو دیکھ سکتی تھیں لیکن سامعہ کے لئے کوئی آواز ایسی نہ تھی جس کو ہلکی موسیقی سے بھی تعبیر کرسکیں۔ چاندنی کرنیں نہایت آزادی کے ساتھ پانی سے کھیل رہی تھیں۔ تمام سطح آب پر بکھری ہوئی نظر آرہی تھیں اور کوئی دامن اس چاندنی کو جمع کرنے والا تھا۔ چاند آہستہ آہستہ بلند ہوتا گیا اور اپنی متین اور سنجیدہ رفتار کے ساتھ نصف آسمان تک پہنچکر معلق نظر آنے لگا۔ ہوا چل رہی تھی لیکن اس قدر نرمی و نزاکت کے ساتھ کہ درختوں کی پتیاں بھی ایک دوسرے سے نہ مل سکتی تھیں اور چھوٹے سے چھوٹا ذرہ بھی اپنی جگہ آسودہ نظر آرہا تھا۔ "[1]

جہاں تک عورت اور اس کی خوبیوں کے بیان کا تعلق ہے۔ نیاز کی مذہبی قسم کی تحریروں کو چھوڑ کر باقی تمام تحریریں ان مضامین سے رنگین ہیں۔ جیسا کہ ابھی ابھی کہا گیا ہے نیاز حسن کے فریفتہ و دلدادہ ہیں اور اُن کے ہاں تمام کائنات کے حسن کا نچوڑ اور تمام عالم کی رعنائیوں کا عطر اور تمام اوصاف کا ہیولیٰ اگر کوئی چیز ہے تو وہ عورت ہے۔ شروع کی تحریریں بالخصوص لبریز کیف و مستی ہیں۔ نیاز کے رومانی افسانوں کی جان، اُنھیں پُر تاثیر بنانے والی قوت، اُن میں شعریت و رنگینی کی کیف آگینی شامل کرنے والی لطیف شے صرف عورت ہے۔ عورت کے نغمے نے اُن کے ہر لفظ کو، ہر جملے کو، ہر قصّے کو رومانی اور رومانی سے زیادہ کیف آور بنانے میں مدد دی ہے۔ نہ تمام افسانوں کے نام گنائے جاسکتے ہیں اور نہ بہت سی مثالیں پیش کرنے کی ضرورت۔ تاہم بطور نمونہ چند ایک سطور نقل کی جاتی ہیں :

" اپنی دوکان کے سامنے بیٹھا ہوں کہ ناگہاں ایک تلاطم نور، ایک سیلابِ رنگین، ایک طوفانِ حسن و شباب یعنی ایک عورت، مکمل عورت، تمام نازک ترین خصوصیات نسائی لئے ہوئے دوکان کی طرف بڑھتی نظر آتی ہے "[2]

" خدا کا وجود ثابت کرنے کے لئے لوگ خدا جانے کیا بے سر و پا دلائل پیش کرتے ہیں حالانکہ اس سے زیادہ روشن دلیل اور کیا ہوسکتی ہے کہ وہ ایک حسین عورت بھی پیدا کرسکتا ہے۔ آپ خود غور کیجئے کہ چنبیلی اور گلاب کے افشردہ کو منجمد کرکے اس سے ایک مجسمۂ جمیل طیار کرنا، اس کی رگ رگ میں آتشِ سیال دوڑا دینا اور کمر کی دونوں طرف کا بلّور نکال کر سینہ میں بھر دینا تاکہ ایک ہی وقت میں شباب کی نزاکت و قوت دونوں بجلی کی منفی و مثبت رو کی طرح دیکھنے والے کو مسحور کرلیں، سوائے خدا کے کوئی اور کرسکتا ہے ؟ یاد رکھیئے یہ جی چاہتا تھا کاش میں ذرّہٗ خاک ہوکر اس کی راہ میں پڑجاتا اور وہ پامال کرتی گزرجاتی۔ "[3]

" وہ یونان کے اُس عہدِ زرّیں کا مجسمہ تھا جب مقصدِ فطرت صرف حسن کا پیدا کرنا تھا اور اس کے ساتھ پرستاریِ حسن کو عام کردینا ایک سانچے میں ڈھلی ہوئی چمپئی رنگ کی مورت، سر سے لے کر پاؤں تک لوچ ہی لوچ۔ اعضا کے لحاظ سے سراپا تناسب و موزونیت۔ ہر ہر ادا سے نفع بخش و سحر انگیز۔ ہیئات کے اعتبار سے یکسر برقِ تپاں۔ تاثرات کے لحاظ سے بالکل چھوئی موئی اور محبت کی پذیرائی میں ہمہ تن درد۔ آہ۔ کراہ "[4]

" صحرائے عرب آج تک کوئی ایسا غزالِ رعنا پیدا نہیں کرسکا اور نہ سرزمینِ شام نے ایسی سیاہ چشم نازنین آج تک کبھی دیکھی۔ اس کی رعنائی ایک ایسا تیر ہے جو ایک بار دل میں پیوست ہوجانے کے بعد نکالا نہیں جاسکتا۔ اس کی چشمِ شہلائی ہر نگاہِ غلط انداز ایک ایسا کرشمہ ہے جس میں بیک وقت

---

[1] جمالستان ص۱۲۱۔ [2] ہمارے افسانے ص۲۰۱۔ [3] جمالستان ص۱۱۶ [4] جمالستان ص۶۵

سحر بھی ہے اور شراب بھی، جو مسحور بھی کر دیتا ہے اور مخمور بھی۔ اس کی لانبی پلکیں، جن کی ہر جنبش بحالتِ التفات رگِ جاں ہے اور بصورتِ عتاب نوکِ سناں۔ اس حریر سے بنائی گئی ہیں جسے نازنینانِ حرم کی نرم اور لچکیلی انگلیاں طیار کرتی ہیں۔[1]"

"اس کا رنگِ جسم یہ معلوم ہوتا تھا، نسترنِ زارِ فردوس کی صباحت میں ہلکا سا رنگِ شفق ملا کر بلّوری جلد کے نیچے دوڑا دیا ہے۔ آنکھوں کے سکر و خمار کی یہ کیفیت تھی کہ اگر کبھی کوئی پوری نگاہ کسی پر ڈال دی تو یہ معلوم ہوا کہ کوئی سیلاب ہے جو ابدیت کی طرف بہائے لئے جا رہا ہے۔[2]"

"اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں ایک ایسا عمیق چشمہ تھیں جن میں دلربائی سے زیادہ معصومیت اور مادیت سے زیادہ روحانیت پائی جاتی تھی۔[3]"

"حُسنِ عام اس سے کہ وہ ایک نوزائیدہ سبزہ کی نرم و نازک پتی اور ایک ہلکے رنگ کی کلی میں آسودہ ہو یا جنسِ لطیف میں پانزدہ سالہ دوشیزگی کو اپنا نشیمن بنانا پسند کرے۔ فطرتاً اس امر کا مقتضی ہے کہ حُسن ہی اس کا متجسس ہو، جمال ہی اس کی جستجو میں سرگرداں ہو، جس طرح نزاکت کا بار اُٹھانے کے لئے نزاکت ہی زیادہ موزوں ہے، نازک بیلوں پر ایک تتری ہی بیٹھی ہوئی بھلی معلوم ہوتی ہے۔ اور ایک حسین صبیح پیشانی پر کچھ صندل ہی کا قشقہ لطف دیتا ہے۔ معدنی اشیاء میں سونے اور پارے کی خصوصیات مجھے بہت پسند ہیں۔ وہ جاذب ہے اور یہ منجذب۔ وہ پسندیدۂ حُسن ہے اور یہ حُسن پسند۔ عورت سونے ہی کے زیور پر جان دیتی ہے اور سُنا ہے کہ پارہ بھی اپنے معدن سے باہر نہیں آتا جب تک کوئی حسین لڑکی گردن جھکا کر جھانک نہیں لیتی۔[4]"

"عورت ایک لذّت ہے مجسّم، ایک تسکین ہے متشکّل، ایک سحر ہے مرئی، ایک نور ہے مادّی ....[5]"

زیادہ مثالیں طوالت کا باعث ہوں گی کیونکہ عورت اور اس کے حُسن کا بیان جہاں بھی ہوا ہے ایک نئے پیرائے سے ہوا ہے۔ یہ امر نیازؔ کے ذوقِ جمال، یہ حُسن پرستی اور اس کا والہانہ بیان ان کی تحریروں کو ایک حُسن اور دلکشی بخشتا ہے۔

نظم و نثر دونوں میں رنگینی اور دلکشی پیدا کرنے کے لئے اکثر تشبیہات سے کام لیا جاتا ہے۔ نیازؔ اس فن میں بھی بہت مہارت رکھتے ہیں:

"اس کے جوتے کی نوک ایسی سریع جنبش کے ساتھ تختۂ رقص کو چھوتی تھی جیسے ہرن کے پاؤں چوکڑی بھرتے وقت اور جب بریقہ کی رنگین روشنیاں اُس کے قامتِ خوش اندام پر ڈالی جاتیں تو ایسا معلوم ہوتا کہ وہ پرستان کی کوئی مخلوق ہے جو راستہ بھول کر دُنیا میں آگئی ہے یا سمندر کی دیوی ہے جو دُنیا والوں کو ڈبو دینے سطحِ آب پر آگئی ہے۔[6]"

"یہ عورت جسے ایک نوجوان لڑکی کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ بہت قبول صورت، حد درجہ مہذب اور نہایت خوش ادا اور اپنی نزاکت کے لحاظ سے ایک سفید فاختہ یا کبوتری معلوم ہوتی تھی۔ اس کے رنگ کی کندنی چمک، اس کے خد و خال کی کشمیریت، اس کی آنکھوں کی نشیلی کیفیت ......[7]"

---

[1] جمالستان ص ۲۳۳ [2] مذاکراتِ نیاز ص ۷۹ [3] نگارستان ص ۷ [4] [5] [6] نگارستان ص ۱۷۱ [7] نگارستان ص ۱۷۱

"اس کے بال ایسے تھے جیسے بھیگا ہوا سنہرا ریشم اور جو بال ذرا الگ ہوگیا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے شیشے کے پیالے میں باریک سونے کا تار۔ اُس کا جسم سفید تھا جیسے چنبیلی اور اس کا نچلے کا حصّہ جیسے چاندی اور موتی۔ ہاں اُس کا یہ حصۂ جسم ایسا ہی تھا۔ اور سمندر کی سبز گھاس اس کے چاروں طرف لپٹی ہوئی تھی۔ اُس کے کان گویا صدف تھے اور اس کے ہونٹ جیسے بالکل مونگا ......[1]"

"اس کا نام کملا تھا۔ اور اس میں شک نہیں کہ وہ ایک کنول ہی کی طرح ...... اس کنول کی طرح جو سطحِ آب سے اونچا ہوکر پتلی سی شاخ پر کھلتا ہے۔ نازک اور لچیلی تھی۔ اُس نے پشت کی طرف کرسی پر اپنی ہنس کی سی گردن ڈال دی۔ موتیوں سے مانگ بھرنے کے لئے کنیز نے اپنا زریں ظرف سنبھالا اور راج کماری گنگنانے لگی۔ اُس کی آواز میں ایسی جھنکار تھی جیسے چاندی کے برتن پر کوئی ضرب لگادی جائے۔ سچے موتیوں کے باریک ذرّے اور مقیش کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اس کے بالوں کے اندر ایسے نظر آتے تھے جیسے اندھیری رات میں جگنو چمک رہے ہوں۔....[2]"

"عریاں شانہ و دوش پر بکھرے ہوئے سنہرے بال ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے آئینے میں دور کے کسی آبشارِ زریں کا نظارہ ......[3]"

اس کے ساتھ ساتھ نیاز رقص و سرود اور نغمہ و آہنگ کے بھی شیدا ہیں۔ ان کی یہ فریفتگی اور ذوقِ نغمہ بھی ان کی تحریروں پر اثر انداز ہوا ہے۔ ان کی طبیعت میں مغنی کی لے اور رقاص کی لچک جاں گزیں ہے جس کی وجہ سے لاشعوری طور پر ان کی عبارت میں بھی یہ نغمگی اور حرکت منتقل ہوجاتی ہے۔ اسے عبارت کی خوبی سمجھا جاتا ہے جیسا کہ ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ نے کہا ہے کہ: "ہر بہترین نثر کی علامت یہ ہے کہ اُس کو پڑھتے وقت آواز میں مدوجزر اور دل آویزی پیدا ہوگی[4]" ذرا غور سے دیکھیں تو ان کی عبارتوں میں یہ اثرات جگہ جگہ بکھرے ہوئے مل جاتے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی نشانی الفاظ کی تکرار ہے مثلاً :۔

"گھر گھر مجالسِ لطف و نشاط کا قیام گوشہ گوشہ میں رندانِ بادہ کوش کا اژدحام، ہر ہر بام سے حُسن دلنواز کی جلوہ فروشی اور ہر ہر گلی میں عشق کی تپش اندوزی، ہر شام کو شبِ عیش کے اسباب کی وہ افراط گویا صبح تک زندہ رہنا نہیں۔[5]"

"پیالے جام بھر بھر کر دئے جانے لگے۔ لوگوں نے خالی کرنا شروع کئے اور نشہ کی سرخیاں حاضرین کے چہروں پر دوڑ گئیں۔ سرکٹ کٹ کر فرش پر۔ گر رہے تھے[6]"

"نہ بچے کی تمیز تھی نہ عورت کی، نہ بیمار پر رحم تھا نہ ضعیف پر، مذہب کا خون آشام دیوتا بپھرا ہوا تھا اور انسانی جان کی قربانیوں پر قربانیاں طلب کر رہا تھا وہ خون کا پیاسا تھا اور کسی طرح اس کی پیاس نہ بجھتی تھی۔ معصوم بچّے ماؤں کی گود سے چھین چھین کر آگ میں ڈالے جارہے تھے اور ان کے نرم نرم گوشت کے جلنے سے جو بُو پھیل رہی تھی اس کو سونگھ سونگھ کر دیوتا خوش ہو رہا تھا۔ حسین عورتوں کو برہنہ کر کے ان کا جسم نیزوں سے چھلنی کیا جا رہا تھا اور ان کی چیخیں سُن سُن کر یہ خونخوار دیوتا ناچ رہا تھا[7]"

"میری تکریم، میری قدر، میری محبت صرف پیرس میں ہوتی ہے۔ پیرس جو کعبۂ عشاق ہے، جو قبلۂ اہلِ دل ہے، جو زیارت گاہِ حسن ہے[8]"

---

[1] جالستان ص۲۴۱۔ [2] ایضاً ص۴۵۔ [3] ایضاً ص۱۷۵۔ [4] اُردو اسالیب بیان ص۱۷۱، محی الدین قادری زورؔ۔ [5] انتقادیات اول ص۲۷۔ [6] حسن کی عیاریاں ص۱۵۰
[7] حسن کی عیاریاں ص۱۵۹۔ [8] ایضاً ص۶۶۔

"اس کے جسم سے برقی شعاعیں نکل نکل کر میرے دل کے اندر تپ کی حرارت پیدا کر رہی تھی۔۔۔۔اُس کی رگ رگ میں آتشِ سیال دوڑا دیتا۔۔۔"[1]

"یاد رکھو کہ یہ جنّت کا لالچ دلا دلا کر رات بھر مریدوں سے پاؤں دبوانے والے دن دن بھر ملازموں کی طرح کام لینے والے مذہب کے دشمن ہیں۔"[2]

"میری ہر ہر سانس آلودۂ گناہ، ان کے جسم کا ریشہ ریشہ مریم پناہ"[3]

"اللہ میاں کو توبہ توبہ تم نے خانہ زاد سمجھ لیا ہے جو بات بات میں تمہارے پیچھے دوڑتا پھرے۔۔۔۔۔"[4]

"وہاں کالے کالے بادلوں میں سُرخ سُرخ ڈیلیا پھولتا ہے تو یہ "کاک ٹیل" دماغِ انسانی پر کیا اثر کرتی ہے۔ مجھ پر اول اول جو اثر ہوا اگر میں بیان کر دوں بھی تو آپ کو اعتبار نہ آئے گا"[5]

"بچہ بے قرار ہے، رو رہا ہے۔ ماں آغوش میں بھینچ بھینچ کے، سینہ سے لپٹا لپٹا کے، منھ چوم چوم کے اپنی ساری قوتِ محبت سے اسے چُپ کرا رہی ہے۔۔۔۔"[6]

اس کے بعد خاص طور پر عبارت کو دلکشی اور دل آویزی سے مزین کرنے والی چیز جا بجا حسین و لطیف اور بے تکلف شعروں کا استعمال ہے۔ یہ چیز بھی نیاز کی شاعرانہ طبیعت کا پرتو ہے۔ کوئی موضوع ہو حسب موقع اپنے مقصد کی وضاحت کے طور پر یا اپنے کسی قائم کردہ نظریہ کے ثبوت یا سند کے لئے شعر کا استعمال کرتے ہیں اور اس بے تکلفی سے کہ لطف آجاتا ہے۔ اشعار کا یاد رکھنا واقعی قابلِ ستائش امر ہے اور اچھے اشعار کا انتخاب اور بھی زیادہ قابلِ تعریف بات ہے لیکن برموقع اور برمحل کسی شعر کا استعمال تو صلاحیت کا اظہار ہے اور یہ بات ہر آدمی کے بس کی نہیں۔ ویسے تو شاید ہی کوئی نثر نگار ایسا ہوگا جو نثر لکھتے وقت شعر کے استعمال سے کلّی طور پر اجتناب کرتا ہو لیکن جس کثرت اور خوبی کے ساتھ ابوالکلام آزاد اور نیاز اشعار سے کام لیتے ہیں، وہ چیز عام نہیں جہاں زیادہ کھُل کھیلنے کا موقع ملتا ہے وہاں اشعار کا استعمال اور بھی زیادہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً ان کے خطوط میں اشعار کی بہتات ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ کہیں بھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ شعر ٹھونسا گیا ہے۔ جو شعر جہاں آیا ہے محسوس ہوتا ہے کہ اس کا آنا اشد ضروری تھا ورنہ شاید یہ بات نہ بنتی۔ یہ چیز بھی اُن کے کمالِ فن پر دلالت کرتی ہے۔ ان کے ذوق کی بلندی اس امر سے ظاہر ہے کہ گھٹیا درجہ کا پست مضامین کا حامل شعر شاید ہی کہیں مل سکے۔

"خط ملا۔ اس برہمی پر نثار ہو جائیے اس "تو سے ناہیں بولوں رے" والی ادا کے قربان جائیے۔ نظامؔ رام پوری کا شعر ؎

اے جان کہو پھر اسی ادا سے　　　میں آج نظام سے خفا ہوں

کاش ایسا ہوتا کہ بجائے "جانِ عالم" کے "جانِ نیاز" لکھ سکتا۔ ہائے غالبؔ ؎

قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو　　　کاش کہ تم میرے لئے ہوتے"[7]

"زندگی کے دوسرے سوانح کا ضبط و شمار کیسا۔۔۔ تاہم سن پیدائش و وفات کی جگہ آپ "ازل تا ابد" لکھ سکتے ہیں اور سوانح زندگی کی

---

[1] جمالستان ص۲۱۶۔ [2] مکتوبات، حصہ اول ص۳۹۔ [3] مکتوبات، حصہ دوم ص۱۷۵۔ [4] مکتوبات، حصہ اول ص۹۰۔ [5] مکتوبات، حصہ دوم ص۲۹۲
[6] نگارستان ص۸۲۔ [7] مکتوبات اوّل ص۱۲۳۔

جگہ صرف یہ شعر ؎ حاصلِ عمرم سہ سخن بیش نیست　　خام بُدم پختہ شدم سوختم[1]"

"کبھی کبھی اپنی اپنی جماعت کو بھی غیر معصوم جان کر اس کے اعمال و افعال کا جائزہ لے لیا کیجیے کہ خانقاہوں کے گوشوں اور مسجد کے محراب و منبر سے جو تقدس کی داستانیں بیان کی جاتی ہیں کیا وہ واقعی صحیح و درست ہیں۔

اتنی نہ بڑھا پاکیٔ داماں کی حکایت　　دامن کو ذرا دیکھ ذرا بندِ قبا دیکھ[2]"

"...سو یہ چند لمحوں کی بات ہے اس کے لیے ساری زندگی خراب کرنا کہاں کی عقلمندی ہے۔ تم تو ایک حد تک مذہبی انسان بھی ہو اس لیے تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ :

روئے کشادہ باید و پیشانیِ فراخ　　آں جا کہ لطمہ ہائے ید اللّٰہی زنند[3]"

"سوادِ بمبئی شروع ہوتے ہی ایک ایک کرکے تمام اُن کیفیات کی یاد ستانے لگی جن کو ہر چند میں بھلا چکا تھا۔ لیکن ان کے بھلانے کی ایذا کبھی نہیں بھول سکتا ؎

جاتی ہے کشمکش کہیں اندوہِ عشق کی　　گو دل نہیں رہا تو وہی دل کا درد تھا[4]"

ایک اور لطف کی بات یہ ہے کہ نیاز اس پر بھی قادر ہیں کہ پورے شعر کی بجائے مصرع ہی پر اکتفا کریں اور مصرع کو اس خوبی اور مہارت سے عبارت میں پیوست کریں کہ وہ نشترِ دل کا کام دے۔ مصرعوں کے استعمال کے بارے میں اگر یہ کہا جائے کہ اردو نثر نگاروں میں نیاز کا مقام سب سے ممتاز ہے تو شاید بے جا نہ ہوگا۔ پڑھتے پڑھتے عبارت میں مصرعے آتے چلے جاتے ہیں اور اس بے تکلفی سے کہ کہیں روانی میں فرق نہیں آتا۔ مثلاً :

"ارے بھئی! ان کا کیا ہے ؏ وہ جسے چاہتے ہیں اپنا بنا لیتے ہیں
مشکل تو ہماری ہے کہ ؏ ڈوبنے جائیں تو دریا ملے پایاب ہمیں[5]"

"لیکن جب اپنی فراست سے اسے سمجھا تو آپ جانتے ہیں کیا ہوا ؏ خاکِ او گشتم و چندیں درجاتم دادند۔
آپ سمجھے یہ "درجات" کیا وہی درجاتِ بے نیازی نہ ہی ؏ نتواں تا وجاں را بہم امتیاز کردن[6]"

"اسی کے ساتھ ایک ایسی کراہ کے ساتھ جس میں کا انتہائی حزن و ملال پنہا تھا گویا کسی نے یہ کہا ؏
کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد[7]"

"اگر جنت ایک زاہدِ شب زندہ دار صرف تقشف ہی سے حاصل کر سکتا ہے تو میں وہ ہوں کہ ؏ فردوس را بدام نگہی کنم شکار[8]"

---

۱ مکتوبات، اوّل ص۲۲۳۔ ۲ من و یزداں ص۸۷۔ ۳ تاثراتِ نیاز ص۱۰۔ ۴ مذاکراتِ نیاز ص۳۰۔ ۵ مکتوبات، سوم ص۲۷۔
۶ مکتوبات، سوم ص۹۱۔ ۷ مذاکرات ص۳۳۔ ۸ من و یزداں ص۳۶۔

" میرا مقصود کبھی تنگ نظری کا اظہار نہیں ہوتا اور اگر کوئی صورت ایسی پیدا ہو جاتی ہے تو صرف اس لئے کہ ع
مستم چنانکہ گل فشاسم ز نوکِ خار۔ وغیرہ[1] "

" وہ محسوس کرنے لگا کہ دنیا نام ہے صرف " ہیں جائے من و جائے تو باشد " کا[2] "

یہ ذوقِ شعر ان کی طبیعت میں اتنا رچ گیا ہے کہ حافظہ کی بے پایانی نے یہ اقتدار حاصل کر لیا ہے کہ نیاز بے تکلفانہ نثر لکھتے چلے جاتے ہیں اور ان میں شعر تو رہا ایک طرف مصرع بھی نہیں بلکہ ایک ایک دو دو الفاظ اس طرح کے پیوست کرتے جاتے ہیں کہ قاری کا ذہن خود بخود اشعار کی طرف منتقل ہوتا چلا جاتا ہے ۔ یہ چیز کمال وضاحت پر دلالت کرتی ہے کہ ایک دو لفظ جو اُکھڑے ہوئے بھی ہوں بلکہ اگر کوئی نہ پہچانے تو یہ بھی نہ معلوم ہو سکے کہ ان کا پس منظر کیا ہے اور پس منظر کے نامعلوم ہونے کے باوجود بھی ان کی ذاتی قدر و قیمت میں فرق نہ آئے ۔ اس طرح عبارت میں لائے جائیں کہ محض ان کے اشارے ہی سے وسیع مضامین خیال میں آجائیں اور عبارت بھی گراں بار نہ ہو۔

" جی ہاں کل میر صاحب تشریف لائے تھے اور جتنی " گالیاں " انھیں یاد تھیں سب " صرفِ درباں " کر گئے ۔ میں آپ کا " درباں " ہی ہوں نا۔[3] "

اس عبارت میں انھوں نے غالب کے شعر کو خوب کھپایا ہے۔

واں گیا بھی تو اُن کی گالیوں کا کیا جواب — یاد تھیں جتنی دُعائیں صرفِ درباں ہو گئیں

اس طرح غالب کے اس شعر کی طرف

میں اور حظِّ وصل خدا ساز بات ہے — جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

اس عبارت میں کیسا اشارہ کیا ہے دیکھئے : " اور یقیناً یہ اجتماع بڑی " خدا ساز " بات سمجھی جاتی ہے .....[4] "

اس طرح جب ہم ان کی یہ عبارت پڑھتے ہیں :

" آپ کو یاد ہوگا کہ جب ہم آپ کسی وقت ایک " رندِ شاہد باز " کی فرضی تصویر کھینچ کر گھنٹوں خیالی لطف حاصل کیا کرتے تھے ۔[5] "

تو ذہن فوراً اس شعر کی طرف منتقل ہوتا ہے :

اسد اللہ خاں تمام ہوا — اے دریغا وہ رندِ شاہد باز

" " حکم بر ستارہ کنم " تو نہایت ضعیف سی بات ہے ۔ یہاں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کائنات میری محکوم ہے ۔ "

گدائے میکدہ ام لیک وقتِ مستی بیں — کہ ناز بر فلک و حکم بر ستارہ کنم

" ..... سوگوار لحن سے اشعار پڑھنا اور پھر ساری محفل کا نازک ہاتھوں سے نازک سینوں پر " خانہ بر انداز " قسم کی ضربیں لگاتے لگاتے تھک کر .... حقیقت یہ ہے کہ انسان سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ ایسی صورت میں شہادت کو زندہ و زنی قرار دے یا اس " خونِ بہا " کو[6] "

اس عبارت سے ذہن فوراً ان دو اشعار کی طرف جاتا ہے :

؎ گل پھینکے ہیں اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی	اے خانہ بر اندازِ چمن کچھ تو ادھر بھی	(سوداؔ)
؎ محابا کیا ہے میں ضامن ادھر دیکھ	شہیدانِ نگاہ کا کیا خوں بہا کیا	(غالبؔ)

---

[1] من و یزداں ص۳۵ ۔ [2] شہاب کی سرگزشت ص۱۴۷ ۔ [3] مذاکرات، حصہ اول ص۶ [4] مذاکراتِ نیاز ص۲۱ ۔
[5] مذاکراتِ نیاز ص۱۰۱ ۔ [6] مذاکراتِ نیاز ص۱۰۲ ۔

"پہاڑوں کی برف پگھل پگھل کر دریائے جہلم اور ڈل جھیل کی رعنائیوں میں گرمیٔ خرام پیدا کر رہی ہے اور ہوا کا جھونکا گویا "موجِ خرام" یار ہے جو ہر جنبش پر گویا گُل کتر کر گزر جاتا ہے[1]"

ظاہر ہے کہ خرامِ یار اور گل کترنے سے غالب کے اس شعر کی طرف اشارہ مقصود ہے۔

دیکھو تو دلفریبیٔ اندازِ نقشِ پا موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی

ایک اور خصوصیت جو نیاز کی نثر میں نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ بعض اوقات جذبات کی شدت کے وقت ان میں ایک خطیبانہ رنگ پیدا ہو جاتا ہے یعنی چھوٹی سی بات کو جو مختصر عبارت میں بھی بیان کی جا سکتی ہو خوب پھیلا دیتے ہیں۔ یہ چیز بھی مولانا ابوالکلام آزاد کی طرزِ نگارش سے مماثلت رکھتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ مولانا طبعاً خطیب ہیں، اس لئے ان کی عبارت میں اس چیز کی افراط ہے اور خطیبانہ رنگ نیاز کے مذہبی مضامین میں دوسرے مضامین کی بہ نسبت زیادہ دکھائی دیتا ہے۔ چند ایک مثالیں جو نیاز کی مختلف کتب سے لی گئی ہیں ملاحظہ فرمائیے:

"میں دیکھ سکتا ہوں کہ ایک شخص مجبور ہو کر اپنے وطن کی یاد اپنے دل سے بھلا دے۔ اس منظر کو برداشت نہیں کر سکتا کہ آزادی کی حالت میں ترکِ اُلفت کے بہانے تلاش کئے جائیں۔ میں اس بات کو سُن سکتا ہوں کہ ایک شخص عام اضطراب میں ممنوعات اپنے اوپر جائز کر لے لیکن اس کے سننے کی تاب مجھ میں نہیں کہ صرف ہوا و ہوس کی مجبوری سے کسی لغو تاویل کو درست سمجھ لے۔ میں ایک ظالم و سخت گیر قوت کے سامنے سر جھکا دینے والوں پر ملامت نہیں کرتا خواہ وہ قوت کتنی مردود میں کیوں نہ ہو لیکن میرے غصہ کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ جب میں دیکھتا ہوں کہ وہ قوت سر جھکا دینے پر کسی کو مجبور نہیں کرتی اور یہ عجز، دنائتِ اخلاق کا نتیجہ ہے۔ میں کسی جدید تعلیم یافتہ کو مذاقِ سلیم سے معرّیٰ دیکھ کر اس خیال سے خاموش رہ سکتا تھا کہ یہ اس کے لئے ناگزیر ہے لیکن اظہارِ نفرت و ملامت اس وقت میرے اختیار سے باہر ہے جب میں جان لوں کہ تعلیم جدید سلبِ وجدان نہیں کرتی۔ میں کسی کو مجنونِ فیشن و لباس دیکھ کر اس یقین کی بنا پر دم بخود رہ سکتا ہوں کہ شاید فنونِ یورپ صرف یہی سکھاتے ہوں گے۔ لیکن ....[2] الخ"

"جب ارتقاءِ انسانیت کی یہ حالت ہے اور کارگاہِ قابلیت کا یہ عالم، تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ لوگ جو ادبی روحانیت اور روحانی ادب سے اظہارِ نفرت و حقارت کو معیارِ قابلیت دے چکے ہیں، وہ لوگ جو ذوقِ شعری سے اس لئے متنفر ہیں کہ یورپ ان کا مرشدِ مقدس اس طرف متوجہ نہیں۔ وہ لوگ جو پاکیزہ ترین ادبی مذاق کو بھلا بیٹھے ہیں اس بنا پر کہ ان کے پیرِ مغاں کا وہ مسلک نہیں، وہ لوگ جنہوں نے اپنے محاسنِ قومی و خصوصیاتِ مذہبی سے یکسر روگردانی اختیار کر لی، اس خیال سے کہ وہ ایک مدعیٔ تہذیب قوم کے نزدیک افسانہ ہائے پارینہ ہیں وہ لوگ ....[3] الخ"

"یہ آپ نے خوب سوال کیا کہ دنیا میں کسی چیز کا قائل بھی ہوں یا نہیں ..... اے حضرت آپ کا قائل ہوں۔ آپ کی پارسائی کا قائل ہوں۔ آپ کی شب زندہ داریوں کا قائل ہوں ......[4]"

"خدا کی قسم کیا کام کیا ہے۔ رستم و اسفندیار کی روحیں کانپ اُٹھی ہوں گی۔ سکندر و نپولین کی قبروں پر لرزہ طاری ہو گیا ہوگا۔ آجکل کے سینڈو اور گاما کا کیا ذکر وہ لوگ بزدل ہیں جو اپنے سے قوی کو لوٹتے ہیں .... الخ"

---

[1] جمالستان ص ۶۷۔ [2] مقدمہ گیتا نجلی ص ۲۰۔ [3] ایضاً ص ۱۰۹۔ [4] مکتوبات سوم ص ۲۷۔

"آج سے میری تمام تحریریں ایک ایسے شخص کی تحریریں سمجھی جائیں جسے اسلام سے کوئی علاقہ نہیں...... لیکن اگر اسلام ضمیر و خیال کی آزادی نہیں چھینتا، اگر وہ فکر و رائے کی حریّت کا دشمن نہیں ہے، اگر وہ بغیر اطمینانِ نفس پیدا کئے ہوئے بہ جبر اپنی حقیقت کسی سے تسلیم نہیں کراتا، اگر وہ مجموعۂ مزخرفات و خرافات نہیں ہے اور اگر وہ ہر شخص کے لئے ہر زمانے میں دستگیر و راہنما بن سکتا ہے تو اے مسلمانو! میں پوچھتا ہوں کہ ان مولویوں کو کیا حق حاصل ہے کہ وہ مجھے اسلام سے خارج کریں۔ ان کو کیا منصب حاصل ہے کہ وہ ایک توحیدِ خداوندی کا اقرار کرنے والے کو کافر قرار دیں...... [1]"

جہاں تک فقروں کی ساخت کا تعلق ہے یہ بالعموم لمبے ہیں اور اس وصف میں وہ سرسید کے انداز سے قریبی مناسبت رکھتے ہیں۔ سرسید کی بھاری بھرکم شخصیت اور ان کے وسیع و عریض مقاصد، ان کی بے پایاں ذمہ داریاں، ان کی طرزِ تحریر پر اسی صورت میں اثر انداز ہوئیں یعنی عبارت میں بھی ایک بھاری بھرکم پن پیدا ہو گیا۔ سرسید کی عبارت میں اور، جس، لیکن، اگر، مگر، پھر کا استعمال بہت زیادہ ہے۔ یہی چیز بڑی حد تک نیاز کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ نیاز کی ذمہ داریاں سرسید کی ذمہ داریوں کے مقابلے میں کم ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ جہاں تک لکھنے کا تعلق ہے، ان کی دنیا سرسید کی دنیا سے بہت وسیع ہے۔ نیاز نے بہت زیادہ لکھا ہے اور مختلف موضوعات پر قلم اُٹھایا ہے۔ اس چیز میں ان کی طبیعت کی جولانی کے علاوہ ان کا اڈیٹر ہونا بھی کسی حد تک ممد ہے یعنی ایک تو طبیعت کی اس افتاد کے سبب کہ وہ جلد جلد اور تیز تیز اپنے مطالب کا بیان کرنا چاہتے تھے، ان کے فقرے لمبے ہو گئے۔ اور جو، جس وغیرہ کی قبیل کے الفاظ زیادہ استعمال میں آئے۔ دوسرے ایک رسالہ کے اڈیٹر ہونے کی وجہ سے بعض اوقات انھیں نصف یا اس سے بھی زائد پرچہ خود ہی لکھ کر پورا کرنا پڑتا تھا۔[2] اس وجہ سے بھی انھیں بہت زیادہ اور بہت مختلف موضوعات پر قلم اُٹھانا پڑا جس کی وجہ سے جہاں مضامین وسیع ہوئے وہاں عبارت کے جوڑ بند بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ یہ نہیں کہ نیاز کے ہاں چھوٹے فقرے نہیں پائے جاتے۔ چھوٹے فقرے بھی ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو پھر ان کی عبارت رواں ہونے کے باوجود کسی حد تک بھیکی ہو جاتی۔ خطوط میں زیادہ حد تک چھوٹے چھوٹے فقرے استعمال کرتے ہیں اور مذہبی بحثوں میں زیادہ تر طویل فقرے، اس کی وجہ یہ ہے کہ جہاں موضوع زیادہ سنجیدہ ہو اور امور بحث طلب ہوں وہاں فقرے لمبے ہو جاتے ہیں۔ جو باتیں محض شگفتگیِ خاطر کے لئے لکھی جائیں ان میں فقرات چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں۔[3]

یہ ان کے طرزِ تحریر کی چند مجموعی خصوصیات ہیں، یہ تو ظاہر ہے کہ ہر موضوع اپنی نوعیت کے اعتبار سے اور مضمون کے لحاظ سے ایک جدا اسلوب کا متقاضی ہوتا ہے۔ افسانہ، اس میں بھی رومانی اور عام اخلاقی افسانہ۔ استدلالی مذہبی مضامین انشائے لطیف۔ عام علمی مضامین۔ تنقید اور خطوط وغیرہ موضوعات ایک دوسرے سے بُعدِ بعیدہ رکھتے ہیں۔ اس لئے ایک ہی مصنف کے مختلف موضوعات کی عبارتیں بالکل یکساں نہیں ہوتیں۔ مصنف کی طبیعت کا جزو اہم ان میں قدرِ مشترک کے طور پر ضرور موجود ہوتا ہے۔ اور اس سے اس کا مصنف پہچانا جا سکتا ہے۔ خواہ موضوع کوئی کیوں نہ ہو لیکن مضامین کے اپنے اپنے لب و لہجہ کے تفاوت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر مولانا محمد حسین آزاد کی عبارات کو دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ دربارِ اکبری، آبِ حیات، نیرنگِ خیال بڑی حد تک ایک دوسرے سے مماثل ہیں لیکن سیرِ ایران اور ان کے خطوط کا اسلوب اِن سے مختلف ہے۔ سخندانِ فارس نہ ان کے خطوط کی طرح سادہ ہے نہ آبِ حیات کی طرح پرکار۔ قصصِ ہند اور درسی کتابیں جو مولانا نے دانستہ آسان عبارت میں لکھیں اُن کا انداز اور اسلوب جداگانہ ہے لیکن ان تمام ظاہری فرق کے باوجود مولانا کی طبیعت کا خلوص اور دردمندی ہر جگہ کارفرما ہے اور آزاد کا شخصی رنگ ہر عبارت میں ہویدا ہے۔ اس لئے یہ پہچاننے میں کوئی دقت نہیں ہوتی کہ عبارت کا مصنف کون ہے۔ یہی حال مولانا شبلی کا ہے۔ انھوں نے سیاسی تاریخیں بھی لکھی اور علمی ادبی مضامین بھی لکھے اور خطوط بھی۔ لیکن "شعر العجم" میں جو دلکشی ہے، ظاہر ہے کہ وہ الغزالی میں نہیں ہو سکتی اور جو دلآویزی ان کے خطوط میں ہے وہ مقالات میں نہیں۔ اور لطف تو یہ ہے کہ خود ان کے خطوط لطف اور چاشنی کے لحاظ سے دو حصوں میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں۔ ایک وہ جو عطیہ فیضی کو لکھے گئے اور باقی وہ جو "مکاتیبِ شبلی" میں شامل ہیں۔ تاہم شبلی اپنی ہر تحریر میں موجود ہیں۔ ان کی حساس طبیعت اور مزاج کی نزاکت ہر جگہ نمایاں ہے۔ بعینہٖ یہی حال نیاز کی تحریروں کا ہے۔ ان کی کوئی تحریر اٹھا کر دیکھ لی جائے نیاز کی مضطرب طبیعت اس میں جلوہ گر ہو گی۔ ہر جگہ عبارت کی طراری اور زلزلہ انگیزی اپنے مصنف کی شخصیت کی آئینہ دار نظر آئے گی۔

---

[1] من و یزداں ص ۱۴۳۔ [2] ۱۹۳۰ء کے قریب کے رسائل ملاحظہ ہوں۔ [3]

بہرحال یہ درست ہے کہ نیاز کی ابتدائی تحریروں میں رومانیت بہت زیادہ تھی۔ اس زمانہ میں ٹیگور کا اثر ان پر زیادہ تھا۔ مضامین خیالی بہ افراط تھے اور مجرد تشبیہات کی بھی کمی نہیں تھی۔ ان کی وہ نثر بیدل کی شاعری سے مماثل کہی جا سکتی ہے، جو خوبی اور رعنائی کے باوجود لفظاً بھی معناً بھی مشکل تھی لیکن اس کے باوجود اس میں وہ دلکشی تھی کہ نوجوانوں نے ان کے اسلوب کی تقلید کرنا چاہی اور ان کا بھی وہی حشر ہوا جو بیدل کی شا کے مقلدین کا ہوا۔ یہ چیز عجیب وغریب ہے کہ ایک شاعر اپنے مقلدین سے گھبرا کر اپنی روش میں مناسب ترمیم کرنے پر مجبور ہو جیسا کہ تاجور نجیب آبادی نے لکھا ہے [1] اس امر کے متعلق عزیز احمد نے اپنی مشہور تصنیف "ترقی پسند ادب" میں مواخذہ کیا ہے۔ وہ اُن کی اس رومانیت پسندی کو ادب برائے ادب کے مسلک سے تعبیر کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ "اگر جدید اُردو ادب میں واقعتاً ادب برائے ادب کسی کا مسلک رہا ہے تو وہ نیاز فتحپوری ہیں۔ اس کا نتیجہ دیکھنے کے لئے ملاحظہ ہو "شاعر کا انجام" کا تہدیہ [2] اس تہدیہ کا ایک حصہ یہاں نقل کیا جاتا ہے — "اے دلِ دیوانہ! اپنے نغمہ ہائے شکر تیرے ہی ساز بے خودی کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ خدا کرے یہ عرضِ نغمہ تیری ہی مستیِ متالم کے حضور میں خجلت کا وش نہ ثابت ہو۔" ظاہر ہے کہ یہ آخر تک قائم نہیں رہا نیاز خود اس طرف متوجہ ہوئے اور عبارت کو سہل بنانے کی کوشش کی۔ بعض مقامات پر اندازِ بیان کو بدل دیا اور بعض مقا پر بہ خیال خود غیر ضروری عبارت کو کاٹ دیا۔ مثلاً "شہاب کی سرگزشت" کے پہلے ایڈیشن اور بعد کے ایڈیشن میں اس قسم کا ردّ و بدل ملتا ہے مثلاً پہ ایڈیشن میں یہ فقرہ تھا "کیا مقصد کی کامیابی دُنیا میں نامطبوع چیز خیال کی جاتی تھی؟" [3] اب نئی کتاب میں ہے "کیا مقصد کی کامیابی دُنیا میں بُری با ہے؟" [4] اسی طرح انھوں نے متعدد جگہ عبارت کو مختصر کر کے زیادہ مؤثر بنانے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً یہ عبارت :

"غلطی یہ ہے کہ اب پھر مجھ سے ملنے کی تمنا رکھتے ہو اور یقین کرتے ہو کہ زمانہ اس صدمہ کو بُھلا دے گا۔ مجھ سے معافی چاہ کر اس خلا کو پُر کر دو گے جو مراسمِ محبت میں پیدا ہو گیا ہے۔ ممکن ہے کہ زمانہ اس صدمہ میں کمی پیدا کر دے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ تم مجھ سے طلبِ عفو کرو لیکن محمود یہ قطعی ناممکن ہے کہ تم ایک شیشہ میں پڑ جانے والے بال کو دور کر سکو۔ [5]"

اب اس طرح ہے :-

"غلطی یہ ہے کہ اب پھر مجھ سے ملنے کی تمنا رکھتے ہو یہ ممکن ہے کہ زمانہ اس صدمہ کو کم کر دے۔ لیکن یہ قطعی ناممکن ہے کہ تم ایک شیشہ میں پڑ جانے والے بال کو دور کر سکو۔ [6]"

"دُنیا میں ایک خود غرض شخص سب سے پہلے جن لوگوں کو اپنے حملہ کا مستحق سمجھتا ہے وہ اُس کے احباب ہوتے ہیں۔ [7]"

اب یہ فقرہ اس طرح ہے :-

"دُنیا میں ایک شخص سب سے پہلے اپنے حملہ کا مستحق احباب ہی کو سمجھتا ہے۔ [8]"

"الہٰنۃ القمر اپنی تمام بے حجابیوں اور بے باکیوں کے ساتھ دُکنے والی جوانی کی طرح اپنی مینائے سیمیں سے ہلکے رنگ کی شرابِ زرّیں چھلکاتی ہوئی آ رہی تھی۔ [9]"

اس کو اس طرح بدل دیتے ہیں :-

"ادھر چاند کی دیوی اپنی مینائے سیمیں سے ہلکے رنگ کی شرابِ زرّیں چھلکاتی ہوئی نمودار ہو رہی تھی۔ [10]"

اس قسم کی بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ شروع کی تحریروں سے اب کی تحریریں کچھ مختلف ضرور ہیں۔ فقر کی ساخت اور ان میں مشکل الفاظ کی کمی اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ عنفوانِ شباب کے جوش اور ادھیڑ عمر کے سکون سے عبارت میں کتنا فرق آجاتا۔ شہاب کی سرگزشت کے نئے ایڈیشن میں بعض جگہ فقرے کے فقرے جو اب شاید ان کو غیر شائستہ نظر آئے ہیں انھوں نے کاٹ دئے ہیں۔

---

[1] رُوحِ انتخاب ص۲۳۴۔ [2] ترقی پسند ادب ص۲۲۔ [3] شہاب کی سرگزشت (پُرانا ایڈیشن)۔ [4] شہاب کی سرگزشت (نیا ایڈیشن) ص۱۲۔ [5] شہاب کی سرگزشت (پرانا ایڈیشن) ص۸۴-۸۵۔ [6] شہاب کی سرگزشت (نیا ایڈیشن) ص۹۔ [7] شہاب کی سرگزشت (پرانا ایڈیشن) ص۸۴۔ [8] شہاب کی سرگزشت (نیا ایڈیشن) ص۸۔ [9] شہاب کی سرگزشت (نیا ایڈیشن) ص۱۱۷۔ [10] مثلاً جدید ایڈیشن ص۱۲۶ اور پرانے ایڈیشن کا ص۱۸۷۔

نیاز کی عبارت میں خامیاں بھی ہیں وہ بعض اوقات عربی فارسی کے موٹے موٹے الفاظ استعمال کرنا شروع کردیتے ہیں جس سے ایک تو عبارت میں ناہمواری پیدا ہو جاتی ہے۔ دوسرے عبارت عوام کی سمجھ سے بالاتر ہو جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس قسم کے الفاظ کا استعمال غیر شعوری طور پر کرجاتے ہوں کیونکہ عربی فارسی کا مطالعہ انھوں نے کافی کیا ہے مگر اُردو کی سلاست میں اس سے ضرور فرق آجاتا ہے۔

"دُنیائے شاعری مشکل سے ایسے "ایجاز سدید" "بیانِ جزیل اور عبارت انیق" کی پاکیزہ مثال پیش کر سکتی۔ مومن اسلوبِ ادا اور قدرتِ بیان کا بادشاہ ہے۔ وہ معمولی سے معمولی بات کا اظہار کرتا ہے تو بھی اس لطف کے ساتھ کہ اس میں جدّت پیدا ہو جاتی ہے...[1]"

اس قسم کی عبارتیں ان کی ہر کتاب میں مل جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر "ایک شاعر کا انجام" کے چند فقرے نقل کرتے ہیں:

"میرے کوائف سے استبعاد حقیقی ہے۔" "آج کم و بیش ۳۰ دن ہوئے جب مجھ سے اس ناساعد مناکحت کی تقریب میں قبول کیا۔" "اس کی آنکھیں یوں تو اور بھی مترحم اور عاشقانہ کیف کا محلِ نظر آئیں۔" میرے لئے وجہ نکوہش ہے۔" "اس کی نگاہوں کی عادتِ مستمرہ ہوگی۔" وغیرہ

اسی طرح نگارستان میں بھی ہمیں اس قسم کے فقرے مل جاتے ہیں۔ "اپنی جھکی ہوئی آنکھوں سے استرحام پیدا کر سکتے۔" "رسمِ مناکحت قاطبۃً مسدود۔" "عقد انا مل پر اسمِ الٰہی کا ورود شروع کر دیا۔" نگارستان کے پُرانے ایڈیشن سے بھی چند فقرے ملاحظہ ہوں: "اس کے پاس ایک ساختہ اسحر گھوڑا تھا۔" "جسارت مستمرہ اور سلاستِ مقالی عود کر آتی۔"

اور پھر "طیران" بجائے اُڑان کے استعمال کیا ہے۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بعض اوقات نیاز خود بھی اس امر سے آگاہ ہوتے ہیں کہ ان کے بعض الفاظ قاری کے لئے آسان نہیں۔ اس لئے وہ کئی دفعہ قوسین میں معنی بھی لکھ دیتے ہیں جیسے طیورِ جمیل کے حویصلات (پپوٹوں) کو زمردِ گیاہ کے دانوں پر بھرنے سے مامور تھے۔[2]"

مجموعی اعتبار سے نیاز کا طرزِ نگارش اور اسلوبِ بیان ایک جداگانہ شان کا مالک ہے، جس طرح ان کی شخصیت دوسرے مصنفین کی شخصیتوں سے مختلف ہے اسی طرح ان کا اسلوب دوسروں کے اسالیب سے جدا ہے۔ ہم ان کی تحریروں کو کسی اور مصنف کی تحریروں کے مماثل نہیں قرار دے سکتے۔ وہ مذہبی معاملات میں سرسید کی طرح سوچتے ہیں لیکن مذہبی مضامین پر قلم اٹھاتے وقت سرسید کی سی سادگی اور استدلال کا کڑا پن برقرار نہیں کر سکتے۔ کبھی کبھی ابوالکلام آزاد کی طرح خطیبانہ رنگ بھی اختیار کر لیتے ہیں لیکن ان کی سی متانت اور سنجیدگی قائم نہیں رکھ سکتے۔ حالی کی سادگی سے ان کو دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ نہ محمد حسین آزاد کی طرح ان کی عبارتیں تصویریت اور شدتِ احساس کا غلبہ ہے۔ مرزا غالب کی نثر سے بھی ان کی نثر کو کوئی مناسبت قریبہ نہیں کیونکہ غالب کی شوخی اور بے تکلفی میں بھی ایک وضع داری موجود ہے۔ اگرچہ نیاز اپنے خطوط میں شوخی اور بے تکلفی سے پوری طرح کام لیتے ہیں لیکن اس وضعداری اور برگزیدگی کا احساس نہیں ہونے پاتا تاہم اپنی جگہ نیاز کی نثر کسی بھی دوسرے مصنف کی نثر سے کم رتبہ نہیں کہی جا سکتی اور نہ ان کو کسی کا مقلد قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ اسلوبِ نگارش ایک ذاتی جوہر ہے..... انسان کی ذہنی ساخت کا اثر اس کی عبارت پر پڑتا ہے۔ الفاظ کی دروبست اور اُن کا محلِ استعمال، شخصی تخیل، زبان پر قدرت اور لطیف جمالیاتی احساس یہ ایسی چیزیں ہیں جو کسی کے اتباع سے حاصل نہیں ہوتیں۔ انشا پردازی کے اصول جان لینے سے کبھی بھی بڑا انشا پرداز پیدا نہیں ہوتا۔[3]

نیاز کا طرزِ نگارش بڑا دلکش و دلفریب ہے۔ عبارت میں ایک حرکت ہے اور زندگی۔ یبوست، خشکی اور بے رونقی کا احساس کہیں نہیں ہوتا۔ نئی نئی ترکیبیں، نیا نیا اسلوبِ بیان اور بدیع مطالب کے سبب جگہ جگہ گلہائے رنگا رنگ کی نمود نظر آتی ہے۔

ان کی تحریروں میں نشیب و فراز ہیں۔ مذہبی مضامین میں ایک کڑا پن بھی اور طعن و تشنیع کی دلآویزی بھی۔ مالہٗ و ما علیہ میں بے باکی بھی ہے اور سخت گیری بھی۔ خطوط میں شیرینی بھی ہے اور شوخی بھی۔ غرض مکمل یکسانی و یک رنگی نہیں ہے لیکن اس اختلافِ لب و لہجہ کی حیثیت وہی ہے جو مختلف رنگ پھولوں کی غالب کے نزدیک ہے۔

ہے رنگ لالہ و گل و نسریں جدا جدا ÷ ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے

یہ ساری چیزیں مل کر نیاز کے اسلوب کی تعمیر کرتی ہیں اور یہی رنگا رنگی اُن کے انداز کی مقبولیت کا سب سے بڑا راز ہے۔

(یہ مضمون "نگار" مئی ۵۴ء کے شمارے میں شامل تھا)۔ ▲▼▲

---

[1] انتقادیات، حصہ اول ص۳۲۔ [2] جمالستان ص۳۷۹۔ [3] Some Secrets of Style



جی. کے. مانک ٹالا

ہندوستانی اکیڈمی کے تعلق سے
نیاز فتح پوری، پریم چند اور دیا نرائن نگم کے مابین

کچھ ہنگامی بحثیں

مرتبہ: مانک ٹالا

تمہید

علامہ نیاز فتح پوری ایک متبحر عالم اور عربی و فارسی کے منتہی تھے۔ ماہنامہ نگار اُن کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ نگار کے توسط سے انھوں نے متعدد فنکاروں کو متعارف کرایا تھا جن میں سے کئی آج بھی آسمانِ ادب پر آفتاب و ماہتاب کی طرح چمک رہے ہیں۔ نیاز صاحب اپنی ذات میں ادارہ تھے۔ اُن میں ایک خوبی یہ بھی تھی کہ نگار کو مرتب کرتے وقت وہ مصنفین کے تعاون کے کبھی دستِ نگر نہیں رہے۔ تعاون تو انھیں ہمیشہ ملتا ہی رہا لیکن اپنا پرچہ مرتب کرتے وقت جب کبھی مضامینِ نظم و نثر کی کمی پڑ جاتی وہ اس کی خانہ پُری اپنے ہی عالمانہ مضامین سے کر لیتے۔

نیاز صاحب نے نگار پہلے پہل آگرہ سے جاری کیا تھا۔ اس کے تیسرے شمارے پر تبصرہ کرتے ہوئے منشی دیا نرائن نگم زمانہ کے جون ۱۹۲۲ء کے شمارہ میں صفحہ ۳۴ پر رقم طراز ہیں:

"مجلۂ نگار کا تیسرا پردہ اُٹھ چکا ہے جس میں عروسِ ادب فردکش ہے۔ یعنی نگار کا تیسرا نمبر شائع ہو چکا ہے اور وہی اس وقت ہمارے پیشِ نظر ہے۔ اس میں نظم و نثر کے چھوٹے بڑے سترہ مضامین شائع ہوئے ہیں جن میں سے دس جناب نیاز فتح پوری کے قلم سے نکلے ہیں ......"

نیاز صاحب نے تقریباً سبھی اصنافِ ادب پر طبع آزمائی کی ہے۔ انھوں نے نظمیں اور غزلیں تخلیق فرمائیں۔ افسانے اور ناول/ناولٹ لکھے۔ تحقیق و تنقید کے خارزاروں میں بھی قلم کے جوہر دکھلائے۔
اُن کا ناولٹ "شہاب کی سرگزشت" ماہنامہ زمانہ میں قسط وار شائع ہوا تھا۔ اور اگر میری یادداشت دھوکا نہیں دیتی تو اُن کا دوسرا ناولٹ "شاعر کا انجام" بھی میں نے زمانہ ہی کے صفحات کی زینت بنا ہوا دیکھا تھا۔

نیاز صاحب کے تخلیقی ادب میں زیادہ تر عبارت آرائی اور نقش نگاری کی کارفرمائی تھی۔ اس کی وضاحت ڈاکٹر عبدالمغنی کی ایک تحریر "شہاب کی سرگزشت" کے سیاقِ عبارت کے تعلق سے پیشِ خدمت ہے :

"...... ماحول کے خارجی پہلوؤں کے بجائے افراد کی داخلی کیفیتوں کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ سارا زور واقعات و حادثات کی عکاسی کے بجائے احساسات و جذبات کی نقاشی پر ہے۔ غیر معمولی اور مثالی قسم کے ہیرو ہیروئن بالکل تخیلی نوعیت کے کردار پیش کرتے ہیں۔ ماجرا کی تعمیر عمل و ردِ عمل کی سرگرمیوں سے زیادہ مکالموں اور جملہ بازیوں سے ہوتی ہے۔ پورے قصے میں رومانیت، شعریت اور فلسفہ طرازی کی فضا طاری رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بول چال کی سادہ زبان نہیں استعمال کی جاتی صرف انشائے لطیف کا دریا بہایا جاتا ہے۔" (ہماری زبان، ۲۳ مئی ۱۹۹۴ء)

نیاز صاحب کی تنقید نگاری کے بارے میں بھی ڈاکٹر عبدالمغنی کا ایک اقتباس "ہماری زبان" کے اسی شمارے سے پیش ہے :

" افسانے کے بعد نیاز فتح پوری کا قابلِ ذکر کام تنقید نگاری کی صنف میں ہے۔ اُن کے انتقادی مقالات متعدد ہیں۔ وہ ایک تاثراتی ناقد ہیں اور اُن کی رائیں بالکل ذاتی پسند و ناپسند پر مبنی ہیں۔"

بہت عرصہ پہلے نیاز صاحب کے انتقادی مقالات کا ایک مجموعہ میری نظر سے گزرا تھا۔ اُس میں جوش ملیح آبادی اور فراق گورکھپوری کی شاعری پر دو تنقیدی مقالے بھی تھے۔ جوش صاحب پر لکھے ہوئے مقالے میں انھیں جوش کی شاعری پر کوئی خوبی نظر نہیں آئی۔ انھیں جوش صاحب کے کئی اشعار میں کئی سقم نظر آئے۔ کچھ شعروں/مصرعوں پر انھوں نے اصلاح بھی فرمائی تھی۔ اُدھر فراق پر لکھے ہوئے مضمون میں نیاز صاحب کو خوبیاں ہی خوبیاں نظر آئیں حالانکہ جس زمانے میں وہ مقالہ لکھا گیا تھا وہ فراق صاحب کی شاعری کا ابتدائی دور تھا اور فراق صاحب، جوش صاحب کے مقابلے میں کم تر شاعر تھے۔

نگار کے ابتدائی صفحات میں "ملاحظات" کا ایک مستقل کالم ہوا کرتا تھا جو اکثر و بیشتر کئی کئی صفحات کو محیط ہوتا تھا۔ اس میں علم و ادب، سیاحت، مذہب، سیاسیات وغیرہم مختلف النوع موضوعات پر نیاز صاحب بلا لاگ لپیٹ بحث فرماتے تھے۔ مذہب کے معاملے میں وہ غیر قدامت پسند اور فراخ دل تھے اور اس کالم میں وہ اکثر بنیاد پرست اور متعصب علمائے دین کے خلاف بہت سخت بلکہ کسی حد تک توہین آمیز تحریریں بھی احاطۂ قلم میں لاتے تھے۔ اس نوعیت کی دو تحریریں میں نگار کے جون ۱۹۳۰ء اور اکتوبر ۱۹۳۰ء کے شماروں سے حاصل کر کے نذرِ قارئین کر رہا ہوں تاکہ وہ کسی حد تک نیاز صاحب کے میلانِ طبع کے ایک رُخ کی چھوٹی سی جھلکی دیکھ سکیں۔

نیاز صاحب کی اس انتہا پسندی کا ایک دوسرا رُخ ہندوستانی اکیڈمی کے خلاف اُن کے "جہاد" میں ملتا ہے جس میں انھوں نے اُردو کے معاملے میں بلا وجہ ہندو مسلم سوال اٹھا کر پریم چند، دیا نرائن نگم اور دو ایک دیگر اُردو کے ہندو خدمت گزاروں کو لپیٹے میں لے لیا تھا۔ اس تفصیل میں جانے سے پہلے ہندوستانی اکیڈمی کی ابتدا اور تشکیل وغیرہ کی مختصر روداد پیش کرنا ضروری ہے۔

ہندوستانی اکیڈمی

۲۷ مارچ ۱۹۲۷ء کو الہ آباد میں ہندوستانی اکیڈمی کا افتتاح، صوبہ متحدہ (موجودہ اُتر پردیش) کے اُس وقت کے گورنر سر ولیم میرس کے ہاتھوں ہوا۔ سر ولیم ایک روشن خیال عالم فاضل شخصیت تھے۔ وہ دل و جان سے چاہتے تھے کہ صوبہ جات متحدہ میں علوم و فنون کو فروغ حاصل ہو۔ ہندی اور اُردو کی باہمی رقابت دُور ہو اور دونوں زبانوں کو ایک دوسرے کے قریب لایا جائے۔ جدید مغربی علوم و فنونِ لطیفہ اور سائنس کے تراجم کرائے جائیں اور دونوں زبانوں کے اہلِ قلم افراد کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ دونوں زبانوں میں عام مذاق کو ملحوظ خاطر رکھ کر مختلف شعبہ ہائے علوم و فنون اور ادب و تاریخ وغیرہ کی کتابیں تیار کرائی جائیں۔

اکیڈمی کے قیام کے اعلان پر صوبہ کے تقریباً سبھی مؤقر رسائل، اخبارات اور اہلِ علم و ادب حضرات نے خوشی کا اظہار کیا اور اُسے ایک فعال اِدارہ بنانے میں ہر قسم کے تعاون کا یقین دلایا۔ اکیڈمی کی صدارت کے لئے گورنمنٹ نے سر تیج بہادر سپرو اور سکریٹری شپ کے لئے ڈاکٹر تارا چند کو نامزد کیا۔ اس کے علاوہ نامزد ممبران، جن کی کل تعداد تیئس تھی، میں درج ذیل مشاہیر ادب کے نام بھی تھے ــــــ
(۱) ڈاکٹر مسعود حسن رضوی (۲) منشی پریم چند (۳) منشی دیا نرائن نگم (۴) سید سجاد حیدر (۵) منشی بینی پرشاد (۶) علامہ نیاز فتحپوری (۷) رام بابو سکسینہ (۸) مرزا محمد حسن عسکری (۹) پروفیسر رشید احمد صدیقی (۱۰) بابو شیام سندر داس (۱۱) مولانا عبدالماجد دریا آبادی۔

اکیڈمی کی طرف سے مختلف کتابوں کے ترجمے اُردو اور ہندی میں شائع کرائے گئے اور جنوری ۱۹۳۱ء سے دونوں زبانوں میں دو سہ ماہی رسالے جاری کئے گئے۔

اُس وقت تک شعبۂ اردو میں جو متعدد و مفید علمی و ادبی کتابیں شائع کی گئیں ان میں سے چند ایک کے نام درج ذیل ہیں:

(۱) "ازمنۂ وسطیٰ میں ہندوستان کے معاشرتی و اقتصادی حالات"۔ مرتبہ: مسٹر عبداللہ یوسف

(۲) "عرب و ہند کے تعلقات"۔ مصنف: سید سلیمان ندوی

(۳) "ناتن" (جرمن ڈرامہ)۔ مسٹر نعیم الرحمٰن (اس کا ہندی ترجمہ مولانا ابوالفضل نے کیا تھا)

(۴) "فریبِ عمل" (گالسوردی کا ڈرامہ)۔ مترجمہ: چوہدری جگت موہن لال رواں۔

اس کے علاوہ "ہندی شاعری" اور "فنِ زراعت" وغیرہ کتابیں بھی زیرِ طبع تھیں۔

اُردو کے جن قابل مصنفین کی حوصلہ افزائی کے لئے گزشتہ سالوں میں (یعنی اکیڈمی کے اجراء سے لے کر جنوری ۱۹۳۱ء تک) بہترین مطبوعات پر انعام دیئے گئے، ان کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

(۱) تنظیم الحیات۔ مصنف: حضرت صفی لکھنوی

(۲) وقارِ حیات۔ مؤلف: مولوی اکرام اللہ خاں نقوی

(۳) معراجِ سخن۔ مصنف: حضرت عروج لکھنوی

(۴) نفسیاتِ ترغیب۔ مصنف: سید وہاج الدین کنتوری

مندرجہ بالا کتابوں میں سے ہر ایک پر پانچ سو روپیہ انعام دیا گیا تھا۔

(درج بالا سبھی تفصیلات کو زمانہ کے مختلف شماروں سے منتخب کرکے راقم الحروف نے اپنی کتاب "پریم چند۔ حیاتِ نو" میں شامل کیا تھا۔)

ہندوستانی اکیڈمی کا اگلا اجلاس پورے چار سال کی تاخیر کے بعد ۱۲، اور ۱۶، جنوری ۱۹۳۱ء کے دوران الہ آباد میں منعقد ہوا تھا۔ اس میں شرکت کے لئے ہندی اور اردو کے کئی مشاہیر الہ آباد پہنچے تھے۔

اس اجلاس میں ہندی اور اُردو کے مسئلے پر مفصل تبادلۂ خیال ہوا۔ پریم چند اس بات سے کافی جُز بُز ہوئے تھے کہ دو ادبا کو الگ الگ جگہ پر ٹھہرایا گیا تھا۔ اُن کی نظر میں اس سے ہندی اور اُردو کی دیوار بھی اونچی ہوگئی۔ پریم چند کا خیال تھا کہ اگر دونوں دھڑے مل نہیں سکتے تو نہ ملیں۔ اپنی ڈفلی الگ بجانا چاہتے ہیں تو بجاتے جائیں۔ لیکن کیا اس میں بھی کوئی برائی ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ بھی نہ رہ سکیں؟ پریم چند نے اس موقعے پر جو تقریر کی اس میں ہندی اور اُردو کے مسئلے کا حل پیش کرتے ہوئے کہا :

> " ورنیکولر فائنل اور ہائی اسکول کے امتحانات تک اُردو اور ہندی دونوں لازمی مضمون بنا دیئے جائیں تبھی آنے والی نسل جس جذبے یا خیال کے اظہار کے لئے جو مناسب سمجھے گی استعمال کرے گی۔"
>
> ("پریم چند وشو کوش" جلد ۱ از ڈاکٹر کمل کشور گوئنکا ص ۲۱۵ سے منقبض)

اکیڈمی کے ممبران کی نامزدگی کی مدت تین سال کے لئے تھی۔ چنانچہ جون ۱۹۳۰ء میں جب اکیڈمی کی نئی تشکیل ہوئی اس میں نیاز فتح پوری کے ساتھ ساتھ درج ذیل ممبران کو نکال کر نئے ممبران کو لیا گیا تھا : مولانا عبدالماجد دریا آبادی۔ مولوی نورالحسن نیّر۔ جناب صفی۔ منشی پریم چند۔ مرزا محمد حسن عسکری اور سید شاہ سلیمان ندوی۔

منشی دیا نرائن نگم کو بھی نئی کمیٹی میں شامل نہیں کیا گیا تھا لیکن اکیڈمی سے متعلق ان کی خدمات سے متاثر ہوکر آنریبل جسٹس سر شاہ سلیمان اور خان بہادر حافظ ہدایت حسین کی تحریک و تجویز خاص سے اکیڈمی نے ان کو نہ صرف جنرل کونسل بلکہ کمیٹی انتظامیہ کا بھی ممبر منتخب کرلیا" — نیاز صاحب نے اکیڈمی سے اپنے اخراج کو توہین آمیز سمجھتے ہوئے انتہائی برافروختگی کے عالم میں نہ صرف اکیڈمی کے خلاف بلکہ اُردو کے ہندو اہلِ قلم کے خلاف بھی نومبر اور دسمبر ۱۹۳۰ء کے ملاحظات میں کافی تُند و تلخ باتیں تحریر فرمائیں۔ اس کے جواب میں پریم چند اور دیا نرائن نگم نے نیاز صاحب کی تحریروں کے خلاف پروٹسٹ کے طور پر جوابی مضامین زمانہ دسمبر ۱۹۳۰ء میں شائع کرائے۔ ان سب مضامین سے پہلے نیاز صاحب کے ملاحظات کے وہ دو مضمون بھی شامل کر دیئے گئے ہیں جن میں علامہ نے مذہب کے معاملے میں اپنی غیر قدامت پسندی اور فراخ دلی کا اظہار فرمایا ہے۔ تفصیل درج ذیل ہے :

(۱) ملاحظات : جون ۱۹۳۰ء (۲) ملاحظات : اکتوبر ۱۹۳۰ء — علامہ کی مذہب کے بارے میں غیر قدامت پسندی کے اظہار میں۔
(۳) ملاحظات : نومبر ۱۹۳۰ء (۴) ملاحظات : دسمبر ۱۹۳۰ء — علامہ کے اکیڈمی اور ہندو اہلِ قلم کے خلاف مضامین۔
(۵) زمانہ : دسمبر ۱۹۳۰ء — علمی خبریں اور متفرق نوٹ : دیا نرائن نگم کا جواب۔
(۶) زمانہ : دسمبر ۱۹۳۰ء — اردو میں فرعونیت : منشی پریم چند کا جواب۔

نگار : جون ۱۹۳۰ء صفحہ ۴/۵ **ملاحظات**

مجھے ہندوؤں کے علمائے مذہب کا حال نہیں معلوم کہ ان کا کتنا اور کس قسم کا اثر لوگوں پر قائم ہے لیکن مسلمان جماعت کا حال ضرور معلوم ہے اور میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے ہاں تمام خرابیوں کا سبب صرف علماء کی ذات گرامی ہے اور انھوں نے ہمارے ذہن و دماغ، ہمارے اخلاق و عادات کے بگاڑنے میں کوئی دقیقہ کوشش کا نہیں اٹھا رکھا۔ انھوں نے ہمارے بجائے مذہب کے ہم کو صرف رسم و رواج کا پابند بنایا۔ انھوں نے مذہب کی حقیقی رُوح سے بیگانہ کرکے ہم کو عصبیت اور تنگ نظری کی تعلیم دی اور انھوں نے ہمیشہ وہی درس دیا جو وطنیت کے جذبہ کو خاک میں ملا دینے والا تھا۔ انھوں نے ہم کو عمر بھر کفر و اسلام کے نزاع، مسجد و مندر کی تفریق،

ریش و بروت کے جھگڑوں میں پھنسائے رکھا اور کبھی اسلام کے اُس مفہوم سے آشنا نہیں کیا جو ساری دنیا کے افراد کو ایک رشتہ سے وابستہ کر دینے والا ہے۔ یہاں تک کہ اگر آج کوئی شخص مجھ سے دریافت کرے کہ اصلاح ملک و قوم کی بہترین تدبیر کیا ہے۔ تو میں صرف یہی کہوں گا کہ بلا امتیاز و تفریق اس جماعت کے ایک ایک فرد کو منہدم کر دینا چاہئے اور ان کے ہاتھوں سے وہ اقتدار چھین لینا چاہئے جس کی بدولت یہ اپنے آپ کو خدا کا بندہ کہنے والے اس وقت تک "خدائی" کرتے چلے آئے ہیں۔ ان میں سے "سوء" و "خیر" کا انتخاب نسیہ و نقد کے امتیاز میں نہ صرف وقت ضائع کرنا ہے بلکہ بڑی حد تک خطرناک بھی ہے۔ کیونکہ اگر ہم کو کوئی ایسا ظرف دے دیا جائے جس میں ۹۹ سانپ ہوں اور ایک مچھلی اور اس کے اندر ہاتھ ڈال کر مچھلی نکال لینے کا اختیار دیا جائے تو ہمارے لئے چارۂ کار سوائے اس کے کیا ہو سکتا ہے کہ ہم اس ظرف ہی کو زمین میں دفن کر دیں اور ایک مچھلی کی جستجو میں ۹۹ سانپوں سے ڈسے جانے کے خطرہ کو منظور نہ کریں۔

ایک مولوی تبلیغ اسلام کے نام سے جمعیۃ قائم کرکے مسلمانوں کی موجودہ بے معنی جماعت میں آسی بے معنی ذہنیت رکھنے والے افراد کا اضافہ کر سکتا ہے، خلافت کے لغو و بے بنیاد تحریک کو قائم رکھنے میں وہ قرآن و حدیث کے سارے دفتر کو ہر مہمل تاویل کے ساتھ پیش کر سکتا ہے۔ وہ دیوبند میں بیٹھ کر خدا اور رسول کے بہانے سے ہر طاغوتی قوت کو بروئے کار لا سکتا ہے، وہ فرنگی محل میں بیٹھ کر اپنے آپ کو دین کا "والی قطب" ظاہر کرتے ہوئے صرف عرب و فلسطین کی سیاسیات میں دلچسپی لینے کی تعلیم مسلمانوں کو دے سکتا ہے لیکن اس کو یہ سلیقہ کبھی حاصل نہیں ہو سکتا کہ وہ ملک کی فلاح پر غور کرے، وطن کی سیاسی اقتضاء کو سمجھے اور اس ایثار و قربانی کا درس دے جس کو سب سے زیادہ اسلام ہی نے سمجھا اور سمجھایا۔

لفظ "مسلمان" دنیا میں صرف ایک ہی مفہوم کے ساتھ پیش کیا گیا تھا اور وہ مفہوم "بہترین انسان اور بہترین متمدن" ہونے کا تھا، لیکن آج یہ علمبرداران اسلام، یہ حاملان مذہب اپنے اقوال و افعال سے اپنی گفتار و کردار سے اس کا مفہوم یہ بتا رہے ہیں کہ نہیں "مسلمان" وہ ہے جو انتہا درجہ کا تنگ نظر ہو، حد درجہ کا خود غرض ہو اور بے انتہا کمزور و بزدل بھی ہو یعنی اس کا ذریعۂ فخر بلندیٔ اخلاق و پاکیزگیٔ سیرت نہیں رہا، بلکہ اس کی پہچان اب صرف یہ رہ گئی ہے کہ خدا کی عبادت کی جگہ وہ صرف محراب و منبر کی پوجا کرتا ہو، قرآن کے الہامی ہونے کے ثبوت میں وہ اس کی بلند تعلیم پیش کرنے کی بجائے معجزۂ شق القمر اور فصاحت و بلاغت کا ذکر کرتا ہو اور اپنے سوا سب کو کافر، ملحد، مشرک اور ناری بتاتا ہو حالانکہ اس غریب کو یہ خبر نہیں کہ ذہنیت کا یہی وہ دَور ہے جو فی الدرک الاسفل من النار سے تعبیر کیا گیا ہے اور یہی وہ منزل انحطاط ہے جہاں پہنچنے کے بعد "علی شفا حفرۃ من النار" کی تصویر سامنے آجاتی ہے۔

نگار : جلد ۱۸   اکتوبر ۱۹۳۰ء   شمارہ ۴ : ملاحظات

حکومت ترکی کی آزاد روی کے متعلق ہندوستان کے مسلم اخباروں میں جس وقت کوئی خبر نظر آتی ہے تو میں اتنا متعجب نہیں ہوتا جس قدر ان اخباروں کی توجیہ و تاویل کو دیکھ کر ہنسی آتی ہے۔ اگر کبھی وہاں سے خبر آجاتی ہے کہ حکومت ترکی نے قدیم شکستہ مسجدوں کو مسمار کرکے چمن بنا دئے ہیں۔ اذان کا طریقہ انھوں نے لاسلکی مکبر الصوت کی صورت میں رائج کیا ہے۔ عورتیں برافگندہ نقاب احتفالات رقص میں شریک ہوتی ہیں۔ عربی رسم الخط کو مٹا کر انگریزی حروف کو استعمال کیا جا رہا ہے۔ مغربی ٹوپی لباس کا جزو قرار دی گئی ہے، مذہبی و فقہی تعلیم کے ساتھ ہمدردی اٹھتی جا رہی ہے، علماء مذہب کو کوئی مخصوص شرف و امتیاز نہیں دیا جاتا۔ نماز کا مفہوم وہاں صرف عبادت (اور عبادت بھی قومی اجتماع کے اصول پر) قرار دے کر اس وقت بینڈ بجانے کا دستور ہوتا جا رہا ہے۔ الغرض ترکی کے متعلق جب کوئی خبر ایسی آجاتی ہے جو ہندی مسلمانوں کے مذہبی نقطۂ نظر سے قابل نفرت و استکراہ ہے تو بعض ایڈیٹروں کا یہ شیوہ ہوتا ہے کہ وہ ان خبروں کو دشمنوں کا پروپگنڈہ قرار دے کر ان کی صحت سے انکار کر دیتے ہیں۔ کیونکہ ان کو یہ گوارا نہیں ہوتا کہ ایک قوم جو اپنے آپ کو مسلمان کہتی ہے اس قدر "نامسلمانی" کا اظہار کرے اور بعض ان کو صحیح جان کر ترکی کی گمراہی اور ضلالت و الحاد پر اظہار

افسوس کرکے خاموش ہو جاتے ہیں۔

پھر سوال یہ نہیں ہے کہ ترکی میں یہ سب کچھ ہو رہا ہے یا نہیں بلکہ گفتگو اس میں ہونی چاہئے کہ جو کچھ بیان کیا جا رہا ہے وہ اگر آج غلط ہے تو کل تک صحیح ہونے والا ہے یا نہیں۔ اگر اندیشہ ہونے کا ہے تو پھر غور کرنا چاہئے کہ اس کے اسباب کیا ہیں۔

ہمارے یہاں کے علماء کرام کی بے نیازی کا یہ عالم ہے کہ اگر آج ساری دنیا کے مسلمان ان عقائد سے ہٹ جائیں جن پر مذہب اسلام کی بنیاد کا قائم ہونا ظاہر کیا جاتا ہے تو وہ حد درجہ استغناء کے ساتھ کہہ دیں گے کہ اسلام اور خدائے اسلام کسی کا محتاج نہیں۔ اگر روئے زمین پر کوئی مسلمان (سوائے ان کے) باقی نہ رہے تو کیا پرواہ ہے۔ حالانکہ ان کو غور کرنا چاہئے کہ اگر وہ تمام عالم کے مسلمانوں کو جہنم کے سپرد کرکے خود تنہا جنت چلے گئے تو انھیں کیا خاک لطف آئے گا۔ اور حور و قصور، فردوس و سلسبیل کی ضرورتِ وجود پر کس چیز کو بطور حجت پیش کیا جائے گا۔ برخلاف اس کے اگر وہ اپنی محدود مختصر جماعت کو علیحدہ کرکے باقی سب کو فردوس کا مستحق قرار دیں تو بے شک اس میں ایک بات ہے اور اس سے کچھ خدا کی خدائی بھی ظاہر ہوتی ہے ورنہ یوں تو کائنات کا مفہوم صرف ایک خدا اور چند مولویوں سے زیادہ کچھ نہیں قرار پاتا۔

الغرض یہ لوگ خدا کی بے نیازی ظاہر کرنے میں یہ تو آسانی سے کہہ دیتے ہیں کہ اسے مطلق پرواہ نہیں۔ اگر ساری دنیا کافر ہو جائے لیکن کبھی وہ ایک لمحہ کے لئے بھی اس پر غور نہیں کرتے کہ کیا خدا اسلام کا پابند ہے؟ اور جس طرح وہ سارے عالم سے بے نیاز ہے کیا اسی طرح وہ اسلام سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ساری دنیا کا مبتلائے کفر ہو جانا اس کو نقصان نہیں پہنچا سکتا تو سارے عالم کا مسلمان ہو جانا بھی اس کی عظمت و برتری میں کسی طرح کا اضافہ کا باعث نہیں ہو سکتا۔

پھر جب مذہب و ملت کے مسائل میں خدا اور اس کی مرضی کا سوال اُٹھ گیا تو کفر و اسلام کا فرق کوئی خدائی امتیاز نہ ٹھہرا بلکہ صرف عقائد کا اختلاف اور اُصول اخلاق کا اختلاف ہوا اور عقائد و اصول بھی وہ جنھیں خود انسان نے بنایا ہے۔ پھر ایک انسان یہ دعویٰ تو کر سکتا ہے کہ اُس کے بنائے ہوئے قواعد حیات و معاشرت ایک مخصوص ملک و عہد کے لئے موزوں ہو سکتے ہیں لیکن وہ یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ جو اُصولِ زندگی اب سے دو ہزار برس قبل پائے جاتے تھے وہی اب بھی پائے جاتے ہیں۔ یا جو اَب موجود ہیں وہ آئندہ دو ہزار سال کے بعد بھی اسی طرح قائم رہیں گے جبکہ اصولِ اخلاق و معاشرت انسان کی ذہنیت کے تابع ہیں اور انسانی ذہنیت کا وقت اور ماحول کے لحاظ سے تغیر پذیر ہونا ایک پیش پا افتادہ حقیقت ہے۔

پھر اگر ترکی، مولویوں کے بنائے ہوئے اصول و قواعد سے منحرف ہو رہا ہے تو دُنیا میں وہ کونسی قوت ہے جو اس کی موجودہ ذہنیت کو بدل سکتی ہے جبکہ اس کا تجربہ و مشاہدہ ہے کہ اس کی ترقی کا راز ہی ان اصول سے انحراف کرنے میں پوشیدہ ہے۔ ترکی کی ترقی اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب اُس نے خلافت کی زنجیر سے اپنے آپ کو آزاد کیا اور چونکہ خلافت بھی مولویوں ہی کا مسلّط کیا ہوا عذاب تھا اس لئے قدرتاً اس کو اس جماعت سے متنفر ہونا چاہئے تھا اور اس تنفر کے بعد قدرتاً ان تمام اصولوں سے بیزار ہو جانا چاہئے اس لئے اگر حالات یہی ہیں تو بہت جلد وہ وقت آنے والا ہے جب مذہب کا بعید ترین واسطہ بھی مفقود ہو جائے گا۔ اور اگر انھوں نے زیادہ تنگ نظری سے کام لیا تو ان کے مذہب کا نام ترکیت بلکہ صرف انسانیت قرار پائے گا۔ جو نہ وضع لباس کو دیکھتی ہے نہ کسی مخصوص عبادت و نیایش کو بلکہ صرف اخلاق کو، اصولِ تہذیب و تمدن کو اور اُس جذبہ کو جو تمام انسان کو ایک ہی رشتہ سے منسلک کرنے والا ہے۔ پھر اگر یہ اصول حقیقتاً غلط ہیں، اگر یہ ذہنیت گمراہی ہے تو اس غلطی و ضلالت کے ثبوت کا بار کس پر ہے؟ اُن پر جو ان کو صحیح سمجھ کر اختیار کئے ہوئے ہیں، یا اُن پر جو اُن کی غلطی کے مدعی ہیں۔

ہمارے یہاں کے علمبردارانِ مذہب اس امر کے لئے تو بیقرار ہیں کہ اُن کا اقتدار بدستور قائم رہے۔ منصب ہدایت ان سے نہ چھینا جائے، لیکن وہ اس کی یہ فکر نہیں کرتے کہ لوگوں کے خدشاتِ قلب دُور کریں، اپنی تعلیمات میں تمدن حاضرہ کے اقتضاء کے مطابق تغیر و تبدل کریں اور خود اپنے اندر وہ ذہنیت پیدا کریں جو اس دورِ علم و حکمت کی ترقیوں کا ساتھ دے سکے۔

اب زمانہ وہ ہے کہ الہام و وحی کے مفہوم کو صرف تبلیغی مکر و فریب سمجھا جاتا ہے۔ کتب مقدسہ و ملہمہ کے بیانات کو بربنائے تحقیقات

تاریخی غلط ٹھہرایا جا رہا ہے۔ تعلیمات مذہبی کو ناقص و نامکمل ثابت کرکے اُسے تقویم پارینہ بنایا جا رہا ہے اس لئے میرے نزدیک اب سوال مقابلہ کا نہیں ہے بلکہ سپر ڈال دینے کا ہے یا پھر مذہب کو اس قدر بلند لے جائے کہ ان تمام اعتراضات کی دسترس سے دُور ہو جائے۔

نگار: جلد ۱۸ | نومبر ۱۹۳۰ء | شمارہ ۵: ملاحظات

اس سے قبل ناظرین نگار کو معلوم ہو چکا ہے کہ ہمارے صوبہ متحدہ گورنمنٹ نے اُردو ہندی کی زبانوں کی خدمت کے لئے ایک اکیڈمی قائم کی ہے اور خزانۂ حکومت سے سالانہ معقول امداد اس کو ملتی ہے۔ اس کا نظام کیا ہے۔ اور اکیڈمی کیا تدابیرِ خدمت زبان کے لئے اختیار کر رہی ہے اس کی تفصیل یا اس پر تنقید کسی دوسرے وقت پر ملتوی کرتا ہوں۔ فی الحال میں ایک اور مسئلہ پر اظہار خیال کرنا چاہتا ہوں جس کو ملتوی نہیں کیا جا سکتا۔

اکیڈمی کے دستور اساسی و نظم عمل میں ایک خیال یہ بھی تھا کہ ایک جریدہ ایسے لٹریچر کے ساتھ پیش کیا جائے جو ایک طرف حقیقی معنے میں اکیڈمی کی شہرت و وقار کو قائم رکھنے والا ہو اور دوسری طرف واقعی خدمتِ زبان اس سے مقصود ہو۔ چنانچہ اب قیام اکیڈمی کے تقریباً چار سال بعد یہ تحریک بروئے کار آ رہی ہے اور ایک سہ ماہی رسالہ کا اجراء وہاں سے شروع ہو رہا ہے لیکن قبل اس کے کہ وہ جاری ہو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بعدِ اشاعت حدودِ تنقید کو تنگ کرنے کے لئے قبل اشاعت ہی ان مشوروں کو پیش کر دیا جائے جو اپنی توقعات کے لحاظ سے ہم پیش کر سکتے ہیں۔

یہ حقیقت غالباً اربابِ نظر سے پوشیدہ نہیں کہ جب سے اُردو ہندی کی تفریق و نزاع شروع ہوئی ہے اس وقت سے ایک خاص جماعت اربابِ فکر کی ایسی پیدا ہو گئی ہے جو ان دونوں میں رشتۂ اتحاد پیدا کرنے کی مدعی ہے اور جہاں تک اُردو انشاء کا تعلق ہے وہ چاہتی ہے کہ اُس کو اس قدر سہل و آسان بنا دیا جائے کہ غیر مسلم یا غیر عربی و فارسی داں حضرات بھی بغیر کسی تکلیف کے آسانی سے سمجھ سکیں۔ یہ تجویز یا نیت بظاہر نہایت خوشنما اور دل پذیر معلوم ہوتی ہے لیکن ایک نگاہ غائر اس تجویز میں چند در چند نقائص محسوس کر سکتی ہے۔ اچھا اب آیئے عملی نقطۂ نظر سے اس خیال کا تجزیہ کریں اور دیکھیں کہ نتیجہ کس صورت میں رونما ہوتا ہے۔

اگر اُردو انشاء کو سہل بنایا جائے، یعنی عربی، فارسی الفاظ ترک کرکے عوام کے لئے نہایت ہی آسان زبان استعمال کی جائے تو اس کے معنی صرف یہ ہوں گے کہ اردو میں جو کچھ لکھا جائے اسی ذہنیت کو سامنے رکھ کر لکھا جائے جسے عوام کی ذہنیت کہتے ہیں۔ یعنی اردو میں سوائے معمولی قصے کہانیاں داستانوں، افسانوں اور بعض ابتدائی علوم کے مبادیات کے کسی اور سنجیدہ و دقیق صحبت پر گفتگو نہ کی جائے۔ یا بالفاظ دیگر یوں کہئے کہ اردو بولنے اور لکھنے والی جماعت کو (جس میں عنصر غالب مسلمانوں کا سمجھا جاتا ہے) مطلقاً تربیتِ ذہن و دماغ کی ضرورت نہیں ہے اور ان کو ہمیشہ سطحیات میں مبتلا رکھنا چاہیئے تاکہ وہ بدستور جاہل بنے رہیں اور ان میں دقیق مسائل پر سوچنے اور خود اپنے اندر ذہن خلاق پیدا کرنے کی اہلیت نہ پائی جائے۔

ممکن ہے بعض لوگوں کو تعجب ہو کہ میں اس نتیجہ پر کیونکر پہنچا لیکن ادنیٰ تامل سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ خیال کی بلندی و دقت از خود زبان کو بلند و دقیق بنا دیتی ہے۔ اگر ہم زندگی کے نہایت معمولی روز کے واقعات بیان کریں تو آسان زبان کافی ہو سکتی ہے لیکن اگر ہم علم الحیات، نفسیات وغیرہ دیگر علوم دقیقہ سے بحث کریں گے یا خود انشاء کے اندر نازک خیالی اور بلندی تخیل سے کام لے کر زبان کو معانی جدیدہ اور نکاتِ نادرہ سے آشنا کرنا چاہیں گے تو زبان خود دشوار ہو جائے گی اور ہم مجبور ہوں گے کہ عربی فارسی کے الفاظ اور ان کے ترکیبی فقروں سے کام لیں۔

یہ امر مسلم ہے کہ ہر موضوع کے لئے ایک مخصوص زبان ہوا کرتی ہے، جو زبان ہم ایک افسانہ میں استعمال کرتے ہیں کیا نفسیات کے کسی مضمون کے لئے مناسب ہو سکتی ہے، کیا جس زبان میں ہم مذہبی مسائل کا ذکر کرتے ہیں، وہ ایک سیاسی خطیب کے لئے موزوں ہے۔

الغرض اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ معانی و مطالب کے اشکال کے ساتھ ساتھ زبان کا بھی اشکال بڑھتا ہے اور اس پہ مشورہ دینا کہ اُردو کو نہایت سہل اور حد درجہ عوام پسند بنا دیا جائے یہی معنی رکھتا ہے کہ اس کو علمی بلند زبان بنانے سے احتراز کرنا چاہیئے۔

اس نوع کا مشورہ دینے والے دو گروہ ہیں۔ ایک گروہ مسلمانوں کا ہے' جو فارسی عربی سے لگاؤ نہیں رکھتا اور جس نے اپنے گہوارہ ہی میں انگریزی ماحول کو دیکھا۔ دوسرا گروہ ہندوؤں کا ہے جو اُردو زبان میں عربی فارسی الفاظ کا استعمال کیا معنی۔ یہ بھی گوارا نہیں کرتا کہ اُردو رسم الخط قائم رہے۔ اگر ہندوؤں کی یہ ذہنیت صرف اس بنا پر ہوتی کہ اُن کو عربی فارسی سے قدرتاً کوئی لگاؤ نہیں ہے تو وہ زیادہ قابلِ الزام نہ تھے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی اس تحریک میں سیاسی غرض پنہاں ہے اور وہ ہندی کو ترقی دینے کے لئے جنگ کے ان تمام اصولوں سے کام لے رہے ہیں جو حصول مدّعا کے لئے کسی نہ کسی نہج سے مفید ہو سکتے ہیں۔ اس کا ثبوت فراہم کرنے کے لئے زیادہ دقّتِ نظر کی ضرورت نہیں ہے۔ گزشتہ دس سال کے اندر ہندی لٹریچر نے جو صورت اختیار کی ہے وہ ایک ایسی قوی شہادت ہے جس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ اگر ہندو جماعت کے سامنے اردو زبان کو سہل بنانے کی کوشش میں دونوں جماعتوں کا اتحاد خیال و زبان مقصود ہوتا، تو چاہیئے تھا کہ وہ ہندی میں بھی اسی اصول پر کاربند ہوتے یعنی جس طرح وہ اُردو کو عربی فارسی کے الفاظ سے بیگانہ کرنا چاہتے ہیں اسی طرح وہ ہندی کو بھی سنسکرت کے ثقیل الفاظ سے ناآشنا رکھتے لیکن کس قدر حیرت ہے کہ ایک طرف تو وہ مسلمانوں کو یہ مشورہ دے رہے ہیں تم اپنی زبان کی خصوصیات کو ترک کر کے اس کو ہندوستانی زبان بناؤ لیکن دوسری طرف جس وقت ہندی زبان کا مسئلہ ان کے سامنے آتا ہے تو وہ کوئی دقیقہ اس کو دشوار بنانے کی کوشش میں نہیں اٹھا رکھتے اور اس کو ہندوستانی زبان بنانے کے بجائے دیوبانی بنانے مطلقاً کوئی تامل نہیں ہوتا۔ اوّل اوّل جس وقت اُردو ہندی کی نزاع شروع ہوئی دنیا کو بتایا گیا کہ یہ صرف رسم الخط کی تبدیلی ہے اور انشا کے لحاظ سے ہندی میں اردو سے کوئی فرق نہیں ہے لیکن بعد کو رفتہ رفتہ حجاب اُٹھتا گیا اور یہ حقیقت آخر کار ظاہر ہو کر رہی کہ جس چیز کو صرف رسم الخط کا امتیاز کہا جاتا تھا اس میں نیّتوں کا کھوٹ شامل تھا اور وہ امتیاز حقیقتاً مذاہب کا اختلاف تھا، تمدن و معاشرت کا اختلاف تھا اور اس عصبیت کا اختلاف تھا جو ایک مسلمان کے دل سے محو ہو سکتی ہے لیکن ایک ہندو جو مسلمان کو ہندوستان کا غیر مستحق باشندہ سمجھتا ہے کبھی اس سے منفک نظر نہیں آ سکتا۔

پھر آج ہندی کے رسالوں کو اُٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اُردو زبان کو سہل بنانے کا درس دینے والے خود ہندی زبان کو مسلمانوں کے لئے کس درجہ ناقابلِ فہم بناتے جاتے ہیں اور اُردو کے وہ معمولی الفاظ بھی جو حقیقتاً سنسکرت ہی کی بگڑی ہوئی صورت رکھتے ہیں کس طرح ترک کئے کئے جا رہے ہیں۔ کیا انصاف کا یہی تقاضا ہے۔ کیا صداقت اسی طرز عمل کی مقتضی ہے اور دونوں قوموں کو متحد دیکھنے کی آرزو اسی طریق کار سے پوری ہو سکتی ہے۔

مجھ سے زیادہ دونوں قوموں کے اتّحاد کا شاید ہی کوئی حامی ہو، لیکن میں یہ ماننے کے لئے تیّار نہیں کہ اس کے لئے دونوں قوموں کو اپنی زبان کی خصوصیات بدلنے کی بھی ضرورت ہے۔ البتہ بجائے اس کے اگر اس امر کی تبلیغ کی جائے کہ دونوں جماعتیں دونوں زبانوں کا اتنا علم حاصل کریں کہ وہ ایک دوسرے کے علوم سے مستفید ہو سکیں تو بے شک میں اس کو ایک نتیجہ خیز بات کہہ سکتا ہوں۔ اس کے کوئی معنی نہیں کہ ہندو جماعت اردو کو تہی مایہ بنانے کی کوششیں کرتی رہے اور ہندی کے باب میں وہ اصول کو ترک کر کے اختلاف زبان کی خلیج کو اور زیادہ وسیع کرتی جائے۔

ہندو جماعت میں اول تو اردو کے انشاپرداز بہت کم ہیں اور جو ہیں فسانہ نگاری سے آگے نہیں بڑھے، لیکن گزشتہ دس سال کے اندر انھوں نے جس قدر تغیر اپنی اردو میں پیدا کر لیا وہ کسی سے مخفی نہیں۔ مسٹر پریم چند اردو کے مشہور افسانہ نگار ہیں لیکن اب سے چند سال قبل کے افسانے ان کے دیکھئے اور پھر ان سے مقابلہ کیجئے ان کے موجودہ افسانوں کا تو معلوم ہوگا کہ زبان و خیال دونوں حیثیتوں سے ایک تغیر عظیم ان میں پایا جاتا ہے اور وہ ذہنیت جس کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں پوری طرح نمایاں ہو گئی ہے۔ نولکشور پریس کی طرف سے جو اُردو کی ریڈرس تیار کی گئی ہیں ان کو ملاحظہ کیجئے کہ مسٹر پریم چند نے کس بے دردی کے ساتھ اردو کو ذبح کیا ہے اور خیال و زبان دونوں اعتبار سے اس میں کس قدر نقائص پائے جاتے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ اوّل اوّل جب یہ ریڈرس لکھی گئی تو ان کی زبان کافی سادہ تھی۔ لیکن تھی اُردو۔ مگر جب

جناب پریم چند کے سامنے حک و اصلاح کے لئے آئیں تو انھوں نے کوئی دقیقہ ان کی زبان کو مسخ کرنے کا اٹھا نہ رکھا۔ یقیناً پریم چند صاحب اُردو میں فسانہ لکھتے ہیں اور اچھا لکھتے ہیں لیکن ان کو اردو زبان کا ماہر یا صاحب نظر مصنف تو نہیں کہہ سکتے۔ وہ یقیناً نہیں سمجھ سکتے کہ اُردو کی خصوصیات کیا ہیں۔ عربی فارسی ترکیبوں پر اس کی معنوی خوبی کا کس قدر انحصار ہے۔ اگر وہ عربی فارسی کے جاننے والے ہوتے۔ اگر وہ بجائے فسانوں کے علمی یا تنقیدی مضامین بھی لکھتے تو ان کو معلوم ہوتا کہ اُردو کو کسی طرح عربی فارسی سے بے نیاز نہیں بنایا جاسکتا جس طرح وہ خود اپنے ہندی مضامین کو سنسکرت کی ترکیبوں سے خالی نہیں کر سکتے۔ یہ میں نے اس لئے ظاہر کیا کہ اگر کوئی شخص جواب میں پریم چند صاحب کی انشاء کو پیش کرے تو پہلے ہی سے اُس کو میرا جواب رفع دخل معلوم ہو جائے۔

اس قدر تمہید و تفصیل کے بعد میں اب ہندوستانی اکیڈمی، اس کے ممبران اور رسالہ کے ایڈیٹران سے خطاب کر کے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ اکیڈمی کی طرف سے جو سہ ماہی رسالہ اُردو کا جاری ہونے والا ہے وہ کس ذہنیت کے ماتحت شائع ہوگا اور ملک و قوم کو اس کی طرف سے کیا توقعات قائم کرنا چاہیے۔

چونکہ خود مجھے بھی اکاڈمی کے ممبر ہونے کی عزّت حاصل کر چکی ہے اور میں اس ذہنیت سے اچھی طرح واقف ہوں جو زبان کے متعلق وہاں کی فضا میں پائی جاتی ہے۔ اس لئے مجھے اندیشہ ہے کہ زیر تجویز رسالہ کہیں غلط اصول پر نہ جاری کیا جائے اور مبادا وہ بھی سیاسی اغراض کا شکار ہو جائے۔ اس اندیشہ کی تصدیق اُس روایت سے بھی ہوتی ہے جو مسٹر دیا نرائن نگم سے بواسطہ جناب مشیر احمد صاحب علوی مجھ تک پہنچی ہے کہ اس رسالہ کا نام صرف ہندوستانی ہوگا اور اس پر بجائے سہ ماہی کے تہ ماہی رسالہ درج کیا جائے گا (معلوم نہیں میں نے تہ ماہی لکھنے میں صحیح رسم خط استعمال کیا ہے یا نہیں۔ ممکن ہے وہ اس کو تماہی لکھیں)۔ مجھے روایت سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ یہ تجویز پروفیسر صدیقی صاحب کی ہے۔ میں پروفیسر صدیقی سے واقف نہیں ہوں اور غالباً میری طرح کوئی بھی ان کی خدمت زبان کے کارناموں سے آگاہ نہیں ہے لیکن پروفیسر صدیقی کی طرف سے اس تجویز کا پیش ہونا (محض اس وجہ سے کہ وہ مسلمان ہیں) قوم کے صحیح جذبات کی ترجمانی نہیں ہوسکتی جبکہ معلوم ہے کہ وہ اپنے مصالح مقامی کے لحاظ سے کبھی اس کی جرأت نہ کر سکتے تھے کہ ارباب اکیڈمی کے ہندو عنصر کے خلافِ مزاج کوئی تجویز پیش کر سکیں۔ مسلمان لاکھ بیوقوف سہی لیکن زمانے نے ان کو اتنا باخبر ضرور کر دیا ہے کہ وہ اس نوع کے تحریک و تجویز کی اہمیت اور اس کی شاطرانہ چال کو سمجھ سکیں۔

حکومت کی طرف سے اکیڈمی کو جو امداد ملتی ہے وہ صرف ترقی زبان کے لئے ملتی ہے اور اس مقصد کے تحت میں کوئی اور غرض شامل نہیں ہے۔ پھر اصولاً صرف یہ دیکھنا چاہیئے کہ اُردو کی ترقی کیونکر ممکن ہے۔ اگر سہ ماہی کو تماہی کرنا علامت ترقی میں شامل ہے صرف اس وجہ سے کہ اس طرح فارسی لفظ سہ محو ہوتا ہے تو ہندی رسالہ میں بجائے کسی اور سنسکرت ترکیب کے سہ ماہی لکھنا چاہیئے تاکہ وہاں سے سنسکرت عنصر کم کیا جائے۔ یہ عجیب بات ہے کہ ہندی رسالہ میں تو وہ تمام اخلاق روا رکھا جائے جس کو یقیناً اکثر ہندو حضرات بھی نہیں پسند کر سکتے لیکن اُردو سے ان معمولی عربی فارسی کی ترکیبوں کو بھی نکال دیا جائے جو ہندو زبانوں پر بھی عرصہ سے رائج چلی آتی ہیں۔

میں پوچھتا ہوں کہ وطن کے بجائے اردو میں جنم بھوم کیوں لکھا جائے۔ زیور کی جگہ بھوشن کیوں رائج کیا جائے، موسم، وقت کے بجائے سمے کا کیوں استعمال ہو۔ 'لیکن' کی جگہ 'پرنتو' کیوں لکھا جائے، کیا کوئی ہندو ایسا ہے جو اس سے انکار کرے کہ وہ وطن، زیور، موسم اور لیکن کا مفہوم نہیں جانتا اور روز کی زندگی میں بجائے ان الفاظ کے جنم بھوم، بھوشن، سمے اور پرنتو کا استعمال کرتا ہو، پھر جب مقصود یہ ہے کہ زبان کو کثیر الفہم بنایا جائے تو وہ الفاظِ جاریہ کو قائم رکھنے سے حاصل ہوتا ہے یا ان میں غیر مانوس تبدیلی کرنے سے؟ میں پوچھتا ہوں کہ سہ ماہی میں کیا خرابی یا اشکال ہے جو اس کو تماہی بنایا جا رہا ہے اور اس سے مدعا کیا ہے۔

بہرحال میں ارباب اکیڈمی کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ اگر وہ اُردو رسالہ جاری کرنا چاہتے ہیں تو اس کے ارباب نظم و نسق میں سے تماہی ذہنیت رکھنے والے عناصر کو بالکل علیحدہ کر دیں۔ کیونکہ یہ لوگ یقیناً اردو کے بہی خواہ نہیں ہیں اور اس کو انھیں خصوصیات کے ساتھ جاری کریں جو اس کو عام سطح سے بلند کرنے والی ہے۔ یقیناً اس میں عام سطحی افسانوں کے علاوہ علمی و تنقیدی مضامین بھی درج کئے جائیں گے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ان مضامین کی جو زبان

ہوگی وہ کسی طرح تماہی کی ہم آہنگ نہیں ہوسکتی اور اس میں عربی و فارسی الفاظ و تراکیب کا ضرورتاً و مجبوراً استعمال یقیناً ہوگا۔ پھر جب اس کوشش کا کوئی مفید نتیجہ نہیں نکل سکتا تو میں حیران ہوں کہ صرف سہ ماہی کو تماہی کر دینے سے جذبہ اصلاح کیونکر پورا ہو سکتا ہے۔ البتہ اگر وہ اکیڈمی کے رسالہ کو صرف بچوں کا کھیل اور ادنیٰ درجہ کے معمولی و سطحی مضامین کا مجموعہ بنانا چاہتے ہیں تو اس سے کوئی واسطہ نہیں خواہ اس کا نام تماہی رکھیں یا ٹری ماسی پترکا، البتہ اس وقت یہ مطالبہ ضرور کیا جا سکتا ہے کہ حکومت کی امداد کا مصرف صحیح بھی ہے اور کیا جو رقم اردو زبان کی ترقی کے لئے دی جا رہی ہے اس کو اس طرح فی الحقیقت ہندی زبان کی اُستواری میں صرف نہیں کیا جاتا۔

جو کچھ میں نے عرض کیا وہ بالکل خلوص نیت لیکن پوری آزادی رائے کے ساتھ ظاہر کیا ہے لیکن اگر اس کو عصبیت کے رنگ میں دیکھا جا سکتا ہے، تو میں باوجود اپنی اس تمام جرأت رائے کے جو مذاہب و مسالک اور ملل و اقوام کے باب میں ہر شخص پر ظاہر ہے اس کو عصبیت تسلیم کرنے پر آمادہ ہو جاؤں گا اور کبھی گوارا نہ کروں گا کہ اُردو زبان کو سیاسی اغراض کا نشانہ بنایا جائے اور اس کو ترقی دینے کی بجائے مسمار و منہدم کیا جائے۔

نگار: جلد ۱۸ — دسمبر ۱۹۳۰ء — شمارہ ۶ : ملاحظات

گزشتہ ماہ کے رسالہ میں ہم ہندوستانی اکیڈمی کے "تماہی رسالہ" کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے بتا چکے ہیں کہ اردو کی خدمت کا صحیح مفہوم کیا ہے اور وہ زبان ع

سادگی پر جس کے مٹ جانے کی حسرت دل میں ہے

بعض ناحق کوش اور رمز شناس حضرات کی دوستی سے کس خطرہ میں ہے۔ اسی کے ساتھ ہم نے یہ بھی وعدہ کیا تھا کہ اگر کسی وقت فرصت ہوئی تو اکیڈمی کے وجود اور اس کے برکات سے بھی بحث کی جائے گی۔ ہر چند ہم اس وعدہ کی تکمیل کے لئے ابھی تیار نہیں لیکن چونکہ اکیڈمی کی گزشتہ سہ سالہ یا تسالہ رپورٹ (انگریزی میں) شائع ہو کر ہمارے ہاتھوں تک پہنچ گئی ہے اس لئے ضمناً و ایجازاً ایک سرسری نگاہ اس پر بھی ڈالنا ضروری ہے۔

یہ رپورٹ اوسط تقطیع کے ۳۱ صفحات پر شائع ہوئی ہے اور اس میں شک نہیں کہ ایک ناواقف الحال شخص اس کو دیکھنے کے بعد جس نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے وہ وہی ہے جو اکیڈمی کے ارباب نظم و نسق دنیا کو باور کرانا چاہتے ہیں لیکن ہم اس رپورٹ کے مرتب کرنے والے کو زیادہ مستحق مبارکباد سمجھتے اگر وہ اس کی ترتیب کو "خلوستان زار" کے لئے بھی محل تنقید و نظر ہوس سے محفوظ رکھ سکتا۔

اس رپورٹ کا تقریباً نصف حصہ تو اس بیان پر مشتمل ہے کہ اکیڈمی کا وجود کیونکر عمل میں آیا، صوبہ کی حکومت نے کس قدر دلچسپی کا اظہار کیا، کون کون ممبر نامزد ہوئے، لائحہ عمل کیا مرتب کیا گیا، کتنے جلسے ہوئے، ان میں کیسی کیسی شاندار اور وزنی تجویزیں پیش ہوئیں، وغیرہ وغیرہ اور ظاہر ہے کہ جہاں تک الفاظ و ترتیب الفاظ کا تعلق ہے یا جس حد تک اغراض و مقاصد کا بیان ہو سکتا ہے اس حصہ میں ایک جگہ بھی حذف و اضافہ یا ترمیم و اصلاح کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی لیکن اس کے بعد کا حصہ جس میں واقعات و عمل، اعداد و شمار کا بیان ہے ہم کو بعض بعض مقامات میں کچھ ایسے خلاء ضرور نظر آتے ہیں جہاں نگاہ پہنچ کر خود بخود رک جاتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاید تفصیل سے قصداً گریز کیا گیا ہے۔

میں اس وقت رپورٹ کے اس حصہ سے بحث نہیں کرنا چاہتا جس کا تعلق تجربہ ماضی سے ہے اور نہ ان بعض کمیٹیوں کے اندرونی تار و پود کا ذکر کروں گا جنھوں نے بعض بالکل غیر مستحق کتابوں کو انعام دینے کے لئے حد درجہ چابکدستی سے کام لیا بلکہ صرف یہ دیکھوں گا کہ آئندہ جو کچھ وہاں ہونے والا ہے اس سے اردو زبان یا اردو اہلِ قلم حضرات کو کس قدر فائدہ پہنچنے کی توقع کی جاتی ہے۔

اکیڈمی کے ممبر ہونے کی حیثیت سے میرا تین سال کا گزشتہ تجربہ بتاتا ہے کہ محض پانسو روپیہ انعام کی توقع پر کوئی اچھی کتاب جو اکیڈمی

کے شایانِ شان ہو نہ کبھی مرتب کی جاسکتی ہے اور نہ حصولِ انعام کے لئے پیش ہوسکتی ہے اس کا سبب خواہ زرِ انعام کی کمی ہو یا کچھ اور۔ بہرحال یہ ایک واقعہ ہے جس سے غالباً اکیڈمی کے دیگر ممبران اور صدر و سکریٹری کو بھی انکار نہیں ہوسکتا۔ ممکن ہے ہندی کے شعبہ میں یہ شکایت محسوس نہ کی جاتی ہو لیکن شعبۂ اُردو کا تو یہ ایک تجربہ ہے جس سے انکار نہیں ہوسکتا اس لئے کامیابی کی صورت اگر کوئی ہوسکتی تھی تو صرف یہ کہ اکیڈمی خود ایک شعبۂ تصنیف و تراجم قائم کرے یا ایسے لوگوں سے جو حقیقی معنے میں اس کے اہل ہیں معقول معاوضہ دے کر منتخب کتابیں ترجمہ کرائے یا خاص خاص موضوع کے تصانیف حاصل کرے۔

رپورٹ زیرِ بحث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تجویز پر عمل ہو رہا ہے اور ترجمہ و تالیف کے لئے بعض حضرات کا انتخاب بھی عمل میں آیا ہے لیکن کس حسن تدبیر کے ساتھ، کس اصول تقسیم کی بنا پر اور کس لطف و مصلحت کوشی کو لئے ہوئے؟ اس کا ذکر غالب مرحوم اس طرح کر گیا ہے کہ ؎

دہر بہ مجلسیاں بادۂ و بہ نوبت من   بمن نماید و در انجمن فسرد ریزد

سب سے پہلے مجھے یہ دریافت کرنا چاہیئے کہ ترجمہ کے لئے صرف انگریزی زبان کی کتابوں اور اُن میں گالسوردی کے ڈراموں کو کیوں پسند کیا گیا۔ کیا اُردو یا ہندی کی ترقی کی بنیاد صرف ڈراموں ہی سے اُستوار ہوسکتی ہے اور وہ بھی صرف انگریزی کے عہدِ حاضر کے ڈراموں سے۔ اگر غیر زبانوں کی ادبیات ہی سے اردو یا ہندی کی نجات ممکن ہے اور وہ ادبیات سنسکرت و عربی میں نہیں پائے جاتے یا جو کچھ اُن سے لینا تھا وہ لیا جاچکا ہے تو میں دریافت کروں گا کہ فرانسیسی زبان کے تمثیل نگاروں میں سے کیورے (Curel)، برنسٹائن (Bernstein) اور ٹرسٹا برنارڈ (Trista Bernard) کو کیوں نظر انداز کیا گیا۔ اطالوی ڈرامہ نویسوں میں سے ڈانشنزیو (D. Annunzio) کی طرف کیوں توجہ مائل نہ ہوئی، کیا لطافت خیال اور نزاکت بیان کے لحاظ سے کوئی دوسری نظیر ایسی پیش کی جاسکتی ہے۔ اس طرح اگر آپ دورِ حاضر کے کچھ زمانہ قبل چلے جائیں تو کیا روسی لٹریچر میں سے پوشکن (Pushkin) کا انتخاب نہیں ہوسکتا تھا یا اس کے بعد دا ستفسکی (Dostoivsky)، تورگینف (Turgeniew)، طالسطائی (Tolstory)، چیکف (Chekov) اور گورکی (Gorky) کو نظر انداز کرسکتے ہیں جنھوں نے واقعہ نگاری کی دنیا میں ایک الہامی انقلاب پیدا کر دیا اور جن کے مقابل مغربی ممالک میں کوئی ملک لٹریچر میں واقعیت (Realism) پیدا کرنے کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔

بہرحال میں اصولاً اس کا مخالف ہوں کہ اُردو یا ہندی میں سب سے پہلے غیر زبانوں کے ادبیات منتقل ہونے چاہیئے کیونکہ کم از کم اُردو کے متعلق میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ادبیات میں وہ اس قدر فروتر نہیں ہے جیسا کہ سمجھا گیا ہے۔ اگر کوئی کمی بھی ہے تو چنداں قابلِ لحاظ نہیں کیونکہ اس وقت ضرورت اس کو علمی زبان بنانے کی ہے اور جو روپیہ ڈراموں، ناولوں اور افسانوں کے ترجمہ میں بیکار صرف کیا جاتا ہے۔ اس سے زیادہ کام کی باتوں میں صرف ہونا چاہیئے۔

اس رپورٹ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ گالسوردی کے چار منتخب ڈراموں میں سے تین ڈرامے اُردو ترجمہ کے لئے منشی دیا نرائن نگم کے سپرد کئے گئے ہیں اور ایک جگت موہن لال صاحب رواںؔ کو مرحمت ہوا ہے۔ اگر مترجموں کا یہ انتخاب صرف اس لئے نہیں ہوا کہ وہ ہندو ہیں تو ہم حیران ہیں کہ ان دونوں حضرات میں وہ کونسی خصوصیات پائی جاتی ہیں جو ہندوستان کی آٹھ کروڑ مسلمان آبادی میں سے کسی میں نظر نہیں آتیں۔ اگر کسی اُردو رسالہ کا اتنی مدت تک نکلتے رہنا کہ اُس کا جُبلی نمبر شائع ہوسکے، کافی اہلیت گالسوردی کے ساتھ اردو میں انصاف کرنے کا قرار دیا جاسکتا ہے تو مسٹر دیا نرائن نگم اور جگت موہن لال رواںؔ سے باندازہ دو چوبلی و بہ مقیاس چار دواوین زیادہ مستحق حضرات مسلمانوں میں بھی نکل سکتے تھے اگر ادنیٰ سعی و کاوش سے کام لیا جاتا۔ لیکن ایسا نہیں کیا گیا اور اُردو کی خدمت کے لئے کوئی ایک شخص بھی اکیڈمی کے ارباب نظم و نسق کو مسلمانوں میں ایسا نظر نہ آیا جو گالسوردی کے ترجمہ کرنے کا اہل ہوتا۔ معلوم نہیں اس مسئلہ میں ہم کو اپنے یہاں افراد قابل کے فقدان پر ماتم کرنا چاہیئے یا اس ذہنیت کی داد دینا چاہیئے جو آنکھوں میں خاک جھونکنے کی حد تک بھی اپنی عصبیت کی سکون بخشی کی تدابیر سے کبھی شرم نہیں کرتی۔

یقیناً مسٹر دیا نرائن نگم ایک اُردو رسالہ کے ایڈیٹر ہیں اور اگر زمانہ کے گزشتہ چند سال کے لٹریچر کو نظر انداز کر دیا جائے جو فی المعنی ہندو معاشرت و تاریخ، ہندو تہذیب و سیاست ہی کی تبلیغ و خدمت میں شمار کیا جائے گا تو ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے ایک حد تک اُردو کی کچھ خدمت بھی انجام دی ہے۔ اسی طرح اس میں بھی کلام نہیں کہ منشی جگت موہن لال رواں کا مجموعۂ نظم بہت پاکیزہ چیز ہے لیکن ان حضرات کی ان خدمات کا اعتراف اس طرح بھی ہو سکتا تھا کہ اکیڈمی رسالہ زمانہ کی مستقل امداد کر دیتی یا رواں صاحب کو ان کے دیوان پر اسی طرح انعام دے دیتی جس طرح صفی کی مثنوی اور عروج کے مرثیہ کو دیا گیا ہے۔ لیکن یہ کیا ضروری تھا کہ ڈراموں کا ترجمہ ان کے سپرد کر کے غریب گالسوردی اور اُردو دونوں کو کشمکش میں مبتلا کیا جاتا۔

جیسا کہ میں گزشتہ ماہ کے رسالہ میں عرض کر چکا ہوں اُردو زبان میں مہارت تامہ یا بصیرت کاملہ ہندوؤں میں کسی طرح پیدا ہو ہی نہیں سکتی جس طرح ایک مسلمان ہندی زبان میں کبھی اس کے ماہر ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ اُردو زبان پر اُسی شخص کو پورا عبور حاصل ہو سکتا ہے جو عربی فارسی کا "قدرِ ضرورت" سے زیادہ مطالعہ کر چکا ہو جس طرح ہندی کے صاحبِ نظر ہونے کے لئے سنسکرت یا ہندی بھاشا کا علم ضروری ہے۔

جب تک مسلمانوں کی حکومت ہندوستان میں قائم رہی ہندوؤں کو یا تو مجبوراً یا اس ذوق کے لحاظ سے جو عام طور پر اس وقت پیدا ہو گیا تھا فارسی تعلیم حاصل کرنا ہوتی تھی کیونکہ دربار و دفتر کی وہی زبان تھی۔ لیکن جس زمانہ میں اُردو کا رواج ہوا وہ دورِ حکومتِ برطانیہ کے آغاز کا تھا۔ جب اردو سے زیادہ انگریزی جاننے والوں کی ضرورت تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو جنھوں نے فارسی و عربی کا مطالعہ بقدر ضرورت محض مجبوری کی بنا پر کیا تھا اب انگریزی کی طرف متوجہ ہو گئے اور کچھ عرصہ میں فارسی عربی کا تھوڑا بہت ذوق جو ان میں چلا آرہا تھا رفتہ رفتہ فنا ہو گیا۔ اس میں شک نہیں کہ اس مجبوری میں مسلمانوں کو بھی شریک ہونا پڑا اور ان کو بھی انگریزی کی طرف مائل ہونا ضروری ہو گیا۔ لیکن وہ عربی فارسی سے نابلد نہ رہ سکتے تھے کیونکہ ان کا مذہبی، تاریخی، قومی، معاشرتی، اخلاقی و ادبی لٹریچر سب انھیں زبانوں میں تھا۔ اور سب سے پہلے حروف شناسی کے بعد ہی جو کتابیں اُن کے سامنے رکھی جاتی تھیں وہ عربی فارسی کی ہوتی تھیں بلکہ اس وقت تک اکثر خاندانوں میں یہی رواج چلا آتا ہے۔

اس لئے وہ شخص جس نے اردو زبان کا کچھ بھی غائر مطالعہ کیا ہے وہ سمجھ سکتا ہے کہ اس کے جاننے کا مدعی وہی ہو سکتا ہے جو نہ صرف عربی فارسی کا جاننے والا ہو بلکہ اس کے اندر ایک صحیح ذوق ان زبانوں کا پایا جاتا ہو اور لغوی و اصطلاحی دونوں حیثیت سے فرق کو سمجھ سکتا ہو جو بہ ادنے 'تغیر اعراب و لہجہ' ایک لفظ کے مفہوم میں پیدا ہو جاتا مثلاً اسی لفظ تماہی کو لے لیجئے جو اصطلاح اُردو کے سلسلہ میں اکیڈمی کی سب سے پہلی اُپج ہے۔ ان لوگوں نے سہ ماہی میں سے لفظ 'سہ' کا ترجمہ بالاختصار 'تے' یا 'تے' تو کر دیا لیکن غریب یہ نہ سمجھ سکے کہ اردو زبان نے سہ ماہی اور تماہی دونوں کے مفہوم ایک دوسرے سے مختلف ہونا چاہئے۔ اردو میں چھ ماہی کا استعمال ہوتا ہے لیکن صرف اُن مراسم کے لئے جو کسی شخص کے مرنے کے بعد چھٹے مہینے ادا کئے جاتے ہیں کبھی یہ لفظ اس مفہوم سے ہٹ کر استعمال نہیں ہوا۔ چنانچہ غالب کا شعر ہے ؎

رسم ہے مُردہ کی چھ ماہی کی ؎ میری چھ ماہی سال میں دو بار

اس لئے اگر تماہی کا استعمال ہو سکتا ہے (حالانکہ اس وقت تک کہیں نہیں دیکھا گیا) تو اسی قسم کے مفہوم میں جو چھ ماہی کا ہے اور قیاس کی بنا پر وہی مفہوم اس کا متعین ہو سکتا ہے۔ پس اسی سے اندازہ کیجئے کہ محض ذرا سی ناواقفیتِ زبان کی وجہ سے "اکیڈمی کے تماہی رسالہ" کا مفہوم کس قدر مضحک، مہمل (اور شاید "شگون بد" بھی) ہو کر رہ گیا۔

یہی سبب ہے کہ آج ہندوؤں میں بہتر سے بہتر اُردو نظم و نثر لکھنے والا ایسا نہیں ہے جس کی تحریروں میں زبان، محاورہ و لغت کی غلطیاں نہ پائی جائیں چہ جائیکہ منشی دیا نرائن نگم جگت موہن لال صاحب کے ان بے چاروں نے تو کبھی اپنی زباندانی یا قدرتِ انشاء کا دعویٰ بھی نہیں کیا، اور نہ حقیقتاً ان کی زندگی کا کوئی ایسا ادبی کارنامہ موجود ہے جو انھیں کسی تاویل بعید ہی کے بعد کسی اُردو ترجمہ یا تالیف

کا مستحق قرار دے مجھے انتخاب کرنے والی کمیٹی کی جسارت پر اتنی حیرت نہیں ہے جس قدر خود ان حضرات کے "تسلیم و رضا" پر۔ اگر ان کا نام بغیر ان کی خواہش و تمنا کے اس خدمت کے لئے تجویز کیا گیا تھا تو خود ان کو اپنی اہلیت دیکھ کر اس سے انکار کر دینا چاہئے تھا کیونکہ اُردو سے عدم واقفیت کسی نا قابلیت کا اظہار تو ہے نہیں کہ اس کو گوارا نہ کیا جا سکے، اور اگر ہو تو بھی کیا ایسی نا قابلیت باعثِ فخر نہیں جس میں لارڈ اِروِن، وزیر ہند بلکہ خود ملک معظم برابر کے شریک ہیں۔ رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ گالسوردی کے ڈرامہ (Skingame) کا اُردو ترجمہ جو منشی جگت موہن لال صاحب نے کیا ہے شائع ہو گیا ہے لیکن اس وقت تک غالباً ریویو کے لئے کہیں نہیں بھیجا گیا۔ اگر کسی وقت مل گیا تو میں زیادہ تفصیل کے ساتھ اس مسئلہ پر روشنی ڈال سکوں گا۔

رپورٹ زیر بحث سے معلوم ہوتا ہے کہ اکیڈمی نے حسبِ ذیل علم و فنون کی تصانیف کا بھی اہتمام کیا ہے۔

(۱) فلکیات (ASTRONOMY) (۲) جغرافیہ طبعی (PHYSICAL GEOGRAPHY)
(۳) ارتقاء (EVOLUTION) (۴) برقیات (ELECTRICITY)
(۵) اجتماعیات (SOCIALOGY) (۶) انکشافات علمیہ (MODERN SCIENTIFIC DISCOVERIES)
(۷) فلاحت البناتین (HORTICULTURE) (۸) حیات اجتماعیہ حیوانیہ (SOCIAL LIFE IN ANIMALS)
(۹) ماکولات (FOOD) (۱۰) اجمالیات حکمیہ (OF SCIENCE)
(۱۱) فلاحت (AGRICULTURE)

ان گیارہ علوم میں سے صرف چار (۵، ۶، ۸، ۱۱) پر چار کتابیں اُردو کی تجویز ہوئی ہیں اور سات ہندی کے لئے۔ اس تقسیمِ عدم توازن کے لئے اگر کوئی سبب موجود تھا تو اس کو ظاہر کرنا چاہئے تھا۔ کیا جن علوم پر اردو کتابیں تصنیف نہیں کرائی جا رہی ہیں، وہ اردو میں پہلے سے موجود ہیں۔ اور کیا جن علوم پر ہندی کی تصانیف پیش نظر ہیں وہ ہندی میں پہلے نہیں پائے جاتے تھے؟

اسی کے ساتھ مصنفین کے نام کو چھپایا گیا ہے۔ حالانکہ ضرورت اظہار کی تھی تاکہ ان کی اہلیت کے لحاظ سے ان تصانیف کی اہمیت کا اندازہ ہو سکتا۔ اگر یہ اخفا اتفاقی فروگذاشت نہیں ہے تو اردو کے ارباب علم و فضل کو مطمئن رہنا چاہئے کہ ان میں سے کسی کو ان علوم پر کسی تصنیف مرتب کرنے کی زحمت نہ دی جائے گی۔

علاوہ متذکرہ بالا علوم و فنون کے اور مباحث پر بھی اکیڈمی کے ممبران نے تصانیف مہیا کرنے کا اہتمام کیا ہے اور ان کے لئے جو فہرست مصنفین و مؤلفین کی مرتب ہوئی ہے وہ بھی اکیڈمی کا راز ہے جس کا اظہار رپورٹ میں نہیں کیا گیا۔ حالانکہ اس کا اظہار کم از کم اس خیال سے ضروری تھا کہ لوگ اس کو ضمیر کی عدم جرأت یا اخلاقی کمزوری پر محمول نہ کریں۔

ان مباحث میں سے افراد تاریخ ہند کے سلسلہ میں (تین ہندوؤں کے مقابلہ میں) صرف ایک محمد تغلق مسلمانوں میں قابل ذکر سمجھا گیا۔ اسی طرح لٹریچر میں چار ہندوؤں کے مقابلہ میں صرف دو (غالبؔ و انیسؔ) کو لیا گیا ہے۔ اور ابطال اقوام عالم میں سے صرف ہارون الرشید اور مامون الرشید کو۔ اس کے علاوہ تاریخ و فلسفہ وغیرہ میں کسی جگہ مسلمانوں کی نمائندگی کا خیال نہیں کیا گیا۔

میں حیران ہوں کہ وہ کون سے (Members of the Academy) تھے اور وہ (Other Scholars) کس گوش و ہوش کے تھے جنھوں نے نہ صرف انتخاب علوم بلکہ اُن کے ماتحت انتخاب مباحث میں اس قدر بے اصولی، پریشاں خیالی، غیر موزونی اور محاورۂ عوام میں "بے تکے پن" سے کام لیا۔

۳۰-۱۹۲۹ء میں اکیڈمی نے صرف ایک مسودہ "دیلی کرسان رکمنی ری" اشاعت کے لئے پسند کیا۔ معلوم نہیں اور مخطوطات موصول ہوئے یا نہیں، اگر ہوئے تو کتنے اور کس کس موضوع پر۔ اور ان میں سے صرف رکمنی والے مسودہ کو پسند کرنے کے کیا اسباب تھے؟ ان تمام امور کی طرف سے رپورٹ کے مرتب کرنے والے نے بہت با معنی سکوت اختیار کیا ہے۔

ہندی اُردو لٹریچر کی ترقی کی سالانہ رپورٹ اکیڈمی کے اسکالروں نے کانفرنس میں پڑھی تھی۔ اسی طرح اور مضامین اس موقع پر پڑھے گئے تھے لیکن وہ اب تک شائع نہیں کئے گئے۔ رپورٹ میں ان کی اشاعت کا سرسری وعدہ کرکے ٹال دیا گیا ہے۔ شائع شدہ کتابوں کی تعداد چودہ بتائی گئی ہے۔ سات کے متعلق ظاہر کیا گیا ہے کہ پریس میں ہیں، چھ طباعت کے لئے تیار ظاہر کی گئی ہیں اور آٹھ نظرِ ثانی کی منزل سے گزری ہوئی ہیں لیکن رپورٹ کے مرتب نے نہ انڈکس کی صورت میں نہ اصل رپورٹ میں کہیں ان کتابوں کی فہرست دی اور نہ بعید ترین اشارہ اس امر کی طرف کیا گیا ہے کہ وہ کس زبان و موضوع کی ہیں۔

اسی طرح رپورٹ میں تکمیل کے ساتھ کسی جگہ اس کا ذکر نہیں ہے کہ لیکچر دینے والوں کو کیا رقم دی گئی، انعام پانے والے اور مترجمین کون کون تھے اور کس کو کیا دیا گیا۔ اگر رپورٹ کے تسلسل میں اس کے بیان سے خرابی پیدا ہونے کا اندیشہ تھا تو انڈکس کی صورت میں اس تفصیل کو ظاہر کرنا چاہیے تھا۔ اسی کے ساتھ یہ بھی قابلِ افسوس ہے کہ گزشتہ تین سال کے اندر جو جو لیکچر دئے گئے ان میں سے سوائے بعض کے ابھی تک شائع بھی نہیں ہوئے۔ یا اگر شائع ہوئے تو ان پر اربابِ صحافت کو رائے زنی کا موقع نہیں دیا گیا۔ لائبریری کے متعلق جو روپیہ صرف کیا گیا ہے۔ اس کی تفصیل ہونا چاہیئے کہ اُردو کتابوں پر کس قدر رقم خرچ کی گئی اور ہندی کتابوں پر کتنی؟ اور ۲۸۶۷ ہندی کتابوں کے مقابلہ اردو کی کتابیں کیوں صرف ۱۹۲۶ فراہم ہوسکیں۔

الغرض یہ رپورٹ اپنی ترتیب و تفصیل کے لحاظ سے بہت نامکمل ہے اور باوجود کوشش اخفا کے بعض اُمور میں جو کہیں کہیں "مترشح" ہوگیا ہے تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ "ظرف" کس چیز سے لبریز تھا؟

میں اخیر میں ایک بار پھر عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس وقت ہندوستان جس دَور سے گزر رہا ہے اور جس کی اہمیت سے کوئی تعلیم یافتہ ہندو بے خبر نہیں، صرف رواداری چاہتا ہے، لیکن خیر رواداری تو بہت بڑی چیز ہے، مسلمانوں کو ان کی زندگی کے ان حقوق سے بھی محروم کیا جا رہا ہے جو ان کے عمران و تمدن کے اجزاء ترکیبی ہیں۔

ایک طرف ہندو حضرات سیاسیات و قومیات میں مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملے رہنے کی بھی دعوت دے رہے ہیں۔ "بھارت ماتا" کے حقوق بھی دونوں جماعتوں پر یکساں ثابت کئے جاتے ہیں لیکن جب ان جذبات وطنیت کا تجزیہ کیا جاتا ہے جب اس دعویٰ بلند یا نگ کے بعد اعمال و افعال پر نگاہ ڈالی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب مکر و فریب ہے' خدع و ریا ہے اور ہندو جماعت اب تک مسلمانوں کے وجود، مسلمانوں کی معاشرت، مسلمانوں کی تہذیب، یہاں تک کہ مسلمانوں کی زبان و انشا کو بھی "آریہ ورت" کی "پوتر" فضا میں دیکھنا پسند نہیں کرتی۔

دنیا کو معلوم ہے کہ میں کانگریس کے مقاصد و اغراض کا بہت بڑا حامی ہوں اور میں نے ہمیشہ مسلمانوں کو یہی بتایا کہ اگر ہندوستان میں رہنا ہے تو ابنائے وطن کے ساتھ وطنیت کے رشتہ کو مستحکم کرو اور مذہب کو بالکل علیٰحدہ رکھو۔ کیونکہ ایک ایسے ملک کی ترقی جس میں مذاہب کے لحاظ سے مختلف جماعتیں پائی جائیں، غرض مشترک اور مرکزیت صرف وطنیت کے جذبہ سے پیدا ہوسکتی ہے لیکن اسی دوران میں، اسی زمانۂ ہیجان و اشتداد میں جبکہ مسلم افراد بھی ہندوؤں کے دوش بدوش جیل میں جا رہے تھے یکساں صبر و تحمل کے ساتھ حکومت کی سختی کو برداشت کر رہے تھے۔ یہیں لکھنؤ سے جہاں ہر ہندو اُردو لکھنے پڑھنے کا عادی ہے کانگریس کے دفتر سے جو لٹریچر شائع ہوتا ہے۔ جو اطلاعات آویزاں کی جاتی ہیں، ان میں غالب حصہ ہندی کا ہوتا ہے اور جو بیج (Badges) تیار کئے جاتے ہیں ان میں ایک لفظ بھی اُردو کا نہیں ہوتا اور ہندی میں بھی جو بھارت درج ہوتی ہے وہ یکسر ثقیل سنسکرت ہوتی ہے۔ کیا اس سے زیادہ ناعاقبت اندیشانہ عصبیت کوئی اور ہوسکتی ہے۔ کیا اس سے زیادہ ناموزوں و نامناسب محل اس جذبۂ نفرت کے اظہار کے لئے کوئی اور ہوسکتا تھا۔ پھر یہ منظر صرف لکھنؤ اور دفتر کانگریس کی ...... محدود نہیں رہتا، بلکہ زبان کے مسئلہ میں گاندھی آشرم اور آنند بھون کے اندر بھی وہی ایک آواز گونجتی ہوئی .... اور الٰہ آباد یونیورسٹی سے لے کر ڈسٹرکٹ بورڈ کے اس ابتدائی اسکول تک جہاں ایک صاحب اقتدار ہندو بھی سانس لے رہا ہے یہی کوشش کام کرتی ہوئی دیکھی جائے گی کہ اُردو تعلیم، اُردو رسم الخط، اُردو

تصانیف سب کو صفحۂ ہستی سے محو کر دیا جائے، ڈاکخانے جائیے تو وہاں کا ہندو کلرک منی آرڈر فارم ہندی زبان ہی کا دے گا اور اگر اردو فارم کی خواہش کی جائے گی تو اس کا جواب یہی دیا جائے گا کہ اردو فارم نہیں ہیں، حالانکہ ایک غیر تقسیم شدہ انبار اُردو فارم کا دیمک کی نذر ہو رہا ہے۔ عدالتوں میں جائیے، دفاتر کی سیر کیجئے، دوکانوں سے معاملہ کیجئے، الغرض ہر جگہ اور زندگی کے ہر شعبہ میں جہاں کہیں کوئی ہندو کی ذات کام کر رہی ہے اردو کے ساتھ بغض و عناد کا جذبہ یکساں طور پر کام کر رہا ہے اور ایک عام نفرت ہندوؤں میں اس کی طرف سے پیدا ہو گئی ہے۔

اس لئے اگر ارباب اکیڈمی، جن میں غالب حصہ ہندوؤں کا ہے، اردو کا حق تلف کرنے میں جسارت سے کام لے رہے ہیں۔ اگر وہ اردو کے تراجم کا کام بھی ہندوؤں سے لینا چاہتے ہیں اس خیال سے کہ وہ زیادہ بہتر طریق پر اردو کو .... کر سکیں گے۔ اگر ہندوؤں کی اشاعت گاہوں سے اردو کی ریڈریں مسخ شدہ صورت میں نکل رہی ہیں تو جائے حیرت نہیں کیونکہ یہ سب اسی ایک مقصد کے تکمیل کے مختلف تدابیر ہیں جس کے ذریعہ سے پھر ہندوستان کے اس دور کو از سر نو زندہ کیا جانے والا ہے جسے عہد آخر میں مرہٹوں نے زندہ کرنا چاہا تھا۔ لیکن بد قسمتی سے "دولت مستعجل" ثابت ہوا۔

کس قدر عجیب و غریب جسارت ہے، کتنی حیرت ناک جرأت ہے کہ ہندوستان کی ایک عام مشترک زبان رائج کرنے کے بہانہ سے اُردو میں تو ہندی و سنسکرت الفاظ داخل کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا جائے۔ ایک اردو رسالہ کو بجائے سہ ماہی کے تماہی لکھنے کے لئے اکیڈمی اپنی پوری قوت صرف کر دے۔ لیکن جس وقت ہندی لٹریچر کا سوال سامنے آئے تو تماہی کے بجائے "تری ماسی پتر کا" ہی کا اختیار کرنا ناگزیر ہو۔ اور الٰہ آباد یونیورسٹی کا وائس چانسلر جب کوئی .... رتہس لکھے تو اکیڈمی اس کو ایک نعمت و برکت سمجھ کر بغیر کسی تنقید و اعتراض کے شائع کرنے پر آمادہ ہو جائے خواہ اس کے ثقیل و نامانوس الفاظ خود ہندو جماعت ہی کے لئے ناقابل فہم معمہ کیوں نہ ہوں۔

یہ کیا تماشہ ہے۔ یہ کس قسم کی آبلہ فریبی ہے۔ یہ کس نوع کی کورانہ ذہنیت ہے۔ اگر ہندوؤں کی عام جماعت اس کو نہیں سمجھ سکتی تو خواص کے پاس اس کا کیا جواب ہے اور خواص کو بھی جانے دیجئے۔ کم از کم اکیڈمی کے ممبران کو تو غور کرنا چاہئے کہ حکومت سے جو رقم اُردو کی ترقی کے لئے ملتی ہے اس کے صرفِ صحیح میں بخل و عصبیت سے کام لینے کا انھیں کیا حق حاصل ہے؟

آخر یہ کیسی دستبرد ہے۔ یہ کس طرح کی قزاقی ہے۔ یہ کس نوع کا دماغی افلاس ہے جو ایسی رکیک و سخیف .... ذلیل حرکات پر ہندوؤں کو آمادہ کئے ہوئے ہے۔ اگر مسلمانوں یا بہی خواہان اردو نے اس طرف توجہ نہ کی اور .... سے کام نہ لیا تو یہ طوفان کسی طرح نہیں رک سکتا اور وہ وقت دور نہیں جب مسلمانوں کو پورے حقوق ہمسائیگی دینے کے اسباب میں ایک قوی سبب یہ بھی بتایا جائے گا کہ ان کی زبان میں اُردو فارسی کے الفاظ شامل ہیں۔ ان کا سواد و خط غیر ملکی ہے اور ان کی تحریر بجائے بائیں طرف کے داہنی طرف سے شروع کی جاتی ہے جس کو ہندو قوم کسی طرح برداشت نہیں کر سکتی۔

مجھے معلوم ہے کہ ہندو جماعت اس اظہار خیال پر بہت برہم ہوگی اور مجھے خود تکلیف ہے کہ میں کیوں ایسا لکھنے پر مجبور ہوا لیکن اس باب میں اپنی طرف سے میں ایک عذر پیش کر سکتا ہوں کہ

از نالہ ام مرنج کہ آخر شدست کار
شمع خموشم و ز سرم دود میرود

آخر میں نہایت ادب کے ساتھ میں اکیڈمی کے ارباب کار کو توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ وہ اُردو زبان .... اس کے ناقص و ثقیل ہونے پر حکم نہ لگائیں کیونکہ "جہل" کو علم کے مسئلہ پر بالکل "غیر ہندو" ہو کر نگاہ ڈالیں اور اگر ان کو اُردو سمجھنے میں کسی قسم کی زحمت ہوتی ہے تو جانچنے کا معیار کرنا قرینِ انصاف نہیں۔ اسی سلسلہ میں مجھے ایڈیٹران رسالہ کی جماعت میں پروفیسر مسعود حسن صاحب رضوی سے یہ دریافت کرنا ہے کہ انھوں نے اس عقدہ دشوار کے لئے "مشکل کشائی" کی کیا تدبیر سوچی ہے یا وہ بھی اپنے دوسرے شریک ادارت پروفیسر...... کی طرح (جن کی طرف سے تسمیۂ رسالہ کے سلسلہ

میں تمام ہی تجویز پیش ہوئی تھی) اُسی لاتحزن ان اللہ معنا پسند کرتے ہیں۔

میں یہاں تک لکھ چکا تھا کہ اکیڈمی کے مجلس عاملہ کی دو نشستوں (۲۰ اگست ۱۹۳۰ء اور ۴ استمبر ۱۹۳۰ء) کی رپورٹ مجھے ملی اور اس کے ملاحظہ کے بعد میں نے محسوس کیا کہ یہ بھی ایک مستقل گفتگو کی محتاج ہیں لیکن چونکہ نہ اس ماہ کے ملاحظات میں اب گنجائش باقی ہے نہ رسالہ میں کوئی اور جگہ، اسلئے اس افسانہ کا دوسرا ٹکڑا ماہ آئندہ پر ملتوی کرتا ہوں۔

زمانہ دسمبر ۱۹۳۰ء　　صفحہ نمبر ۳۷۰ تا ۳۷۴　　علمی خبریں اور متفرق نوٹ

۱۹۲۷ء میں ہمارے دوست مسٹر نیاز فتحپوری بھی اکیڈمی کے ممبر نامزد ہوئے تھے مگر معلوم ہوتا ہے کہ جو کوشش آپ نے پہلی دفعہ کی تھی اُس کا یا تو اس دفعہ آپ کو موقع ہی نہیں ملا یا اگر موقع ملا تو اس سال ان کی کوشش کارگر نہیں ہوئی۔ بہر حال سرکاری حیثیت سے جون ۱۹۳۰ء میں اکیڈمی کی جو از سر نو ترتیب ہوئی اس میں گورنمنٹ نے آپ کا نام نامی نظر انداز کر دیا ہے۔ نیاز صاحب نے تو خیر تین سال کے دوران میں نہ اکیڈمی کی کوئی خدمت انجام دی اور نہ ملک ہی کی کوئی خاص ادبی خدمت کر سکے۔ ہاں اس اثنا میں آپ نے "جن" نامی ایک رسالہ ضرور جاری فرمایا ہے لیکن اس کو کسی تاویل بعید کے بعد بھی کوئی ادبی کارنامہ نہیں قرار دیا جا سکتا ہے۔ مگر مولانا عبدالماجد صاحب دریا آبادی، مولوی نورالحسن صاحب نیر، حضرت صفی، منشی پریم چند، مرزا محمد عسکری اور سید شاہ سلیمان صاحب ندوی کی عدم شمولیت کا ہم کو ضرور افسوس ہے۔ ان میں سے دو اصحاب کو ممبران اکیڈمی نے بہ اختیار خود ممبر منتخب کر لیا ہے۔ ایڈیٹر زمانہ کو بھی جن کی مسلسل کوششوں کی بدولت سر ولیم میرس گورنر صوبہ کے عہد حکومت میں ہندوستانی اکیڈمی قائم ہوئی تھی موجودہ وزیر تعلیم نے نامزد نہیں فرمایا تھا مگر اکیڈمی کے متعلق ان کی خدمات سے متاثر ہو کر آنریبل جسٹس سر شاہ سلیمان صاحب و خان بہادر حافظ ہدایت حسین صاحب کی تحریک و تجویز خاص سے اکیڈمی نے ان کو نہ صرف جنرل کونسل بلکہ کمیٹی انتظامیہ کا بھی ممبر منتخب کر لیا۔ بہر حال انتخاب اراکین میں وزراء کی تبدیلیوں کے ساتھ ردوبدل ہوتا ہی رہے گا۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جس کی وجہ سے اکیڈمی موردِ الزام قرار دی جا سکے لیکن مسٹر نیاز نے اس نقصان کو جو ان کی عدم شمولیت سے اکیڈمی کو پہنچا ہے بہت زیادہ محسوس فرمایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ساڑھے تین سال کے خواب غفلت کے بعد اب آپ اکیڈمی کے کام کا جائزہ لینے پر مستعد ہوئے ہیں۔ پبلک انسٹی ٹیوشنوں کی نکتہ چینی تو خیر ہر اخبار نویس کا فرض ہے اور ہندوستانی اکیڈمی بھی اس سے بالاتر نہیں ہو سکتی ہے لیکن ہر ایماندار معترض کے لئے صحیح معلومات کا بہم پہنچانا لازمی امر ہے۔ نیاز صاحب نے نگار کے نومبر دسمبر کے پرچوں میں ہندوستانی اکیڈمی کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس کے لفظ لفظ سے اصل حالات سے آپ کی عدم واقفیت اور لاعلمی ثابت ہوتی ہے۔ ہم کو خواب میں بھی خیال نہیں ہو سکتا تھا کہ کوئی سمجھدار شخص جو تقریباً ۳½ سال تک کسی جماعت کا رکن رہ چکا ہو اس کے طرز عمل اور کارگزاریوں سے اس درجہ لاعلم رہ سکتا ہے کہ اس عرصہ میں نیاز صاحب اکیڈمی کے تمام جلسوں میں صرف سرکار کا مقرر کردہ سفر خرچ وصول کرنے کی غرض سے شرکت کرتے رہے اور ممبری کے زمانے میں اس ادبی جماعت کی علمی تجاویز و خدمات سے کوئی عملی دلچسپی نہیں لی، ورنہ ممبری سے اخراج اور کام نہ ملنے کی وجہ سے قدرتاً جو غم و غصہ ہونا چاہئے اس کے باوجود نیاز صاحب اس قدر غلط بیانیوں کے مرتکب نہ ہو سکتے۔ آپ کو افسوس ہے کہ بعض انگریزی ڈراموں کے ترجمے منشی دیا نرائن نگم اور چودھری جگت موہن لال صاحب رواں کے کیوں سپرد ہوئے۔ انتہائی سادہ لوحی سے آپ پوچھتے ہیں کہ ان دونوں اصحاب نے خود ہی اس خدمت سے کیوں نہ انکار کر دیا۔ خیر یہ تو آپ کو معلوم نہ ہوگا کہ اکیڈمی کے ایک جلیل القدر مسلم ممبر کی تجویز ہی سے یہ خدمت ان صاحبوں کے سپرد ہوئی ہے۔ اور واقعہ تو یہ ہے کہ چاہے جس شخص کے سپرد انتخاب ہوتا اس کی نظر انٹرنس سے زیادہ انگریزی لیاقت رکھنے والوں ہی کی طرف اٹھتی۔ یقیناً یہ دونوں اصحاب ان ڈراموں کے ترجمے کرنے کی قابلیت رکھتے ہیں۔ تصنیف و تالیف نیاز صاحب کا ذریعہ معاش ہے اور اس حیثیت سے ہم کو ان کے ساتھ پوری ہمدردی ہے لیکن افسوس تو یہ ہے کہ جس قسم کی طرز تحریر کی بنیاد انہوں نے ڈالی ہے اس کی

توصلہ افزائی ہندوستانی اکیڈمی سے ناممکن ہے۔ زبان اور ادب کے متعلق جن اعلیٰ مقاصد کو مدنظر رکھ کر اکیڈمی قائم کی گئی ہے اس کی تفصیل ان یادگار تقریروں میں موجود ہے جو سر ولیم میرس سابق گورنر اور رائے راجیشور بلی صاحب سابق وزیر تعلیمات صوبہ نے اکیڈمی کے افتتاحی جلسے میں جو لکھنؤ میں ۲۷ مارچ ۱۹۲۷ء کو منعقد ہوا تھا ارشاد فرمائی تھیں۔ نیاز صاحب نے اپنی طرز تحریر کو پہلے کی نسبت اب بہت کچھ سنبھال لیا ہے لیکن ابھی اس میں مزید اصلاح کی گنجائش ہے اور جب تک یہ اصلاح مکمل نہ ہو جائے اس وقت تک ان کو اکیڈمی سے کسی کام ملنے کی توقع نہ رکھنا چاہیئے۔ بفضلہ مسلمانوں میں بہت سے اچھے اچھے لکھنے والے موجود ہیں اور ہم کو معلوم ہے کہ اس وقت بھی مسلمان مصنفین کی ایک معقول تعداد اکیڈمی کے لئے مصروفِ کار ہے۔

نیاز صاحب چاہیں گے تو ہم ان اصحاب کی مکمل فہرست بھی شائع کر دیں گے۔ اکیڈمی کی فرمائش پر جرمنی کے ڈرامہ ناتن کا ترجمہ سید نعیم الرحمٰن صاحب نے اردو میں کیا ہے جس کا ہندی ترجمہ مولینا ابو الفضل کے سپرد ہوا ہے۔ اس ذکر سے ہماری مراد صرف یہ دکھلانا ہے کہ اس وقت تک ہندوستانی اکیڈمی میں ہندو مسلمان کا سوال پیدا ہی نہیں ہوا ہے اور نہ اردو ہندی میں کوئی تفریق کی گئی ہے۔ زبان کے متعلق بھی (جیسا کہ سر ولیم میرس نے اپنی افتتاحی تقریر میں اشارہ فرمایا تھا) ہندوستانی اکیڈمی بعض رسمی قیود و پابندیوں کے متعلق جو یا تو اصولی حیثیت سے درست نہیں ہیں یا جن کی وجہ سے اردو ہندی کی مزید ترقی میں رکاوٹ پڑ رہی ہے اہلِ ملک کی رہنمائی کرنا چاہتی ہے۔ فرانس کی اکیڈمی نے اس بارے میں فرنچ زبان کی غیر معمولی خدمات انجام دی ہے۔ ہندوستانی اکیڈمی زبان کو اصولی حیثیت سے زیادہ عام فہم بنانے کی خواہشمند ہے۔ تحریر میں اصولی سادگی کا معیار ملک کے سامنے پیش کرنا چاہتی ہے۔ ہم کو معلوم ہے کہ اس بارے میں بعض مسئلوں کے متعلق زبردست اختلافات رائے کی گنجائش ہے مگر اس کے بغیر دنیا کا کون سا بڑا کام انجام پذیر ہوا ہے اور کوئی علمی انجمن یا ادبی جماعت محض اختلافات رائے کے ڈر سے اپنے فرائض انجام دینے سے باز نہیں رہ سکتی ہے۔ جنوری آئندہ سے اکیڈمی کی طرف سے اردو ہندی کا ایک سہ ماہی علمی رسالہ جاری ہو رہا ہے جس کے لئے ڈاکٹر تارا چند صاحب کی صدارت میں ایک ایڈیٹوریل بورڈ منتخب ہو گیا ہے اور دو قابل ایڈیٹر بھی مقرر ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر صدیقی صاحب ایم اے پی ایچ ڈی صدر شعبۂ عربی و فارسی الٰہ آباد یونیورسٹی کی خاص تحریک پر ایڈیٹوریل بورڈ نے یہ تجویز کیا ہے ہے کہ اس رسالہ کے اردو ہندی دونوں ایڈیشن ایک نام سے موسوم ہوں اور ہندی میں "ترماسِک" (پترکا) میں اردو میں سہ ماہی (رسالہ) کے بجائے دونوں زبانوں میں ایک ہی لفظ "تماہی" پترکا یا رسالہ لکھا جائے۔ ہندی والوں نے پہلے اس تجویز کی سخت مخالفت کی تھی اور اردو کے قائم مقام بھی اس کے موید نہ تھے لیکن آخر میں ڈاکٹر صدیقی صاحب نے بحث و مباحثہ سے سب کو ہموار کیا اور تجویز پاس ہو گئی۔ شروع میں راقم الحروف کو بھی یہ جدت پسند نہ تھی۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کے دلائل کے سامنے گردن تسلیم خم کرنا پڑی۔ اب بھی ہم اس کو بہت بڑی اصلاح نہیں سمجھتے ہیں اور نہ عام رواج یا مروجہ اصول و قواعد کے لحاظ سے اس کی حمایت کر سکتے ہیں۔ لیکن نیاز صاحب نے اس ذرا سی بات پر آسمان سر پر اٹھایا ہے۔ اس سلسلے میں جو بیہودہ ہرزہ سرائی انھوں نے نگار میں کی ہے اس سے ان کی ذہنیت کا ثبوت ملنے کے سوائے اور کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا ہے۔ نیاز صاحب کو بجا یا بیجا اپنی "عربی دانی" پر ناز ہے مگر افسوس آپ عربی زبان کی موجودہ ہندوستانی تحقیق سے مطلق واقف نہیں ہیں۔ ڈاکٹر صدیقی نے ہندوستان میں عربی زبان کی تعلیم سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد کامل سات برس تک جرمنی میں رہ کر عربی کی انتہائی تعلیم حاصل کی ہے۔ آپ عرصہ تک جامعہ عثمانیہ کے پرنسپل اور ڈھاکہ یونیورسٹی کے عربی و فارسی شعبہ کے صدر رہ چکے ہیں اور اب ایک عرصہ سے الٰہ آباد یونیورسٹی کے عربی و فارسی زبان کے پروفیسر اعلیٰ ہیں۔ مسلمانوں کی تعلیمی تحریکات سے آپ کو خاصی دلچسپی ہے۔

علم فائیلالوجی کے آپ ماہر خاص ہیں۔ اور سندیلہ کے رہنے والے ہیں، اس پر اس صوبہ کا کوئی اخبار نویس آپ سے واقف نہ ہو تو "چشمۂ آفتاب را چہ گناہ" مگر یہ ناواقفیت نیاز صاحب کو ڈاکٹر صدیقی کی نیت و لیاقت وغیرہ پر رکیک حملہ کرنے سے باز نہ رکھ سکی۔ اس دیدہ دلیری کے بعد اگر نیاز صاحب نے ہندوؤں پر طرح طرح کے الزامات لگائے ہیں تو کیا عجب ہے آپ کی رائے میں ہندوؤں میں کوئی شخص اردو کا انشا پرداز ہو ہی نہیں سکتا ہے۔ آپ کی رائے میں عربی فارسی کی تھوڑی بہت تعلیم کے بغیر جس پر آپ کو اس قدر ناز ہے کوئی شخص اردو کا

انشا پرداز ہو ہی نہیں سکتا ہے۔ آپ کو نہ صرف پریم چند کے کمالِ فن سے انکار ہے بلکہ آپ کے خیال میں انھوں نے نہایت بے دردی سے اُردو کو ذبح کیا ہے۔ اسکولوں کی ابتدائی درجوں کی جن مشترکہ زبان کی ریڈروں کی بنا پر ان پر یہ الزام لگایا گیا ہے وہ سرکاری قواعد وضوابط کے بموجب ایک مشہور مسلمان ادیب کی شرکت میں تیار ہوئی ہیں۔ مگر نیاز صاحب کو واقعات سے کیا غرض۔ آپ کو تو محض نکتہ چینی کے پردے میں اپنے غم وغصہ کا اظہار مقصود ہے۔ مگر کوئی خوش ہو یا ناخوش۔ واقعہ یہ ہے کہ نیاز صاحب کے تیس برس بعد اُردو ادب میں ان کا نام لینے والا باقی نہ رہے گا اور پریم چند کے افسانے لاکھوں آدمی شوق سے پڑھیں گے۔ اور ان پر وجد کریں گے۔ اُردو پر پریم چند کے دائمی احسانات ہیں۔

نیاز صاحب نے اردو میں غیر معروف عربی الفاظ اور ترکیبوں کے استعمال کے جواز میں جو کچھ ارشاد کیا ہے اس کے متعلق ہم عصر سرفراز لکھنوی کا نوٹ نقل کرنے کے لائق ہے۔ ہمارا معزز ہمعصر بالکل صحیح لکھتا ہے کہ

> " یہ تو صحیح ہے کہ علمی تنقیدی اور فلسفیانہ مضامین کی زبان افسانوں اور ناولوں سے زیادہ مشکل ہوگی لیکن اس سے " نگاری" اسکول کی یہ روش کسی طور سے حق بجانب نہیں ثابت ہوسکتی کہ خواہ مخواہ عربی کے موٹے موٹے الفاظ اور ترکیبیں تحریروں میں ٹھونسی جارہی ہیں جن سے اُردو کی عام روانی میں فرق آرہا ہے۔ نیاز صاحب کا اگر یہ خیال ہے کہ عربی لغت کے ان موٹے موٹے پتھروں کے ڈھلکانے سے پڑھنے والوں پر علمی رعب طاری ہوجائے گا تو یہ انھیں محض مغالطہ ہے۔ وہ اپنے طرز نگارش کے ایک واضح عیب پر اس عنوان سے پردہ ڈالنا چاہتے ہیں۔ اردو کے خدمت گذاروں کو درمیانی راستہ اختیار کرنا چاہیئے یہی اعتدال روش قرین ثواب ہے۔"

یہ بھی عجیب لطف کی بات ہے کہ ایک طرف نیاز صاحب جیسے تنگدل حضرات ہندوؤں میں اردو انشاپردازوں کے وجود ہی سے انکار کر رہے ہیں۔ دوسری طرف ہمارے ایک معزز نامہ نگار اس بات کی شکایت کرتے ہیں کہ 'زمانہ' بابت ماہ اکتوبر ۱۹۳۰ء میں مسٹر گنگا پرشاد ورما بی۔ اے کا جو مضمون .... صفحہ ۲۴۷ بعنوان "اُردو زبان کی ترقی میں ہندوؤں کا حصہ" شائع ہوا ہے اس میں پنجاب اور دوسرے صوبوں کے اکثر نامور ہندو شعراء اور نثر نگاروں کا ذکر نہیں کیا گیا۔ ہم اس شکایت کے جواب میں صرف اسی قدر کہہ سکتے ہیں کہ مضمون نگار صاحب کو بھی اس مضمون کے جامع ومکمل ہونے کا دعویٰ نہیں ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے مضمون میں خود لکھا ہے کہ

> " اگر ہندو اہلِ قلم اور ان کی تصانیف کا ذکر کیا جائے تو یہ مختصر مضمون ایک کتاب کی صورت اختیار کرلے۔ لہٰذا مثال کے طور پر چند بزرگوں کے نام اور ان کی تصانیف کا ذکر کرنا کافی ہوگا۔"

زمانہ دسمبر ۱۹۳۰ء صفحہ ۳۸۱ سے ۳۸۳ مباحثہ

(۲) اُردو میں فرعونیت

(از : منشی پریم چند)

مسٹر نیاز فتحپوری اردو کے ایک سربرآوردہ اخبار نویس ہیں یعنی ان میں اشتعال انگیز تحریر کا خداداد ملکہ ہے اور

ادعا، قوم پروری کے باوجود انتہا درجہ کے فرقہ وارانہ جذبات اور خیالات کے اظہار کی حیرت انگیز جرأت۔ جس فرد میں یہ دونوں ارکان مجتمع ہوجائیں اس کے کامیاب اخبار نویس ہونے میں شبہ کی گنجائش نہیں۔ اِدھر سرکار بھی خوش۔ خریدار بھی خوش اور ارباب نظر کا دائرۂ انگشت بدنداں۔ جمد ومدِ اُردو دنیا میں ایک طرزِ تحریر کی ایجاد کی جسے ژولیدہ نگاری کہہ سکتے ہیں اور شروع میں "رقاصہ" اور "مغنیہ" اور "کیوپڈ" اور اسی ذیل کے دیگر مجتہدانہ مضامین پر خامہ فرسائی فرماتے رہے۔ آپ آج کل انسائیکلوپیڈیا یا دیگر رسائل سے علمی مضامین کا بلا حوالہ ترجمہ کرتے ہیں اور اس اعتبار سے ان کا شمار علماء میں کیا جا سکتا ہے۔ آپ رسوم کے بُت شکن ہیں اور طبقہ علماء میں اصلاح کے زبردست مؤید۔ وقتاً فوقتاً آپ اپنی آزاد خیالی کے اظہار کے لئے مذہبی حقائق اور اخلاقی مسائل پر چوٹیں کیا کرتے ہیں جس سے مجلسِ احباب میں اچھی چہل پہل ہو جایا کرتی ہے۔ غالباً اسی وجہ سے کوئی آپ کے اعتراضات کا جواب دینے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ آپ گزشتہ تین سالوں تک ہندوستانی اکیڈمی کے ایک ممتاز رکن رہے مگر نئے انتخاب میں کسی وجہ سے نہ آسکے۔ یہ تو اُن کے اکیڈمی پر برہم ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ خدا کے فضل سے آپ اتنے تنگ دل نہیں ہیں مگر شاید آپ کی عدم موجودگی میں اکیڈمی نے سراسر بے ضابطگیاں اور فرقہ پرستیاں شروع کر دی ہیں۔ اور اس لئے آپ کا آزاد قلم اِدھر دو تین ماہ سے اکیڈمی کا بخیہ ادھیڑنے میں مصروفِ کار ہے۔ ہندوستانی اکیڈمی کا وجود اُردو ہندی ہر دو زبانوں کی تقویت و ترقی کے لئے عمل میں آیا اور دونوں ہی زبانوں کے کچھ ممتاز اصحاب اِس کے رکن بنائے گئے۔ ہندی شعبہ میں کسی مسلمان اہلِ قلم کو نامزد نہیں کیا گیا کیونکہ اس صوبہ میں کوئی مسلمان ہندی نویس نہیں ہے۔ اُردو شعبہ میں دو ایک ہندو بھی نامزد کر دیئے گئے۔ اس لئے کہ حضرت نیازؔ چاہے ان کے وجود سے مُنکر ہوں پر اُردو میں ہندوؤں کی ایک معقول تعداد ہے۔ اکیڈمی چونکہ ایک ادبی جماعت ہے جہاں اُس نے نظریات، تاریخ، اقتصادیات، معاشیات کی طرف توجہ کی وہاں ادبیات کو بھی نظر انداز نہیں کیا اور انگریزی کے ایک مشہور و معروف ڈرامہ نویس کے چند ڈراموں کو ہر دو زبانوں میں شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہندی ترجمہ کی خدمت میرے سپرد ہوئی۔ اردو ترجمہ منشی دیا نرائن نگم صاحب ایڈیٹر زمانہ اور منشی جگت موہن لال صاحب رواںؔ کے سپرد کیا گیا۔ حضرت نیازؔ اس وقت اکیڈمی کے رکن تھے مگر تب انھوں نے ان تجاویز کے خلاف زبان کھولنا آئینِ مصلحت کے خلاف سمجھا۔ اب آپ کا یہ اعتراض ہے کہ انگریزی ڈراموں کا ترجمہ کیوں کیا گیا اور کیا اس کے لئے مسلمان اہلِ قلم نہ مل سکتے تھے آپ کے خیال میں کوئی ہندو اردو لکھ ہی نہیں سکتا چاہے وہ مدّت العمر مشقِ سخن کرتا رہے۔ اور مُسلمان خلقی طور پر اُردو لکھنا جانتا ہے یعنی اردو نویسی کا کمال وہ ماں کے پیٹ سے لے کر آتا ہے۔ یہ دعویٰ اتنا لغو، لچر، مہمل اور حماقت آمیز ہے کہ اس کے جواب کی ضرورت نہیں۔ میں تو اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ جس زبان کے ادیب اتنے کوتاہ نظر اور خود بیں ہوں اس کا خدا ہی حافظ۔ مسلمانوں پر یہ عام اعتراض ہے کہ انھوں نے ہندو شعراء اور مصنفین کا کبھی اعتراف نہیں کیا۔ حتیٰ کہ نسیمؔ، سرشارؔ بھی اردو کے دائرہ کمال سے خارج کر دیئے گئے۔ مگر ایسی دریدہ دہنی کی جرأت آج تک کسی نے نہ کی تھی۔ اس کا طرۂ امتیاز مسٹر نیازؔ کے سر ہے۔ میں یہ ماننے کو تیار ہوں کہ اُردو زبان پر مقابلۃً مسلمانوں کے احسانات زیادہ ہیں لیکن یہ نہیں تسلیم کر سکتا کہ ہندوؤں نے اردو میں کچھ کیا ہی نہیں۔ آج کروڑوں ہندو اُردو پڑھتے ہیں۔ لاکھوں لکھتے ہیں۔ ہزاروں اسی زبان میں اظہارِ خیال کرتے ہیں خواہ نظم میں یا نثر میں اور اردو کی ہستی ہندوؤں کی اعانت سے قائم ہے۔ پنجاب کے مسلمان پنجابی لکھتے اور بولتے ہیں۔ بنگال کے مسلمان بنگالی، سندھ کے سندھی، گجرات کے گجراتی، مدراس کے تامل۔ اردو بولنے والے ہندو یا مسلمان زیادہ تر اس صوبہ میں ہیں، کچھ پنجاب اور حیدر آباد میں، اگر اس امر کی تحقیق کا کوئی صحیح طریقہ ہو کہ کتنے ہندو اردو بولتے ہیں اور کتنے مسلمان تو میرے خیال میں دونوں کی تعداد میں بہت زیادہ فرق نہ نظر آئے گا۔

یہ دوسری بات ہے کہ حضرت نیازؔ ہندوؤں کی اُردو کو اُردو ہی نہ کہیں۔ اسی طرح ہندو بھی مسلمانوں کی اردو کو اردو نہ سمجھے تو وہ موردِ الزام نہیں ہو سکتا۔ اگر مسلمان اردو میں عربی اور فارسی لغت ٹھونس ٹھونس کر اسے اسلامی رنگ دینا چاہتا ہے تو ہندو بھی اس میں ہندی اور بھاشا کے الفاظ داخل کر کے اُسے ہندو رنگ دینے کا متمنی ہو سکتا ہے۔ اردو نہ مسلمان کی میراث ہے نہ ہندوؤں کی۔ اس کے لکھنے اور پڑھنے کا حق دونوں کو حاصل ہے۔ ہندوؤں کا اس پر حق اَولیٰ ہے کیونکہ وہ ہندی کی ایک شاخ ہے۔ ہندی آب و گل سے اس کی تخلیق ہوئی ہے اور محض چند عربی اور فارسی الفاظ کے داخل کر دینے سے اس کی ہیئت نہیں تبدیل ہو سکتی۔ حضرت نیازؔ چاہے کتنی ہی آنکھیں پیلی کریں مگر ہندو

اردو پر استحقاق سے دست بردار نہیں ہوسکتا اور نہ وہ اُسے اپنے ڈھنگ پر لکھنے ہی سے باز آسکتا ہے۔ اُسی طرح جیسے مسلمان اُسے اپنے ڈھنگ پر لکھنے سے باز نہیں آتے۔ حضرت نیاز کہہ سکتے ہیں ہندو اُردو کا خون کر رہے ہیں۔ اُسی طرح ہندو بھی کہہ سکتا ہے مسلمان اُردو کے گلے پر کُند چھری پھیرے ہیں۔ بٹوارہ اس طرح ہوسکتا ہے کہ مسلمان لکھیں مسلمان ناظرین کے لئے ہندو لکھے گا ہندو ناظرین کے لئے، مگر یہ نہیں ہوسکتا کہ ہندو تصنیف و تالیف سے یک قلم کنارہ کش ہوجائیں۔ اور مسلمانوں کی تصنیفات پڑھ کر تشفی کرلیں۔ وہ اس ثانوی درجہ کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اور ہر وہ تحریک جو اردو زبان کی ترقی کے لئے عمل میں آئے اس میں ہندو اپنی حیثیت سے شریک ہونے کا حق رکھتے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ بجز حضرت نیاز جیسے کوتاہ نظر اصحاب کے ایسے مسلمان بہت کم ہوں گے جو ہندوؤں کے اس حق سے انکار کرسکیں۔ اکیڈمی کی جس سب کمیٹی پر اردو ترجمہ کے لئے مترجموں کے انتخاب کا بار ہے اس میں کافی تعداد مسلمان صاحبان کی ہے۔ اگر وہ حضرات ہندوؤں کو اس حد تک نالائق نہیں سمجھتے جتنا نیاز صاحب سمجھتے ہیں' اور بعض ہندو اہلِ قلم کی دیرینہ خدمات یا علمی ذوق کا اعتراف انھیں مناسب معلوم ہوتا ہے تو کسی کو شکایت کا موقع نہ ہونا چاہئے۔ مسٹر نگم کی اُردو خدمات سے انکار کرنا ایسی شرمناک ادبی فروگزاشت ہے جو حضرت نیاز سے ہی ممکن ہے۔

کون اندازہ کرسکتا ہے کہ مسٹر نگم نے زمانہ کی اشاعت میں کتنے نقصانات اُٹھائے ہیں۔ اس پر خاندانی جائیداد ہی نہیں قربان کردی بلکہ اپنی زندگی بھی اس کی نذر کردی اور آج ایک تنگ دل اخبار نویس کو یہ کہنے کی جرأت ہوتی ہے کہ اس پچیس سالہ ادبی خدمت کی کوئی حقیقت ہی نہیں۔ حضرت رواں اُردو کے کہنہ مشق شاعر ہیں۔ ان کے کلام کے شاید حضرت نیاز بھی قدرداں ہوں مگر آپ کی قدردانی زیادہ سے زیادہ زبانی اعتراف تک جاسکتی ہے۔ مبلغات کا موقع آتے ہی وہ قدردانی مائل بہ تجنیز ہوجاتی ہے۔ میں حضرت نیاز کو مخلصانہ مشورہ دوں گا کہ وہ اکیڈمی کے ارکان کا انتخاب زبان کی بناء پر نہیں' قومیت کی بناء پر کروائیں۔ اس وقت اگر کوئی ہندو مداخلتِ بیجا کرے تو اس کے پیچھے لٹھ لے کر دوڑیں۔ لیکن جب تک انتخابات زبان کی بناء پر ہیں اور ہندو بھی اُردو لکھتے ہیں اُس وقت تک وہ ہندوؤں کو علمی قدردانی کے دائرہ سے باہر نہیں رکھ سکتے۔ مگر یاد رہے کہ قومیت کی بناء پر حد سے ایک تہائی سے زیادہ رقم اُردو کے ہاتھ نہیں پڑسکتی۔ اس تہائی میں تاریخی اہمیت اور وقار سب کچھ شامل ہے۔ یہاں تو ہندو مصنفین کے ساتھ اس قدردانی کا اظہار کیا جاتا ہے۔ اُدھر ہندوؤں کو ہندی کے مسلمان شعراء کے ساتھ کتنی عقیدت ہے! رحیم اور جائسی وغیرہ شعراء کے کلام کے نئے نئے ایڈیشن ہوتے رہتے ہیں اُسے اتنے شوق سے پڑھا جاتا ہے جیسے سور یا تلسی کا کلام۔ نصابِ تعلیم میں اُسے ہندو شعراء کے صف بہ صف جگہ دی جاتی ہے۔ ہندو یا مسلمان ہونے کا کسی کو خیال ہی نہیں آتا۔ اُردو کے کسی ہندو شاعر کا کلام کسی مسلمان نے مرتب کیا ہو اس کی مجھے کوئی نظیر نہیں ملتی۔ حال میں حضرت اصغر نے یادگارِ نسیم کی ترتیب دی ہے جس کا اُنھیں خمیازہ اُٹھانا پڑ رہا ہے۔ اس ادبی تنگ نظری اور نخوت کی بھی کوئی حد ہے۔

ل۔ احمد ——— نیاز صاحب کی طویل فہرست تصانیف پر نظر ڈالنے سے بسہولت اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان کی ہمہ گیر جودت طبع کس قدر متضاد و موضات علم و ادب پر محیط ہے۔ اردو بولنے اور پڑھنے والی موجودہ نسل کی ذہنی تربیت میں نیاز صاحب کی روشن خیالی اور حریت فکر کو بہت بڑا دخل ہے۔ تقلید پرستی نے اجتماعی فکری صلاحیتوں پر جو جالے پر دے تھے ان کی صفائی میں نگار کی تحریروں نے حیرت انگیز کام کیا ہے۔

علامہ نیاز فتح پوری کی کتاب "جذبات بھاشا"
پر ماہنامہ "زمانہ" نومبر ۱۹۱۶ء میں
ایک نایاب تبصرہ

تبصرہ نگار : جناب سلطان احمد از جہلم

بازیافت . مانک ٹالا

E-10, Cenced Apartments,

Pali Hill, Khar,

BOMBAY - 400 052

بہت کم قارئین کو معلوم ہو گا کہ علامہ موصوف نے ۱۹۱۵-۱۶ء میں ایک کتاب تصنیف فرمائی تھی، جس کا نام تھا "جذبات بھاشا" - یہ کتاب دائرۃ الادب، دہلی کے اہتمام میں شائع ہوئی تھی - انتہائی کوششوں کے باوجود مجھے اس کتاب پر دسترس حاصل نہ ہو سکی - تاہم جہلم شہر (حال پاکستان) کے جناب سلطان احمد صاحب نے ماہنامہ "زمانہ" کانپور کے نومبر ۱۹۱۶ء کے شمارے میں اس کتاب پر ایک سیر حاصل تبصرہ شائع کرایا تھا - یہ تبصرہ بھی نایاب تھا - میں نے اسے "زمانہ" کے فائل سے حاصل کیا تھا - اور اب قارئین کی نذر کر رہا ہوں -

علامہ موصوف بھاشا کی شاعری کے بہت بڑے مداح تھے اور غالباً اس صدی کے تیسرے یا چوتھے دہے میں بھاشا کی شاعری اور ادب پر اپنے ماہنامہ "نگار" کا ایک شمارہ وقف کر دیا تھا - اس خاص نمبر پر "نگار" کے مختلف شماروں میں اعلانات تو نظر آئے لیکن یہ شمارہ دستیاب نہ ہو سکا -

تبصرہ نگار اگر اپنے تبصرے میں علامہ نیاز کے پیش کردہ شاعری کے چند نمونے بھی پیش کر دیتے تو اس تبصرے کی افادیت میں اضافہ ہو جاتا -

(مانک ٹالا)

زبان بھاشا

بحوالہ زمانہ نومبر 1916ء

ص 223

دل بہ یاد تو گلے شد ہم نوائے عندلیب
خوش رفیقے گشت پیدا از برائے عندلیب

ہر شخص زبان رکھتا ہے اور سوائے اس کے کہ کوئی گنگ ہو ہر شخص بولتا ہے لیکن ہر شخص کی زبان بولنے اور گفتگو میں یکساں کیفیت نہیں رکھتی - بعض لوگ بولنے میں شیریں گفتار اور شیریں سخن ہوتے ہیں بولنے میں گویا پھول جھڑ رہے ہیں - ایک معمولی بات بھی وہ لذت اور وہ شیرینی رکھتی ہے کہ سننے والے حلاوت طلاقت سے متاثر نہیں ہوتے ہیں بلکہ متعجب ہوتے ہیں، قدرت نے زبان میں کیسی حلاوت اور کیسا اثر دیا ہے لیکن خلاف اس کے بعض لوگ بولتے ہیں - ایسے درشت ہوتے ہیں کہ سننے والے طوعاً کرہاً بات سنتے ہیں تاثر کا تو ذکر ہی کیا -

ایک شخص مشہور گویہ ایک طرف الاپتا ہے اور دوسری طرف ایک معمولی اناڑی دو چار بول بولتا ہے۔ چونکہ یہ معمولی اور اناڑی قدرتاً خوش گلو رکھتا ہے۔ اس واسطے جو اثر اس کی آواز اور لے کا ہوتا ہے وہ مشہور گویہ کی آواز کا نہیں ہوتا۔ کچھ شک نہیں علم اور فن کے رنگ میں باعتبار نزاکت ہائے موسیقی گویہ کی صدائیں ایک سندی قیمت رکھتی ہیں۔ لیکن طبائع پر جو سکہ ایک خوش گو کی آواز بٹھاتی ہے وہ اس گویہ کی قسمت میں کہاں۔

ایں سعادت بزور بازو نیست

دنیا میں بیسیوں باجے ہیں لیکن بعض باجوں کا اثر جو طبائع پر ہوتا ہے وہ ہر باجہ کے حصے میں نہیں آتا۔ بانسری کی لے جو اثر کرتی ہے اور گداز دل اس سے جس رنگ میں اور جس قدر متاثر ہوتے ہیں وہ کسی اور باجہ کو کہاں حاصل۔ یہی کیفیت زبانوں کی بھی ہے بعض زبانیں دنیا میں باوجود اس بات کے بھی ان میں علمی سامان بہت کچھ ہے شیرینی اور حلاوت میں ایسی شہرت نہیں رکھتیں۔ جو بعض دوسری زبانیں رکھتی ہیں۔ جس طرح طلاقت کی حلاوت ایک خداداد بات ہے اسی طرح زبانوں کی ترکیبی صورتیں اور تلفظانہ کیفیتیں بھی خداوندی ہوتی ہیں۔ یوروپ کی زبانوں میں فرانسیسی زبان مناسبتاً ایک شیریں زبان ہے اور جرمن زبان ایک کرخت زبان۔ عجمی زبانوں میں فارسی زبان ایک شیریں زبان ہے جس طرح طلاقت کی حلاوت ایک قدرتی بات ہے اسی طرح زبان کی حلاوت بھی ایک قدرتی امر ہے۔ زبانوں کی حلاوت اور تاثیرات بلیغہ اگرچہ معمولی بات چیت اور گفتگو میں بھی کھلتے ظاہر و معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن زیادہ تر اظہار اس وقت ہوتا ہے جب خاص تراکیب کے ماتحت ان سے کام لیا جاوے۔ مختلف اور پریشان مضامین جب باندھے جاتے ہیں تو وہ زبانیں جو اپنے اندر شیرینی اور حلاوت نہیں رکھتی ہیں الفائے اظہار حلاوت و اثر سے قاصر رہ جاتی ہیں لیکن وہ زبانیں جو شیرینی رکھتی ہیں مختلف اور پریشان خیالات کی ترتیب اور بندش، فرحت اس خوبصورتی سے ادا کرتی ہیں کہ حسن بیان اور بھی زیبا اور خوش آیند ہو جاتا ہے۔ شاعری اور نظم میں مضامین عالیہ اور مقاصد جمیلہ و پریشان کا باندھنا اگر ایک طرف شاعر کے حسنِ طبع اور جامعیت معلومات وانتخاب نادر کا محتاج ہے تو دوسری طرف خود زبان کی جامعیت بستگی اور ندرت بیان اور وسعت کا بھی خواہاں ہے۔ بے شک شاعر، تاثر کے اپنے حسن بیان کے بھی مضامین میں بہت کچھ محتاج ہوتے ہیں۔ لیکن اصل ضرورت وسعت اور جامعیت نہیں رکھتے۔ نادر سے نادر مضامین ایک جذبے کے ساتھ بیان نہیں کر سکتا۔ زبان ایک طرف ہے۔ اگر ظرف لسان موزوں ظرفیت نہیں رکھتا تو حسنِ مضامین کس طرح اس میں خوبی کے ساتھ آسکتے ہیں اور کس طرح مختلف قسم کے خیالات کے مجموعہ کی اس میں سمائی ہو سکتی ہے۔ نہ صرف گنجائش کی ہی ضرورت ہے بلکہ اس حلاوت اور اس تاثیر اور جذب کی بھی جو ایک دلکش زبان کے عناصر لازمیہ میں بعض زبانیں سمائی بھی رکھتی ہیں لیکن ان میں وہ کشش، وہ جذب، وہ تاثیر، وہ حالات اور وہ خوش آیندگی نہیں ہوتی جو ہونی چاہیے یہ تمام باتیں بعض وقت ایسی عجوبہ اور نادر معلوم ہوتی ہیں، انہیں بالفاظ دیگر قدرتی باتوں اور قدرتی مواد سے تعبیر کرنا زیادہ تر زیبا معلوم دیتا ہے، کہنے والے بھی زبان کے اعتبارات سے ہی کیفیات رکھتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ تاثیرات زبان و جذبات زبان و دلبستگی زبان کا پہلو تفہیم زبان سے بھی ایک حد تک وابستہ ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا جاوے گا کہ اصل جذب اور اصل تاثیر اس زبان میں ہے جو بغیر تفہیم کے بھی، باعتبار اپنے حسنِ تلفظ حسنِ ادا کے کانوں کو پیاری، دل و دماغ کو محبوب اور مرغوب معلوم دے۔ کیا تم دیکھتے نہیں کہ بعض زبانیں قول لب اور مضامین الگ رکھ کر کانوں کو بھلی نہیں سنائی دیتیں۔ اور بعض باوجود نقص مضامین کے بھی دل پر اثر کرتی اور کانوں کو بھی بھلی معلوم ہوتی ہیں ایک طرف پشتو اور ایک طرف ناری بول کر دیکھو کہ دونوں کا سننے والوں پر کیسا اثر ہوتا ہے یہ بات بھی کسی حد تک حلاوت السنہ کے امتیاز کے لیے ایک اچھا معیار ہے گو یہ فیصلہ کن نہ ہو مگر تعبیر رنگ میں اس کی بھی اچھی قیمت ہے۔

بھاشا زبان میں بھی یہ طاقت اور یہ جذب و دلکشی خصوصیت سے موجود ہے کہ اس کی طلاقت ایک خاص حلاوت رکھتی ہے نہ صرف حلاوت ہی بلکہ اس قدر جامعیت بھی کہ ان سے وجدانی ادق مضامین خصوصاً وہ مضامین جو دل و دماغ کے واسطے موثرانہ پیرایہ میں ایک وابستگی اور لزوم رکھتے ہوں ایسے طور پر فلسفیانہ رنگ میں طبائع پر اثر افگن ہو سکتی کہ نوے فی صدی دل و دماغ ہدف اثر ہو کر خود بخود اس کی طرف کھنچ آئیں نہ صرف یہی بات بلکہ یہ بن فرط اثر اور تفوق جذب کی بدولت وہ لذت اور اس دل چسپی اور دلآویزی کا اظہار مشکل سے کر سکتا جو ان کا دل و دماغ رفتہ رفتہ اس حسن بیان اور

حسنِ نظم سے اقتباس کر رہا ہے اور بجائے مہمان کے ان پر خود بخود ایک ایسا عالم محویت طاری ہو رہا ہے جو ایک وجدانی سرور کی ایک زندہ تفسیر اور موثر تصویر ہے اگر آپ بھاشا کے حسن بیان کی منہ بولتی تصویر دیکھنا چاہتے ہیں تو دائرۃالادب دہلی سے ایک جلد کتاب جذبات بھاشا منگوا کر دیکھنی چاہیے۔

یہ کتاب حضرت نیاز فتحپوری کی جذبات علمیہ اور مقتضیات ادبیہ کا ایک قیمتی دلآویز اور زندہ نمونہ ہے حضرت نیاز نے تاثرات بھاشا سے متاثر ہو کر مختلف نمونے بھاشا شاعری کے دے کر یہ ثابت کیا ہے کہ زبان بھاشا میں کس درجہ کا اثر اور کشش ہے اور مختلف مضامین کس خوبصورتی اور کس جامعیت سے بھاشا میں ادا ہو سکتے ہیں۔ ناظرین کو اس کتاب کے پڑھنے سے یہ باتیں ذہن نشین ہو جائیں گی کہ

(الف) بھاشا زبان بلحاظ تاثیرات کیسی زبان ہے۔

(ب) بھاشا میں مختلف مضامین خصوصاً وہ مضامین جن میں عشق و الفت، یاس و امید کا بیان ہوتا ہے کس جامعیت سے سما سکتے ہیں۔

(ج) بھاشا کے الفاظ اور معانی میں کیا کچھ نسبت اور کیسی کشش ہوتی ہے۔

(د) ہندوستان کے فارسی اور اردو شاعروں نے بھاشا سے کیا کچھ حاصل کیا اور کہاں تک ان کی بے توجہی رہی اور اس بے اعتنائی کا اردو علم و ادب پر کیا اثر پڑا۔

(ہ) اس موجودہ کمی کی تلافی کیسے ہو سکتی ہے یا کیسے ہونی چاہیے، ہم اس بات کے معترف ہیں کہ بعض شاعروں اور بعض مسلمان مورخین نے ہندی اور بھاشا کی جانب اپنے مرتے وقت میں توجہ کی اور ان کی ادبی دنیا بھاشا کے جواہرات اور خوبیوں سے مستفید ہوئی لیکن بہ حیثیت مجموعی اردو شاعری اور اردو ادب بھاشا سے محروم ہی رہا۔ اور اب تک محروم ہے اگر ہمارے اور شاعروں کا کافی حصہ اس طرف متوجہ ہوتا تو اس وقت اردو شاعری کے ایک بڑے حصے کی صورت و شکل کچھ اور ہوتی اور ہمیں خوشی سے یہ لکھنے کا موقع ملتا کہ ہمارا اردو علم ادب، اس زبان کی خوبیوں، تلازمات استعارات اور دلآویزیوں سے بھی خالی نہیں رہا۔ جو اس کی محض ایک ہمسایہ زبان ہی نہیں ہے بلکہ ایک ایسی زبان ہے جس کا اردو پر ایک مادرانہ حق بھی ہے جب اردو کی ہندوستان میں داغ بیل پڑی تو اس وقت جہاں فارسی اور عربی سے اردو دوچار ہوئی تو ہندی اور بھاشا کی گود میں بھی اسے آرام حاصل کرنے کا مدتوں موقع ملا۔ اردو کی ڈکشنری ذرا غور سے دیکھو کہ ہندی اور بھاشا کا قبضہ اس میں کس قدر ہے اس قدرتی فیض کے ماتحت جو ہمیشہ ایک جدید زبان کے واسطے ایک ذریعہ اور سہارا دوسری زبانوں سے اختلاط کا ہوتا ہے، اردو زبان بھی جب نکلی تو سب سے اول کا اس کا ساتھ بھاشا سے ہی پڑا۔ اردو زبان کیا ہے۔ بھاشا کا ایک ایسا مجسمہ جس میں فارسی، عربی اور انگریزی کے موزوں ہیرے اور جواہرات جڑے ہوئے ہیں۔ حضرت نیاز نے جذبات بھاشا کے شروع میں جو مقدمہ لکھا ہے وہ ایسا جامع اور دلچسپ ہے کہ اس سے ان ادبی ضروریات اور ان ادبی مقاصد کا پتہ لگ سکتا ہے جو بھاشا سے وابستہ ہیں۔ حضرت خلقی کا مقدمہ یا ریویو بھی باوجود اختصار کے اس قدر دلچسپ ہے کہ ناظرین کے واسطے وہ بجائے خود ایک خاص دلچسپی کا موجب ہو سکتا ہے حضرت نیاز کی جدت طرازی اور نغز بیانی ادبی دنیا کے واسطے ایک ایسی ندرت اور دلآویزی ہے کہ جس کی شان اور علو و حلاوت و جامعیت، جذبات بھاشا سے بالخصوص معلوم ہو سکتی ہے، ہم امید کرتے ہیں کہ ہمارے شعرائے اردو کمالیت خیالات کا دامن پہلے سے بھی زیادہ بھاشا کی خوبیوں اور جواہرات ادبی کے سمٹنے کے لیے پھیلادیں گے۔ اردو ہندوستان کی ایک مشترکہ زبان اور مشترکہ ورثہ لسانی ہے۔ حضرت نیاز کے ادبی فیوض میں سے گیتان جلی کا بھی ترجمہ ہے۔ جس کا مقدمہ اس جامعیت اور اس خوبی سے لکھا گیا ہے کہ ہر مصنف طبع سے خراج تحسین وصول کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ شاعر کی جودت نزاکت حسن بیان جہاں بہت کچھ تعریف کے قابل ہے وہاں حضرت نیاز کا مقدمہ بھی کم تعریف کے قابل نہیں ہے اس مقدمہ ہی سے حضرت نیاز کا حسن بیان حسن استدلال اور حسنِ نظام ادبی معلوم ہو سکتا ہے۔ ناظرین کو چاہیے کہ یہ دونوں کتابیں دائرۃالادب دہلی سے منگوا کر دیکھیں اور حضرت نیاز کے سلائے ادبیہ سے مالا مال ہوں۔

کیفیتے از صومعہ حاصل نہ نمودی
زاہد گزرت جانبِ میخانہ ضرور است

پروفیسر اے۔ بی۔ اشرف

نیاز فتحپوری کی افسانہ نگاری

نیاز فتح پوری کا شمار دورِ اوّل کے ان چند افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے اردو زبان میں مختصر افسانے کو متعارف کرایا اور بڑے تواتر کے ساتھ کہانیاں لکھیں۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی تحقیق کے مطابق انھوں نے اپنا پہلا افسانہ "ایک پارسی دوشیزہ کو دیکھ کر" ۱۹۱۵ء میں لکھا[1]۔ ظاہر ہے اس سے پہلے چند سالوں کے فرق سے صرف مولانا راشد الخیری، سجّاد حیدر یلدرم اور پریم چند کی چند کہانیاں منظرِ عام پر آچکی تھیں[2]۔ ان میں پریم چند اور مولانا راشد الخیری کے یہاں اصلاحی اور معاشرتی حوالے نمایاں ہیں جبکہ سجّاد حیدر یلدرم نے رومانیت کا انداز اپنایا یا علامہ نیاز فتحپوری کے یہاں بھی بحیثیت مجموعی وہی رنگ غالب ہے جو ہمیں یلدرم کے یہاں دکھائی دیتا ہے۔ بلکہ دونوں کے افسانوں میں زندگی کے بارے میں نقطۂ نظر کی مماثلت اور ہم آہنگی بھی نظر آتی ہے۔ دونوں کے افسانے معصوم جذبات سے پُر ہیں۔ دونوں کے یہاں انشائے لطیف کا میلان غالب ہے۔ لیکن یہ بات یہیں تک ختم نہیں ہوتی بلکہ میں نے نیاز صاحب کے افسانوں کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا ہے۔

کہ نیاز فتحپوری کو محض رومانی افسانہ نگار کہنا مناسب نہ ہوگا۔ اُن کے یہاں معاشرتی اور اصلاحی پہلو بھی بہت حد تک نمایاں ہے۔ اُن کے افسانوں میں طنز و مزاح، حقیقت و مثالیت کا امتزاج اور سادہ سیدھا اسلوب بھی موجود ہے۔ جس طرح پریم چند کے یہاں حقیقت میں مثالیت کا رنگ ملتا ہے اُسی طرح سجّاد حیدر یلدرم اور نیاز کے یہاں رومانیت میں حقیقت کا پرتو موجود ہے۔ اب رہا یہ کہ یلدرم کے مقابلے میں نیاز کی افسانوی حیثیت و اہمیت پر کم توجہ دی گئی تو سجاد حیدر یلدرم چونکہ افسانہ نگاری تک محدود رہے اس لئے بطور افسانہ نگار ان کا مقام اردو افسانے کی تاریخ میں متعین کیا جاتا رہا اور ان کی افسانہ نگاری پر بہت کچھ لکھا گیا۔ نیاز فتحپوری کے علمی و ادبی کارناموں کے دیگر پہلو اس قدر غالب آگئے کہ ان کی افسانوی حیثیت زیادہ اجاگر نہ ہو سکی۔ اور ان کے اس ادبی پہلو پر کم توجہ دی گئی۔

میں نے جب اس موضوع کا انتخاب کیا اور اس سلسلے میں مواد کی تلاش اور جستجو شروع کی تو مجھے بڑی مایوسی ہوئی کہ نیاز صاحب کی افسانہ نگاری پر مواد نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہاں تک کہ پنجاب یونیورسٹی اور ریفرنس سیکشن میں بھی، کہ جہاں ہر موضوع پر بھی مقالات موجود ہیں، نیاز صاحب کی افسانہ نگاری کے بارے میں کچھ نہ ملا۔ صرف "نگار" نیاز نمبر[3] میں تین ایسے مضامین شامل ہیں جو اس موضوع پر لکھے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک مضمون تو "شہاب کی سرگذشت" کے بارے میں ہے جو ناولٹ، طویل مختصر افسانہ یا کچھ اور تو کہلا سکتا ہے، مختصر افسانہ ہرگز نہیں، ایک مضمون پروفیسر عبدالقادر سروری کا بعنوان "نیاز کے افسانے کا اسلوب" شامل ہے جو جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، صرف اسلوب سے بحث کرتا ہے۔ جناب سروری کا نام بہت بڑا ہے لیکن ان کا یہ مضمون بہت چھوٹا ہے یعنی صرف ایک صفحے کا ہے جس میں نیاز کے ایک آدھ افسانے کے تین اقتباسات نکال لیں تو صرف دس سطریں باقی بچتی ہیں جو اس قسم کے جملوں پر مشتمل ہیں جو ہمیں پرانے تذکروں میں نظر آتے ہیں۔ مثلاً

"نیاز کے قصوں میں سب سے پہلی شے اسلوب بیان کی عمدگی ہے جو سارے قصّے کو

---

[1] بحوالہ نگار افسانہ نمبر سالنامہ ۱۹۸۱ء ص ۲۷

[2] یلدرم نے ۱۹۰۰ء میں، راشد الخیری نے ۱۹۰۳ میں اور پریم چند نے ۱۹۰۷ء میں اپنی پہلی کہانی لکھی۔ چونکہ یلدرم کی پہلی مطبوعہ کہانی طبع زاد نہیں ترجمہ ہے اس لئے راشد الخیری کو اردو کا پہلا افسانہ نگار کہنا مناسب ہے۔

[3] ملاحظہ فرمائیے نگار نیاز نمبر مارچ اپریل ۱۹۶۳ء شمارہ ۲۰۳ ص ۲۳۴ تا ۲۳۸

> روشن بنا دیتی ہے۔ چست بندشیں، انوکھی ترکیبیں الفاظ کا توازن اور موسیقیت ان کے اسلوب کی امتیاز کن خصوصیات ہیں۔[1]

اب لے دے کر رہ جاتا ہے تیسرا مضمون جو پروفیسر وقار عظیم مرحوم کا تحریر کردہ ہے۔ اس کا عنوان ہے "رومانی افسانہ اور نیاز"[2]۔ یہ سوا دو صفحوں کا مضمون ہے جس کے جملوں میں تعمیم کا رنگ زیادہ ہے اور جو نیاز کے علاوہ اس دور کے ہر رومانی افسانہ نگار کے فن پر منطبق کئے جا سکتے ہیں۔ اقتباسات اور دوسرے افسانہ نگاروں کے ذکر کو چھوڑ کر جو تبصرہ بچ جاتا ہے وہ زیادہ سے زیادہ ایک صفحے کا ہوگا۔ تبصرہ مختصر مگر جامع ہو تو مضائقہ نہیں لیکن اگر ریڈیو اور ٹی وی پر پیش کئے جانے والے تبصروں کی طرح محض سرسری مطالعے پر مشتمل ہو تو پھر وقیع تصوّر نہیں کیا جا سکتا۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے نگار نمبر ۱۹۸۱ء میں نیاز صاحب کے افسانوی مجموعوں اور افسانوں کی تعداد وغیرہ کے بارے میں کچھ بنیادی اور ابتدائی معلومات فراہم کردی ہیں لیکن ان کی افسانہ نگاری کا اس قدر جائزہ بھی نہیں لیا جس قدر انھوں نے حکیم احمد شجاع کے افسانوں کا لیا ہے۔ البتہ رشید نظری اور امیر عارفی نے نیاز پر تحقیقی کام کرکے ہندوستانی یونیورسٹیوں سے پی ایچ ڈی کی ڈگریاں لی ہیں[3] تو حق بھی ادا کیا ہوگا لیکن یہ مقالات ہماری رسائی میں نہیں ہیں اس لئے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ نیاز صاحب کی افسانہ نگاری کے سلسلے میں جو غفلت برتی گئی ہے اس کا ازالہ ہونا ضروری ہے اور اس لئے میں نے یہ موضوع اپنے لئے منتخب کیا۔ نیاز صاحب کے افسانوں سے بے پروائی برتنے کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ ابتدائی اردو افسانے میں نیاز صاحب کو بطور افسانہ نگار وہ مقام نہیں دیا گیا جس کے وہ مستحق تھے دوسرے یہ کہ ان کو محض رومانی افسانہ نگار کہنے پر اکتفا کیا گیا اور ان کے بہت سے ایسے افسانوں کو نظر انداز کر دیا گیا جو مختلف طبقوں اور معاشرتی ناہمواریوں کی حقیقی تصویریں پیش کرتے ہیں۔

نیاز فتحپوری کے افسانوی مجموعوں میں "نقاب اٹھ جانے کے بعد" نگارستان، جمالستان، مختاراتِ نیاز اور حسن کی عیاریاں قابلِ ذکر ہیں۔ "نقاب اٹھ جانے کے بعد" میں صرف تین کہانیاں شامل ہیں۔ اس کا دوسرا ایڈیشن مجھے دستیاب ہوا ہے جو یونائیٹڈ پریس لکھنؤ سے ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا۔ نگارستان پہلی بار ۱۹۴۴ء میں اردو پریس حیدر آباد دکن سے شائع ہوا۔ اس میں چھبیس[26] افسانے اور انشائے لطیف پر مشتمل مضامین شامل ہیں۔ "جمالستان" بھی اسی سال (۱۹۴۴ء) اور اسی پریس سے شائع ہوئی۔ اس مجموعے میں بائیس[22] افسانے اور ادبی مضامین شامل ہیں۔ نیاز کے طبع زاد افسانے زیادہ تر اسی مجموعے میں موجود ہیں۔ مختاراتِ نیاز ۱۹۴۷ء میں پہلی بار ادارۂ فروغِ اردو لاہور نے شائع کیا۔ اس مجموعے میں انیس[19] افسانے شامل ہیں جو سب کے سب دیگر زبانوں سے ماخوذ ہیں۔ پہلے چار مجموعے مجھے غالب کے عاشقِ صادق اور عزیب استاد لطیف الزماں خاں[4] کی نہایت مالدار لائبریری سے دستیاب ہوئے ہیں۔ اس مضمون کی تیاری کے لئے ان چار کتابوں پر اکتفا کرتا ہوں کہ نیاز فتحپوری کی افسانہ نگاری کا مجموعی تاثر ان افسانوں کے مطالعے سے قائم کرنا مشکل نہیں البتہ ریسرچ کے نقطۂ نظر سے اس کام کی تکمیل کی ذمہ داری انوار احمد پر ڈالتا ہوں کہ یہ ان کا منصب ہے اور حق بھی[5]۔

"نقاب اٹھ جانے کے بعد" — میں چند نام نہاد مذہبی شخصیتوں کا اصل روپ دکھایا گیا ہے۔ پہلی کہانی کا عنوان "مولانا وارث علی اور ان کی بیوی" ہے۔ مولانا وارث علی چشتی قادری — فنون ظاہری کے مشہور عالم اور علوم باطنی کے بے مثل ماہر تھے، سر کے شملے سے لے کر پاؤں کے جوتے تک زہد و تقدّس کی تصویر تھے۔ لیکن بیوی کے لئے مانندِ شمشیر تھے۔ ان کی بیوی صغرا نے جو خط اپنی بہن کو لکھا۔ اس میں اس پیر فرتوت کے کرتوت کو جس طرح بے نقاب کیا اور اس کے مظالم کی جو بھیانک تصویر کھینچی وہ بڑی عبرت ناک ہے۔ اسی طرح "خواجہ مسرور شاہ نظامی اور صفیہ" — بھی بڑی دلچسپ لیکن دردانگیز کہانی ہے جس میں خواجہ مسرور شاہ نظامی کے باطنی کردار کو سامنے لایا گیا ہے کہ کس طرح اس نے اپنے ایک مرید کی نیک اور شریف بیٹی کی بے رخی

۱۔ نگار نیاز نمبر ص ۲۳۴۔

۲۔ ملاحظہ فرمائیے نگار نیاز نمبر ص ۲۳۵ تا ۲۳۷۔

۳۔ بحوالہ نگار سالنامہ ۱۹۸۱ ص ۲۸۔

۴۔ جناب لطیف الزماں خاں گورنمنٹ کالج ملتان میں انگریزی کے استاد ہیں۔ "غالبیات" کے موضوع پر ان کے پاس نایاب کتب اور مسوّدات موجود ہیں۔

۵۔ انوار احمد "اردو افسانہ اپنے سیاسی وسماجی تناظر میں" کے عنوان سے ریسرچ کر رہے ہیں۔

اور انکار کا بدلہ اُس کی زندگی تباہ کرکے لیا۔ تیسری کہانی مولوی حکیم صاحب ناظم یتیم خانہ کی بداعمالیوں کی داستان ہے۔ یہ کہانی ہماری سوسائٹی کے حقیقی نقشے پیش کرتی ہیں ان میں نام کے علاوہ سب کچھ سچ ہے۔ یہ کہانیاں ہمارے دور کی بھی زندہ حقیقتیں ہیں۔

تکنک کے لحاظ سے سیدھی سادی بیانیہ کہانیاں ہیں۔ مربوط اور دلچسپ پلاٹ، کردار سامنے کی زندگی کے نہ خیالی نہ مثالی۔ اسلوب سیدھا اور صاف مثلاً

"شہر میں حضرت کے توکل کی دھوم ہے حالانکہ مجھے معلوم ہے کہ یہ حریص کس طرح لوگوں کے حقوق تلف کرکے روپیہ جمع کر رہا ہے۔ اور کن کن ترکیبوں سے دنیا کو فریب میں مبتلا کرتا ہے۔ متوسط طبقے کے لوگوں سے گنڈے تعویز کا نذرانہ، عمل پڑھنے کا خرچ، دُعا کرنے کی شیرینی، چلہ کشی کی نیاز، بزرگوں کا توشہ، ایک ایسا بہانہ ہے کہ اس سے کافی رقم ہاتھ آجاتی ہے[1]"

"یا"

"مسرور شاہ، صاحب دل درویش ہوں یا نہ ہوں لیکن اس میں شک نہیں کہ ان کی آنکھ میں موہن اور زبان میں سحر ضرور تھا، آنکھوں میں آنکھ ڈال کر مسکراتے ہوئے ان کا کسی سے بات کر لینا قیامت تھا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ پتلیوں سے خاص قسم کی ٹھنڈی شعاعیں نکل کر دل و دماغ میں نشہ کی سی کیفیت پیدا کر رہی ہیں۔ اور لبوں کی جنبش سے پیدا ہونے والا ہر لفظ روح کے لئے ایک مخصوص حلاوت ہے۔ صورت کے لحاظ سے بھی بدقسمت نہ تھے اور صاف رنگ پران کی کاکلیں، وسیع پیشانی، بڑی آنکھوں، نمایاں ابروؤں پر بہت بھلی معلوم ہوتی تھیں۔"

(نقاب اٹھ جانے کے بعد ص ۲۶)

اسی طرح

"رنگ سیاہ، خط و خال بھدّے، ناک موٹی، ہونٹ نسبتاً ذرا پتلے، دانت برابر لیکن پان کی سرخی ان پر قائم، بھویں چوڑی اور آنکھیں شوخ و شریر، پاجامہ شرعی، جوتہ ہندوستانی جاڑوں میں سر پر صافہ باندھتے ہیں اور گرمیوں میں کپڑے کی گول ٹوپی جس پر ریشمی یا کلا بتونی کام ہوتا ہے۔ ایک رومال میں یتیم خانہ کی روداد، رسید بک اور اسی طرح کے چند کاغذات لپیٹے ہوئے بغل میں۔ یہ ہے ہمارے ناظم صاحب کا سراپا مع ان تمام اضافیات کے جن سے وہ وہی کام لیتے ہیں جو ایک سپاہی جنگ کے وقت اپنے آلاتِ حرب سے۔"

(نقاب اٹھ جانے کے بعد۔ ص ۵۱)

"نگارستان" میں انشائے لطیف پر مبنی چند مضامین کے علاوہ رومانوی اور معاشرتی دونوں قسم کے افسانے ملتے ہیں۔ رومانوی افسانوں میں "کیوپڈ و سائیکی"، "کہکشاں کا ایک سانحہ" "قربان گاہِ حسن"، "محبت کی دیوی، ایک مصلح بت تراش، رُوح کی فریب کاریاں عالم محبت میں، ستی، شہزادہ خرم اور ابابیل اہم ہیں۔ جبکہ معاشرتی اور اصلاحی کہانیوں میں "وسلے بخیر گذشت"، چند گھنٹے مولوی کے ساتھ، محلہ کی رونق، میر بیدانہ، ٹیلی فون نمبر ۲۰۷ قابل ذکر ہیں۔ کیوپڈ و سائیکی ابدی محبت کا قصہ ہے جس کا تعلق یونانیوں کے علم الاصنام سے ہے لیکن نیاز صاحب نے اس کو اس انداز میں قلم بند کیا ہے کہ طبع زاد معلوم ہوتا ہے۔ خود نیاز کے الفاظ میں "یہ افسانہ ..... اپنی ترتیب، اپنے اندازِ بیان اور اپنے اسلوب کے

---

[1] بحوالہ "مولانا وارث علی اور ان کی بیوی" (نقاب اُٹھ جانے کے بعد) ص ۱۵

لحاظ سے بالکل نئی چیز ہے اور ماخذ و اقتباس سے بالکل پاک[1]؛

کہکشاں کا ساحر — یلدرم کے افسانے "خارستان و گلستان" کی یاد دلاتا ہے۔ اس کا موضوع بھی کم و بیش وہی ہے یعنی حسن کو عشق کی دسترد اور جسمانی ملاپ سے دور رکھنے کی خواہش۔ دراصل نیاز اپنے رومانی افسانوں میں حسن کے حصول اور قربت سے زیادہ اس کی طلب اور جستجو کی طرف مائل دکھائی دیتے ہیں۔ پا نا ان کے نزدیک معراج نہیں پانے کی چاہت ان کا مقصود و منتہا ہے۔ تاکہ عشق کو زوال نہ آئے[2]۔ "قربان گاہ عشق" بابل کی سرزمین کا قصہ ہے جس میں رومان حقیقت کا امتزاج موجود ہے۔ محبت، ایثار، حسد و رشک، نفرت اور انتقام کے انسانی جذبوں سے گندھی ہوئی دلچسپ اور خوبصورت کہانی ہے۔ "محبت کی دیوی" نیم تاریخی نیم رومانی کہانی ہے۔ "روح کی فریب کاریاں عالم محبت میں" شہزادہ خرم اور ارابیل اور نوجوان شہزادہ آسکر وائلڈ سے ماخوذ ہیں۔ "ستی" نیم تاریخی قصہ ہے جس کا موضوع محبت کی قربانی ہے۔ سوشیلا اپنی سہیلی تارا کی زندگی بچانے کی خاطر اپنی محبت کی قربانی دیتی ہے اور اپنے محبوب رنجور سے اس کی شادی کرا دیتی ہے اور خود ستی ہونے والی بیوی کی طرح آگ میں جلتی رہتی ہے۔

معاشرتی موضوعات پر مبنی کہانیوں میں "دلے بخیر گذشت" بڑی دلچسپ کہانی ہے۔ یہ مختصر سے کینوس پر تیار کی گئی ہے۔ محبوبہ کے ساتھ باکس میں فلم دیکھتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑے جانے کے بعد جو "خفت" کسی "شریف" خاوند کو بیوی کے سامنے اٹھانا پڑتی ہے اس کو نہایت لطیف اور مزاحیہ پیرائے میں بیان کیا ہے۔ کہانی کا کلائمکس اس وقت آتا ہے جب یہ کھلتا ہے کہ بیوی کو محبوبہ نے خود ریڈ (RAID) کی دعوت دی ہوئی ہے۔ "چند گھنٹے مولوی کے ساتھ" میں ریل کے ایک سفر کا واقعہ کہانی کی صورت میں لکھا ہے۔ اثنائے سفر ساٹھ سالہ مولوی ایک نوجوان ہندو عورت پر ریشہ خطمی ہو جاتے ہیں لیکن افسانہ نگار اس کی خبر لیتے ہیں تو وہ کفر کا فتویٰ عائد کرنے پر اتر آتا ہے۔ "محلہ کی رونق" ایک بد زبان، بد مزاج اور بد اخلاق بیوہ مہر زمانی بیگم کی کہانی ہے جس نے سارے گھر والوں کو عذاب میں مبتلا کر رکھا ہوتا ہے۔ خاوند کی وفات کے بعد وہ خود رحمی کا شکار ہو جاتی ہے۔ بات بات پر بھڑک اٹھتیں، اولاد، بہو، نوکر چاکر سب کو بے نقط سنانے لگتیں۔ آخر ان کے قلب کی حرکت بند ہو گئی تو سب نے سکھ کا سانس لیا لیکن نیاز صاحب کے خیال میں محلے کی رونق ان کے دم سے تھی۔

"میر بیدانہ" کرداری افسانہ ہے جس میں ایک باتونی انسان سید لطافت حسین کا کردار پیش کیا گیا ہے۔ ادھر گاڑی چھوٹنے کو تھی اور ادھر میر بیدانہ کی بات ختم ہونے میں نہ آتی تھی۔ آخر چلتی گاڑی سوار ہونے کی کوشش میں افسانہ نگار گر کر اپنی ٹانگ تڑوا بیٹھے اور وہ میر صاحب کی یاوہ گوئی سے ایک مستقل عذر لنگ ہو کر رہ گئے۔ "ٹیلیفون نمبر ۶۷۰" مرد کے ہرجائی پن اور عورت کی وفا شعاری کا قصہ ہے۔ مسٹر زیدی یورپ پلٹ ہونے کی وجہ سے مغربی تہذیب کے دلدادہ بیوی کی تلاش میں تھے جو انہیں مس لطیفہ سہروردی کی صورت میں حاصل ہو گئی۔ لیکن دونوں کا جام چار مہینوں میں جاتا رہا۔ اور اب محض تکلفاً تعلقات قائم رکھے ہوئے تھے۔ اسی دوران میں لطیفہ سہروردی کی سہیلی بلقیس ان کے گھر آن ٹپکی اور زیدی کے ساتھ مراسم قائم کرنے لگی۔ اب لطیفہ نے انتقام لینے کی خاطر جھوٹ موٹ کا عاشق بنایا۔ اس سے اپنے نام خط لکھوائے اور ۶۷۰ فون نمبر پر میٹھی میٹھی باتیں شروع کیں۔ یہ نمبر دراصل زنانہ سکول کا تھا۔ انکشافِ حال پر زیدی کی خفت کا یہ عالم تھا کہ "اس نے کچھ دنوں لطیفہ کو اپنی صورت تک نہ دکھائی اور جب کبھی انتہائی لطف کی حالت میں لطیفہ اس کو چھیڑنے کے لئے ٹیلی فون نمبر ۶۷۰ کا نام لے دیتی تو وہ جھینپ کر رہ جاتا"[3]

"نگارستان" کے رومانی افسانوں میں جا بجا عورت، حسن، محبت، موسیقی، مناظرِ فطرت اور تخلیق کے بارے میں بڑے شاعرانہ انداز میں اظہارِ خیال ملتا ہے کہ عورت کے بارے میں یہ جملے دیکھئے:

---

[1] تمہید۔ کیوپڈ و سائیکی (نگارستان)، طبع اوّل ۱۹۴۴ء ص۱۵

[2] غالب نے اس کے بالکل برعکس نظریہ پیش کیا ہے ؎

گر تیرے دل میں ہو خیال وصل میں شوق کا زوال

موجِ محیطِ آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں

[3] نگارستان ص۳۲۲

"اے عورت! تو فرشتوں اور حوروں کی نگاہ میں خواہ کچھ ہو، لیکن ہمیں تو تیری فطرت و خلقت پرستش پر مجبور کر رہی ہے۔ آہ! تجھے اپنی آفرینش کا حال معلوم نہیں۔ مگر ہم جانتے ہیں تیرے خمیر میں کتنی خوشبوئیں کتنی رنگینیاں، کتنی نزاکتیں شامل ہیں"

(کیوپڈ و سائیکی۔ نگارستان ص۱۴۱)

محبت کے بارے میں خیالات ہیں تو وکٹر ہیوگو سے ماخوذ لیکن نیاز صاحب نے اپنے اسلوب کے حسن سے انھیں اور جنبل رنگ دے دیا ہے۔

"تم اگر اذیت میں ہو اس لئے کہ تم محبت کرتے ہو تو اور زیادہ محبت کرو کیوں کہ محبت میں مر جانا، محبت کے ساتھ زندہ رہنا ہے۔"

مناظر فطرت میں پناہ ڈھونڈنے کا جذبہ خالصتاً رومانی رویہ ہے جو یلدرم کے یہاں بھی ملتا ہے۔ اور نیاز صاحب کے یہاں بھی۔ لکھتے ہیں۔

"حیات نام ہے صرف ان تاثرات کا جو مناظر فطرت کی اچھوتی فضا میں پیدا ہوں اور اسی میں تحلیل ہو جایا کریں"

(برسات۔ نگارستان ص۸۹)

سجاد حیدر یلدرم کے افسانے "اگر میں صحرا نشیں ہوتا" کی صدائے بازگشت نیاز کے "ایک قافلۂ صحرا کو دیکھ کر" میں سنائی دیتی ہے۔ دونوں کے یہاں ہنگامہ پرور دنیا سے فرار اور صحرا میں پناہ لینے کی تمنا مشترک ہے۔

"تو اے فرزندانِ صحرا! تم مجھے بھی اپنے ساتھ مل کر رہنے کی اجازت دو گے۔ کیا مجھے اس لڑکی سے جو اپنی شیام جوانی لئے ہوئے بڑی بڑی وحشی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی ہے۔ دو باتیں کرنے کی فرصت دو گے۔"

(ایک قافلۂ صحرا کو دیکھ کر۔ نگارستان ص۱۳)

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے "مختاراتِ نیاز" میں شامل کم و بیش تمام افسانے دیگر زبانوں سے ماخوذ ہیں۔ عربی سے ماخوذ چند افسانوں کے علاوہ اناتول فرانس، ایڈگر ایلن پو، چیخوف، والٹیر اور دوستوفسکی کی کہانیوں کے تراجم ہیں۔ یہ تمام کے تمام افسانے رسالہ نگار میں ۱۹۲۴ء، ۲۵، ۲۸، ۳۶، ۳۷ اور ۴۵ کے مختلف شماروں میں چھپ چکے تھے۔ افسانہ "فاطمہ" میں بیوی کی وفاداری، عفت، اور پاکیزگی کی کہانی مثالی انداز میں پیش کی گئی ہے۔ "خواب کے بعد بیداری" بھی کم و بیش اسی موضوع پر ہے۔ مغربی طرز زیست کا دلدادہ سعید اپنی بیوی سے الگ ہو کر زندگی بسر کرتا ہے لیکن جب بیماری کا شکار ہوتا ہے تو عیسائی محبوبہ روزا کے علاوہ ہم پیالہ و ہم نوالہ احباب بھی چھوڑ جاتے ہیں اور آخر کو وفاشعار بیوی اس کی خدمت کو پہنچتی ہے اور اسے موت کے منہ سے نکال لیتی ہے۔

"عہد عباسیہ کا دور زرّیں" — ایک دلچسپ کہانی ہے۔ جس میں تاریخی رنگ بھی ہے اور خوابناک فضا بھی۔ اس میں مامون الرشید اور بوران کی شادی کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ "رستم نپولین کا غلام" بھی نیم تاریخی کہانی ہے جس میں نپولین کے مصاحب رستم کے کردار کو رومانی رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔ "بھوتوں کا شہر" فراڈ اور کرائم کی کہانی ہے لیکن اس پر مابعد الطبیعاتی رنگ اس طرح غالب کر دیا گیا ہے کہ افسانہ حقیقت کے بجائے ایک فنتسی (FANTASY) کی صورت اختیار کر لیتا ہے جس میں خواب و خیال کی دنیا ابھرتی دکھائی دیتی ہے۔

"چور فرشتہ" — میں خاوند کی بے وفائی اور میاں بیوی میں بد اعتمادی کی بدولت گھر کی بربادی کا موضوع اختیار کیا گیا ہے۔ "ایک لاسلکی ڈراما" — مکالموں کی صورت میں ہے۔ یہی ڈراما "نگارستان" میں "انتظام علی صاحب" کے عنوان سے کہانی کی صورت میں شامل ہے۔ یہ مزاحیہ رنگ کا افسانہ ہے جس میں شاعری کے شغف پر لطیف انداز میں طنز کی گئی ہے۔ "ہلتا زار" — نفسیاتی عذاب، سیاہ بلی، شرط، ایک فلسفی

کا انجام اور بڑے دن کا درخت اور ایک شادی معروف اور مقبول یورپی افسانہ نگاروں کے افسانوں سے ماخوذ ہیں۔

بحیثیت مجموعی اس مجموعے میں شامل افسانوں کے موضوعات میں تنوع اور تلوّن کی کیفیت پائی جاتی ہے، نیاز صاحب نے بعض افسانوں میں نام نہیں بدلے لیکن بیشتر میں نام بدل کر انہیں خالصتاً مقامی رنگ دے دیا ہے۔ اسلوب سادہ اور سلیس ہے اور نیاز صاحب کے عمومی رنگ سے ہٹ کر ہے کہ نیاز صاحب ایک ایسے اسلوب کے حامل ہیں جو ہر رنگ کے موضوع کو اپنے اندر سمونے کی صلاحیت رکھتا ہے، اس لئے موضوع کے ساتھ ساتھ ان کا اسلوب بھی بدل جاتا ہے۔ خالصتاً رومانوی رنگ کے افسانوں میں ان کا اسلوب رومانوی اور تخیلی ہوتا ہے لیکن جن افسانوں میں اصلاحی اور حقیقی رنگ موجود ہے ان میں اسلوب رومانوی اور تخیلی ہوتا ہے لیکن جن افسانوں میں اصلاحی اور حقیقی رنگ موجود ہے ان میں اسلوب بھی سادہ اور حقیقی اختیار کیا گیا ہے۔ "مختاراتِ نیاز" میں شامل افسانوں کے کچھ اقتباسات درج ذیل ہیں۔ ان کے حوالے سے ان افسانوں کے عمومی اسلوب کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

> "قاہرہ کے ایک بڑے اور آباد محلہ میں ایک مکان ہے جس پر سکون، خاموشی اور وحشت چھائی ہوئی ہے اور جو ایک عرصہ سے ویران ہے۔ محلہ کے پرانے خیال کے لوگ اس ویرانہ کو جنّات و شیاطین کا مسکن سمجھتے ہیں اور اس کے متعلق عجیب و غریب روایات مشہور رہیں گویا اس عہد کی روشن خیال آبادی کے محلہ میں یہ ویرانہ عہدِ قدیم کی توہم پرستی کا ایک ظلمت کدہ ہے۔"[1]
>
> (افسانہ "فاطمہ"، ص ۲۳)
>
> "کئی دن سے موسلا دھار بارش ہو رہی تھی اور میں برآمدہ میں بیٹھا یہ غور کر رہا تھا کہ دیکھئے یہ طوفان کیا رنگ لاتا ہے کہ میں نے ایک آدمی کو سڑک پر سے گزرتے ہوئے دیکھا۔ یہ اس وقت بالکل برہنہ معلوم ہو رہا تھا جب میرے مکان کے پھاٹک کے قریب پہنچا تو اندر کو مڑ گیا۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ وہ برہنہ نہ تھا بلکہ اس نے کپڑے کمر تک اٹھائے ہوئے تھے تاکہ پانی سے خراب نہ ہوں"[2]
>
> (بھوتوں کا شہر ص ۴۲)
>
> "جب رستم پیرس پہنچا تو نپولین کی بیوی جوزفائن اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ رستم کی شکل و صورت اسے بہت پسند آئی اور اس کو خاص اپنی خدمت میں رکھا۔ جوزفائن کے دشمنوں نے یہ خبر اڑائی کہ جوزفائن نے اپنے عشاق کی جماعت میں رستم کو بھی داخل کر لیا ہے۔ نپولین کی غرض رستم کے لانے سے یہ تھی کہ اس کی بیوی اسے دیکھ کر خوش ہو۔ اور پیرس والے بھی اسے مشرقی لباس میں دیکھیں اور اس کے حسن و جمال پر تعجب کریں"[3]
>
> (افسانہ "رستم نپولین کا غلام"، ص ۶۰)
>
> "چونکہ سعید کی فطرت اور تخیل بالکل یورپین واقع ہوئی تھی اس لئے وہ حقیقی معنی میں ہندوستانی معاشرت سے متنفر تھا اور مغربی زندگی کے لئے بیتاب رہا کرتا تھا۔ اس کی گفتگو اس کی نشست و برخاست، اس کا کھانا پینا، اس کا چلنا پھرنا، اس کا ہنسنا بولنا، الغرض اس کی زندگی کا ہر لحہ یورپین تھا۔ وہ سوچتا بھی تھا تو مغربی انداز میں، اور خواب بھی دیکھتا تو بالکل انگریزی وضع کا لیکن بدقسمتی سے اس کی مالی حالت اچھی نہ تھی اس لئے عملاً وہ

---

[1]، [2]، [3]۔ یہ اقتباسات "مختاراتِ نیاز" سے لئے گئے ہیں۔

کسی طرح یورپین نہ بن سکتا تھا۔ اور اس حسرت میں رات دن تڑپا کرتا تھا۔"[1]

(افسانہ "خواب کے بعد بیداری"، ص۳۵)

"رات تاریک تھی اور بلقیس اس کے اندر روشن تارہ کی طرح چمک رہی تھی بلتازار کو ساتھ لئے ہوئے چلی اور ایک شراب خانہ میں پہنچی جہاں بازاری لوگ اور فاحشہ عورتیں نظر آ رہی تھیں۔ یہاں یہ دونوں ایک کونے میں بیٹھ گئے۔ اور دیکھا کہ کہیں کچھ بدمعاش کسی عورت یا شراب کے لئے آپس میں لڑ رہے ہیں اور کہیں بعض لوگ خمار میں فرش پر پڑے ہیں۔ یہاں کی ہوا بہت کثیف تھی اور سخت بُو آ رہی تھی۔"[2]

"میں اپنے بچپن میں اپنی سیدھی سادھی اور عجز پسند طبیعت کے لئے مشہور تھا لیکن اس قدر رحم دل واقع ہوا تھا کہ میرے ساتھی اکثر میرا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ بچپن ہی سے مجھے پالتو جانوروں کا شوق تھا اور میرے والدین نے میرے اس شوق کو پورا کرنے کے لئے میرے واسطے طرح طرح کے جانور پال رکھے تھے میرا زیادہ تر وقت انہیں جانوروں کے ساتھ گذرتا اور انتہائی سکون و مسرت کے ساتھ گزرتا۔ میری عمر کے ساتھ ساتھ میرا یہ شوق بھی بڑھتا رہا۔"[3]

(سیاہ بلی ص۱۲۴)

"میں نے شام سے رات کے دس بجے تک کا وقت جس اضطراب سے بسر کیا اس کا اندازہ مشکل ہے آخر کار جب وقت قریب آیا تو میں نے اوورکوٹ پہنا۔ کمر سے تلوار لگائی۔ اور جنگل کی طرف چل دیا۔ چاندنی رات تھی لیکن جنگل ایسا گھنا تھا کہ اس کی تاریکی کو چاند کی روشنی زائل نہ کر سکتی تھی۔ چاروں طرف سناٹا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں عالم ارواح میں پہنچ گیا ہوں جہاں پتوں کی سرسراہٹ بھی ایک ہولناک چیخ ہو کر کانوں تک پہنچتی ہے۔"[4]

(نپولین کی زندگی کا پوشیدہ ورق"، ص۱۹۰)

"اس رات کو اینڈرسن نے اپنے سکول کے کمرہ میں حسب معمول اشعار نہیں کہے۔ وہ کھڑکی کے قریب کھڑا ہو کر نیلے آسمان پر اپنے سے دور چاند کے زرد ہالہ کی طرف دیکھتا اور سوچتا رہا۔ اس کے حالات منتشر، ڈراؤنے اور ایسے خوفناک ہوگئے تھے کہ اس کا سر چکرا رہا تھا۔ وہ ایسا محسوس کر رہا تھا گویا وہ اب بھی انہیں تینوں آدمیوں کو جن کو گولی ماری گئی تھی۔ دیکھ رہا ہے جو کھیت میں پڑے ہوئے ٹھنڈے ٹھنڈے چاند کو اپنی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔"[5]

("انقلابی"، ص۲۹۴)

یہ اقتباسات میں نے شعوری کوشش سے منتخب نہیں کئے بلکہ یونہی کسی افسانے کی کوئی سی عبارت لے لی ہے۔ اب جو لوگ نیاز فتحپوری کے افسانوی اسلوب کو محض شاعرانہ اسلوب کہہ کر اسے نظر انداز کر دیتے ہیں یا انہیں محض رومانوی افسانہ نگار کہنے پر اکتفا کرتے ہیں وہ خود یہ اسلوب

---

[1]، [2]، [3]، [4]، [5]۔ یہ اقتباسات "مختاراتِ نیاز" سے لئے گئے ہیں۔

ملاحظہ فرمالیں اور اس کے بعد کوئی فیصلہ دیں۔

"جمالستان" ــــ میں بائیس۲۲ رومانی اور معاشرتی کہانیاں شامل ہیں۔ دنیا کا اولین بت ساز، ایک شاعر کی محبت، زہرہ کا ایک پجاری، مطربۂ فلک درسی محبت۔ ایک شاعر کا انجام، اور شبنمستان کا قطرۂ گوہریں، رومانی افسانے ہیں جبکہ شہیدِ آزادی، دو خط، سودائے خام، ۲۵ کا ایک صوفی، فریب خیال، بعد المشرقین، جانعالم اور ملکہ مہر نگار، چنگاری، صدائے شکست، ازدواجِ مکرر اور ایثار، معاشرتی، اخلاقی اور اصلاحی کہانیاں ہیں۔ "دنیا کا اولین بت تراش"۔ــــ زرقا نے ایک عورت کا بت بنایا۔ اس میں جان پڑ گئی لیکن زرقا کی بدسلوکی نے اس لچکیلی عورت کو پھر سے سنگین عورت بنا دیا پھر اس نے بہت کوشش کی لیکن

اگر عورت کو خود مرد سنگ دل بنا دے تو پھر اس کی تلافی مرد کے جان دینے سے بھی نہیں ہوسکتی"۔ (جمالستان ص۹)

"ایک شاعر کی محبت"، رومانی افسانہ ہے لیکن دراصل اس میں عورت کی محبت، حصول کے لئے کوشش، پانے اور کھو دینے کا واقعہ بند ہے۔ جاوید مثالی محبت کا قائل ہے وہ ملکۂ مصر کا شیدائی ہے جس کو مرے دو ہزار سال گزر چکے ہیں۔ جاوید کی عاشق خالدہ اس کی سرشاری سے فائدہ اٹھا کر ملکہ کے تابوت میں لیٹ جاتی ہے اور رات کو جاوید کے ساتھ مکان میں آجاتی ہے صبح ہونے سے پہلے چلی جاتی ہے۔ جب جاوید کا فریبِ نظر ٹوٹتا ہے تو وہ اپنی محبت کی تذلیل برداشت نہیں کرسکتا اور خودکشی کرلیتا ہے۔

"شہیدِ آزادی"، آزادیٔ نسواں کی حامی ایک مغرب زدہ عورت کی کہانی ہے جو اپنے خاوند کو چھوڑ کر ایک نوجوان کی مصنوعی محبت پر اپنی جان لٹا بیٹھتی ہے۔ اس افسانے سے مثالی بیوی کا جو تصوّر ابھرتا ہے وہ یہ ہے کہ "بیوی ایک ایسے انیس و ہمدم کا نام ہے جو بہرا بھی ہو اور اندھا بھی۔ اس کی ساری دنیا صرف شوہر کی ذات ہو اور اس کے جملہ مشاغل کا مقصد تنہا شوہر کے اسبابِ آسائش کی فراہمی ہو"۔ ل

"دو خط"ــــ سجاد حیدر یلدرم کے افسانے "صحبتِ ناجنس"، کی یاد دلاتا ہے۔ اس افسانے کا موضوع کم و بیش وہی ہے صرف فرق یہ ہے کہ وہاں دو سہیلیوں کی خط و کتابت میں ایسے خاوندوں کا حال درج ہے جن کے مزاج ان کے مزاج سے نہیں ملتے اور "دو خط" میں خاوندوں نے اپنی بے جوڑ بیویوں کی بوالعجبیوں کی داستان بیان کی ہے۔ دونوں خاوندوں کو یہ شکوہ ہے کہ ان کی بیویاں ان کے تصوّر سے مختلف ہیں۔

"سودائے خام"، میں یہ نظریہ پیش کیا گیا ہے کہ دینداری اور مذہب پرستی کے ذریعہ پیٹ کے تقاضے پورے نہیں ہوتے اور بے ایمانی کی عیاشی کرتے کرتے ایک روز خودکشی کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ افسانے میں طویل تقریریں اور اخلاقی درس موجود ہیں۔ "۲۵ کا ایک صوفی"۔ ایک نام نہاد مقدّس شخص فرق شاہ کی کہانی ہے جو فراڈ کے ذریعے لوگوں کو بے وقوف بناتا اور لوٹتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک رنڈی اس کے جھانسے میں آجاتی ہے اور وہ پھر اس کا سب کچھ لوٹ کر رفوچکر ہو جاتا ہے۔ "فریبِ خیال"، میں بیوی کی محبت اور مغرب زدہ فیشن ایبل محبوبہ کی بے وفائی اور ہرجائی پن کی کہانی ہے۔ "بعد المشرقین"، دلچسپ افسانہ ہے۔ اگرچہ اقبال اور سعادت علی خاں کا نکاح بچپن میں ہوگیا تھا لیکن اقبال تعلیم یافتہ بے پردہ اور روشن خیال لڑکی تھی جبکہ سعادت علی خاں قدامت پرست، تنگ نظر اور متعصب نوجوان تھا۔ اس لئے اقبال نے تنسیخ نکاح کے لئے مقدمہ دائر کردیا جس کا فیصلہ اقبال کے حق میں نہ ہوسکا۔ آخر اس نے مولانا سعادت سے چھٹکارا پانے کے لئے عیسائی مذہب قبول کرلیا اور اس طرح اس کی جان چھوٹی۔ اس افسانے میں نیاز صاحب نے روشن خیالی کی فتح اور قدامت پرستی کی شکست دکھائی ہے۔

"جانعالم اور ملکہ مہر نگار"، نام اور عنوان کے اعتبار سے داستانوی قصّہ معلوم ہوتا ہے لیکن اس میں سامنے کی زندگی کا موضوع موجود ہے۔ اسلم اور شیریں ایک فلم میں ہیرو اور ہیروئن کا کردار ادا کر رہے ہیں۔ عین اس وقت جب فلم قریب الاختتام تھی اسلم نے فلم میں کام کرنے سے انکار کردیا اور شرط یہ عائد کردی کہ پہلے شیریں اس سے شادی کرے۔ فلم کمپنی کے مالک نے اپنا سرمایہ بچانے کی خاطر اپنی بیٹی شیریں کی شادی اسلم کے ساتھ کردی۔ "چنگاری"، جدید عورت کی بے وفائی، مکاری اور عیش پرستی کی کہانی ہے۔ "صدائے شکست"، محبت کی کہانی ہے جس میں شکست اور اعترافِ شکست کے بعد محبت کی جیت ہوتی ہے۔ "ازدواجِ مکرر"، وہی بیوی کی مثالی وفا اور ماڈرن عورت کی بے وفائی اور مکاری

ل۔ جمالستان ص۴۳۔

کی کہانی ہے۔ "ایثار" اس نظریئے کی نفی کی کہانی ہے کہ "نکاح کا اصل مقصود صرف ہمدردی و ایثار ہے" [1]

بحیثیتِ مجموعی نیاز صاحب کے معاشرتی اور اصلاحی افسانوں کا موضوع زیادہ تر عورت، شباب، حسن و عشق، گناہ و ثواب، گھریلو زندگی کی چھوٹی چھوٹی خوشیاں، ناچاقیاں اور ملاپ ہے۔ ان تمام برائیوں کی اصلاح اور صورتِ حال کی تبدیلی کی خواہش ان تمام افسانوں میں ملتی ہے۔ گھریلو زندگی میں میاں بیوی کے تعلقات کی نوعیت نیاز صاحب کے یہاں لطافت خوش دلی اور افہام و تفہیم پر مبنی ہے۔ میاں ہرجائی دل پھینک، حسن پرست ہو تو کوئی مضائقہ نہیں البتہ بیوی عفتِ شعار، وفادار اور ہر حال میں تابع فرمان ہونا چاہیئے۔ خدمت گذار ہو۔ خاوند کو مجازی خدا تصور کرتی ہو۔ عورت کا یہ مثالی روپ اس زمانے میں کم و بیش تمام افسانہ نگاروں کے یہاں موجود ہے خواہ وہ سجّاد حیدر یلدرم ہوں، حکیم احمد شجاع ہوں یا پریم چند ــــ

پلاٹ کے لحاظ سے یہ افسانے اردو کہانی کے ابتدائی دور کے افسانوں کی بد وضعی، غیر ضروری تفصیلات، طویل تقریریں اور مباحثے لئے ہوئے ہیں۔ طول طویل مناظر کشی، تاثرات کا تفصیلی بیان، جزئیات اور تفصیلات کی بھرمار، رومانوی اور مثالی طرزِ احساس اور رنگین اسلوب بیان۔ ان افسانوں میں کسی نہ کسی حد تک موجود ہیں۔ البتہ بعض افسانوں میں اسلوب سادہ، سلیس اور رچا ہوا ہے۔ جہاں تک کرداروں کا تعلق ہے رومانوی افسانوں کے کرداروں کو چھوڑ کر باقی کردار سامنے کی زندگی کے انسان ہیں انسانی جذبوں کے حامل۔ البتہ نسوانی کرداروں میں کہیں کہیں مثالیت کا رنگ ملتا ہے عورت کے بارے میں ان کے تاثرات بڑے شاعرانہ ہوتے ہیں۔ مثلاً

> "عورت ایک لذت ہے مجسم، ایک تسکین ہے متشکل اک سحر ہے مرئی، اک نور ہے ابدی"
> (عورت۔ نگارستان ص ۹۷)

اسی طرح

> "اے عورت! تو فرشتوں اور حوروں کی نگاہ میں خواہ کچھ ہی ہو لیکن ہمیں تو تیری فطرت وخلقت پرستش پر مجبور کر رہی ہے۔ آہ! تجھے اپنی آفرینش کا حال نہیں معلوم۔ مگر ہم جانتے ہیں تیرے خمیر میں کتنی خوشبوئیں، کتنی رنگینیاں، کتنی نزاکتیں شامل ہیں"
> (کیوپڈ و سائیکی۔ نگارستان ص ۱۴۰)

لیکن اس طبقے کے بارے میں، جو ان کے نزدیک تضادات کا شکار اور منافقانہ رویّوں کا حامل ہے، ان کا ردِ عمل بڑا شدید ہوتا ہے۔ مثلاً یہ اقتباس ملاحظہ فرمایئے :-

> "دنیا میں سانپ اور مولوی دو چیزیں ایسی ہیں جن کی قسموں کی انتہا نہیں۔ البتہ فرق یہ ہے کہ اکثر سانپ زہریلے نہیں ہوتے اور موخر الذکر کا یہ حال ہے کہ ؎
>
> ہر کرا جامہ مولوی بینی — دَرد مش صد ہزار مار نگار
>
> ("چند گھنٹے ایک مولوی کے ساتھ" نگارستان ص ۲۶۳)

جنس کے بیان میں یا عورت مرد کے تعلقات کو ظاہر کرتے ہوئے نیاز فتح پوری کسی تلذّذ کا شکار نہیں ہوتے شہوانیات یا ترغیبات جنسی اور من و یزداں جیسی خطرناک اور کمزور ایمان والوں کو خطرے میں ڈال دینے والی کتابیں لکھنے والا، نیاز اپنے افسانوں میں مرد عورت کے تعلقات کے بارے میں ایسے معصومانہ، بے ضرر اور لطیف جملے لکھتا ہے کہ رومانی افسانوں اور کنپٹیاں گرم کرنے والی میٹھی میٹھی کہانیوں میں لذت کا سامان ڈھونڈنے والے قاری مایوس ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ان افسانوں میں اتنی جنسی چاشنی بھی نہیں ہوتی جتنی ڈاکٹر سلیم اختر کے افسانوں میں ہوتی ہے۔

یہ درست ہے کہ آج اردو افسانے نے بہت سا فنی سفر طے کر لیا ہے۔ آج ہمیں پرانی کہانیاں بھدی فارم اور بدہیئتی کی بنا پر مضحکہ خیز دکھائی

---

[1] جمالستان ص ۳۷۵

دیتی ہیں۔ ان میں حشو و زوائد کی بھرمار ہے۔ کفایتِ لفظی کا اہتمام نہیں ملتا۔ پلاٹ، کردار نگاری اور دیگر فنی لوازم میں نقائص پائے جاتے ہیں لیکن ان قدیم کہانیوں کی تاریخی حیثیت مقدم ہے۔ اردو افسانے کے سفر میں یہ کہانیاں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان ابتدائی کہانیوں میں قصہ پن، دلچسپی، اصلاحی جذبہ بھرپور انداز میں موجود ہے۔ نیاز فتحپوری کے افسانوں کی تعداد بلاشبہ سینکڑوں تک پہنچتی ہے [1] ان کہانیوں میں سے انتخاب کیا جائے تو خاصی تعداد ایسے افسانوں کی مل جائے گی جو موضوع اور فن کے لحاظ سے خاصے کی چیز ہیں اور ابتدائی دور میں ان کی اہمیت و حیثیت اپنی جگہ مسلّم ہے۔ نیاز صاحب کی افسانوی حیثیت کو کسی طور نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے جس بے باکی، جرأت اور "سخت جانی" کے ساتھ معاشرے کے تضادات، حماقتوں، ظاہر داریوں، نحوستوں اور بے ضمیریوں کے خلاف لکھا اس کی اپنی اہمیت ہے۔ ٹوٹ پھوٹ کے اس دور میں جب ایک طرف اندر کے بکھراؤ، انتشار، عدم تشخص، عدم تحفظ، اجنبیت اور بے معنویت کو جدید ادب کے کثیر لایعنی حصّے کا جواز بنایا جا رہا ہے۔ منافقت ظاہر داری، تعصب، تنگ نظری کے رویّے عام کئے جا رہے ہیں۔ ہمارے انٹلکچول افسانہ نگار اور ٹی وی پر مسلط ڈراما نگار آئن سٹائن کو صوفی، سائنس کو شعبدہ بازی اور تعویز گنڈوں کی تاثیر کو ثابت کرنے پر تُل گئے ہیں تو نیاز فتحپوری جیسی "سخت جان" شخصیت کی سخت ضرورت ہے جو سانپوں بھرے جنگل میں تنہا جوگی تھا۔ انہوں نے سانپوں کے زہریلے دانت توڑے۔ ادب میں معنویت اور استدلال کی عقل داڑھ اُگائی۔ تعویز گنڈوں کا اثر مٹایا۔ اور ادب و سائنس کا رنگ جمایا۔ ایسے جری افسانہ نگار کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

---

[1] ۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے۔ رسالہ "نگار" سالنامہ ۱۹۲۳ء (نیاز نمبر حصہ دوم) ص۲۲۱ تا ص۲۲۶



نیاز فتحپوری اور متوازی افسانہ

پروفیسر قمر رئیس (ہندوستان)

بیسویں صدی کے خاتمہ پر اردو افسانہ کے سفر کی ایک صدی مکمل ہو جائے گی۔ اس طویل سفر میں اردو افسانہ کئی طرح کے نشیب و فراز سے گزرا ہے۔ ایک طرف اگر نفیس خیال، اظہار و بیان اور تکنیک کے بیشمار تجربوں سے وہ مالامال ہوا تو دوسری طرف بیسویں صدی کی انقلاب آفریں تحریکوں اور سماجی زندگی کی کروٹوں نے اردو افسانہ میں تنوع اور تازگی پیدا کی۔ اگر ذرا بلندی سے افسانہ کے اس سفر پر طائرانہ نظر ڈالی جائے تو محسوس ہوگا کہ ایک کشادہ ندی کی طرح ایک منحنی لیکن جلی لکیر کی صورت اردو افسانہ کا سفر جاری ہے۔ اس جلی لکیر کے ساتھ ساتھ، ایک دوسرے دھارے کی خفی لکیر بھی چل رہی ہے۔ یہ دوسرا دھارا کہیں کہیں اتنا سکڑ جاتا ہے کہ مشکل سے دکھائی دیتا ہے مگر اس کا وجود ختم نہیں ہوتا۔ اسے اردو کے متوازی افسانہ کا نام دیا جا سکتا ہے۔ کشادہ ندی اردو افسانہ کی بنیادی روایت ہے۔ اس کی کشادگی اور گہرائی اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ بنیادی روایت کا افسانہ بدلتی ہوئی ہمہ رنگ زندگی اور اس کے پیچ و خم سے ہم آہنگ رہا ہے۔ اس نے زندگی کی وسعتوں کا ہی نہیں پیچیدگیوں کا بھی احاطہ کیا ہے۔ سیاسی شورشیں، ظلم و استحصال کی طاقتوں کے خلاف محنت کش انسانوں کی جدوجہد، انسانی حقوق اور آزادی کے لئے طبقۂ نسواں کی تگ و دو، متوسط طبقہ کا عروج اور اس کے تہ در تہ مسائل، الغرض اس صدی کی کوئی اجتماعی، قومی تحریک اور اس سے پیدا ہونے والا اضطراب اور رفتار ایسا نہیں جس کا ادراک اور اظہار اردو افسانہ میں نہ ہوا ہو۔ اس کے متوازی اردو افسانہ کی جو روایت رہی ہے وہ اجتماعی زندگی کی ہلچل اور اس سے پیدا ہونے والی مادی تبدیلیوں کے بجائے ایک حد تک ان تبدیلیوں سے جنم لینے والے تصورات اور قدروں کی ترجمان رہی ہے۔ بنیادی روایت اگر اجتماعیت کی آئینہ دار تھی تو متوازی افسانہ انفرادیت یعنی فرد کی داخلی دنیا کو اہمیت دیتا تھا۔ بنیادی روایت نے معروضی حقائق کے افہام و تفہیم پر زور دیا تو متوازی افسانہ نے انسانی جذبہ اور احساس کے نادیدہ یا کم نما منطقوں کا سراغ لگایا۔ بنیادی روایت کی تعقل پسندی نے اردو افسانہ میں حقیقت اور تجزیہ کی روشنی پیدا کی تو متوازی افسانہ نے انسانی وجود کے دھندلے اور پُراسرار خطوں میں غوطہ زنی کی۔ بنیادی روایت کے افسانہ نے حالات اور معاشرہ کو بدلنے پر زور دیا تو متوازی افسانہ نے نئے بدلے ہوئے تناظر میں کائنات کی ایک نئی تعبیر پیش کی۔

فنی نقطۂ نگاہ سے بھی افسانہ کی بنیادی روایت اور متوازی روایت میں جہاں کچھ اجزاء و عناصر مشترک تھے وہاں دونوں کے کچھ فنی اوصاف علیحدہ اور مختلف دائرے بناتے رہے۔ بنیادی روایت میں اظہار و بیان کی سادگی اور بول چال کے محاورہ کو اپنایا گیا تو متوازی روایت نے اظہار و بیان کی آراستگی اور تخئیلی لطافت پر زور دیا۔ بنیادی روایت میں افسانوں کے کردار اپنے ماحول اور حالات سے جنم لیتے اور پروان چڑھتے ہیں تو متوازی افسانہ میں اکثر کردار تصورات کی تجسیم ہوتے ہیں اور ماحول کی تشکیل و تعمیر کرداروں کی روایت سے ہوتی ہے۔ بنیادی روایت میں افسانہ واقعات کی ٹھوس کڑیوں میں بندھا ہوتا ہے۔ متوازی روایت میں قصہ کی تعمیر میں شعری پیکر آفرینی کارگر رول ادا کرتی ہے۔ اسی طرح فنی فرق و امتیاز کے بعض دوسرے پہلو بھی ہیں جن کا حوالہ آگے آئے گا۔

اردو افسانہ کی بنیادی روایت کو حقیقت نگاری کی روایت کا نام بھی دیا گیا ہے۔ اس روایت کے اولین معمار پریم چند تھے۔ ان کے پہلے مجموعہ "سوزِ وطن" سے ہی قومی آشوب و اضطراب ان کے افسانوں کا موضوع رہا ہے۔ اور جیسے جیسے گرد و پیش کی اجتماعی زندگی کے بارے میں ان کی فہم گہری اور تیکھی ہوتی گئی۔ ان کے افسانوں میں زیادہ تازگی، اثر انگیزی اور معنویت پیدا ہوتی گئی۔ انھوں نے ٹیگور اور ٹالسٹائی کی کہانیاں پڑھ کر افسانہ نگاری کا آغاز کیا تھا لیکن وہ قصہ گوئی کی ہندوستانی روایت سے بھی مانوس تھے۔ پھر ان کی اپنی شخصیت کی سادگی، عوام دوستی اور دردمندی ان کے افسانوی اسلوب پہ برابر اثر انداز ہوتی رہی۔ پنڈت سدرشن، اعظم کریوی اور سلطان حیدر جوش ان کے پیرو تھے۔ تیسرے دہے کے آخر میں اوپندر ناتھ اشک، حیات اللہ انصاری، سہیل عظیم آبادی اور علی عباس حسینی بھی حقیقت نگاری کی اسی توانا روایت سے وابستہ ہوگئے۔ ان ادیبوں نے متوسط طبقہ کے علاوہ محنت کش عوام اور گاؤں کے پسماندہ طبقہ کی زندگی کے مرقعے، ان کے ماحول کی ساری جزئیات کے ساتھ پیش کئے۔ انھوں نے افسانہ کو ایک غایتی میلان سے آشنا کیا اور افسانوں کے وسیلہ سے سماج کو بدلنے پر زور دیا۔

ستمبر ۱۹۱۰ء سے ۱۹۱۴ء تک پریم چند نے 'بے غرض محسن'، 'صرف ایک آواز' اور 'خون سفید' جیسی کہانیاں لکھ کر اردو میں پہلی بار گاؤں کے غریب کسانوں کو افسانہ کا ہیرو بنایا۔ انھوں نے کھیت مزدوروں اور دلت طبقہ کے مسائل کی طرف قارئین کی توجہ مبذول کرائی۔ ۱۹۲۰ء کے بعد ان کی کہانیوں میں طبقاتی آویزش کا احساس ہندوستانی سماج کی برہنہ حقیقت کے طور پر نظر آنے لگا۔

نیاز فتحپوری نے پریم چند کی زندگی میں ہی ان کے افسانوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا:

> "پریم چند فارسی عربی سے بقدر ضرورت بھی آگاہ نہیں ہیں۔ اور اس لئے اردو زبان پر انھیں وہ قدرت حاصل نہیں ہو سکتی جو سادہ افسانہ نگاری کو چھوڑ کر کسی عمیق غور و فکر یا علمی و تحقیقی تحریر کے لئے درکار ہوتی ہے۔"
>
> (مذاکرات نیاز۔ ص ۱۵۷ ۱۹۴۲ء)

اس سے قطع نظر کہ یہ بیان غلط ہے اور پریم چند فارسی زبان بہت اچھی جانتے تھے اس سے دو باتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ اوّل یہ کہ نیاز پریم چند کی سادہ افسانہ نگاری یا حقیقت نگاری کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ دوسرے یہ کہ عمیق غور و فکر کے اظہار کے لئے وہ فارسی عربی کی واقفیت کو ضروری سمجھتے تھے۔

دراصل یہی وہ خط انحراف ہے جہاں سے اردو افسانہ حقیقت پسندی کے متوازی ایک نئے فکری اور جمالیاتی مسلک کے ساتھ اپنی الگ پہچان بنانے لگا۔ سجاد حیدر یلدرم اور 'مخزن' کے بعض دوسرے ادیبوں نے اس کی داغ بیل ڈالی تھی اور یلدرم نے ترکی افسانوں کی تلخیص و ترجمہ کے ذریعہ ایک ایسی فضا خلق کر دی تھی جس میں تخیئلی پیکر تراشی افسانہ میں رنگینی اور دلچسپی کے عناصر پیدا کرتی ہے۔ یلدرم کو بلاشبہ متوازی افسانہ کا پیش رو ہی نہیں بانی کہا جا سکتا ہے۔ نیاز فتحپوری نے بھی اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں اور اپنے جریدے "نگار" کے ذریعہ اس رجحان کو ایک تحریک بنا دیا اور اس کی جڑیں اتنی مضبوط اور گہری کر دیں کہ اردو افسانہ کے بعد کے رجحانات اور تجربات میں بھی اُن کی وراثت کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔

انیسویں صدی کے آخر میں انگریزی ادب میں بھی یورپ کی حقیقت نگاری اور نیچرلزم کے خلاف ردعمل کے طور پر ایک ایسی ہی تحریک نے جنم لیا تھا جس کی سربراہی آسکر وائلڈ کر رہا تھا۔ نیاز نے مغرب کے جن ادیبوں سے اپنی اثرپذیری کا اعتراف کیا ہے ان میں بلاشبہ آسکر وائلڈ کا نام سب سے نمایاں ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ انکے مشہور افسانہ "شہاب کی سرگزشت" میں آسکر وائلڈ ہی چھپا ہوا ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں اور نگار کے صفحوں میں آرٹ اور ادب کے جس تصور کو فروغ دینے کی کوشش کی اس میں آسکر وائلڈ کے خیالات کی گونج صاف سنائی دیتی ہے۔ نیاز بھی آسکر وائلڈ کی طرح انانیت پرست اور باغی تھے۔ دونوں کے رویّوں میں ادعائیت تھی۔ دونوں اساسی طور پر شاعر تھے اور زندگی اور ادب کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر جمالیاتی تھا۔ دونوں کی ذہانت آزادیٔ فکر اور نئے پن پر اصرار کرتی ہے اور فرسودہ و پامال تصورات

سے بیزار ہے۔ دونوں اجتماعیت سے منحرف اور انفرادیت پسندی کے داعی ہیں۔

آسکر وائلڈ نے "نئی جمالیات کے نام سے آرٹ اور ادب کی جو نئی بوطیقا مرتب کی اس میں وہ چار نکتوں پر خصوصیت سے زور دیتا ہے۔ کم و بیش اسی کے الفاظ میں یہ چار نکتے یہ ہیں:۔

۱۔ آرٹ مکمل طور پر خود مختار ہے اور ضروری نہیں کہ وہ اپنے عہد کے افکار و خیالات کا ترجمان ہو۔ زندگی اور نیچر کی تصویر کشی اور ان کو آدرشوں میں تبدیل کرنے سے بُرا آرٹ جنم لیتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ جب آرٹ اپنے تخیلی میڈیم سے دست بردار ہو جاتا ہے تو گویا وہ سب کچھ تج دیتا ہے۔

۲۔ آرٹ جس قدر زندگی کی نقالی کرتا ہے اس سے کہیں زیادہ زندگی آرٹ کی نقل کرتی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ تخلیقی تخیل عرفان ذات کی صورتیں فراہم کرتا ہے۔

۳۔ خارجی فطرت بھی ایک طرح سے آرٹ کی نقالی کرتی ہے اس لئے کہ جن حواس کے ذریعہ ہم اس کا ادراک کرتے ہیں وہ صرف انہی اثرات کی باز آفرینی پر قادر ہوتے ہیں جن کو قبول کرنے کی تربیت آرٹ دیتا ہے۔

۴۔ دروغ گوئی یعنی ایسی دلنشیں باتیں کہنا جو سچ نہ ہوں آرٹ کا مقصود حقیقی ہے۔

آسکر وائلڈ کا تصور جمال یا جمال آفرینی نیکی اور سچائی دونوں سے بلند تر ہے۔ دوسرے اس کے نزدیک آرٹ کی قدر شناسی کے لئے کوئی اخلاقی پیمانہ ہو ہی نہیں سکتا۔

آسکر وائلڈ نے اپنے افسانوں اور ڈراموں میں اپنی تصوّرات کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

یہاں آرٹ اور ادب کے بارے میں وائلڈ کے خیالات کے محاکمہ کا موقع نہیں ہے۔ مقصد صرف یہ دکھانا ہے کہ نیاز فتحپوری نے اپنے عہد کے بعض عوامل کے زیر اثر وائلڈ کے ان خیالات سے گہرے اثرات قبول کئے۔ انھوں نے حقیقت پسندانہ افسانہ کے معاصر رجحان سے شعوری طور پر گریز اختیار کیا اور افسانہ میں تخیلی اور جمالیاتی عناصر پر زور دے کر ایک متوازی رجحان کی آبیاری کی۔ اس نقطۂ نگاہ سے "نگار" کے اجرا یعنی فروری ۱۹۲۲ء سے مارچ ۱۹۳۲ء تک کا زمانہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ۱۹۳۲ء تک اس لئے کہ اسی سال 'انگارے' شائع ہوئی اور اس کے بعد اردو افسانے نے ایک نئی کروٹ لی۔ یہ ترقی پسند افسانے کی خشت اوّل تھی۔ بعد میں ترقی پسند افسانہ نے 'نگار کی روشن خیالی' اس کی بغاوت اور توانا رومانوی حیثیت کو اپنے وسیع دامن میں جذب کر لیا۔

مذکورہ زمانہ میں یوں تو بے شمار ادیبوں نے 'نگار' کے صفحات میں لکھا لیکن جن ادیبوں کے افسانے متوازی رجحان کی خصوصیت سے نمائندگی کرتے ہیں ان میں نیاز فتحپوری کے علاوہ لطیف الدین احمد، خلیقی دہلوی، تمکین کاظمی، مجنوں گورکھپوری، عابد علی عابد، مسعود علی ذوقی، سید علی اختر کاظمی، ن۔ احمد اور ایک قلمی نام 'وشنی' قابلِ ذکر ہیں۔ اہلِ نظر اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ نگار کے صفحات میں اس کے مدیر یعنی نیاز فتحپوری کی شخصیت ہمیشہ چھائی رہتی تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ 'نگار' میں لکھنے والے عموماً ایسی ہی تخلیقات بھیجتے تھے جو اس کے مدیر کے نظریۂ فن کی میزان پر پوری اتریں۔ اس سلسلہ میں خود نیاز کے افسانے سب سے زیادہ رہبری کرتے تھے۔ ان کے افسانوں کے صرف ایک مجموعے "نقاب اُٹھ جانے کے بعد" کے علاوہ کسی افسانہ میں ان کی سماجی بصیرت کا اظہار نہیں ہوتا۔ وہ جس تصور کو لے کر افسانے لکھتے تھے اسے "جمالیاتی عینیت پسندی" کا نام دیا جا سکتا ہے۔ نیاز یوں تو ہر روپ میں حسن کی پرستش کرتے تھے لیکن نیاز کا حسین ترین نکتہ ان کے نزدیک عورت اور اس کا شباب ہے۔ نسوانی حسن کے بیان میں غضب کی جولانی پیدا ہو جاتی ہے اور ان کا تخیل عورت کی پیکر تراشی میں ساری دنیا کے اس رنگ اور سگندھ کو سمیٹ لاتا ہے ایک مصور فرشتہ۔ دنیا کا اولین بت ساز قلوبترہ ۔۔ اور ایک مصلح بت تراش جیسے افسانوں میں عورت کے بارے میں ان کے عینیت پسندانہ تصورات کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ ایک دوسرے افسانہ "یکے از غوازی مصر" میں جو اکتوبر ۲۵ء میں نگار میں شائع ہوا اس میں وہ عورت کے کرشمہ ساز حُسن کی جو شبیہہ پیش کرتے ہیں جزوی فرق کے ساتھ ان کی ہر ہیروئن اسی پیکر میں نظر آتی ہے۔ لکھتے ہیں:

"زبیدہ میں ناگن کا بل تھا اور لہروں کا لوچ۔ گلبن کی لچک تھی اور سنبل کا پیچ و خم۔ کیونکہ میرے نزدیک وہ سر سے لے کر پاؤں تک ایک فنی شاہکار تھی۔ قدرت کے اُس اختراع و ابداع کی جس کا قیاس بھی انسان کبھی نہ کر سکتا اگر عورت کی آفرینش نہ ہوتی۔"

(مذاکرات نیاز۔ ص ۱۳)

"ایک مصلح بُت تراش" میں جو ستمبر ۱۹۲۳ء کے نگار میں شائع ہوا وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ مغرب نے عورت کی نمائش کرکے اس کی نسائیت کو سلب کر لیا ہے۔ عورت کا اصل حُسن اس کے جسمانی تناسب اعضا میں نہیں بلکہ حسنِ صفات میں ہے۔ اس طرح وہ حُسن کو اخلاقیات سے بھی جوڑتے ہیں۔ ان کے بعض افسانوں میں حُسن سچائی اور خیر کا مترادف بن جاتا ہے۔ اس طرح آسکر وائلڈ کا یہ قول کہ حُسن سچائی اور خیر کے مقابلہ میں زیادہ قابلِ پرستش ہے، نیازؔ فتحپوری کے یہاں کچھ تحلیل ہو جاتا ہے۔

نیازؔ کے بعد نگار میں سب سے زیادہ افسانے لطیف الدین احمد اکبرآبادی کے شائع ہوئے جو اس دور میں ذہنی طور پر نیاز سے بہت قریب تھے۔ لالہ رخ، کامران، ناکامی، میں ہوں اپنی شکست کی آواز اور زہرہ کی ایک کرن' جیسے افسانوں میں وہ حُسن و عشق کی ایک خوابگوں دُنیا آباد کرتے ہیں۔ یہ افسانے نیاز کے افسانوں کی طرح تخیّلی نقاشی سے معمور ہیں۔ ان کی انفرادیت پسندی کرداروں میں حقیقت کا ہلکا سا شائبہ پیدا کرنے کے باوجود سماجی حقیقتوں کی ترجمانی میں مانع ہوتی ہے۔ ان کے کردار زیادہ سے زیادہ بعض اقدار و تصورات کا مجسمہ بن جاتے ہیں۔

مجنوں گورکھپوری کے اس عہد کے افسانوں میں یہی تخیّلی اور تمثیلی رنگ نمایاں ہے جسے وہ 'رومانیات' کے ذیل میں شمار کرتے ہیں۔ سمن پوش، حسن شاہ اور محبّت کا جوگ جیسے افسانوں پر نیاز کا اثر واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ سمن پوش اور دوسرے افسانے کے مقدمہ میں لکھتے ہیں ــــ "میں جذبۂ جنسی یا محبت کو انسان کی سب سے بڑی بدبختی سمجھتا ہوں ...... اور یہ محبّت مجھے مرنے کے بعد بھی کارفرما نظر آتی ہے۔"

"حقیقت جانی نہیں جا سکتی بلکہ صرف محسوس کی جا سکتی ہے۔"

ان کے ہیرو اکثر ایسے ہی رومانوی تصوّرات کو شد و مد سے پیش کرتے ہیں۔ "زیدی کا حشر" انھوں نے نیازؔ کے افسانہ "شہاب کی سرگزشت" کے جواب میں لکھا تھا جس کا ہیرو اپنی بنت عم صوفیہ کے سیلِ حُسن میں غرق ہو جاتا ہے۔ وہ محبّت کو ایسا جذبۂ لطیف قرار دیتا ہے جس کو قائم رکھنے کے لئے 'مادیات' سے اس حد تک اجتناب ضروری ہے کہ بقول مجنوں ایک 'تخیل مجرد' اور ایک 'تصورِ مطلق' کے سوا کچھ نہ رہ جائے۔ زیدی بار بار اپنی گفتگو میں آسکر وائلڈ کے ایسے اقوال نقل کرتا ہے جو اس کی جمالیاتی عینیت پسندی سے تعلق رکھتے ہیں۔ نیاز کے افسانوں کی طرح مجنوں کے افسانوں کا انجام بھی المیہ ہوتا ہے۔ اس کا ایک سبب تو شوپنہاور کے قنوطی فلسفہ سے ان کی اثر پذیری ہے اور دوسرا ان کا یہ تصوّر کہ محبّت کا منتہائے حقیقی وصل نہیں فراق ہے۔

'نگار' کے صفحات میں اسراری، جہاتی اور نیم سائنسی افسانے بھی شائع ہوئے جن میں خود نیازؔ کا افسانہ 'چاند کی سیر' اور بعض 'مختارات' شامل ہیں۔ یہ افسانے بھی قاری کو ایک غیر حقیقی اور ماورائی دُنیا کی سیاحت کراتے ہیں۔ وہ سائنسی شعور جگانے کے بجائے ایک طرح کی بربریّت کا پرچار کرتے ہیں۔ ان کی زبان بھی آراستہ ہے اور واقعات عقلی نہیں بلکہ شعری منطق کے تابع ہیں۔ خلیقی دہلوی کا افسانہ 'مشہدِ عروس' جو ستمبر ۱۹۲۲ء کے 'نگار' میں شائع ہوا ایک عورت کی مثالی وفاشعاری کی المناک کہانی ہے۔ اس کی زبان نہ صرف شاعرانہ پیکر آفرینی سے معمور ہے بلکہ مصنف نے کہانی کا ایک جذباتی حصّہ مثنوی کے پیرایہ میں پیش کیا ہے۔ خلیقی کے یہاں بھی تلاشِ حُسن میں زندگی کی معنویت پوشیدہ ہے۔

علامہ نیازؔ فتحپوری نے 'نگار' میں ایسے افسانوں کی بھی حوصلہ افزائی کی ہے جن میں قدیم مصر کے کاہنوں اور اساطیری

کرداروں کو پیش کیا گیا ہے۔ مثلاً وشنی کے فرضی نام سے شائع ہونے والے دو افسانے 'زہرہ کا ایک پجاری' اور 'مطربۂ فلک' جو نومبر اور دسمبر ۱۹۲۵ء کے شماروں کی زینت ہیں۔ یا ن۔ احمد کا افسانہ 'ملاءِ اعلیٰ کا سیاح' جو دسمبر ۱۹۲۲ء میں شائع ہوا۔ ان دیومالائی افسانوں میں زہرہ، کیوپڈ، سائکی، جو پیٹر اور مرکری کو کردار بنا کر پیش کیا گیا ہے اور ان کے اساطیری اوصاف کی مناسبت سے ایک پُراسرار اجنبی فضا تخلیق کی گئی ہے۔

یہاں اس دلچسپ حقیقت کی طرف اشارہ بے محل نہ ہوگا کہ نیاز فتحپوری 'نگار' میں شائع ہونے والے افسانوں پر کبھی کبھی نقد و تبصرہ بھی کرتے تھے۔ میرا تاثر یہ ہے کہ وہ اپنے حلقہ اور اپنے مسلک سے وابستہ افسانہ نگاروں کی فنی کمزوریوں کو نظر انداز کر دیتے تھے لیکن حقیقت پسندانہ افسانوں کو کڑی تنقید کی نظر سے جانچتے تھے۔ جب انھوں نے علی عباس حسینی کا افسانہ 'نبردِ عشق' مارچ ۱۹۲۸ء میں شائع کیا تو اس پر ایک تفصیلی تبصرہ کرتے ہوئے آخر میں لکھا ـــــ

"الغرض یہ افسانہ پلاٹ کے لحاظ سے ناقص، سیرت نگاری کے لحاظ سے متبائن الاقوال، افراد کی گفتگو کی حیثیت سے یکسر عامیانہ اور زبان کے لحاظ سے بہت ژولیدہ ہے۔" ("نگار" ص ۲۹)

اس میں شک نہیں ہیئت اور تکنیک کے اعتبار سے متوازی افسانہ میں بعض جرأت آزما تجربے کئے گئے ہیں۔ ایک تیزی سے تغیّر پذیر سوسائٹی میں اس طرح کے تجربے اکثر بڑی مقبولیت حاصل کر لیتے ہیں۔ کہیں یہ فرد اور فطرت کے درمیان مکالمہ بن جاتے ہیں اور کہیں فرد کی داخلی کشمکش کو سامنے لاتے ہیں۔ ان کے کرداروں کی سرتیت، باغیانہ جسارت اور خطر پسندی ڈرامائی حُسن پیدا کرتی ہے۔ نسوانی حُسن کی عینیت پسندانہ مصوّری اور شاعرانہ پیکر تراشی ان افسانوں میں بیانیہ کو اتنا متحرک بنا دیتی ہے جو اُس عہد کے حقیقت پسندانہ افسانوں میں بالکل نظر نہیں آتا۔ یہی وجہ ہے کہ 'الہلال' کے مضامین کی طرح 'نگار' کے افسانوں نے بھی اُس عہد میں متوسط طبقہ کے نوجوانوں کو متاثر کیا۔ ان کے تخیل کو وسعت عطا کی اور دلوں کو رنگ و نکہت کی تازگی سے بھر دیا۔

تاہم آج یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس متوازی روایت کے بے شمار افسانے مغرب کے رومانوی افسانوں کے چربے تھے۔ ان کی رُوح مغربی ہے اور جسم ہندوستانی۔ اس ثنویت نے ان افسانوں میں تصنع اور اجنبیت پیدا کر دی اور وہ بے جڑ کے پودے بن گئے۔

ارسطو کا کہنا ہے کہ تخلیقی ادب تاریخ سے اس لئے مختلف اور مستند ہوتا ہے کہ وہ تعمیمی شکل میں حقیقتوں کی فلسفیانہ تعبیر پیش کرتا ہے اور اس کی اساس ممکن الوقوع پر ہوتی ہے۔ عہدِ جدید کے ناقدین نے اسے روحِ اثر سے تعبیر کیا ہے۔ متوازی افسانہ کی سب سے بڑی کمزوری روحِ عصر سے محرومی یا اس کی کمی ہے۔

یہاں ایک بات اور قابلِ غور ہے۔ ہر عہد کے ادیبوں کے افکار و نظریات میں اشتراک و مناسبت ہوتی یا ہو سکتی ہے لیکن ان کا تخیل اور احساس جداگانہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک عہد سے وابستہ ہو کر بھی اپنی علیحدہ شناخت بنا لیتے ہیں۔ احساس و تخیل کا امتیاز ان کی انفرادیت کا ضامن ہوتا ہے۔ لیکن اس عہد کا متوازی افسانہ اس حقیقت کے باوجود کہ اس میں احساس و تخیل کو نمایاں اہمیت دی گئی ہے بڑی یکسانیت کا شکار ہے۔ نتیجہ میں اس روایت سے وابستہ ادیب بھی اپنی ایک روشن شناخت بنانے میں ناکام رہتے ہیں۔ نیاز فتحپوری کے علاوہ اس حلقہ کا کوئی ادیب ایسا نہیں جو ایک منفرد پہچان رکھتا ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ ۱۹۲۵ء کے بعد اس حلقہ کے ادیبوں کو یہ احساس ہونے لگا تھا کہ جو ادب وہ تخلیق کر رہے ہیں وہ جاندار نہیں ہے۔ اس میں تخیل کی نزاکت تو ہے زندگی کی حرارت نہیں ہے۔ لطیف الدین احمد (جو بعد میں ترقی پسند ادیبوں کی صف میں شامل ہوئے) اپنی تصنیف "تاثرات" (حصہ دوم) میں لکھتے ہیں:

"غالباً ۱۹۲۵ء کی بات ہے کہ ایک ملاقات میں برسبیل تذکرہ نیاز صاحب اور میں اس بات پر متفق الخیال تھے کہ جو ادب اس وقت پیدا ہو رہا ہے ناپائیدار شے ہے اس کے بعد (بھی) میں ارادے کے باوجود سماجی موضوعات پر لکھنے سے قاصر رہا۔ اور ۱۹۳۲ء سے سماجی موضوعات از خود ذہن میں اُترنے لگے۔" (ص ۳۳۸۔ غیر مطبوعہ)

۱۹۳۲ء کے آس پاس علامہ نیاز فتحپوری کو بھی اس حقیقت کا ادراک ہوا کہ صرف تخیل پرستی افسانہ کی تخلیقی معنویت کی ضامن

نہیں ہوسکتی۔ اس کے لئے زندگی کا وسیع مشاہدہ ہی نہیں گہرا تجربہ بھی درکار ہے جو تخیل کو اختراعی قوت سے ہمکنار کرتا ہے اور انسانی جذبات کو فلسفہ طرازی میں نہیں بلکہ تغیر پذیر انسانی رشتوں میں تلاش کرتا ہے۔

نیاز فتحپوری ایک مکتوب میں لکھتے ہیں :

> "اب ہماری اور آپ کی فسانہ نگاری کا دور ختم ہوا۔ پچھلے چند سال کے اندر جو انقلاب اس فن میں ہوا ہے اس کو نبھانے کے لئے جس آزادہ روی اور کھل کھیلنے کی ضرورت ہے وہ ہمیں آپ کو نصیب نہیں۔ اس سے قبل فسانہ نگاری نام تھا صرف خیال سے لذت اندوز ہونے کا۔ لیکن اب وہ عملی زندگی کی چیز ہے۔ پہلے صرف تصور سے کام چل جاتا تھا جس کے لئے محض فرصت درکار تھی اور اب معاملہ حقائق کا ہے جن کے لئے خاک چھاننا ضروری ہے۔"
> (مکتوباتِ نیاز، ص ۲۷ ۱۹۴۲ء)۔

اس طرح متوازی روایت کا یہ دھارا ترقی پسند تحریک کے دورِ عروج تک معدوم سا ہوگیا۔ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اس روایت کے دو اہم ستون ل۔ احمد اور مجنوں گورکھپوری ترقی پسند تحریک کے زبردست حامی بن گئے اور رومانوی مزاج رکھنے والے ترقی پسند افسانہ نگاروں نے اس روایت کے جذباتی تخیلی عناصر کو اعتدال کے ساتھ اپنا لیا۔ ان میں کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی اور مرزا ادیب کے نام خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ ۱۹۶۰ء کے بعد متوازی افسانہ کا یہ میلان جدیدیت کے مسلک کے زیرِ اثر ایک بار پھر ابھر کر سامنے آیا لیکن ذرا بدلی ہوئی شکل میں۔ اُس کے رد و قبول کی روداد دلچسپ ہے۔ لیکن اُسے سنانے کا یہ موقع نہیں۔

پروفیسر یوسف سرمست ـــــ نیاز کی شوخ تحریریں کیٹس کے اِس خیال کا کہ ایک خوبصورت چیز ہمیشہ کے لئے مسرت بخشتی ہے (A thing of beauty is a joy for ever) محکم ترین ثبوت ہیں۔



تارا چرن رستوگی
گوہاٹی ۷۸۱۰۱۶

نیاز فتحپوری سے باتیں، ملاقاتیں

نوٹ:- محترم رستوگی صاحب نے یہ مضمون علالت میں لکھا ہے۔ اور اعتراف کیا ہے کہ انہیں بہت کچھ لکھنا تھا۔ لیکن پیرانہ سالی اور علالت کے باعث زیادہ نہیں لکھ سکے۔ بہت کچھ ان کی یادداشت میں ہے۔ کوئی ہوتا تو ٹیپ کرادیتے۔

مدیر

درآں حال کہ میں نے دورِ طالب علمی میں پانچویں جماعت ہی تک اردو پڑھی مگر صحبت و ماحول کے زیر اثر اس کے زبان وادب سے عشق کرنے لگا۔ کیمبرج نصابات کے لئے جن دو کلاسیکل زبانوں کا میں نے انتخاب کیا لاطینی اور فارسی تھیں۔ اغلبًا فارسی درسیات نے مئے اردو کو دوآتشہ بنادیا ہو۔ انگریزی سے روزی روٹی کا تعلق اور اردو و فارسی ادبیات سے دلبستگی دونوں محرکات نے میرے ذوق و آہنگ کی تشکیل کی ہے، خود احتسابی تو اسی حقیقت کی نشاندہی کرتی ہے۔ اس صورت حال کے پیش نظر مشاہیر اردو سے اکتساب فیض کے لئے شرف قدم بوسی حاصل کرنا، موجب مسرت ہوا کرتا تھا۔ نواب جعفر علی خاں (مرحوم) آثر لکھنوی سے ۴۳ء سے اصلاح لینا شروع کیا اور جب تک استاذی حیات رہے گرمیوں کی تعطیلات میں لکھنؤ کی مسافرت کرنا ناگزیر مصمم ارادہ ہوا کرتا تھا۔ لکھنؤ میرے دل و دماغ کی کیفیات کی تشکیل میں معاون اور ساتھ ہی میری تمنیات کا مدفن بھی یہی شہر ثابت ہوا۔ استاذی آثر مرحوم کا واضح اثر مرتب ہوا ہے۔ مزید براں، لکھنؤ میں دو اور نامور ہستیوں نے مجھے نوازا، چودھری خلیق الزماں مرحوم جو کل ہند مسلم لیگ کے جنرل سکریٹری تھے مجھ پر بہت مہربان تھے اور ایک طرح میں بھی افراد خانہ میں شامل ہی تھا۔ دل سے مجبور ہو کر ان کا ذکر نہ کرنا کفر کے مترادف ہوگا، گھر پر بڑے سیکولر مزاج کے انسان تھے۔ نیاز فتح پوری بھی بڑی مہربانی سے پیش آتے تھے۔

پیرانہ سالی و عدم صحت نے حافظے کو خاصا کمزور کردیا ہے اور نتیجۃً حالات کو تسلسل زمانی میں پیش کرنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔ ہاں، قبلہ نیاز فتح پوری سے آخری ملاقات ۱۹۲۱ء میں ہوئی، اس دوران وہ اقبال خصوصی نمبر ترتیب دے رہے تھے جو ۱۹۲۶ء میں شائع ہوا۔ جب ان کے آفس پہنچا اور تسلیمات عرض کرتے ہوئے ان سے مخاطب ہوا تو کہنے لگے کہ

"اب تم انگریزی کے پروفیسر ہو کر آسام کیا چلے گئے ہو، عید کا چاند ہی ہو گئے ہو۔ بسا اوقات تم کچھ نہ کچھ تعمیری و انتقادیاتی سوالات تلاش ہی کر لیتے تھے...
میں نے عرض کیا کہ کیا اقبال کے کلام پر بھی زبان و اظہار کے حملے کئے ہیں جیسے آپ دوسروں پر کرنے کے عادی ہیں۔ مجھے معلوم ہے بہ خوبی یاد ہے کہ آپ لفظ "عادی" کو اردو میں مستعمل معنوں میں صحیح نہیں سمجھتے اور "معتاد" کو استعمال کرتے ہیں...
کہنے لگے کہ "انگریزی کے پروفیسر ہو، لہذا ایسے معترضات پر نگاہ رکھتے ہو مگر

پہلے اداریہ پر سرسری نظر ڈالو دراں حالیکہ اس میں ابھی ترمیمات بھی ہوسکتی ہیں .....،

" اداریہ بہت خوب ہے ، بالخصوص مجھے یہ نکتہ بڑی روشن خیالی سے عبارت معلوم ہوتا ہے کہ کلام اقبال میں اسلام سے زیادہ مسلمانوں کی عہد وسطیٰ کی تاریخ پر زیادہ زور صرف کیا گیا ہے ۔ بہت خوب مگر آپ نے اظہار و بیان کے اسقام سے پہلو تہی کرنا پسند کیا ہے ، کیوں ؟"

" وضاحت کرو ،، نیازؔ صاحب نے جواب میں فرمایا

" لب کشائی کی جرأت کرتا ہوں ، گستاخی معاف ہو ویسے اس نوعیت کے نکات میں نے 'نگار' کے مطالعے ہی سے حاصل کئے ہیں ، عرض ہے " تصویر درد " کا معروف شعر ؎

یہ دستورِ زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری

فارسی میں " زباں بندی ،، میں جادو سے کسی کی زبان بند کر دینا ، حاکم کی عدالت میں گواہی دینا یعنی اظہار و شہادت وغیرہ معنوں میں مستعمل ہے ۔ چوں کہ شعر ہذا میں زباں بندی کو اضافت کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے لہذا وہ معنی جس میں اقبال نے نظم کیا ہے شعر سے برآمد نہیں ہوتے ۔ اردو میں زباں بندی کو پابندی تقریر کے لئے استعمال کیا جاتا ہے ۔ چکبست ، سرور جہاں آبادی ، عزیز لکھنوی ، جگت موہن رواں ، غرض کہ کسی کے ہاں یہ استعمال دیکھنے میں نہیں آتا ۔ چکبست نے کہا ہے ؎

زباں کو بند کریں یا مجھے اسیر کریں میرے خیال کو بیڑی پنہا نہیں سکتے

یہ سب کچھ میں آپ کے موقف کی روشنی میں کہہ رہا ہوں ، ویسے میں اقبال کے اس اجتہاد کو پسند کرتا ہوں ۔ یگانہ چنگیزی کا بھی یہی نظریہ رہا ہے (یگانہ سے روا رکھے گئے سلوک کے بارے میں بعد کو عرض کروں گا) کہ اضافت کے ساتھ فارسی تراکیب کو اردو معنوں میں استعمال غلط نہ سمجھا جائے یہی بہتر ہے .... "

" .... دوسری مثالیں .،، نیازؔ صاحب نے مسکراتے ہوئے فرمایا ۔

" دوسری مثالیں ۔ قبلہ آپ جانتے ہیں کہ اردو میں نشہ کرانا ہے ، نشہ پلانا نہیں ۔ نشہ پلانا پنجابی روزمرہ ہے اور اقبال کے ہاں مقامیت بہت ابھری نظر آتی ہے ؎

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے مزہ تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

میں کیا اردو روزمرہ ہے ۔ مشکل یہی ہے کہ اقبال کی مادری زبان پنجابی تھی ، اردو یا فارسی نہیں ۔ " پیام مشرق " کے ایک شعر میں انڈا دینے کے معنوں میں خایہ انداختن ملتا ہے ، جب کہ تخم ریختن غالباً درست ہے ۔ اور کیا عرض کروں ۔ تذکیر و تانیث کی غلطیاں بھی ہیں ۔ مثلاً ، سوامی رام تیرتھ پر اپنی نظم میں لفظ " دارد " بہ طور مونث استعمال کیا ہے جب کہ باتفاق آرا مذکر ہے وغیرہ وغیرہ

" اس موضوع پر مضمون پندرہ بیس دن میں ترسیل کر دینا ۔" میں نے معذرت چاہی کیوں کہ آسام میں آ کر مجھے موجودہ انگریزی شاعری پڑھانے کا حکم مل چکا تھا لہٰذا فرض منصبی کے پیش نظر میں نے معذرت پیش کرتے ہوئے انکار کر دیا ۔ ."

اقبال نمبر کے تمام مضامین میں مجھے احتشام حسین اور عظیم فیروز آبادی کے مقالے بہت اہم معلوم ہوئے ۔ اقبال نمبر ۲۶ میں شائع ہوا ۔ اس کے پہلے کی ملاقات کے نقوش ابھر آئے ہیں ۔ آسام آنے کے بیشتر میں جھنجھنوں (راجستھان) ایم ایل کالج (پی جی) میں صدر شعبہ انگریزی تھا ۔ غالباً ۵۸ء یا ۵۹ء میں فراقؔ گورکھپوری اور استاذی اثرؔ لکھنوی کے مابین شعری مسائل پر بحث چل پڑی تھی اور ہر ماہ " نگار " میں فراقؔ یا اثرؔ کا پر مغز مضمون شامل ہوا کرتا تھا ۔ تھوڑے عرصے بعد نیازؔ صاحب بھی بحث میں کود پڑے تھے ۔ میں جب لکھنؤ پہنچا تو استاذی اثرؔ مرحوم سے دریافت کئے بغیر وہ مضمون نیازؔ صاحب کو پیش کیا ۔

" ارے بھئی ، آتے آتے مضمون لکھ ڈالا ۔ اثرؔ صاحب کو تو دکھا لیا ہوگا . . ."

" میں یہ حماقت نہیں کر سکتا تھا، ورنہ استاذی مجھے روک دیتے، موصوف بہ حیثیت انسان جو ہیں آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں " میں نے کہا۔

اس کے بعد، میں نے نیاز صاحب سے مودبانہ دریافت کیا کہ یگانہ چنگیزی سے کیا گیا سلوک کیا لکھنؤ کی ثقافت پر ہمیشہ بدنما داغ نہیں بنا رہے گا، مزید برآں آپ نے ان بدتمیزوں کو روکنے کے لئے کیا کیا جنھوں نے ایسے عظیم شاعر کا منہ کالا کر کے گدھے پر بٹھا کر لکھنؤ کی گلیوں میں گھمانے کی نازیبا حرکت کی اور وہ بھی اس لئے کہ یگانہ شاعر و نقاد کو برداشت نہ کر سکے۔ میں کچھ جذباتی ہو گیا تو نیاز صاحب نے فرمایا کہ

" تم سنو تو۔ اپنا مضمون مجھے دے دو، کسی شمارے میں شامل کر دوں گا۔ یگانہ کی بابت جس المیہ کا تم نے ذکر کیا ہے اس کی اطلاع مجھے ڈراپ سین کے بعد ہوئی۔ فضا میں اشتعال تھا۔ ملا صاحب چاہتے تو بہت کچھ کر سکتے تھے مگر نہ جانے کیوں انھوں نے کوئی کوشش نہ کی، ایسا معلوم ہوتا ہے۔ میں نے ان سے دریافت کرنا نامناسب سمجھا۔۔۔ آخر یگانہ کو یہ کہنے کی ضرورت کیا تھی کہ میں احمدیہ ہوں اور کلام مجید پر حاشیہ لکھ رہا ہوں، مزید براں یگانہ کا یہ شعر ؎

سمجھ میں کچھ نہیں آتا پڑھے جاؤ تو کیا حاصل
نمازوں کا ہے کچھ مطلب تو پردیسی زباں کیوں ہو

اشتعال کا موجب بنا ہوا تھا ہی۔۔۔ "

" مگر احمدیہ تو آپ بھی ہیں، میرا خیال ہے ۔۔۔۔ " میں نے معذرت پیش کرتے ہوئے کہا۔

" تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو، تم سے کس نے کہا " قدرے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

" آپ کے مالہ ماعلیہ کے کالم کے تحت ملفوظات تو یہی تاثر دیتے ہیں، معاف فرمائیں، آپ بزرگ ہیں اور میں آپ کا احترام کرنا لازمی سمجھتا ہوں۔ اگر بارِ خاطر ہوا ہو میں معذرت خواہ ہوں۔۔۔ " میں نے عرض کیا۔

اور بھی باتیں ہوئیں مگر بھول رہا ہوں۔ ہاں، فراق کے خلاف میرے مضمون کو کسی شمارے میں شامل نہیں کیا۔ یاددہانی کرانے پر مجھے جواب یہ ملا کہ " بھئی تم بھول رہے ہو، مضمون تو تم نے دیا ہی نہیں تھا۔ میری میز پر رکھنے کے بعد غالباً نادانستہ طور پر مضمون دوبارہ اپنے بیگ میں رکھ لیا تھا۔" غلط بیانی تھی مگر وہ میرے بزرگ تھے میں نے پھر کبھی اس موضوع پر موصوف کو نہیں لکھا۔ معاصر مشاہیر کے خلاف لکھنا، کسی مطبوعہ غزل و نظم میں شعری اسقام کی نشاندہی کرنا ان کا پسندیدہ مشغلہ ہوا کرتا تھا۔ دوران طالب علمی میں جب تب اکتساب فیض کے لئے نگار کے آفس پہنچ جاتا اور کبھی کبھی وہ مجھ سے پروف ریڈنگ بھی کروا لیا کرتے تھے جس کو میں موجب افتخار و تفوق ہی سمجھتا تھا۔ ایک دفعہ پہنچا تو دیکھا کہ کسی مضمون پر ان کی توجہ مرکوز تھی قلم ہاتھ میں تھا۔ نظریں چھت کی جانب تھیں۔ میری آداب عرض پر قدرے چونک کر بولے " ارے تم آ گئے، بیٹھے کہاں سے آ رہے ہو؟ "

" استاد ہوسٹل سے آ رہا ہوں، قدم بوسی کے بعد کشمیری محلہ جاؤں گا۔"

آج کس پر نشانہ لگایا جا رہا ہے ۔۔۔؟ "

" ناطق گلاوٹھی اتنی مدت سے مشق سخنوری میں مصروف ہونے کے باوجود اچھا بے سقم کلام پیش نہیں کر سکتے۔ مضمون پورا ہو گیا ہے، سرخی پر غور کر رہا تھا "

"قطع کلام، معاف فرمائیں، ناطق کی رعایت سے منظوقاتِ ناطق عنوان کیسا رہے گا۔۔۔۔۔"

"خوب، خوب، تم سیکھنے کی کوشش کرتے ہو، بہت اچھا عنوان ہے اور یہی دے رہا ہوں۔"

غرض کہ بے شمار یادوں کے دھندلائے نقوش حافظے میں بزم آرا ہیں، مگر بہ خوف طوالت مضمون کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔ بہ قول اقبال؎

من از ذوقِ حضوری طول دادم داستانے را　　　بہ حرفِ می تواں گفتن تمنائے جہانے را

مگر ختم کرنے کے پیشتر کئی باتیں اور ضروری معلوم ہونے لگیں لہذا با اختصار ان کی نشاندہی کرتا چلوں۔ ہر ایک کے اپنے ضبط و خبط، تصورات وتحفظات وغیرہ ہوتے ہیں۔ نیاز صاحب، عادی، رویہ، تنقید کو غلط لغات سمجھتے تھے۔ عادی کی جگہ معتاد اور تنقید کی جگہ انتقاد کو صحیح تصور کرتے تھے۔ اردو زندہ زبان ہے اور اخذ وقبول کے سلسلے چلتے ہی رہینگے۔ ایک بات جس پر وہ بہت زور دیتے تھے روزمرہ ہے۔ روزمرہ کے معاملات میں ہر عظیم شاعر وادیب خاصا محتاط رہتا ہے۔ مثلاً، محاورے میں میلے ٹھیلے۔ اہلاً سہلاً ہیں اور ان کو چھیڑنا فی الواقع غلط اقدامی ہوگی۔ میلے ٹھیلے اور بات ہے، میلے اور ٹھیلے دوسری بات، اسی طرح اہلاً اور سہلاً کہنا غلط ہوگا۔ پاکستان کے نامی شاعر وادیب جناب شان الحق حقی صاحب کے ہاں ایسے اغلاط کی نشاندہی میں نے اپنی تحریروں میں' جو طلوع افکار' کراچی میں شائع ہوئیں کی تھی۔ اب موصوف کا بھگود گیتا کا اردو ترجمہ شائع ہوا ہے۔ اس میں بھی ایسی غلطیاں نظر آتی ہیں، مثال کے طور پر، روزمرہ میں چھب ڈھب ہے اور موصوف نے دونوں کے مابین " اور "، کا اضافہ کردیا ہے۔

ذرا آچاریہ جی دیکھیں تو اس لشکر کی چھب اور ڈھب
تمہارے خوشہ چیں دردید کے جائے کے ہیں یہ کرتب　　　(ص ۳۶۰)

شعر میں سقم کر یہ بھی در آیا ہے۔ آچاریہ جی (؟) کے ساتھ تمہارے کہنا درست نہیں ہے۔ مزید برآں دروناچاریہ کے ساتھ " جی "، چپکانا بھی غلط ہے۔ آچاریہ جی معمولی معلم کے معنوں میں اور صرف آچاریہ کہنا دھرم کے ساتھ ہم آہنگ ہوتا ہے۔ مذہب اور دھرم کے معنی ومفہوم علیحدہ ہوتے ہیں۔ حقی صاحب کا حوالہ دینا جملہ معترضہ تو ہے مگر میں نے یہ نکات نیاز، آثر نیز دوسرے مشاہیر ہی کی خدمت میں رہ کر حاصل کئے ہیں۔

نیاز فتح پوری کی خدمات کے پیش نظر مرکزی سرکار نے پدم بھوشن کا خطاب عطا کیا پھر نہ جانے کیوں تھوڑے عرصے بعد خبر آئی کہ نیاز صاحب نے پاکستان جانے کا فیصلہ لے لیا ہے۔ مجھے بھی مطلع کیا کہ جب تک حیات ہوں "نگار" ماہنامے کی اعزازی ترسیل تمہارے نام ہوتی رہے گی، اور انھوں نے اپنا وعدہ ایفا بھی کیا۔ نگار پاکستان کے ایک شمارے میں یہ اطلاع کہ ہندستان میں زرِ سالانہ برہم ناتھ دت صابر، کرشن گلی، امرتسر کے توسط سے ارسال کیا جائے۔ میں حیران تھا کہ آخر صابر صاحب سے نیاز صاحب کے مراسم کب سے تھے۔ صابر صاحب میرے مہربان تھے۔ ان سے رجوع کرنے پر معلوم ہوا کہ نیاز صاحب حسب ونسب کے حامل نہ تھے نیز ان کی بیوی ہجرت کر چکی تھیں مجبوراً وہ چلے گئے۔ مضمون کو اس موضوع پر مزید وضاحت سے طول دینا شرافت کے منافی معلوم ہوتا ہے۔

نیاز صاحب کے صحافتی کو انکسے سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ زمانہ کانپور، نگار، اور شاعر تینوں باوقعت رسالے تھے۔ سیماب اکبرآبادی کا " شاعر " اپنے وجود میں اکادمی اوصاف سے حامل ہوکر آج تک منفرد وممتاز رسالہ ہے۔ لیکن نیاز صاحب کا " نگار " اس آب وتاب سے بیگانہ نظر آتا ہے۔ کاش صحت اجازت دیتی تو اور بھی لکھتا ع

ہزار نکتہ دریں کار وبار دلداریست

نیاز فتحپوری کی ادبی صحافت

ڈاکٹر مجید بیدار
مولانا آزاد کالج - اورنگ آباد (مہاراشٹر)

ادبی حلقوں میں نیاز فتحپوری اور نگار کی صحافت کے چرچے ہر دور میں رہے ہیں اور ان کے ادبی معیار اور صحافت کے مزاج کی وجہ سے یہ سلسلہ اردو زبان و ادب کے وجود تک جاری رہے گا۔ اردو کے بیشتر ادیبوں نے صحافت سے وابستگی کے بعد اپنے رسالہ اور جریدہ کو مکمل طور پر صحافت سے وابستہ کر کے نئی نئی اصناف کی بنیاد رکھی یا پھر ادب کو صحافت پر نچھاور کر دیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد جیسے جید عالم اور ادب کے پارکھ بھی صحافت کے نقیب بن کر رہ گئے۔ مولانا محمد علی، محمد عثمان فارقلیط اور ایسی ہی بے شمار ادبی ہستیوں کے نام لیے جاسکتے ہیں جن کی ادب نوازی پوری طرح صحافت کے پہاڑ کے روبرو رائی کا پربت بن گئی لیکن نیاز فتحپوری نے رسالہ نگار کے پہلے شمارہ ۱۹۲۲ء سے لے کر وفات ۱۹۶۶ء تک پوری شان و شوکت سے اپنے رسالہ کی ادبی صحافت کو برقرار رکھا اور کبھی بھی صحافت کو ادب پر کمند پھینکنے کا موقع نہیں دیا۔ یہی وجہ رہی کہ اردو کے دیگر ادبی رسالوں کے مقابلہ میں "نگار" اپنے خاص ادبی نمبروں کی وجہ سے ادبی صحافت کا نقیب اور اس کے مدیر کے ادبی تفکرات کا نمائندہ بن کر ابھرتا ہے۔

نیاز فتح پوری ایک ایسے دور کے پروردہ تھے جب کہ مشرقی علوم دم توڑ رہے تھے۔ مغربی علوم کی افادیت اور اس کی کارفرمائی نے ساری دنیا کے ادبیات میں تہلکہ مچادیا تھا۔ ادب نوازی اور ادب پروری عروج پر تھی لیکن مشرقی ادبیات کو مغربی تفکرات کی خراد پر کسنا معیوب سمجھا جارہا تھا۔ ایسے پرآشوب ماحول میں نیاز فتحپوری نے اپنی ادبی صحافت کے ذریعے یہ ثابت کر دیا کہ عمدہ اصولوں کے اختیار کرنے میں مشرق اور مغرب کے فرق کو ختم کیا جانا چاہیے، یہی وجہ رہی کہ انھوں نے بےلاگ تبصروں اور ادبی جائزوں کے توسط سے "نگار" کو ایک ایسا رسالہ بنادیا جو خالص ادبی روایات کا پاسدار ہونے کے ساتھ ساتھ مشرق اور مغرب کی تفریق کو مٹانے کا سبب بنا۔ اگرچہ اس دور میں مولانا عبدالحلیم شرر کے "دلگداز" حافظ محمد عالم کا رسالہ "عالمگیر" اور سیماب اکبرآبادی کے جریدہ "شاعر" نے ادبی صحافت کی جانب پیش قدمی کی تھی۔ اس سے قبل مولانا حسرت موہانی کے رسالہ "اردوئے معلی" نے ادبی صحافت کی خاص نہج کو رواج دیا تھا لیکن ان ادبی رسائل و جرائد کو شہرت دوام اس لیے حاصل نہ ہو سکی کہ ان کے مدیران نے مشرقی ادبی اصول نقد کو ہی سہارا بنایا تھا جب کہ مغربی اصول نقد کو شجر ممنوعہ کی حد تک معیوب سمجھنے لگے تھے۔ نیاز فتح پوری واحد مدیر ہیں جنھوں نے نگار کے توسط سے بہترین مغربی اصول نقد کو صحافت میں شامل کر کے ادبی صحافت کی روایتی ڈگر کو ایک نئی سمت سے آشنا کیا اور اپنی ادبی تنقیدوں کے ذریعہ نگار کی صحافت کو معیار اور اعتبار سے ہمکنار کر دیا۔

"نگار" کی شان یہ رہی کہ ہر سال کا جنوری کا شمارہ خاص نمبر ہوتا۔ نیاز فتح پوری نے اپنی ادارات میں "نگار" کے کئی خاص نمبر شائع کئے جن میں ان کی ادبی صحافت ابھر کر سامنے آتی ہے۔ عام طور پر یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ ادبی موضوعات پر تنقید و تبصرہ اور ادبی شخصیات و کتب کی جانچ، پرکھ اور ان کی تحقیق ہی ادبی صحافت ہے۔ حالانکہ ادبی صحافت اس مختصر تعریف سے کہیں زیادہ بالاتر ہے کیونکہ ادبی صحافت مخصوص مزاج کے توسط سے باسلیقہ اور فکرمند قاری کو ادبی شعور سے مالامال کرنے کا فریضہ انجام دیتی ہے اور اس قسم کی صحافت سے ادب کے بے شمار گوشے وا ہوتے اور فراموش کردہ ادبی موضوعات کی بازیابی ممکن ہے۔ یہ کہنا قطعی غلط ہے کہ ادبی صحافت میں تحقیق اور تنقید کو ثانوی حیثیت دی جاتی ہے جب کہ ادبی صحافت میں گہرائی اور گیرائی تحقیق و تنقید سے پیدا ہوتی ہے اور اسی رویہ کی وجہ سے ادبی صحافت کے ذریعہ قاری علم و فن سے بہرہ ور اور مسرت و بصیرت سے آشنا

ہو کر ادب سے لگاؤ پیدا کرتا اور اپنی ذات کو ادب کے مختلف اصناف اور موضوعات سے وابستہ کر لیتا ہے ۔ نیاز فتح پوری کے جریدہ " نگار " کی تمام خصوصی اشاعتوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں ادبی صحافت کے تمام اصولوں کی پاسداری ہوتی ہے ۔ اس لیے برسہا برس گزر جانے کے بعد بھی " نگار " کے خاص نمبروں میں جاذبیت موجود ہے اور ادب کا قاری ان خاص نمبروں کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہے ۔ دور حاضر میں اس قسم کی ادبی صحافت اور صحافی کی عدم موجودگی کی وجہ سے ادب کے قارئین کی تعداد میں کمی آئی ہے اور زبان و ادب کا مخلص صحافی موجود نہ ہونے کے نتیجہ میں ادبی صحافت دم توڑ رہی ہے جس کے لازمی نتیجہ کے طور پر قاری کی توجہ ادب سے دور ہوتی جا رہی ہے ۔

ادبی صحافت کے چند پہلوؤں میں سے ایک پہلو تجسس کی برقراری ہے ۔ جس طرح آج کی صحافت میں " سس پنس " کو اہمیت حاصل ہے ، اسی طرح قاری کی توجہ کو ادبی صحافت سے مربوط رکھنے کے لیے زبان و بیان کے ایسے گوشوں کو روا رکھنا پڑتا ہے جس سے قاری کے ذہن کو تجسس سے وابستہ کیا جائے ۔ اس قسم کا تجسس عام طور پر تصورات کے بت گرانے اور تحسسات کی عمارتیں تعمیر کرنے سے پیدا ہوتا ہے ۔ نگار کے " جگر نمبر " کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ یگانہ نے " غالب شکن " لکھ کر جس طرح غالب کے پرستاروں کو اندھی تقلید سے روکا تھا ۔ اسی طرح نیاز فتح پوری نے جگر کی شہرت کا سبب صرف ان کی خوش الحانی کو قرار دیتے ہوئے انھیں خوش فکر شاعر لیکن خوش گو نہ ہونے کے الزام سے وابستہ کر کے جگر پرستی کے بت کو توڑا ہے ۔ جو ادبی صحافت کی بت شکنی کی مثال ہے اسی طرح حسیت کی عمارت تعمیر کرنے میں نیاز فتح پوری جیسا کوئی صحافی نہیں ۔ جو حسی پیکروں کو تراشتا اور اس کی خوب صورت عمارت تعمیر کر کے رنگ و روغن سے حسین بنا دیتا ہے ۔

نیاز فتح پوری کی صحافت کا میلان ادب کی خدمت رہا ، اسی جذبے کے نتیجہ میں انھوں نے نگار کی بے شمار خصوصی اشاعتوں کے ذریعے اس جدوجہد کا آغاز کیا کہ اردو داں طبقہ کو ہمہ جہتی معلومات سے ہم آہنگ کر دیا جائے چنانچہ ان کی ادارت میں شائع ہونے والا جریدہ " نگار " جہاں آفاقی تجربات کو قید کرتا اور ارضی ایجادات کی تشریحات کرتا نظر آتا ہے وہیں مابعد الطبیعیاتی اصولوں کی بیخ کنی کر کے فلسفہ ، منطق ، نفسیات اور جنسیات کی ایسی ٹھوس حقیقتوں کو رونما کرتا ہے جس کی عقدہ کشائی کو ان کے دور تک غیر ضروری سمجھا گیا تھا ۔ نیاز فتح پوری نے اپنی ادبی صحافت کے ذریعے عریاں حقیقتوں کی نہ صرف تنظیم کی بلکہ ان کے فنی محاسن کے تجزیے سے بے شمار نکات پیدا کیے جو ادب کی دنیا کے لیے ایجادات ثابت ہوئے ۔ وہ اردو کی ادبی صحافت کے کولمبس ہی نہیں بلکہ ابن بطوطہ بھی ہیں ۔ ان کا بہترین مشغلہ ادب کی نئی نئی دنیاؤں کی کھوج کرنا اور انھیں آباد کر کے ان کے سفر نامے تحریر کرتا ہے ۔ اس کی مثال " نگار " کے خاص نمبروں سے واضح ہو جاتی ہے ۔

نیاز فتح پوری کی ادبی صحافت جہاں مشرق سے مستجابی کو اختیار کرتی ہے وہیں مغرب کی احتسابی کو قبول کر کے " مشرق سے حذر کر نہ مغرب سے حذر کر " کے مصداق متوازن رویے کی علمبردار ہو جاتی ہے ۔ یہ ممکن ہے کہ نیاز فتح پوری کی ادبی صحافت پر بعض ناقدین حاشیہ آرائی کریں اور یہ ثابت کریں کہ یوروپی علوم و فنون اور اس کی گھن گرج نے ان کی صحافت کو یوروپ نواز بنا دیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ ادب ، شعر ، زندگی اور نفسیات کے بارے میں یوروپی فلسفہ نے جو تہلکہ مچایا تھا اس سے اردو طبقہ کو واقفیت دلانے میں سب سے اہم کردار " نگار " نے ادا کیا ۔ " نگار " کے " انتقادیات نمبر " کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اردو کے بیشتر اساتذہ ابھی تک اسی دوراہے پر کھڑے ہیں جہاں لا کر ماہ نامہ " نگار " نے کھڑا کیا تھا ۔ نگار کی ادبی صحافت کو پڑھ کر سمجھ لینا اور اس کا اطلاق طلبہ پر کرنا آسان ہے ۔ اسی لیے اساتذہ ابھی تک اسی ڈگر پر کھڑے ہیں کیونکہ بعد کی تنقید نے ایسا پیراہن اختیار کیا کہ تنقید کے سارے محاسن لفظوں کی چوپچ میں بند ہو گئے اور آج کا قاری تنقیدی کتابوں کے ڈھیر سے گونگا اور بہرہ ہو کر رہ جاتا ہے ۔ نیاز فتح پوری کا کمال یہی تھا کہ انھوں نے اپنے دور میں ادبی صحافت کے لیے ایسے طرز اظہار کا سہارا لیا جو آج نصف صدی گزرنے کے باوجود بھی مقبول ہے اور دلوں میں اتر جاتا ہے ۔

نیاز فتح پوری کی ادبی صحافت میں نکتہ چینی کی گنجائش نہیں اور نہ ہی وہ حاشیہ آرائی سے کام لیتے ہیں بلکہ حقیقت کی عقدہ کشائی کے ذریعہ فن کی باریکی ، بلند آہنگی اور محاسن سے آشنائی کراتے ہیں ، ایسے موقعوں پر وہ عبارت آرائی سے پرہیز کرتے اور کم سے کم الفاظ میں عندیہ بیان کرنے پر زور

دیتے ہیں جس کی بہترین مثال " ریاض خیرآبادی نمبر " سے دی جاسکتی ہے ۔ نیاز فتح پوری کی ادبی صحافت کا یہ کرشمہ ہے کہ وہ دل گرفتگی کی تمام تر صلاحیت رکھتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ آج بھی تحریروں میں بستے ہیں ۔

دور حاضر میں صحافت کو سیاست نے اپنے گھیرے میں لے لیا ہے ۔ نیاز فتح پوری کے دور میں بھی سیاست کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا ۔ مولانا ابو الکلام آزاد نے " الہلال " اور " البلاغ " کے ذریعے اور مولانا محمد علی نے " کامریڈ " اور " ہمدرد " کے ذریعے سمندر کی موجوں کو جوار بھاٹا سے ہم آہنگ کر دیا تھا ۔ سارے ہندوستان میں جدو جہد آزادی کا بگل بج چکا تھا ۔ اس سیاسی دار و گیر میں ہنگامہ آرائیوں سے بے نیاز ہو کر ادبی صحافت کو فروغ دینا نیاز فتح پوری کا ہی کام تھا ۔ اردو کے رسائل و جرائد کی تاریخ میں نیاز فتح پوری نے سرسید احمد خاں کی طرح ادبی صحافت کو سیاست سے آلودہ ہونے نہیں دیا بلکہ اپنی وسعت نگاہ کا ثبوت دینے کے لیے تاریخ اسلام نمبر، اصحاب کہف نمبر، مشرق وسطیٰ نمبر، پاکستان نمبر، علمائے اسلام نمبر، فرمانروایان اسلام نمبر اسلامی تعلیمات نمبر اور معلومات نمبر شائع کیے ۔ جن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک ادیب اور صحافی ہی نہیں بلکہ اپنے عہد کے بہت بڑے عبقری تھے اور اردو کے ادبی رسالوں میں " نگار " کو جو مقام و مرتبہ حاصل ہے ۔ اس کے درجہ کو نہ تو سرسید کا رسالہ " تہذیب الاخلاق " پہنچ سکتا ہے اور نہ سیماب اکبرابادی کا رسالہ " شاعر " ۔ نگار ایک رسالہ ہی نہیں بلکہ اردو ادب کی تنظیم و تہذیب کا ایک وسیلہ تھا ۔ شاید اسی وجہ سے جدید نگار کے مقابلہ میں قدیم " نگار " کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے ۔ اردو رسالوں کو ایسے باسلیقہ اور سخن فہم مدیران بہت کم ملے ہیں ۔ ایسا لگتا ہے کہ ان کا مقصد زندگی ہی رسالہ مرتب کرنا رہا ۔ ان کے ناقدین ان سے اختلاف کرنے کی بجائے ان کی رائے کو قبول کرلیتے ہیں ۔ نیاز فتح پوری کے طرز پر اظہار خیال کرتے ہوئے پروفیسر محمد عبدالقیوم نعمانی " نگار " انتقاد نمبر ۲ / فروری ، مارچ ۴۶ء میں یہ اعتراف کرتے ہیں

> " مولانا نیاز کی طبیعت میں بڑی جدت پسندی ہے اور وہ اچھے اختراعی ذہن کے مالک ہیں چنانچہ ان کے ہر خیال اور ہر تحقیق میں ایک جدت اور ندرت ہوتی ہے چنانچہ وہ اکثر ادب ، شعر ، مذہب ، فلسفہ اور دوسری چیزوں میں جمہور کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے ایک نئی رائے پیش کرتے ہیں اور اس میں ہمیشہ اس قدر وزن رہتا ہے کہ باوجود شور و ہنگامہ کے وہ اپنی وقعت حاصل کرلیتی ہے " ۔

بلاشبہ نیاز فتح پوری کی ہمہ جہت شخصیت کا اثر ان کے جریدے " نگار " پر پڑا اور جس طرح پارس سے مس ہو کر ہر چیز سونے کی ہو جاتی ہے اسی طرح نیاز کے قلم کی جلا پا کر " نگار " جیسے رسالہ میں ادبی صحافت کے ایسے جوہر ابھرے کہ وہ سونے سے زیادہ وقیع اور اہمیت رکھنے والا رسالہ قرار دیا گیا چنانچہ آج بھی بعد مرور زمانہ نگار کے خصوصی نمبر اپنی ادبی شان کی وجہ سے وقعت کے حامل سمجھے جاتے ہیں اور جیسا جیسا زمانہ گزرتا جائے گا نگار کے خصوصی نمبروں کی اہمیت میں بھی اس کی ادبی صحافت کی وجہ سے اضافہ ہوتا جائے گا ۔

" "

....

ڈاکٹر عبادت بریلوی ——— نیاز فتحپوری کے تنقیدی نظریات اور انداز تنقید دونوں اس بات کو ظاہر کرتے ہیں کہ ان کا رجحان جمالیات کی طرف ہے اور اس کی نوعیت تاثراتی ہے ۔ وہ پہلے نقاد ہیں جس نے تاثراتی تنقید کی طرف پوری توجہ کی ۔

نیاز کی ادارت میں "نگار" کے خاص نمبروں پر ایک نظر

اسیم کاویانی - "ہل ویو" تھرڈ فلور
نوانگر، ڈوکیارڈ روڈ - بمبئی - ۱۰

"نگار" کا پہلا شمارہ آگرہ سے فروری ۱۹۲۲ء میں شائع ہوا اور دسمبر ۱۹۲۲ء تک ۱۱ شمارے آگرہ سے نکلے۔ اس کے بعد بھوپال سے جنوری ۱۹۲۳ء سے جون ۱۹۲۶ء تک کل ۴۵ شمارے شائع ہوئے۔ بعدازاں لکھنؤ سے نگار جولائی ۱۹۲۷ء سے نیاز صاحب کے پاکستان ہجرت کرنے یعنی جولائی ۱۹۶۲ء تک شائع ہوتا رہا۔ لکھنؤ ہی میں نیاز صاحب نے جنوری ۱۹۲۸ء میں "مومن نمبر" سے ہر سال کے آغاز میں نگار کا سالنامہ یا خاص نمبر شائع کرنے کی روایت شروع کی، جو اکثر کسی ایک خاص موضوع پر ہوا کرتا تھا۔ "نگار" کے لکھنوئی عہد میں "نگار" کے ۲۶۴ عام شمارے اور ۳۵ خاص نمبر چھپے، بعدازاں "نگار" تسلسلِ اشاعت کے اعتبار سے "نگار پاکستان" کے نام سے اگست ۱۹۶۲ء سے کراچی سے شائع ہونا شروع ہوا۔ (اگرچہ جنوری ۱۹۶۲ء سے جولائی ۱۹۶۲ء تک "نگار" لکھنؤ کا چربہ کراچی میں "نگار پاکستان" کے نام سے شائع ہوتا رہا تھا) نیاز اپنے انتقال مئی ۱۹۶۶ء تک نگار کے مدیر اعلیٰ رہے، یوں مجموعی طور پر نگار کے کل عام شماروں کی تعداد ۴۶۸ اور خاص نمبروں کی تعداد ۳۸ تک جا پہنچتی ہے۔ اِن میں مندرجہ ذیل ۱۱ خاص نمبر ایسے ہیں جنھیں مکمل طور پر نیاز صاحب نے تحریر کیا:

۱۔ ملاحظات نمبر (جنوری ۱۹۳۳ء)
۲۔ اصحابِ کہف نمبر (جنوری ۱۹۳۶ء)
۳۔ اسلامی ہند نمبر (جنوری ۱۹۳۸ء)
۴۔ مآخذ القرآن نمبر (جنوری فروری ۱۹۴۵ء)
۵۔ پاکستان نمبر (جنوری فروری ۱۹۴۸ء)
۶۔ فرماں روایانِ اسلام نمبر (جنوری فروری ۱۹۵۴ء)
۷۔ علومِ اسلامی و علمائے اسلام نمبر (جنوری فروری ۱۹۵۵ء)
۸۔ خدا نمبر (جنوری فروری ۱۹۵۶ء)
۹۔ معلومات نمبر (جنوری فروری ۱۹۵۸ء)
۱۰۔ تنقیحِ اسلام نمبر (جنوری فروری ۱۹۵۹ء)
۱۱۔ غالب نمبر (جنوری فروری ۱۹۶۱ء)

علاوہ ازیں ذیل کے خاص نمبروں میں نصف یا پھر غالب حصہ نیاز صاحب نے تحریر کیا:

۱۔ مکاتیبِ نیاز کا انتخاب نمبر (جنوری فروری ۱۹۶۰ء)
۲۔ ایک مستقبل کی تلاش نمبر (جنوری ۱۹۵۱ء)

حیرت انگیز امر یہ ہے کہ نیاز ساڑھے چوالیس سال تک "نگار" پابندی سے نکالتے رہے۔ ایک شمارے کا بھی ناغہ نہیں ہوا، اسی طرح انھوں نے جب ۱۹۲۸ء سے ہر سال "نگار" کا خاص نمبر یا سالنامہ نکالنا شروع کیا تو یہ سلسلہ بھی کبھی منقطع نہیں ہوا۔ آیئے نیاز کی ادارت میں "نگار" کے

خاص نمبروں پر ایک نظر ڈالیں :

جنوری ۱۹۲۸ء مومن نمبر: "نگار" کا پہلا خاص نمبر "مومن نمبر" نیاز کے اس چونکا دینے والے جملے سے شروع ہوتا ہے۔ "اگر میرے سامنے اردو کے تمام شعرائے متقدمین و متاخرین کا کلام رکھ کر (بہ استثنائے میر) مجھ کو صرف ایک دیوان حاصل کرنے کی اجازت دی جائے تو میں بلا تامل کہہ دوں گا کہ مجھے کلیاتِ مومن دے دو اور باقی سب اٹھالے جاؤ"۔ دنیائے ادب اور فضائے شعر و سخن میں یہ بالکل پہلی آواز تھی جس نے لوگوں کو مومن کی طرف سنجیدگی سے متوجہ کیا اور اہلِ قلم، غالب و اقبال کی مقبولیت اور شہرت کے حصار سے نکل کر مومن کی شخصیت و فن کو بھی اپنے تفصیلی مطالعے کا موضوع بنانے پر مایل ہوئے۔ مومن کی شخصیت و فن (بالخصوص فن) پر جو تحقیقی و تنقیدی مواد نیاز نے مومن نمبر میں پیش کیا وہ اس پر آیندہ کام کرنے والوں کے لئے بنیادی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ مومن نمبر کی مقبولیت کا ایک ثبوت یہ ہے کہ نیاز کی زندگی ہی میں اس کے دو اڈیشن اور شائع ہوئے۔ دوسرا اڈیشن بغیر کسی اضافے کے چھپا اور تیسرا اڈیشن بعض نئی نگارشات اور دو سو صفحات کے اضافے کے ساتھ ۱۹۶۴ء میں پاکستان سے شائع ہوا۔

جنوری ۱۹۲۹ء "انتخابِ مضامین" نمبر: "نگار" کی زندگی کے آٹھ سال مکمل ہونے کے بعد اس خاص نمبر میں "نگار" کے سالِ ولادت ۱۹۲۲ء کے گیارہ شماروں میں طبع شدہ مضامین و منظومات کا انتخاب شائع کیا گیا۔

جنوری ۱۹۳۰ء "بہادر شاہ ظفر" نمبر: اس نمبر میں ظفر اور عہدِ ظفر کی شاعری اور اس دور کی دہلی پر چند سیر حاصل مضامین شامل ہیں۔ ان مضامین میں فرحت اللہ بیگ کا "بہادر شاہ ظفر اور پھول والوں کی سیر" اور سید وزیر حسین دہلوی کا "دہلی کا آخری دیدار" کافی مقبول ہوئے۔

جنوری ۱۹۳۱ء: اس خاص نمبر کا تقریباً نصف حصہ سید یامین ہاشمی کے مقالے "علم فراست التحریر" (متعلق بہ اردو) پر محیط ہے۔ بقیہ حصے میں مجنوں گورکھپوری اور نیاز کے دو افسانوں ("خواب و خیال" اور "داستانِ حسن و عشق کا ورق خونیں" بالترتیب) کے علاوہ اڈیٹر "نگار" کا مشہور متنازعہ مضمون "ہمارے علمائے کرام کا عجیب و غریب نظریۂ دین" بھی شامل ہے، جس میں مسئلہ جزا و سزا پر نیاز کے خیالات نے علمائے کرام کے جلے پر تیل کا کام کیا اور نیاز اور مولویوں کے درمیان اختلافات کی خلیج اور گہری ہو گئی۔ اس مقالے میں نیاز نے اپنے عہد کے بتیس ۳۲ مقتدر علمائے دین کی خدمت میں اس مضمون کا استفتا روانہ کیا تھا کہ :

> ایک شخص خاندانی مسلمان، پابند صوم و صلوٰۃ، تہجد گزار، اور بظاہر پابندِ شریعت ہے مگر اس کی زندگی مکر و فریب، کذب و افترا، اور ایذا رسانی میں بسر ہوتی ہے اور ایک دوسرا شخص پشتینی برہمن، کافر و مشرک اور بت پرست ہے، لیکن اپنی زندگی ابنائے جنس کی خدمت، امن پسندی اور یتیموں اور بیواؤں کی بہبودی و ہمدردی میں گزار دیتا ہے۔ ان دونوں میں مذہب اسلام کے نقطۂ نظر سے کون ناجی ہے اور کون ناری، یا دونوں ناجی ہیں یا دونوں ناری۔

اس استفتا پر علمائے دین کی صرف نصف تعداد نے جواب دینے کی زحمت گوارا فرمائی۔ اس میں اکثریت (یعنی ۱۶ میں سے ۱۲ قدامت پسند اور راسخ العقیدہ علما) نے پورے رسوخ و یقین کے ساتھ حکم لگایا کہ مسلمان چاہے جو کچھ کرے بہر حال ناجی ہے بشرطیکہ اس کا خاتمہ ایمان پر ہوا اور بت پرست کتنے ہی اچھے اخلاق کا کیوں نہ ہو اس کا ناری ہونا یقینی ہے۔ بقیہ علما مذبذب، مصلحت کیش یا لاعلم نکلے۔ آخر میں نیاز نے اکثریت کے فیصلے کے بالکل برعکس اپنی رائے کا اظہار کیا ہے اور مذہب کے مقصد و غایت، اخلاقِ حسنہ اور اعمال صالح کی اہمیت اور عبادات و مراسم کی حقیقت پر جو سوال اٹھائے ہیں وہ آج بھی علمائے دین کے جبینِ جبیں کو عرق انفعال سے تر کر سکتے ہیں۔

جنوری ۱۹۳۲ء "مرزا غالب کی شوخیاں اور شوخ نگاریاں": اس عنوان سے مولوی عبدالباری آسی کی تالیف کو "نگار" کے اس خاص نمبر کی صورت میں شائع کیا گیا۔ انھوں نے غالب کے اردو، فارسی نظم و نثر کے سرمائے کو کھنگال کے اور معاصرین کے یہاں سے غالب کی بذلہ سنجی اور شوخ نگاری کی تفصیل مہیا کر کے حالی کے حیوانِ ظریف کو جیتا جاگتا صفحۂ قرطاس پر پیش کر دیا ہے۔ غالب کی ظرافت پر اس بھرپور تفصیلی مقالے پر آج تک کوئی اضافہ نہ ہو سکا۔

جنوری ۱۹۳۳ء "ملاحظات" نمبر: "نگار" میں "ملاحظات" کے عنوان سے نیاز ابتدا ہی سے گوناگوں موضوعات پر اداریے لکھتے رہے۔ اس عہد کے

ادبی، سیاسی، مذہبی اور سماجی پس منظر کو سمجھنے کے لئے آج بھی ان کا مطالعہ معاون ثابت ہو سکتا ہے۔ اس خاص نمبر میں ۱۹۲۶ء سے لے کر ۱۹۳۱ء تک کے منتخب اداریوں کے اقتباسات یکجا کر دیئے گئے ہیں۔

جنوری ۱۹۲۴ء: اس خاص نمبر میں سید یامین ہاشمی کا ایک طویل مقالہ "لبوں کی داستاں" کے عنوان سے شامل ہے، جس میں بوسے کا تاریخ، مذہب، نفسیات، شعر و ادب اور تصوف و فلسفے کے تناظر میں دل چسپ مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ دوسرا کوئی ساٹھ صفحات کا مضمون "بکھرے موتی" نیاز صاحب کے انشائیہ ٹکڑوں پر مشتمل ہے۔ ان میں صنفِ نازک کا موضوع غالب ہے۔ غرض کہ ذکر اس پری وش کا اور پھر بیان نیاز کا۔ اندازہ آپ خود لگا لیں۔

جنوری ۱۹۲۵ء "اردو شاعری نمبر": اردو شاعری پر یہ ایک دستاویزی خاص نمبر ہے۔ جس میں نیاز کے اردو شاعری پر ایک تاریخی تبصرے کے ساتھ ساتھ، اردو شاعری کی تاریخ، اس کے اصناف و اسالیب، دبستانوں کی تفصیل اور عہد بعہد کے ممتاز شعرا کے متعلق گراں قدر تحقیقی مواد فراہم کیا گیا ہے۔ یہ خاص نمبر اختصار کے ساتھ جامعیت کی اپنی مثال آپ ہے۔

جنوری ۱۹۲۶ء "ہندی شاعری نمبر": نیاز صاحب ہندی شاعری میں سادگی و پرکاری، احساسات کی مصوری، نازک خیالی، اور جذبات کی فطری اور بے ساختہ ترجمانی کے والہ و شیدا تھے۔ اس خاص نمبر سے قبل بھی وہ ہندی شاعری کے ان پہلوؤں کو اجاگر کرنے کے لئے "جذبات بھاشا" کے نام سے ایک کتاب لکھ چکے تھے جو اس موضوع پر اردو میں پہلی کتاب کہی جا سکتی ہے۔ "نگار" کا "ہندی شاعری نمبر" بھی اردو رسائل کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا پہلا خاص نمبر ہے جو ہندی شاعری کی تاریخ، ہندی کے مشہور سخن وروں کے احوال ہندی شاعری کی خصوصیات پر معیاری مقالات کا مجموعہ ہے اور اردو دنیا کو ہندی شاعری سے متعارف کرانے میں خاص اہمیت کا حامل ہے۔

جنوری ۱۹۲۷ء "اصحاب کہف نمبر": اس خاص نمبر کے مشمولات ہیں (۱) ڈراما اصحاب کہف (۲) مسئلہ خلافت و امامت (۳) سائنس کے بعض دل چسپ معلومات (۴) آسکر وائلڈ کے خطوط اور نادرات۔

"ڈراما اصحاب کہف" مصری انشا پرداز توفیق الحکیم کی کتاب "اہل الکہف" سے ماخوذ ہے اور اس خاص نمبر کا گل سر سبد ہے، اس لئے اس بے نام خاص نمبر کو اصحاب کہف نمبر کہنا بے جا نہ ہوگا۔ "سائنس کے بعض دل چسپ معلومات" اسم با مسمیٰ ہے یعنی دل چسپ بھی ہے اور معلومات آفریں بھی۔ آسکر وائلڈ سے نیاز کافی متاثر تھے اور اس کے معتقد بھی تھے۔ آسکر وائلڈ کے خطوط سارہ کے نام اور اس کے طرزِ بیان کے نادرات پر ان کا ترتیب دیا ہوا مضمون بھی قابل مطالعہ ہے۔ ۱۹۲۵ء سے "نگار" کے پرچوں میں نیاز صاحب نے "مسئلہ خلافت و امامت" پر تحقیقی مضامین کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ اس کی ایک کڑی، یعنی اس موضوع پر ایک عالمانہ مضمون اس خاص نمبر میں بھی شامل ہے۔ (بعد میں اس سلسلے کے مضامین کچھ اضافوں کے ساتھ امامیہ مشن لکھنؤ نے ۲ حصوں میں کتابی صورت میں شائع کر دیئے) ان مضامین کے تحقیقی معیار اور توازنِ بیان کو اہلِ نظر حضرات نے کافی سراہا تھا۔ نیاز صاحب نے اس سلسلۂ مضامین کے ذریعے سنجیدگی کے ساتھ شیعہ سنّی تنازعے کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کی سعی کی جو نا مشکور رہی۔

جنوری ۱۹۲۸ء "اسلامی ہند نمبر": ہندوستان کے عہدِ اسلامی کی تاریخ، مسلم حکم رانوں کے طرز حکومت، اور کارناموں کا جائزہ۔ مکمل خاص نمبر نیاز صاحب نے تحریر کیا ہے۔

جنوری ۱۹۲۹ء "مصحفی نمبر": مصحفی کی شخصیت اور کلام پر "نگار" کے اس خاص نمبر میں فراقؔ گورکھپوری، مجنوںؔ گورکھپوری، امیر احمد علوی، حسرت موہانی، منیر احمد علوی کے معلومات بخش اور تفصیلی مضامین شامل ہیں۔ مدیر نگار کے انتخاب کردہ مصحفی کے مطبوعہ و غیر مطبوعہ کلام نے اس خاص نمبر کی اہمیت اور بڑھا دی ہے۔

جنوری ۱۹۴۰ء "نظیرؔ نمبر": اردو زبان کے اولین عوامی شاعر نظیرؔ اکبر آبادی کی زندگی، مسلک اور کمالاتِ سخن پر نیاز، مجنوںؔ گورکھپوری، ل۔ احمد اکبر آبادی، مخمور اکبر آبادی، اختر اُرینوی، انتظام اللہ شہابی اور عبدالباری آسی کے معیاری مضامین سے آراستہ اس خاص نمبر میں نظیرؔ کا غیر مطبوعہ کلام بھی شامل ہے۔ مقبول عوامی شاعر کی حیثیت سے آج نظیرؔ کا جو شہرہ ہے، اس میں "روحِ نظیرؔ" اور "زندگانی بے نظیر" کے بعد "نگار" کے نظیرؔ نمبر کا اہم حصّہ ہے۔

جنوری فروری ۱۹۴۱ء "معاصر شعرا نمبر": خاص نمبر کو کوئی نام دیئے بغیر نیاز نے اس دور کے خوش فکر، اکابر، غزل گو شعرا سے یہ بزم نگار سجائی تھی۔ "نگار"، کا یہ خاص نمبر اپنی نوعیت کا نرالا تذکرہ ہے، جس میں اس دور کے مختلف مکاتبِ فکر کے مشہور و مقبول شعرا کا خود کا انتخاب کیا ہوا کلام، ان ہی کے تحریر کردہ یا فراہم کردہ مختصر سوانح کے ساتھ شائع کیا گیا۔ نیاز اس بزم میں دو استاد شعرا صفی لکھنوی اور سائل دہلوی کی عدم شرکت پر متاسف تھے، لیکن پشیمان نہیں، چوں کہ انھوں نے اپنی طرف سے کوئی کوشش نہ اٹھا رکھی۔ ایک کمی رہ جانے پر اردو دنیا کو افسوس ہے یعنی اصغر گونڈوی، جن کے لئے نیاز نے کوشش ہی نہیں کی، چوں کہ وہ نیاز کے معتوبین میں شامل تھے۔ کاغذ کے کال کا دور تھا، اس لئے یہ خاص نمبر جنوری فروری کی مشترکہ اشاعت پر مبنی تھا۔ آئندہ کے لئے یہی دستور ہو گیا۔

جنوری فروری ۱۹۴۲ء "معاصر شعرا پر تنقید نمبر": ۱۹۴۱ء کے معاصر شعرا کے خود کردہ انتخاب کلام پر چوٹی کے تین نقادوں، کلیم الدین احمد، آل احمد سرور، مجنوں گورکھپوری اور بشمول ڈاکٹر تاثیر، کے چار تنقیدی مضامین اور آخر میں نیاز کے قلم سے چاروں نقادوں کے مضامین کا لب و لباب اور تبصرہ اس خاص نمبر میں شامل ہے۔ صرف ۸۰ صفحات پر مشتمل یہ خاص نمبر اپنے ماقبل خاص نمبر "معاصر شعرا نمبر"، کے ساتھ، اردو رسائل کی تاریخ میں ایک اچھوتا تجربہ تھا جو نیاز نے کیا۔

جنوری فروری ۱۹۴۳ء "ریاض مرحوم کی یاد میں": ریاض کی شاعری کی قدر و قیمت ان کے زمانے کے معیار سے متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ریاض کی زندگی، ان کی شاعری اور ان کی شوخ و شگفتہ نثر پر مستند قلم کاروں کے مضامین کے ساتھ ساتھ ریاض کی نثر و نظم کے انتخاب نے اس خاص نمبر کی وقعت بڑھادی ہے۔

جنوری فروری ۱۹۴۴ء "جدید شاعری نمبر": جدید شاعری کے اصول و مقاصد، آغاز و ارتقا اور نظم آزاد کے اسالیب و رجحانات کا اس دور کے نقادوں نے محتاط انداز میں جائزہ لیا ہے۔ یہ خاص نمبر جدید شاعری کے ارتقا میں اس عہد کے نقادوں کا نقطۂ نظر واضح کرتا ہے۔

جنوری فروری ۱۹۴۵ء "مآخذ القرآن نمبر": ڈاکٹر ٹسڈل نے "مآخذ القرآن"، کے عنوان سے قرآن پر اعتراضات کئے تھے کہ وہ صابی و یہودی و نصرانی مشکوک کتب سے ماخوذ ہے اور زرتشتی اثرات سے بھی آزاد نہیں مزید برآں قرآن کوئی الہامی کتاب نہیں بلکہ خود حضرت محمدؐ کی تصنیف ہے۔ "نگار"، کے خاص نمبر میں اس کی اشاعت کے ساتھ کہیں کہیں حاشیوں اور آخر میں ایک مفصّل تبصرے کی صورت میں نیاز نے ردِّ اعتراضات کی کوشش کی، لیکن اصل مقصد ع چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسدؔ کے مصداق، ڈاکٹر ٹسڈل کا چیلنج علمائے اسلام کے سامنے پیش کرنا تھا۔ نتیجتاً نیاز اور علمائے اسلام کے درمیان معرکہ آرائی کا بازار گرم ہو گیا اور "نگار" کے صفحات پر کوئی سال بھر مآخذ القرآن کے سلسلے میں جوابی مضامین شائع ہوتے رہے۔

جنوری تا مارچ ۱۹۴۶ء "انتقاد نمبر": اردو ادب پر اہم تنقیدی مضامین پر مشتمل یہ خاص نمبر دو حصوں میں شائع ہوا۔ پہلا حصہ جنوری ۱۹۴۶ء اور دوسرا حصہ فروری و مارچ ۱۹۴۶ء کی مشترکہ اشاعت پر مبنی تھا۔ مضمون نگاروں میں نیاز، مجنوں گورکھپوری، سید احتشام حسین، مسعود حسین رضوی ادیب، فراق گورکھپوری، خواجہ احمد فاروقی، ممتاز حسین، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر شوکت سبزواری اور احسن فاروقی وغیرہ کے اسمائے گرامی ہی سے "انتقاد نمبر"، کی قدر و قیمت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

جنوری فروری ۱۹۴۷ء "ماجدولین نمبر": فرانس کے بے مثال ادیب الفونس کار کا ایک شاہ کار ہے "زیر فون کے سائے تلے"، جسے حکیم رشید احمد معتصم بریلوی نے مصر کے ادیب شہیر مصطفیٰ لطفی المنفلوطی کے عربی ترجمے سے "ماجدولین"، کے نام سے اردو کے قالب میں ڈھالا تھا جو کہ ناول کی ہیروئن (مرکزی کردار) کا نام ہے۔ ان دنوں نیاز کی رفیقِ حیات LEUKEMANIA کے جان لیوا مرض میں مبتلا تھیں۔ اس جاں کنی کے دور میں نیاز نے "ماجدولین"، کے الم ناک افسانے کو اشاعت کے لئے اس لئے منتخب کیا کہ وہ ان کی ماتم زدگی کے دور کا صحیح عکاسی تھا۔

جنوری فروری ۱۹۴۸ء "پاکستان نمبر": تقسیم کے صرف چار ماہ بعد، اس دور ابتلا میں نیاز نے سال نامے کے لئے کسی ادبی موضوع سے

قطع نظر" پاکستان نمبر" نگار کی ۲۷ سالہ خدمات کی یاد میں جوبلی نمبر کی حیثیت سے پیش کیا اور حکومتِ پاکستان سے خطاب کرتے ہوئے، برصغیر کی تاریخ میں مسلم حکم رانوں کی رواداری، وسیع النظری، ان کے عدل وانصاف اور نظم ونسق اور آداب و معاشرت کی یاد تازہ کی ہے اور تمدن اسلامی کی برکات اور علوم وفنون کی ترقی کا خاکہ کھینچا ہے۔ خاص نمبر کے اداریے میں انھوں نے اربابِ پاکستان کو ہندو مہاسبھائی ذہنیت اختیار کرنے یعنی دونوں ملکوں کو ہندو اور مسلم خانوں میں بانٹنے کے خلاف متنبہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ ایسا کرنا اسلامی روایات اور سیاسی واقتصادی مصالح ہر دو کے منافی ہوگا۔ اس دور میں کشمیر کے مسئلے نے دونوں ملکوں کے درمیان کشیدگی کو خطرناک حد تک بڑھا دیا تھا۔ اس سلسلے میں کوئی نصف صدی قبل نیاز نے جو کچھ لکھا تھا وہ حیرت انگیز طور پر آج بھی پوری طرح منطبق ہوتا ہے:

> " مجلس اقوام، جس کے سامنے یہ مسئلہ پیش کیا گیا ہے، کوئی ایسی جماعت نہیں ہے، جس کی دیانت غیر مشتبہ ہو۔ اس کو ایشیا و ہندستان کسی سے ہم دردی نہیں ہے، اور ان کے ہر فیصلے کا رجحان زیادہ تر امریکہ و برطانیہ ہی کے مفاد کی طرف ہوتا ہے اور چوں کہ پاکستان و ہندستان کا اتحاد ان کے اغراض کے لئے مفید نہیں ہوسکتا، اس لئے ان سے یہ توقع رکھنا بے کار ہوگا کہ وہ کشمیر کے باب میں کوئی ایسا فیصلہ کریں گے جو ہندستان و پاکستان کی موجودہ کشیدگی کو دور کرسکے۔"

تقسیم ہند اور فرقہ وارانہ فسادات کے پُرآشوب دور میں ہندستان میں بیٹھ کر پاکستان نمبر نکالنے اور اربابِ اقتدار کو اخوت و رواداری اور امن اور بھائی چارگی کا بھولا ہوا سبق یاد دلانے کی جرأت نیاز ہی کرسکتے تھے۔

جنوری فروری ۱۹۴۹ء "افسانہ نمبر": "نگار" میں پچھلے ۲۷ برسوں میں شائع شدہ افسانوں کا مجموعہ، جو قطعی بے کیف و ناکام ثابت ہوا، چوں کہ اردو افسانہ ربع صدی جوان ہوچکا تھا اور کئی افسانے محض بڑے ناموں سے منسوب ہونے، یا حلقۂ نگار کے وابستگان کے ہونے کی بنا پر منتخب ہوگئے تھے جب کہ وہ لوگ فطرتاً افسانہ نگار نہیں تھے مثلاً مالک رام، احتشام حسین، عابد علی عابد، فراق گورکھپوری وغیرہ۔

جنوری فروری ۱۹۵۰ء "تنقید نمبر": اردو ادب کی تحریکات ورجحانات اور بعض نظر انداز کردہ شخصیات پر اس خاص نمبر میں وقیع تنقیدی مضامین شامل ہیں۔

جنوری فروری ۱۹۵۱ء "ایک مستقبل کی تلاش میں": یوروپین سیاح مارس ہنڈس (Maurus Hindus) نے مشرق وسطیٰ کے ممالک کی سیاحت کرکے اپنی کتاب (In search of a future) میں ان اسلامی ممالک کے اقتصادی حالات اور ان کی زبوں حالی کے اسباب وعلل کا جائزہ لیا ہے اور نتیجہ اخذ کیا ہے کہ سپرپاور جب تک نئی نئی منڈیوں کے قیام سے قطع نظر، ان ملکوں کے غربا اور کاشت کاروں کی فلاح کی کوئی صورت نہیں نکالتی، روس اور چین کی طرح یہاں بھی اشتراکیت کے سر ابھارنے کا خطرہ بنا رہے گا۔ اپنی چھے ماہ کی سیاحت کے بعد وہ اسرائیل پہنچا تو حیرت زدہ ہوا کہ کیا یہ بھی اسی سرزمین کا حصہ ہے، جہاں کی سیاحت میں وہ پہلی بار ایک سلیقے کی دکان سے ناشپاتی لے کر کھا سکتا ہے اور صاف پانی سے نہا سکتا ہے۔ سیاح مذکور نے لکھا ہے کہ ایک خوش گوار مستقبل کی تلاش میں ایران، مصر، عراق، سب کو اسرائیلی انتظام حکومت اور اس کی زرعی پالیسی سے سبق لینا چاہئے۔ مارس ہنڈس کی اس کتاب کے مترجم "نگار" کے پُرانے قلم کار ل۔ احمد اکبرآبادی تھے۔ آخر میں خاص نمبر کے موضوع کو آگے بڑھاتے ہوئے نیاز صاحب نے اپنا ایک مضمون "جنگ عظیم کے بعد اسلامی سلطنتوں کا انقلاب" اضافہ کیا ہے۔

جنوری فروری ۱۹۵۲ء "حسرت نمبر": یہ ناممکن تھا کہ مومن کے فدائی اور تغزل کے شیدائی نیاز، حسرت کو نظر انداز کردیتے، آخر حسرت کی رحلت کے صرف سات ماہ بعد انھوں نے حسرت کی زندگی، اُن کے تغزل، شاعرانہ مرتبے، ان کی سیاسی زندگی اور ان کے عزم اُمور اور جمالیات پر، آل احمد سرور، مجنوں گورکھپوری، خواجہ احمد فاروقی، رشید احمد صدیقی، فراق گورکھپوری، شفیق جونپوری، خلیل الرحمان اعظمی، اثر لکھنوی، سید سلیمان ندوی، عبدالمالک آروی، عبادت بریلوی، کشن پرشاد کول اور خود اپنے تحریر کردہ وقیع مضامین کا [illegible]

گل دستہ پیش کر دیا، جس کی اہمیت اردو ادب میں کبھی کم نہ ہوگی۔ اسی پر بس نہیں برس بھر "نگار" حسرت کے اثرات سے آزاد نہ ہو سکا۔ کچھ پرچوں میں "افادات حسرت" کے تحت حسرت کے چند قیمتی مضامین، حسرت کی خانگی زندگی پر ایک مقالے کے علاوہ جون ۱۹۵۲ء کا شمارہ تو حسرت نمبر کا تتمہ کہیے جو صرف مولانا حسرت موہانی کے دو طویل مقالات (۱) مشاہداتِ زنداں (۲) تسلیم لکھنوی، پر مشتمل تھا۔

جنوری فروری ۱۹۵۳ء داغ نمبر: تصوّف و فلسفے کی موشگافیوں کو شاعری میں کم پسند کرنے والے نیاز کے نزدیک فکر و تخیل کی گہرائی اور جذبات کی بلندی سے معرّا داغ کی شاعری بھی کم از کم زبان کی صفائی، بیان کی سلاست، محاورات کی برجستگی، اور اظہارِ خیال کی بے تکلفی و بے ساختگی کے اعتبار سے ضرور لائقِ توجہ تھی۔ فصیح الملک داغ پر اس دور کے مستند و معتبر قلم کاروں کی تخلیقات سے مزین یہ خاص نمبر بھی "نگار" کی روایات کا آئینہ دار ہے۔

جنوری فروری ۱۹۵۴ء "فرماں روایانِ اسلام نمبر": اسے آپ ولادتِ نبوی سے لے کر نیاز کے عہد تک، دنیا میں مسلم حکومتوں کے عروج و زوال کی مختصر انسائیکلوپیڈیا کہہ سکتے ہیں۔ فرماں روایانِ اسلام پر اتنی جامع، مستند معلومات ایسے حسنِ اختصار سے اردو میں نہ اس سے پہلے کوئی پیش کر سکا تھا نہ اس کے بعد کر سکا۔

جنوری فروری ۱۹۵۵ء "علوم اسلامی و علمائے اسلام نمبر": "نگار" کے اس خاص نمبر میں (۱) اسلامی حکومتوں میں ترقیِ علوم و فنون (۲) علوم اسلامی (۳) مشاہیر و علمائے اسلام اور (۴) ہندستانی مشاہیر علما، کلیدی موضوعات ہیں۔ یہ خاص نمبر بھی نیاز صاحب کی مورّخانہ ژرف نگاہی کا غیر معمولی کارنامہ ہے۔ حصّہ اول میں مسلم حکومتوں میں عہد بعہد علوم و فنون کی ترقی کا احوال ہے۔ دوسرے حصّے میں علوم اسلامی مثلاً قرآن، تفسیر، حدیث، فقہ، تاریخ، جغرافیہ، فلسفہ، کلام، منطق، ہیئت، ہندسہ، حساب، طب، موسیقی، کیمیا، مصوّری و تمثیل سازی کا مختصر و جامع تعارف پیش کیا گیا ہے۔ تیسرے اور چوتھے حصّے کے تحت تقریباً چار سو مشاہیر و علمائے اسلام کے حالاتِ زندگی اختصار کے ساتھ درج ہیں، جسے قاموس المشاہیر اسلام کہیں تو بے جا نہ ہوگا اور اس کا تتمہ جولائی ۱۹۵۵ء کے نگار میں مزید مشاہیر کے سوانح کی اشاعت پر ہوا۔ غرض کہ علوم اسلامی اور علمائے اسلام پر یہ خاص نمبر "نگار" کا ایک لازوال علمی کارنامہ ہے۔

جنوری فروری ۱۹۵۶ء "خدا نمبر": اس خاص نمبر میں اڈیٹر "نگار" نے دنیا کی مختلف قوموں میں، مختلف ادوار میں مذہب کے بدلتے ہوئے تصوّرات، اس کی تاریخ وار ارتقا اور خدا کے تصوّر سے عالمانہ بحث کی ہے۔ اس خاص نمبر کے انگریزی اور غیر انگریزی ماخذوں پر ایک نظر ڈالنے سے نیاز کی وسعتِ مطالعہ اور ان کے اس علمی کارنامے کی قدر و قیمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

جنوری فروری ۱۹۵۷ء اصنافِ سخن نمبر: اردو کی مشہور اصنافِ سخن مثلاً غزل، قصیدہ، مثنوی، رباعی، مرثیہ، اور آزاد نظم پر مجنوں گورکھپوری، فراق گورکھپوری، ضیاء احمد بدایونی، گیان چند، احتشام حسین، امیر احمد علوی، ڈاکٹر محمد حسن، فرمان فتح پوری، غلام احمد فرقت اور سید صفدر حسین جیسے اہل قلم حضرات کے سنجیدہ اور معلوماتی مضامین کا یہ مجموعہ "نگار" کی روایات و معیار کا ترجمان ہے۔

جنوری فروری ۱۹۵۸ء "معلومات نمبر": نیاز "نگار" میں "باب الاستفسار" کے تحت ابتدا ہی سے گوناگوں موضوعات پر استفسارات کے جواب دیتے آئے تھے۔ یہ خاص نمبر "باب الاستفسار" میں چھپ چکے ایسے ہی منتخب تاریخی، علمی، ادبی، مذہبی اور فنی استفسارات کے جوابات کا خزانہ ہے جو سیکڑوں کتابوں کا نچوڑ اور نیاز کے تبحرِ علمی کا آئینہ دار ہے۔

جنوری فروری ۱۹۵۹ء "تنقیحِ اسلام نمبر": نیاز کا خیال تھا کہ مسلمانوں کی ذہنی پستی کا سبب صرف مذہبی روایت پرستی ہے، جس کے ذمے دار صرف علمائے ظاہر پرست ہیں۔ یہ علما "نگار" کے صفحات پر ہمیشہ نیاز کی تنقیدوں کا ہدف بنے رہے۔ عقل و فکر کی روشنی میں مذہب کی غرض و غایت کو اجاگر کرنے میں کوشاں اور علمائے ظاہر کے تراشے ہوئے تقلیدی اور رسمی اور ماورائی مذہب سے متنفر نیاز کی برہنہ تنقیدوں سے آتش زیر پا علمائے اسلام کی ریشہ دوانیوں نے پہلے تو ان پر بھوپال کی فضا تنگ کی، پھر جب لکھنؤ میں بھی ان کا قلمی جہاد جاری رہا تو علمائے اسلام نے اپنے آخری حربے یعنی کفر و الحاد کے فتوے صادر کر کے انھیں دینی و دنیوی اعتبار سے رسوا اور برباد کرنے کی کوشش کی، لیکن نیاز صاحب کا بدستور یہ حال رہا ع بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ یاں سزا کے بعد۔ نیاز نے انتقادیاتِ مذہب اور تنقیحِ اسلام

پر "نگار" میں کافی سرمایۂ مضامین سپردِ قلم کیا۔ اسی سلسلے کے کچھ نئے اور کچھ پرانے مضامین پر یہ خاص نمبر مشتمل ہے۔

جنوری فروری ۱۹۶۰ء "مکاتیبِ نیاز کا انتخاب نمبر": یہ خاص نمبر نیاز کے ایک عزیز دوست کی بیٹی اور نیاز کی شاگردِ خاص عائشہ خان نے مرتب کیا ہے۔ انھوں نے نیاز اور ان کی انشا پردازی کے بارے میں ایک طویل مقالا بھی سپردِ قلم کیا ہے، اس کے بعد نیاز کے مکاتیب سے طویل اقتباسات درج ہیں، جن میں حسن و عشق، مذہب و اخلاق، اور شعر و ادب کے موضوعات پر نیاز نے انشا پردازی کا کمال دکھایا ہے۔ اسے انشائے لطیف نمبر کہا گیا ہے جو قطعاً بے جا نہیں۔ خاص نمبر کی ترتیب و انتخاب کا انداز نیاز صاحب کی طوطی پسِ آئینہ شرکت کا غماز ہے۔

جنوری فروری ۱۹۶۱ء "غالب نمبر": غالب کی شاعرانہ خصوصیات، معنی آفرینی، خمریات، شوخ نگاری، مثنوی نگاری اور اس کے احساس خودی، طنز و مزاح اور آہنگ و لب و لہجے پر تنہا نیاز صاحب نے قابلِ مطالعہ مضامین سپردِ قلم کئے ہیں اور غالب کے اردو اور فارسی کلام کا انتخاب بھی کیا ہے۔ سارے خاص نمبر میں صرف ایک مضمون "غالب کا معیارِ سخن"، دیوانِ غالب نسخۂ عرشی سے ماخوذ ہے۔ نیاز مومن کے قتیل رہے، لیکن غالب فہمی میں ان کی ناقدانہ بصیرت نے انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔

جنوری فروری ۱۹۶۲ء "اقبال نمبر": نیاز کا مقصود اس سال نامے کی اشاعت سے اقبال کی غنائی شاعری کا مطالعہ تھا، لیکن انھیں احساس ہوا کہ اقبال کے فلسفے اور تصوف کی جو روایات اس وقت تک ذہن نشیں ہو چکی ہیں، وہ اس قدر دیرینہ و مستحکم ہیں کہ ان سے قطع نظر اقبال کی شاعری کا تصور ہی لوگوں کے سامنے نہیں آسکتا اور اقبال کے کلام کا تار و پود ہی کچھ ایسا ہے کہ یہ امر دشوار ہے کہ اقبال کے غنائی محاسن کا ذکر شروع کیا جائے اور اس کے فلسفے و پیام کی بات نہ چل پڑے۔ بہر حال اس خاص نمبر میں اقبال کے فکر و فلسفے، ان کی شاعری میں تغزل اور ڈرامائی عناصر کے پہلو بہ پہلو ان کی ذاتی زندگی اور ان کے سیاسی رجحانات پر بھی چند مضامین عام ڈگر سے ہٹ کر نظر آتے ہیں۔ کوئی نصف درجن اہم مضامین مدیرِ نگار کے قلم سے ہیں، دیگر قلم کاروں میں محمد عظیم فیروزآبادی، جگن ناتھ آزاد، احتشام حسین، ہنس راج رہبر، فرمان فتح پوری اور سید جعفری وغیرہ ہیں۔

مارچ اپریل ۱۹۶۳ء "نیاز نمبر" حصہ اول
مئی جون ۱۹۶۳ء "نیاز نمبر" حصہ دوم

"نگار" کا پاکستانی اڈیشن جنوری ۱۹۶۲ء سے کراچی سے عارف نیازی کے زیرِ انتظام شائع ہونا شروع ہو گیا تھا، جو کہ لکھنؤ اڈیشن کا چربا ہوتا تھا۔ جولائی ۱۹۶۲ء کا شمارہ لکھنؤ سے "نگار" کا آخری شمارہ ثابت ہوا، اور اسی مہینے نیاز نجی وجوہ سے پاکستان جا کر بس گئے۔ ۱۹۶۳ء میں ان کے دستِ راست فرمان فتح پوری کے مسلسل اصرار پر "نیاز نمبر" دو حصوں میں شائع ہوا، جو نیاز کی زندگی ہی میں ان کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف و ستائش میں بیسویں صدی کے اردو کے لگ بھگ ۸۰ ممتاز اہلِ قلم معاصرین کا پیش کیا ہوا نذرانۂ عقیدت ہے۔ ۶۱۶ صفحات کے اس خاص نمبر میں مفصل اور بے لاگ تنقیدی و تجزیاتی مضامین کی کمی ہے۔ بہر کیف یہ خاص نمبر اردو ادب میں نیاز کے مقام اور "نگار" کی علمی و ادبی اہمیت کو سمجھنے میں رہنمائی ضرور کرتا ہے۔ "نیاز نمبر" حصہ دوم کے آخر میں "افاداتِ نیاز" کے تحت کوئی سو صفحات پر نیاز صاحب کی نگارشات کا موضوع وار تفصیلی اشاریہ ترتیب دیا گیا ہے، جو نیاز صاحب کی "نگار" کی اہم سال کی نگارشات کے ساتھ ساتھ قبل از "نگار"، "صلائے عام"، "تمدن"، "الہلال"، اور نقاد میں چھپے ان کے مضامین کی نشان دہی بھی کرتا ہے۔

مئی جون ۱۹۶۴ء تذکروں کا تذکرہ نمبر: "نگار" کا یہ اہم خاص نمبر اردو و فارسی میں تذکرہ نگاری کی روایت و تاریخ، اس کے فن، اور مصنفین کی تفصیل، تذکروں میں درج شعرا کے ذکر اور ان کے عہد کی ادبی و سماجی فضا کے بارے میں بھرپور معلومات فراہم کرتا ہے۔

جولائی اگست ۱۹۶۵ء "جدید شاعری نمبر": ۱۹۴۴ء میں جدید شاعری کے ابتدائی دور میں "نگار" لکھنؤ کا "جدید شاعری نمبر" شائع ہوا تھا۔ ۱۹۶۵ء میں شائع ہوئے "نگار پاکستان" کے اس خاص نمبر سے درمیانی دو دہائیوں میں "جدید اردو شاعری" میں ہوئی تبدیلی و ارتقا کا پتا چلتا ہے۔ نیاز، پروفیسر رشید احمد صدیقی، کنول بالی، اور بسم اللہ بیگم کے سیر حاصل مقالات خاص نمبر کا حاصل ہیں۔ اس کے علاوہ دیگر لکھنے والوں میں کلیم الدین احمد، خلیل الرحمان اعظمی، خواجہ احمد فاروقی، حامد حسن قادری، مجنوں گورکھپوری، احمد ندیم قاسمی،

اور ڈاکٹر محمد حسن کے نام اہم ہیں۔ "نگار" کا یہ آخری خاص نمبر تھا جو نیاز صاحب کی ادارت میں شائع ہوا، ویسے "نیاز نمبر" ہی سے ڈاکٹر فرمان فتح پوری "نگار" کے ہر خاص نمبر میں مؤلف و مرتب کی حیثیت سے شریکِ کار رہے۔

علاوہ ازیں :-

محض دو تین بار ایسا ہوا کہ "نگار" کے دو ماہ کے عام شمارے مشترکہ شائع کر دیئے گئے۔ اور کبھی کوئی عام شمارہ ایک خاص موضوع کے لئے مخصوص کر دیا گیا۔ مثلاً

- اگست ۱۹۴۱ء کا شمارہ صرف حالاتِ جنگ پر مشتمل تھا۔
- جولائی ۱۹۶۱ء میں صرف ایک طویل مضمون "کلامِ جگر اڈیٹر نگار کے نقطۂ نظر سے" ہے، جس میں جگر کی شاعری پر تنقید کی گئی ہے جو تنقیص کی حدوں میں آگئی ہے۔
- جولائی ۱۹۵۱ء کا "نگار" اپنی روایت سے ہٹ کر پہلی اور واحد مرتبہ کتابی شکل میں شائع ہوا۔ پڈکن کی "۵۵ سال کے بعد" نامی اس دل چسپ کتاب کے مترجم تھے مسعود جاوید۔ بہرحال "نگار" کے سالنامے یا خاص نمبروں کی فہرست میں ان کا شمار کرنا درست نہ ہوگا۔ اردو رسائل کی تاریخ میں "نگار" کے خاص نمبروں ہی کو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی کہ ان کو اکثر دوبارہ اور کبھی تیسری بار بھی شائع کرنا پڑا۔ ٭

" .... "

پروفیسر سید احتشام حسین ـــــــــ جو شخص بھی نیاز صاحب کی علمی تحریروں اور افسانوں کا مطالعہ کرے گا اُسے سب سے بڑی اُلجھن کا سامنا اس وقت ہوگا جب وہ ان کے مذہبی اور فلسفیانہ مضامین میں حکمت کی کارفرمائی دیکھے گا اور افسانوں میں جنوں کی، جب وہ انہیں عقل اور دل دونوں سے آنکھ مچولی کھیلتا ہوا پائے گا۔



ڈاکٹر وفا راشدی
سکریٹری دائرۂ ادب پاکستان
بی ۴۸ شاہ فیصل ٹاؤن
ملیر ہالٹ۔کراچی

علامہ نیاز کے چند نیازمند

علامہ نیاز فتحپوری مرحوم اپنی ذات میں ایک انجمن، ایک ادارہ، ایک تاریخ، ایک عہد تھے۔ اردو کے لاکھوں شیدائی علامہ نیاز جیسے آفتابِ عالمتاب کے پرستار ہیں۔ ہزاروں مفکروں اور دانشوروں نے اس آفتاب کی تابانی اور ضیا پاشی سے اپنے نگارخانۂ فکر و دانش کو روشن کیا ہے۔ سیکڑوں ادب نوازوں نے اپنے دلوں میں عقیدت و ارادت مندی کے گلشن سجائے ہیں۔ جن نیازمندانِ نیاز کو میں جانتا ہوں ان میں خان بہادر علامہ رضا علی وحشت کلکتوی، محمد سرور خان سرور، (تلمیذ امیر مینائی)، پیرزادہ سید ظفر ہاشمی، علامہ جمیل مظہری، سید رضا مظہری الکاظمی (راقم کے استادِ مکرم) سید محمود طرزی، پروفیسر عبدالقیوم حسرت نعمانی صدر شعبۂ اردو کلکتہ یونیورسٹی، حافظ محمود باروی (راقم کے استادِ معظم اور صدر شعبۂ فارسی، اردو مدرسہ عالیہ کلکتہ)، جرم محمد آبادی (علامہ آرزو لکھنوی کے مایۂ ناز شاگرد)، حکیم حبیب الرحمٰن (ایڈیٹر ماہنامہ جادو ڈھاکا) خالد بنگالی (ایڈیٹر ماہنامہ اختر میمن سنگھ)، شرف الحسن شرف، پروفیسر ارشد کاکوی ایڈیٹر ماہنامہ ندیم ڈھاکا وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ صد حیف! کہ ان میں سے اب ایک بھی بقیدِ حیات نہیں ہے۔ راقم الحروف نے ان سب اربابِ نظم و نثر کی آنکھیں دیکھی ہیں۔ ان کی بافیض قربتوں سے فیضیاب ہونے کی سعادت حاصل کی ہے۔ ان کی محفلوں میں اکثر و بیشتر علامہ نیاز کا ذکر سنا ہے۔ ان کے گھروں میں نگار لکھنؤ کی جلدیں دیکھی ہیں۔

یہ تقسیم ہند سے کچھ پہلے کی بات ہے کہ لاہور، دہلی، حیدرآباد دکن، بمبئی، بنگلور، بھوپال میں اردو کے لاتعداد رسائل و جرائد شائع ہوتے تھے۔ اور کلکتہ جیسے عظیم شہر میں کثیر تعداد میں فروخت ہوتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب انسانی اقدار کا ایک معیار تھا۔ دلوں میں علم و ادب، تہذیب و اخلاق، محبت و مروت، وضعداری و پاسداری کی شمعیں روشن تھیں۔ اساتذۂ فن و سخن اور اہلِ ذوق و نظر کی بستیاں آباد تھیں۔ نگار شہر کلکتہ کے ہر بک اسٹال پر نظر آتا تھا اور ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو جاتا تھا۔ بنگال کی تمام لائبریریوں میں خصوصاً مسلم انسٹی ٹیوٹ، دلکشا انسٹی ٹیوٹ، مدرسہ عالیہ، کلکتہ یونیورسٹی، ڈھاکا یونیورسٹی، اور دیگر علمی ادبی تعلیمی درسگاہوں کے کتب خانوں میں بڑے ذوق و شوق سے پڑھا جاتا تھا۔ اس زمانے میں نگار میں کسی کا مضمون چھپ جانا بہت بڑی بات تھی۔ پروفیسر مجنوں گورکھپوری، فراق گورکھپوری، پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر احتشام حسین، کلیم الدین احمد، اختر اورینوی، عبدالرحمٰن بجنوری، یگانہ چنگیزی اور ڈاکٹر عندلیب شادانی جیسے اکابرِ ادب و اساتذۂ سخن سے ادبی دنیا ماہنامہ نگار لکھنؤ ہی کے توسط سے واقف و باخبر ہوئی۔

۱۹۴۲ء میں شائع ہونے والے نگار کے خاص نمبر کی خصوصیت یہ تھی کہ برصغیر پاک و ہند کے مشہور و ممتاز شعرائے کرام کے خود نوشت سوانح حیات کے ساتھ ان کا خود انتخاب کردہ کلام بھی شائع کیا گیا تھا۔ علامہ نیاز کے حسب تحریر اس میں صرف ان ہی شعراء کو شریک کیا گیا تھا جن کو نیاز صاحب شاعر سمجھتے تھے یا مانتے تھے اور جن کی شاعرانہ صلاحیت و عظمت کے قائل تھے۔ بنگال کے جن اہم اساتذۂ سخن کی شعری تخلیقات اور حالات سے یہ خاص نمبر مزین ہے۔ ان میں علامہ آرزو لکھنوی، حکیم ناطق لکھنوی اور علامہ وحشت کلکتوی کے نام شامل ہیں۔ اس اشاعت خاص میں اداریہ (بزم نگار) کے علاوہ کچھ متغزلین کے بارے میں، اردو کا رنگ تغزل، ایسی تحریریں ہیں جو عہد جدید کی اردو شاعری پر تاریخی اہمیت کی حامل ہیں" اردو کا رنگ تغزل،، کے تحت علامہ آرزو کے بارے میں اظہار خیال فرماتے ہیں۔

" انھوں نے (آرزو نے) میر کی لمبی بحروں میں اور میر کے انداز کی مشابہت لئے ہوئے غزلیں کہی ہیں

اور حسن و عشق کی کیفیات کی کہیں کہیں بڑی کامیاب مصوری کی ہے۔ آرزو کے یہاں زبان و طرز ادا میں وہی سنگار اور بناؤ پایا جاتا ہے۔ جو مسجع و مقفیٰ نثر میں ہوتا ہے۔"

(نگار جنوری فروری ۱۹۴۱ء ص ۲۱۵)

"بزم نگار" (اداریہ) کے زیر عنوان علامہ نیاز حضرت ناطق لکھنوی کی شاعری کے حوالے سے رقمطراز ہیں۔

"وہ جناب ناطق بھی پرانے کہنے والے ہیں اور فلسفہ و تصوف کے استغراق سے علیحدہ ہو کر اگر آپ کبھی کچھ کہنا چاہتے ہیں تو اس میں بعض باتیں چونکا دینے والی بھی نظر آتی ہیں۔"

(جدید غزل گو، ۱۹۴۱ء کی ایک دستاویز خدا بخش لائبریری پٹنہ ص ۳۱۷، ۳۱۴)

علامہ نیاز اپنے اسی اداریے میں علامہ وحشت سے متعلق تحریر فرماتے ہیں۔

"اب پہلے گروپ میں وہ شعراء رہ گئے ہیں جن کا تعلق دہلی و لکھنؤ اسکول سے نہیں ہے۔ ان میں سب سے پہلے وحشت کا نام سامنے آتا ہے۔ وحشت بڑے کہنہ مشق شاعر ہیں اور اردو تغزل میں فارسی ترکیبوں کو گوارا و خوشنما صورت سے استعمال کرنا وفا رامپوری کی طرح ان کا خاص کارنامہ ہے۔ پڑھا لکھا آدمی جب غزل میں اپنی قابلیت کے اظہار پر آجاتا ہے تو غزل کو بالکل برباد کر دیتا ہے لیکن وحشت کی خوش ذوقی نے کبھی یہ نقص اپنے کلام میں پیدا ہونے نہیں دیا۔ ان کے یہاں یہ سب کچھ بہت توازن اور سلامت روی کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ اس حیثیت سے بڑی عزت کے مستحق ہیں۔"

(ایضاً ص ۳۱۹)

علامہ وحشت بھی علامہ نیاز فتحپوری کے خاص نیاز مندوں میں تھے۔ ان کا ذکر بڑے احترام سے کیا کرتے تھے۔ حضرت نیاز کی فرمائش پر نگار کے لئے اپنا کلام پابندی سے بھیجتے تھے۔ نیاز صاحب نے نگار کے مختلف شماروں میں حضرت وحشت کے بارے میں وقتاً فوقتاً بہت کچھ لکھا ہے خصوصاً "مالہٗ وما علیہ" میں وحشت کی شاعری کے حوالے سے جس محبت و عقیدت سے تنقیدی مطالعہ پیش کیا ہے وہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔" مالہٗ وما علیہ" ہی میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"مجھے نہیں معلوم کہ اس رنگ کی غزلیں وحشت نے اور بھی کہی ہیں لیکن اگر ہیں تو ان سب کے متعلق ان سے پوچھنے کا حق رکھتا ہوں کہ انھوں نے کیوں مجھے ان سے محروم رکھا۔ اگر یہ رنگ ان کے کلام میں ابھی پیدا ہوا ہے تو میں ان کو مبارک باد دیتا ہوں کیوں کہ ان کی جوانی کی شاعری کے سامنے صرف سر جھکتا تھا لیکن اب ان کے اس رنگ کے سامنے روح دوزانو ہوتی ہے۔

یوں تو اس غزل کے تمام اشعار بیان کی سادگی، جذبات کی پاکیزگی، تاثرات کی گہرائی اور رفعت خیال کے لحاظ سے بے مثل ہیں لیکن اس کا پانچواں شعر تو یقیناً لاجواب ہے۔ اس کی صحیح داد نہ لکھ کر دی جاسکتی ہے نہ خاموش رہ کر ؎

اللہ رے زورِ مجبوری خود مجھ کو حیرت ہوتی ہے
جو بار اٹھانا پڑتا ہے کیوں کر وہ اٹھایا جاتا ہے[۱]

افسوس ہے کہ میں وحشت سے بہت دور ہوں ورنہ میں خود ان سے جاکر پوچھتا کہ اس شعر کی تخلیق کیوں کر ہوئی اور وہ کون سا حال تھا جو اس الہام پارہ کے نزول کا باعث ہوا۔

(مالہٗ وما علیہ، نگار جون ۱۹۴۶ء)

۱۹۴۲ء میں دوسرا سالنامہ منظر عام پر آیا۔ یہ خاص نمبر ۱۹۴۱ء کے خاص نمبر سے متعلق پانچ بڑے نقادوں کے تنقیدی مقالات پر مشتمل ہے۔ ۴۲-۱۹۴۱ء کے یہ دونوں شمارے اکثر لوگوں نے ایک جلد میں محفوظ کر لیے۔ راقم نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ ۱۹۴۲ء سے ۱۹۹۳ء تک کی اس طویل مدتوں میں پاکستان اور ہندوستان میں کتنے ہی انقلابات و تغیرات رونما ہوئے۔ زندگی نے کروٹوں پہ کروٹیں بدلیں۔ آنکھوں نے شکست و ریخت کے بے شمار مناظر دیکھے، دلوں نے دکھ پہ دکھ سہے۔ وفا راشدی کا گھر پہ گھر اجڑا مسلسل آندھیوں سے کھیلتا ہوا گزرتا رہا لیکن کتابوں کا ساتھ کبھی نہ چھوڑا جس کا زندہ ثبوت یہ ہے کہ نگار لکھنؤ کے مذکورہ دونوں خاص نمبر خوش قسمتی سے اب تک اس کے نجی کتب خانے میں محفوظ ہیں اور اس وقت بھی دونوں پیشِ نظر ہیں۔

علامہ نیاز سے یہ عقیدت و محبت یک طرفہ نہیں تھی۔ علامہ وحشت دیگر اربابِ علم و ادب کی طرح علامہ نیاز کا بھی بے حد احترام کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے معاصرین کے حوالے سے خیالات و جذبات کا اظہار اکثر اشعار میں بھی کیا ہے جو لوگ علامہ وحشت سے قریب رہے وہ گواہی دیں گے کہ یہ شاعری نہیں حقیقت ہے ؎

نہیں اہلِ فن میں وحشت مجھے ایک سے بھی چشمک
کہ ہے قدر میرے دل میں شعرائے نکتہ داں کی

فرصت کہاں مذمتِ دشمن جو میں کروں
وحشت تری زباں تو ہے وقفِ ثنائے دوست

مجھے وہ دن بھی خوب یاد ہیں جب علامہ وحشت، سید محمود طرزی اور علامہ جمیل مظہری کے ہاں نگار اور مدیر نگار کے بارے میں تبادلۂ خیالات ہوتا تھا۔ نیاز کی نگارشات اور انتقادیات کو سراہا جاتا تھا۔ ان کی ناقدانہ تحریروں کو بڑے سے بڑے نقادوں پر ترجیح دی جاتی تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ علامہ نیاز نے انتقادیات میں جس طرزِ نو کی طرح ڈالی تھی وہ نیاز ہی کی ذات سے مختص ہو کر رہی اس پایہ کی کوئی تنقید اردو ادب میں اضافے کا باعث نہ بن سکی۔

علامہ جمیل مظہری کے علامہ نیاز سے خاص مراسم تھے۔ ان کی تخلیقات نظم و نثر کو بڑے اہتمام و التزام سے نگار میں شائع کرتے۔ بسا اوقات ان کے بارے میں نوٹ بھی شائع فرماتے۔ اس قسم کا ایک نوٹ درج ذیل ہے۔

"وہ (جمیل مظہری) نہایت خوش گو شاعر ہیں اور خوش فکر ادیب ہیں۔ خیال کی رعنائی، اسلوب بیان کی گہرائی ان کی نظم و نثر کی خصوصیت خاصہ ہے۔"

علامہ جمیل مظہری بے پناہ ذہانت کے مالک تھے۔ چھپنے چھپوانے کے معاملے میں بہت بے نیاز تھے۔ وہ میرے استادِ مکرم حضرت رضا مظہری کے بڑے بھائی تھے۔ برسوں علامہ جمیل مظہری کی با فیض مجلسوں سے فیضیاب ہونے کی سعادت حاصل رہی ہے۔ نگار لکھنؤ میں جمیل مظہری کی جو نگارشات لطیف محفوظ ہیں وہ آج اردو ادب کے سرمایۂ گراں مایہ سے کم نہیں۔

نیازمندوں میں کلکتے کے جو نثر نگار، نیاز و نگار کے مداح تھے ان میں پروفیسر عبدالقیوم حسرت نعمانی کی شخصیت بڑی اہم تھی۔ انھوں نے تقسیم ہند کے فوراً بعد وفات پائی۔ کلکتہ یونیورسٹی کے ہردلعزیز استاد اور شعبۂ اردو کے صدر نشیں تھے۔ ان کا خاص موضوع تنقید تھا۔ اگر وہ زندہ ہوتے آج ان کا شمار برصغیر کے بڑے نقادوں میں ہوتا۔ پروفیسر حسرت نعمانی کے تحقیقی و تنقیدی مقالات نگار لکھنؤ کے اکثر و بیشتر شماروں میں شائع ہو کر اربابِ فکر و نظر سے خراجِ تحسین وصول کر چکے ہیں۔ بالخصوص نگار کے انتقادیات نمبر (دو حصوں میں) ان کا جو طویل مقالہ اشاعت پذیر ہوا تھا وہ تنقیدی ادب میں ایک گراں مایہ چیز ہے۔ یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ حسرت نعمانی جو مقالہ رسالہ نگار کے لئے لکھتے تھے اسے پہلے بزمِ احباب کلکتہ کے جلسوں میں ضرور سنایا کرتے تھے۔

یہی نہیں کہ بنگال کے اہلِ قلم ہی نگار کے لئے لکھتے تھے بلکہ حضرت نیاز بھی بنگال اور اہلِ بنگال سے ایک شیفتگی ایک وابستگی محسوس کرتے تھے جس کی شہادت اس بات سے بھی ملتی ہے کہ بنگال سے شائع ہونے والے ادبی رسائل ماہنامہ حادو، ماہنامہ اختر اور ماہنامہ جدید اردو کلکتہ میں برابر لکھا کرتے

تھے۔ شفاء الملک حکیم حبیب الرحمٰن خان احسنؔ علامہ شبلی کے دوستوں میں تھے۔ ان کا مولد ومسکن، مدفن ڈھاکا تھا۔ (۱۸۸۱ء۔ ۱۹۴۷ء)۔ حکیم حبیب الرحمٰن نے ۱۹۲۳ء میں ڈھاکا سے ماہنامہ جادو[7] جاری کیا تھا۔

ماہنامہ اختر کا اجرا مشرقی بنگال کے اندرون علاقہ ضلع میمن سنگھ سے ۱۹۳۴ء میں ہوا۔ وہاں کی عوامی زبان بنگلا ہے۔ اردو بولنے والے اہلِ علم کی تعداد خال خال تھی۔ محمود الرب صدیقی خالدؔ بنگالی جن کی مادری زبان بنگلا تھی رسالہ اختر کے مالک و مدیر تھے۔ علامہ نیاز سے دوستانہ مراسم رکھتے تھے[8]

بیسویں صدی کے اول نصف کے عرصے میں بنگال میں جتنے اردو رسائل وجرائد منظرِ عام پر آئے ان میں معیار، مواد اور مقبولیت کے لحاظ سے ماہنامہ جدید اردو[9] کلکتہ کو اولیت حاصل رہی۔

پیرزادہ ظفر ہاشمی سیالکوٹی ایک قادر الکلام شاعر اور خوش فکر ادیب تھے۔ ممتاز ماہرِ تعلیم اور مشہور انگریزی داں سید محمد یوسف ہاشمی سابق پرنسپل مدرسہ عالیہ کلکتہ (راقم کو ان کی شاگردی پر فخر ہے) کے بھتیجے اور علامہ وحشتؔ کے تلمیذ ارشد تھے۔ ماہنامہ عالمگیر لاہور اور ماہنامہ خیابان لاہور کے مدیر رہے۔ پیرزادہ ظفر ہاشمی نے مدرسہ عالیہ کلکتہ میں تعلیم حاصل کی۔ علامہ جمیل مظہری اور محمد علی بوگرہ (سابق وزیر اعظم پاکستان) کے ہم جماعت تھے۔ ایک مدت تک کلکتے میں رہے۔ کلکتہ اور اہلِ کلکتہ سے بہت محبت کرتے تھے۔ راقم کو اپنے چھوٹے بھائی جیسا عزیز جانتے تھے[10]

پیرزادہ ظفر ہاشمی تکمیل تعلیم کے بعد لاہور چلے گئے۔ احسان دانش، حفیظ جالندھری اور اختر شیرانی ان کے قریبی دوستوں میں تھے۔ علامہ نیاز فتح پوری نے ۱۹۳۱ء میں لاہور کا سفر کیا۔ اختر شیرانی کے مکان واقع فلیمنگ روڈ میں قیام فرمایا۔ اختر شیرانی کے والد محقق اعظم پروفیسر محمود شیرانی (مصنف پنجاب میں اردو) سے علامہ نیاز کے خاص مراسم تھے۔ جب ظفر ہاشمی کو اختر شیرانی کے ایک خط سے لاہور میں علامہ نیاز کے آمد و قیام کی اطلاع ملی تو وہ بے قرار ہو کر نیاز سے ملنے کلکتے سے لاہور پہنچے۔ نیاز صاحب کو جب یہ معلوم ہوا کہ ظفر ہاشمی وحشت کے شاگرد رشید ہیں تو ان کو سینے سے لگا لیا۔ پھر بڑی محبت سے وحشت کا ذکر کرتے ہوئے ان کا یہ مقطع پڑھا ؎

ترے اندازِ سخن سے ہے یہ ظاہر وحشتؔ — کہ مقدر ہے ترا غالبِ دوراں ہونا

نیاز فتح پوری لاہور میں دو ماہ رہے۔ اس عرصے میں ظفر ہاشمی ان کی خدمت میں برابر حاضر ہوتے اور ان سے مستفیض ہوتے رہے۔ ان ہی دنوں ظفر ہاشمی نے علامہ نیاز کی خدمت میں ولی دکنی کے اصل دیوان کا ایک قلمی نسخہ بطور تحفہ پیش کیا۔ یہ قیمتی و نایاب نسخہ ایک بڑھئی کے ذریعے ظفر ہاشمی کے کسی بزرگ کے ہاتھ لگا تھا جو حضرت نیاز کے کتب خانے کی زینت بنا۔ لکھنؤ پہنچ کر نیاز صاحب نے اس نسخے پر نگار میں ایک مبسوط مقالہ تحریر فرمایا اور اس شمارے کی ایک کاپی خاص طور پر ظفر ہاشمی کے نام بھجوائی[11]

راقم الحروف کے بزرگوں کو علامہ نیاز فتح پوری سے نیاز مندی حاصل تھی۔ اسی تعلق سے راقم کو بھی نگار پڑھنے، نیاز صاحب کو جاننے اور ان کے سرچشمۂ فیض سے مستفید و مستفیض ہونے کی سعادت حاصل ہوئی۔ بعد میں خط وکتابت اور نگار لکھنؤ میں چھپنے کا شرف بھی حاصل ہوا۔

۱۹۵۵ء میں راقم السطور کی ایک کتاب "بنگال میں اردو" (مشرقی و مغربی بنگال میں اردو کی ابتدا سے ۱۹۵۴ء تک کی مبسوط تاریخ) کا پہلا ایڈیشن منظرِ عام پر آیا تو اس کا ایک نسخہ بصد مسرت و افتخار علامہ نیاز کی خدمتِ اقدس میں ارسال کیا، مؤدبانہ التماس کے ساتھ کہ اس کم مایہ و بے مواد کا یہ حقیر ادبی تحفہ قبول فرمائیں اور اپنی رائے گرامی سے مطلع فرما کر ممنون کریں۔ گرامی نامہ بلا تاخیر باذرہ نواز ہوا۔

نگار لکھنؤ

۱۸/ اگست ۱۹۵۵ء

مکرمی

کارڈ ملا۔ آپ کی کتاب پر ستمبر کے نگار میں تبصرہ شائع
ہو رہا ہے۔ آپ نے بڑی مفید کتاب لکھی ہے۔

مخلص — نیاز

نگار لکھنؤ میں تفصیلی تبصرہ اشاعت پذیر ہوا۔ علامہ نیاز فتح پوری جیسے نابغۂ روزگار نقاد اور یکتائے عصر مدیر اعظم کی ذاتِ گرامی نے خاکسار کا حوصلہ بڑھایا۔ تبصرے کا اقتباس یہ ہے۔

"یہ کتاب بنگال میں اردو کی نشو و نما کی جامع تاریخ بھی ہے اور ایک بسیط تذکرہ بھی۔ وہاں کے متعدد ہندو مسلمان شعراء اور ان کے منتخب اشعار کو اس فاضل مصنف جناب وفا راشدی نے جس محنت و کاوش کے ساتھ مرتب کیا ہے وہ یقیناً قابل ستائش ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اردو زبان سے دلچسپی رکھنے والے ضرور اس کا مطالعہ کریں گے اور نوجوان مصنف کا حوصلہ بڑھائیں گے تاکہ وہ اپنی تحقیق کا سلسلہ آئندہ بھی جاری رکھ سکیں۔"

(نگار لکھنؤ ستمبر ۱۹۵۵ء)

اب مجھے کوئی آرزو تھی تو یہ کہ علامہ نیاز سے کسی طرح نیاز حاصل کیا جائے۔ جب آپ پاکستان تشریف لائے تو مولانا محمد علی جوہر کے سابق پرائیوٹ سکریٹری اور مشہور تاریخ داں ضیاء الدین احمد برنی (مصنف عظمتِ رفتہ، مدیر اعلیٰ ماہنامہ کتابی دنیا کراچی) نے مجھے ان کی رہائش گاہ "نیاز منزل" کا پتہ بتایا۔ برادرِ مکرم ڈاکٹر شان الحق حقی سے معلوم ہوا کہ نیاز صاحب فریئر ہال کراچی میں سرکارِ پاکستان کی جانب سے قدیم مخطوطات و نوادرات کی تصحیح و تدوین کے کام پر فائز ہیں۔ میں نے سراپا شوق اور پیکرِ اشتیاق بن کر پہلے نیاز منزل اور دفتر نگار پاکستان (گارڈن) کے چکر لگائے لیکن ملاقات نہ ہوسکی۔ پھر فریئر ہال پہنچا۔ مل کر بہت خوشی ہوئی۔ بڑی شفقت کے ساتھ گفتگو کی۔ بڑھاپے میں بھی جوانوں جیسا کس بل، ہمت و استقلال، خدا کی پناہ، اس زمانے میں میرا قیام کوٹری حیدرآباد سندھ میں تھا۔ ان سے کئی بار ملاقات کے لئے کراچی جاتا رہا۔

علامہ وحشت کی زندگی، شخصیت اور افکار سے متعلق جب میری ایک کتاب موسوم بہ "حیاتِ وحشت" کا مسودہ مکمل ہو گیا تو مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ اس کا پیش لفظ علامہ نیاز فتحپوری سے لکھوایا جائے۔ اس سلسلے میں میرے ایک خط کے جواب میں آپ نے تحریر فرمایا:۔

کراچی
یکم ستمبر ۱۹۶۳ء

مکرمی، نوازش نامہ ملا۔ وحشت مرحوم بڑے پایہ کے شاعر تھے۔ ان کے متعلق جو کچھ بھی لکھا جائے گا وہ خوب ہوگا۔ کوئی پیش لفظ لکھے یا نہ لکھے۔ افسوس ہے کہ میرے پاس وقت نہیں ورنہ ضرور تعمیل ارشاد کرتا۔

مخلص نیاز

آج علامہ نیاز فتحپوری ہم میں موجود نہیں ہیں لیکن ان کے ان گنت نیاز مند اور خوشہ چیں برصغیر پاک و ہند کے گوشے گوشے میں موجود ہیں۔ علامہ نیاز نے اپنی وفات سے کچھ پہلے نگار کی ادارت ڈاکٹر فرمان فتحپوری کو سونپی تھی اس وقت سے تا حال نگار پاکستان کراچی سے باقاعدگی سے شائع ہوتا ہے کراچی میں نیاز مندانِ نیاز کا ایک وسیع دائرہ "حلقۂ نیاز و نگار" کے نام سے قائم ہے۔ اس ادارے کے زیرِ اہتمام گذشتہ کئی سالوں سے نیاز کی یاد میں بڑی شان و شوکت کے ساتھ اجتماع ہوتا ہے۔ پاکستان کے اہلِ قلم کے علاوہ ہندوستان اور دیگر ممالک کے اسکالرز شریک ہوتے ہیں۔ مقالات پیش کرتے ہیں۔ ان کی خدمت میں نیاز ایوارڈ کے طور پر شیلڈ پیش کی جاتی ہے۔ اس طرح "نیاز و نگار" کی علم و دانش کا دیا روشن ہے۔ اللہ اسے تا دیر روشن رکھے۔

حواشی

لہ پروفیسر ارشد کاکوی نے قیام پاکستان کے بعد نگار لکھنؤ سے لکھنا شروع کیا تھا۔ بے حد ذہین اور طباع شاعر و نقاد تھے۔ علامہ نیاز ان کی نظم و نثر بہت پسند فرماتے تھے اور نگار میں بڑی خوشی سے چھاپتے تھے۔ ان کی زندگی تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ ارشد کاکوی نے کم عمری ہی میں بڑے بڑوں سے اپنی قوتِ تحریر کا لوہا منوا لیا تھا۔ راقم کے دوستوں میں تھے۔ ان کے نجی کتب خانے میں کتب و رسائل کا خاصا ذخیرہ جمع ہو گیا تھا۔ ۱۹۷۰ء میں ماہنامہ ندیم ڈھاکا جاری کیا۔ جون جولائی ۷۰ء میں اس کا نذرالاسلام نمبر شائع ہوا۔ نذرالاسلام

پر راقم کے دو مضامین اس اشاعت خاص میں شامل ہیں۔ ارشد کاکوی کا انتقال عالمِ شباب میں ہوا۔ مزید تفصیلات کے لئے دیکھئے راقم کی کتاب بنگال میں اردو ص ۲۱۱

۲ـہ ان سب کے حالات زندگی اور انتخابِ کلام "بنگال میں اردو" مصنفہ ڈاکٹر وفا راشدی مکتبہ اشاعتِ اردو ۱۹۵۵ء میں محفوظ ہیں۔

۳ـہ ۱۹۴۱ء کا یہ نگار کتابی صورت میں جدید غزل گو (۱۹۴۱ء کی ایک دستاویز کے نام سے خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ کی جانب سے مارچ ۱۹۸۴ء میں منظرِ عام پر آیا ہے۔ خدا بخش لائبریری کے مخلص و محسن اردو جناب عابد رضا بیدار کی عنایت خاص سے اس کا ایک نسخہ دائرۂ ادب پاکستان کراچی کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔

۴ـہ یہ پوری غزل نگار لکھنؤ جون ۱۹۴۷ء میں شائع ہوئی تھی اس غزل کا مقطع ہے ؎

جب شعر و سخن سے وحشتؔ کو باقی نہ رہی ہو دلچسپی
حیران ہوں پھر کیوں محفل میں یہ شخص بلایا جاتا ہے

۵ـہ یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ علامہ جمیل مظہری بھی میرے اسکول کے استاد تھے۔ میں نے علامہ جمیل مظہری کی شخصیت اور شاعری سے متعلق دو مضامین لکھے۔ ایک مضمون میری طالب علمی کے زمانے میں مدرسہ عالیہ میگزین کلکتہ ۱۹۴۵ء میں چھپا۔ دوسرا مضمون ماہنامہ شاعر آگرہ اپریل ۱۹۴۷ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ اب یہی مقالہ قدرے ترمیم و اضافے کے ساتھ میری حالیہ کتاب "میرے بزرگ میرے ہمعصر" (مکتبہ اشاعتِ اردو کراچی ۱۹۹۳ء) میں شامل ہے۔ ان کی زندگی میں سہیل گیا نے دو جلدوں میں جمیل مظہری نمبر شائع کیا۔ ۱۹۸۰ء میں ان کی وفات کے بعد ہندوستان میں آجکل دہلی نے ۱۹۸۲ء میں اور پاکستان میں طلوع افکار کراچی نے ۱۹۹۱ء میں شائع کیا ہے۔ یہ نشان دہی اس لئے کی گئی ہے کہ علامہ جمیل مظہری کی حیات اور افکار پر کام کرنے والوں کی آئندہ رہنمائی ہو سکے۔

۶ـہ بزم احباب کلکتہ ۱۹ر جون ۱۹۲۰ء کو قائم ہوئی۔ کلکتے کی نہایت فعال ادبی انجمن تھی۔ نظریاتی و سیاسی تنگ نظری سے بالاتر ہو کر ہر مکتبِ فکر و ہر مدرسۂ خیال کے اہلِ علم و اہلِ ذوق اس کی نشستوں میں شرکت کرتے۔ نہایت اعلیٰ ظرفی اور وسیع القلبی سے اظہار خیال کرتے۔ ایک دوسرے کی دل سے قدر اور احترام کرتے۔ تہذیبی رواداری و بُرد باری کا جو منظر اس دورِ غلامی میں دیکھنے میں آتا تھا وہ اس عہدِ آزادی میں دیکھنے کو آنکھیں ترستی ہیں۔ بزم احباب کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ ہر ماہ ہر ممبر کی جانب سے اس کی رہائش گاہ پر نشستوں کا انعقاد ہوتا۔ روایتی تواضع کے علاوہ پُر تکلف عشائیہ سے بھی حاضرین کی خاطر و مدارات کی جاتی۔ علامہ وحشت اور علامہ ناطق لکھنوی جیسے عظیم المرتبت اساتذۂ کرام اس کے مستقل سرپرستوں میں تھے۔ ۴۷-۱۹۴۶ء میں اس کے صدر پروفیسر پرویز شاہدی اور سکریٹری استاذی مکرم رضا مظہری الکاظمی تھے۔

۷ـہ بحوالہ بنگال میں اردو مصنفہ ڈاکٹر وفا راشدی ص ۸۴ اردو پبلشنگ ہاؤس دہلی۔

۸ـہ ایضاً ″ ۸۶ ″ ″

۹ـہ جدید اردو سنہ ۱۹۳۶ء میں ۳۶ مارسڈن اسٹریٹ کلکتہ سے جاری ہوا۔ عبدالجلیل اس کے ایڈیٹر اور ناشر تھے۔ پروفیسر پرویز شاہدی جیسے نامور ترقی پسند شاعر بارہ سال اس کے ایڈیٹر رہے۔ ان کی ادارت میں جدید اردو کے کئی خاص نمبر اور سالنامے بھی شائع ہوئے جن میں ٹیگور نمبر ستمبر ۱۹۴۱ء اور سالنامہ ۱۹۴۵ء ایسے یادگار خصوصی شمارے ہیں جو برصغیر کے کسی بھی بڑے ادبی رسائل کے خاص نمبروں سے کچھ کم اہمیت نہیں رکھتے۔ جدید اردو میں ۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۷ء تک کے عرصے میں راقم (ڈاکٹر وفا راشدی) کے مضامین، نظمیں اور بنگلا ادب پاروں کے ترجمے برابر شائع ہوئے۔ خوش قسمتی سے وہ تمام جلدیں راقم کے پاس محفوظ ہیں۔ ان جلدوں کی مدد سے بیدل لائبریری کے سکریٹری اور ممتاز اسکالر ڈاکٹر ظفر الحسن نے جدید اردو کے مندرجات کا مکمل اشاریہ مرتب کر کے ماہنامہ آگہی کراچی (زیرادارت پروفیسر محفوظ علی) میں ۱۹۹۱ء کے شماروں (گیارہ قسطوں میں) شائع کرا دیا ہے۔ یہ اشاریہ آئندہ اہل تحقیق کے کام آئے گا۔ کلکتے کے احباب و کرم فرماؤں سے درخواست ہے کہ جدید اردو کلکتے سے اب بھی نکل رہا ہو تو براہِ کرم اس خاکسار کو مطلع فرما کر ممنون کریں۔ اگر

جدید اردو بند ہو چکا ہے تو کس سن میں ؟

۱۱ پیرزادہ ظفر ہاشمی کے تین شعری مجموعے حسن خیال ۱۹۳۲ء حسنِ کلام ۱۹۳۸ء اور تنویر عجم ۱۹۵۲ء شائع ہو چکے تھے۔ ان کی خواہش پر اس عاجز و فقیر نے ان کا چوتھا مجموعۂ منظومات آہنگ ظفر کے نام سے مرتب کر کے مکتبۂ اشاعت اردو کراچی کی جانب سے ۱۹۸۲ء میں شائع کیا۔ راقم کے پیرزادہ ہاشمی سے ایسے بے مثال برادرانہ تعلقات تھے کہ ہم دونوں نے مدیر محمد عبداللہ قریشی کے بھرپور تعاون سے ادبی دنیا لاہور کا وحشت نمبر مرتب کر کے ۱۹۷۳ء میں لاہور سے شائع کیا۔ یہ واقعہ بھی علامہ وحشت سے ان کی بے پناہ عقیدت اور اس ناچیز پر مثالی شفقت کا نتیجہ تھا۔ ورنہ آج کل کون کسی کو یاد کرتا ہے۔ پیرزادہ ظفر ہاشمی جب بھی لاہور سے امریکہ بغرض علاج اور حجاز بوجہ حج تشریف لے گئے۔ روانگی اور واپسی دونوں موقعوں پر اس ہیچمداں کے عسرت خانے میں قیام فرماتے تھے۔ اسی دوران انھوں نے علامہ نیاز کی وہ کہانی سنائی تھی جو مضمون میں قارئین کو سنائی گئی ہے۔ وہ آخری بار ۱۹۸۱ء میں کراچی تشریف لائے تھے ان سے میری آخری ملاقات اسی سال لاہور میں ہوئی تھی جہاں ان کی مستقل سکونت تھی۔ ۱۹۸۲ء میں آہنگ ظفر منظرِ عام پر آیا۔ بہت خوش ہوئے۔ ۱۲ فروری ۱۹۸۴ء میں ماڈل ٹاؤن لاہور میں اپنے ربِ حقیقی سے جا ملے۔

۱۲ میری کتاب "حیاتِ وحشت" حضرت رئیس امروہوی کے مبسوط پیش لفظ کے ساتھ چھپی۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن مکتبۂ کارواں لاہور نے ۱۹۸۲ء میں طبع کیا ہے۔ دوسرا ایڈیشن حال ہی میں مغربی بنگال اردو اکادمی کے اربابِ ذوق کی خصوصی توجہ سے شائع ہوا ہے۔ راقم ان کرم فرماؤں کا بطور خاص ممنون ہے۔

".."

خان رشید ـــــ گزشتہ پچاس برس سے نیاز صاحب کے علاوہ اُردو ادب کا ایک بھی ایسا نقاد نظر نہیں آتا جو انفرادی شعور سے کام لیتا ہو۔ ہر شخص اپنی رائے کو محفوظ رکھتا ہے اور ایسی بات کا منتظر رہتا ہے کہ پہلے کوئی اور کچھ کہہ دے تاکہ وہ بھی مصرع اٹھا کر شہیدوں میں نام لکھوا لے۔

ڈاکٹر ابرار رحمانی
آجکل (اردو) پبلی کیشنز ڈویژن
پٹیالہ ہاؤس۔ نئی دہلی۔۱۱۰۰۰۱

تاثرات کے امام — نیاز فتحپوری

تاثراتی تنقید کی اگر سیدھی سادی تعریف کی جائے تو یہ ہوگی کہ کسی ناقد کے دل و دماغ پر کوئی تخلیق پڑھنے کے بعد جو اثرات چھوڑتی ہے، انہیں تاثرات کو ناقد اپنی تنقید میں پیش کر دیتا ہے۔ یہاں ناقد کا مقصد محض سرور و انبساط ہوتا ہے۔ وہ جس قدر اس سے محظوظ ہوتا ہے اس کو اسی حساب سے پیش کر دیتا ہے۔ گویا ایک طرح سے یہ تفریح طبع اور لطف اندوزی کا مترادف سمجھا گیا۔ اُردو میں اس قسم کی تنقید مشاعروں، بیاضوں اور تذکروں میں بھی نظر آتی ہے۔ اور یہی تنقید دور حاضر میں تاثراتی تنقید کے علمبردار نیاز فتحپوری کے یہاں ترقی یافتہ شکل میں دکھائی دیتی ہے۔

لیکن تذکروں کی تنقید اور دور حاضر کی تنقید میں تھوڑا سا فرق ہے۔ تذکروں کی تنقید کا تاثراتی رنگ خالص مشرقی تھا جبکہ جدید ترقی یافتہ تاثراتی تنقید مغربی تنقید سے متاثر ہے۔ جسے شعوری طور پر اپنایا گیا۔

مغربی ادب میں تاثراتی تنقید' پر اگر ایک نظر ڈالیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ اس تنقید کی بنیاد ایک طرح کے ردعمل کے طور پر پڑتی ہے۔ اروِنگ بب بٹ (IRVING BABBIT) نے' جدید تنقید' کو بکواس سے تعبیر کیا تھا مگر جب اس جدید تنقید پر وہ بحث کرتا ہے تو اسے دو خانوں میں تقسیم کرتا ہے۔ اس کا خیال ہے :

> "آج کی تمام' جدید تنقید' اگر بکواس نہیں ہے تو اسے دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ تاثراتی اور سائنسی۔ تاثراتی نقاد ایک کتاب میں اس نقطہ نگاہ سے دلچسپی لیتا ہے کہ وہ کہاں تک محسوسات پر اچھا اثر ڈالتی ہے۔"

Standard in criticism (Essays in Modern Literary Criticism) P-105

مگر جب امریکی تاثراتی نقاد جویل اسپنگاراں (Joel Spingaran) تمام دبستان تنقید کے خلاف اپنے ردعمل کا اظہار کرتا ہے تو یہ کہتا ہے :

> "قدیم' روایتی تنقید' قاری کو شعری اصولوں اور ردیف و قوافی میں الجھا دیتی ہے، تو' تاریخی تنقید' تخلیق کار کی شخصیت سے بہت دور لے جا کر زمانۂ تخلیق میں گم کر دیتی ہے جبکہ' نفسیاتی تنقید' تخلیق کار کے حالات و زیست اور نجی کوائف میں اس قدر دلچسپی لیتی ہے کہ قاری کا ذہن شعر کے تاثرات کی صحیح اور درست قبولیت سے محروم رہتا ہے۔"

چنانچہ اسی بنیاد پر اس کا یہ بھی خیال ہے کہ دیگر علوم یا سماجی پس منظر سے کام لینا فضول سی بات ہے اور یہ کام کسی ادبی نقاد کا نہیں بلکہ تاریخ اور عمرانیات کے طلبہ کا ہے۔

اردو میں تاثراتی تنقید کے نقوش تذکروں میں بھی نظر آتے ہیں۔ حالی اور شبلی کے یہاں بھی اس کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں اور امداد امام اثر، مہدی افادی اور عبدالرحمان بجنوری کے یہاں بھی اس قسم کی تنقید پائی جاتی ہے۔ مگر اسے باضابطہ دبستان کی صورت میں بیسویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی میں پیش کیا گیا۔ اس عہد میں پیٹر (Peter) اسپنگاراں (Spingaran) اور آسکر وائلڈ

(Oscar Wild) کی باضابطہ اور شعوری طور پر پیروی کی گئی۔ ایسے نقادوں میں نیاز فتحپوری، فراق گورکھپوری، مجنوں گورکھپوری اور محمد حسن عسکری کے نام اہم ہیں جن میں نیاز فتحپوری کو امام کا درجہ حاصل ہے۔ انھوں نے نہ صرف اپنی تحریروں میں اس رنگ کو برتا بلکہ اپنے ہم عصر چند دوسرے ادیبوں کو بھی اس طرف مائل کیا۔ کہا جا سکتا ہے کہ تاثراتی تنقید کو اردو میں دبستان کے طور پر پیش کرنے کا سہرا نیاز فتحپوری کے سر ہے۔

نیاز فتح پوری نے اپنی تنقیدی نگارشات کے مجموعۂ انتقادیات، اور مالہٗ وما علیہ، میں اپنے تنقیدی نظریات کی وضاحت جا بجا کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"جب میں کسی شاعر کے کلام پر انتقادی نگاہ ڈالتا ہوں تو اس سے بحث نہیں کرتا کہ اس کے جذبات کیسے ہیں بلکہ صرف یہ کہ اس نے ان کے ظاہر کرنے میں کیا اسلوب اختیار کیا۔ وہ ذہن سامع تک اسے پہنچانے میں کامیاب ہوا ہے یا نہیں؟۔ بیان خواہ حسن وعشق کا ہو یا مہر کی پن چکی کا، اس سے غرض نہیں۔ دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ شاعر جو کچھ کہنا چاہتا ہے، وہ واقعی الفاظ سے ادا ہوتا بھی ہے یا نہیں۔"

(انتقادیات، اول، ص ۲۳۹)

یہاں نیاز فتح پوری والٹر پیٹر کے ہم خیال نظر آتے ہیں۔ پیٹر نے بھی اپنی تصنیف The Renaissance کے دیباچہ میں اسی قسم کے خیال کا اظہار کیا ہے۔ اس کی بھی یہی رائے ہے کہ کسی بھی تخلیق کا تجزیہ کرتے وقت اس کا خیال رکھنا چاہئے کہ اس تخلیق نے ذہن پر کیسے اثرات چھوڑے ہیں۔ اور یہ کہ حواس پر کس حد تک اثر انداز رہی۔ اسی طرح نیاز نے ایک دوسری جگہ اس قسم کی رائے کا اظہار کیا ہے:

"اس کو (نقاد کو) صرف اپنی رائے پر اعتماد کرنا چاہئے اور سمجھ لینا چاہئے کہ جو کچھ میں کہتا ہوں وہی صحیح ہے۔"

(انتقادیات اول ص ۲۳)

ظاہر ہے کہ یہ 'جو کچھ کہنا، کلی طور پر وجدان پر منحصر ہے۔ کسی تخلیق سے جس حد تک ناقد حظ حاصل کرے اسی کو اپنے تاثرات کے طور پر بیان کر دے اور اس میں جمالیاتی حس کارفرما رہے۔ اپنے اس خیال میں بھی نیاز فتح پوری پیٹر سے قریب ہیں۔ پیٹر بھی ادب پارے کے ان پہلوؤں کو اجاگر کرنے کا قائل ہے۔ جو اپنے حسن کی بنا پر حظ کا سبب بنتے ہوں۔

کسی ادب پارے میں حسن و خوبی کی تلاش اور اس تلاش کے لئے وجدان اور تاثرات پر انحصار ہی دراصل نیاز فتح پوری کی خاصیت ہے۔ اور یہی خصوصیت انہیں تاثراتی نقاد بناتی ہے۔

نیاز ادب پارے میں حسن و خوبی کی تلاش اور حظ انگیزی کے علاوہ کبھی کبھی دوسری باتوں پر بھی دھیان دیتے ہیں۔ لیکن یہاں بھی ان کی Approach جمالیاتی اور تاثراتی ہوتی ہے۔ چنانچہ دوسری باتوں پر دھیان دینے میں وہ اپنے نظریات میں افراط و تفریط اور تضاد بیانی کے بھی شکار ہوئے ہیں۔ انتقادیات حصہ دوم میں ایک جگہ حسن اور آرٹ کو ثانوی حیثیت اور اخلاقیات کو اولیت کا درجہ دیتے ہوئے کہتے ہیں:

"یہ کہنا کہ حسن و آرٹ کو محض حسن و آرٹ کی حیثیت سے دیکھنا چاہئے اور اس کے اخلاقی اور غیر اخلاقی ہونے کو نظر انداز کر دینا چاہئے، کوئی معنی نہیں رکھتا۔"

(انتقادیات (دوم) ص ۲۷۹)

یہاں نیاز 'معلم اخلاق' معلوم ہوتے ہیں اور کسی تخلیق کے اخلاقی یا غیر اخلاقی ہونے کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس مقام پر وہ Spingaran پر ایک طرح سے تنقید کرتے نظر آتے ہیں۔ لیکن جب وہ تھوڑی ہی دیر بعد یہ کہتے ہیں:

"اس میں شک نہیں کہ لٹریچر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ جذبات انسانی کو حرکت میں لائے اور اسی لئے ادبیات میں اہم ترین اس کی 'جذباتی قیمت' ہے۔ جو تصنیف ہمارے جذبات ابھار سکتی ہو، وہ یقیناً ہمارے ادبیات میں داخل ہے خواہ اس کی کوئی اخلاقی قیمت نہ ہو۔"

(انتقادیات (دوم) ص ۲۷۰)

تو اسپنگاراں کے ہم خیال اور موئد معلوم ہوتے ہیں۔ یہاں وہ اسپنگاراں کے خیال کے مطابق 'جذباتی قیمت' کو اہمیت دیتے ہیں اور 'اخلاقی قیمت' کی اہمیت سے یکسر انکار کرتے ہیں۔ تاثراتی تنقید کا یہی سب سے بڑا نقص ہے کہ جب جس قسم کے تاثرات ذہن پر مرتسم ہوئے اس کا اظہار کر دیا جاتا ہے۔

شاعری کے تعلق سے نیاز فتح پوری نے جو کچھ لکھا ہے وہ نہ صرف تاثراتی ہے بلکہ 'وجدانی کیفیت' کا حامل ہے۔ چنانچہ جب وہ غزل گوئی، عشق، محبت، پھول، اور رنگ و بو وغیرہ پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے تکرار کرتے ہیں کہ، 'یہ بھی شعر ہے'، 'یہ بھی شعر ہے'، تو وہ پورے طور پر عالم وجد میں نظر آتے ہیں۔ ایک اقتباس ملاحظہ کریں :

"محبت یا عشق فی الحقیقت ایک شدید قسم کا احساس پسندیدگی ہے اور اسی احساس و تاثر کا نام شعر ہے۔ ہم کسی پھول کو دیکھتے ہیں اور اس کے رنگ و بو سے متاثر ہو کر اس کی تعریف کرتے ہیں کہ، 'یہ بھی شعر ہے'! ہم شفق کی رنگینی سے متاثر ہوتے ہیں اور اس کا اظہار کرتے ہیں۔ 'یہ بھی شعر ہے'۔ ہم قوس و قزح کو دیکھتے ہیں اور بے اختیار کلماتِ تحسین زبان سے نکل جاتے ہیں، یہ شعر ہے۔ اسی طرح کائنات میں قدرت کے جتنے مظاہر و آثار ہیں وہ سب کے سب انسان کے احساس پر اثر انداز ہو سکتے ہیں اور جو کیفیت ان سے پیدا ہوتی ہے ان کو بظاہر کر دینا شعر ہو سکتا ہے، بشرطیکہ اس اظہار میں ترنم کو قائم رکھا جائے اور اسی ترنم کو پیدا کرنے کے لئے 'مخصوص لب و لہجہ اور مخصوص اوزان وضع کئے گئے' ہیں۔"

(انتقادیات (دوم) ص۱۶۱)

نیاز فتح پوری کے نزدیک مظاہر کائنات کے وہ تمام اثرات جو ذہن و دماغ کو اپیل کرتے ہوں، ان کو مخصوص لب و لہجہ اور اوزان و بحور میں پیش کر دینے کا نام ہی شعر ہے چنانچہ ایک جگہ دو ٹوک انداز میں کہتے ہیں :

"شاعری صرف تاثرات کی زبان ہے۔" (انتقادیات اول ص۳۳)

اور ان تاثرات کے پیش کرنے میں وہ اس کی نوعیت کو بھی نہیں دیکھتے نہ ہی اس کی کوئی حد مقرر کرنا چاہتے ہیں۔ وہ یہاں تک کہتے ہیں :

"یہ گفتگو کوئی معنی نہیں رکھتی کہ ان تاثرات کی نوعیت کیا ہے، چہ جائیکہ اخلاقیات اور مذہبیات وغیرہ کی بحث چھیڑی جائے کہ اسے تو شاید کوئی پیغمبر بھی گوارا نہ کرے، اگر وہ شعر کہنے پر آجائے۔"

(انتقادیات اول ص۳۴۸)

نیاز فتح پوری کی تنقید کے اس جائزے سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ تاثراتی تنقید موڈ کی تابع ہوتی ہے۔ لہذا اکثر و بیشتر افراط و تفریط کا شکار ہوتی ہے۔

چنانچہ تاثراتی تنقید کے ایک بڑے نقاد مجنوں گورکھپوری کو جب اس نظریہ تنقید کی غیر سنجیدگی کا احساس ہوا۔ تو وہ اس سے تقریباً تائب ہو گئے بعد میں مارکسی تنقید میں انھوں نے اپنا ایک مقام بنایا۔

نتیجہ کے طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ چونکہ تاثراتی نقادوں کا مقصد صرف حظ حاصل کرنا ہوتا ہے، چنانچہ ان نقادوں کے یہاں افادیت پس منظر میں گم ہو جاتی ہے اور اس کا دائرہ جمالیاتی اقدار تک محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔ شاید اسی لئے اب تاثراتی تنقید میں کوئی بڑا نام نظر نہیں آتا۔

''میں کہتا ہوں، بہ آواز بلند کہتا ہوں اور بلا خوف تردید کہتا ہوں کہ یہ وقت اسبات کے دیکھنے کا نہیں کہ مسلمان نماز پڑھتا ہے یا نہیں، روزے رکھتا ہے یا نہیں، دوزخ و جنت کا قائل ہے یا نہیں، بلکہ صرف یہ سوچنے کا ہے کہ مسلمان کے پاس کچھ کھانے کو بھی ہے یا نہیں، اگر علماء دین ہمارے حقیقی بہی خواہ ہوتے اور ان کے دلوں میں ہمارا سچا درد ہوتا تو اس وقت تمام مواعظ مذہبی کو چھوڑ کر صرف اس پر غور کرتے کہ مسلمان اپنا پیٹ کس طرح بھریں، ان کے بچے بھوک سے کیونکر محفوظ رہیں اور ان کی عورتیں کس تدبیر سے اسباب ستر پوشی حاصل کر سکیں۔ آپ ایک مسلمان کو موٹر پر سوار، نفیس لباس پہنے ہوئے دیکھ کر اس کی خوش حالی و مسرت کا اندازہ نہ کیجئے بلکہ اس کے گھر میں جاکر دیکھئے کہ کیا حالت ہے اور اس کے دل میں سما کر معلوم کیجئے کہ وہ کس تکلیف و عذاب میں مبتلا ہے۔ پھر میں پوچھتا ہوں کہ کیا ہمارے اس قائد و رہنما کو، ہمارے اس دینی و دنیوی رہبر کو کبھی اس کا خیال ہوا ہے کہ جس وقت وہ اپنے دستر خوان پر نفیس نفیس غذائیں کھانے میں مصروف رہتا ہے ٹھیک اسی وقت اس کے پڑوس میں ایسے کتنے مسلمان ایسے ہیں جو بھوکے پیاسے پڑے ہوئے ہیں جن کی مائیں اپنی خشک چھاتیوں سے ایک قطرہ دودھ کا ان کے منہ میں نہیں ٹپکا سکتیں۔ جس وقت وہ حریر و کمخواب، یا لکھنؤ کی باریک چکن اور ولایتی تزیب کی اچکن پہن کر ایک ادائے معشوقانہ کے ساتھ موٹر پر سوار ہونے کے لئے گھر سے نکلتا ہے کیا ایک لمحہ کے لئے بھی اس کا خیال اس حقیقت کی طرف منتقل ہوتا ہے کہ اس قوم کے کتنے افراد جھلسا دینے والی دھوپ میں ننگے بدن، برہنہ پا پتھر توڑ رہے ہیں، کیا اس سے زیادہ دنیا میں بے عزتی، بے حیائی اور بے شرمی ہو سکتی ہے کہ جو افراد فاقہ کر کر کے، اپنے بچوں کا پیٹ کاٹ کاٹ کر اس کے لئے یہ نعائم و لذائذ فراہم کریں انھیں کے دکھ درد کی طرف سے وہ یوں بے خبر و بے پرواہ ہے، ہر چند فرعون و نمرود کو گزرے ہوئے زمانہ گزر گیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی اولاد اب تک دنیا میں باقی ہے اور اسی اخلاق سوز انسانیت شکن خصوصیات کے ساتھ باقی ہے جو کسی وقت ان کے اسلاف میں پائی جاتی تھیں مگر صرف یہ ہے کہ ان پر عذاب نازل ہو چکا اور ان کے لئے ہنوز دست خدا میں انتظار کر رہا ہے۔

لکھنوی علماء کے کسی مجمع میں ایک بار میں نے دریافت کیا کہ ''فرمائیے اب کیا ارادہ ہے اور قومی فلاح و بہبود کے لئے کون سی مقامی تحریک آپ کے پیش نظر ہے''۔ ان میں سے ایک نے کہا ''ہاں عرصہ سے ہمارا یہ خیال ہے کہ یہاں کے مسلم کلب کی حالت درست کی جائے اور انسائیکلوپیڈیا کے قسم کی ایک کتاب اردو میں لکھی جائے۔'' یہ سنتے ہی میرے بدن میں آگ لگ گئی، میں نے کہا ''قبلہ، اپنے جھوپڑے کو محل بنانے سے پہلے کیوں آپ اس کی آرائش و زینت کی فکر میں مبتلا ہیں، تمدن کی ترقی، جاہ و ثروت کے تخم کے ساتھ یہ سب کچھ اپنے آپ ہو رہے گا، نہ جانے کتنے کلب قائم ہو جائیں گے کتنی انسائیکلوپیڈیاں بن جائیں گی۔ اس وقت تو سوال جزحیات کا ہے۔ بقاء زندگی کا ہے، تن پوشی اور رفع گرسنگی کا ہے۔ اس لئے طریقۂ زکوٰۃ کو منظم کیجئے۔ قومی بیت المال کی طرح ڈالئے، گھر گھر جاکر دیکھئے کہ کون کس حال میں مبتلا ہے اور سب سے پہلے اس زخم کا علاج کیجئے جس نے ساری قوم کو مفلوج بنا رکھا ہے''۔ یہ سن کر فرمانے لگے کہ ''ہاں یہ تحریک بھی ضروری ہے اور انشاء اللہ الرحمٰن اس پر غور کریں گے''۔ لیکن آپ جانتے ہی ہیں کہ جب مولوی کسی بات کو انشاء اللہ سے شروع کرتا ہے تو اس کا انجام کیا ہوا کرتا ہے۔''

اقتباس از ''ایک تلخ حقیقت'' [من دیزداں، نیاز]



راشد انور راشد
جے این یو - نئی دہلی

ایک جیّد عالم — نیاز فتحپوری

۲۴ مئی ۱۹۶۶ء کو صبح کراچی (پاکستان) میں مولانا نیاز فتحپوری انتقال فرما گئے۔ پورے ۸۲ سال کی بے قراریوں کو آخر قرار آگیا۔ مسلسل ساٹھ سال تک انشائے لطیف سے لیکر ادب و تنقید، افسانہ و ترجمہ اور مذہب و تاریخ کو اپنی مضبوط گرفت میں لینے والا قلم رک گیا۔ ایک روایت کو نیند آگئی اور ایک اسلوب کا خاتمہ ہو گیا۔

تعمیر و تخلیق کی چنگاریوں کو روشن کرنے میں مولانا نیاز فتحپوری نے ہر قدم پر پیش قدمی کرکے اپنی دانشمندی اور بے پناہ صلاحیتوں کا ثبوت دیا تھا۔ اس دور کے اساتذۂ شعر و ادب میں مولانا کو ایک منفرد مقام حاصل تھا اور ہر کوئی نہایت ادب و احترام سے ان کی عظمت کو تسلیم کرتا تھا۔ مولانا کی تحریروں کے علمی، ادبی، لسانی، فنّی اور معلوماتی پہلو، تشنگانِ ادب کے لئے وجہِ کشش ہوتے تھے۔ "نگار" کی بعض تحریروں سے اکثر و بیشتر ادباء و شعراء کو اختلاف ہوتا تھا۔ ان کی عظیم ادبی شخصیت، انتھک خدمات اور ان کے ادب و احترام کے باوجود ان کی "ہنگامہ پسندی" اور "مصلحت اندیشی" سے لوگوں کو تکلیف ہوتی تھی۔ مولانا کی شخصیت اس وقت بھی مسلّمات سے تھی، اب بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گی۔ ان کے کارہائے نمایاں بھلائے نہیں جا سکتے لیکن جب ان کی بہت سی تحریروں کا واقعات کے پس منظر میں جائزہ لیا جاتا ہے تو ایک طرح کا دُکھ ہوتا ہے۔ مجنوں گورکھپوری کی یہ بات۔

"وہ سنسنی خیز باتوں کی تجارتی قیمت کو ایک معاملہ سنج کی حیثیت سے مجھ سے بہتر سمجھتے ہیں"
کتنی تلخ معلوم ہوتی ہے، لیکن کیا کیجئے کہ اسے جھٹلایا نہیں جا سکتا۔

مذہبی معتقدات ہوں یا علمی و فنّی نکات، تنقید ہو یا تبصرہ، فرد ہو یا جماعت، مولانا نے جس موضوع کو بھی ہاتھ لگایا، اپنے مخصوص طرزِ تحریر کی تمام تر رعنائیوں کے باوجود کہیں نہ کہیں "سنسنی خیزی" ضرور پیدا کی۔ انہیں قلم پر اتنی غیر معمولی قدرت تھی کہ "نگار" کے پورے پورے "خاص نمبر" اپنی ہی تحریروں سے مرتّب و مزیّن کر دیئے۔ اسلوب میں ایسی جان کہ قاری کھنچتا چلا جائے۔ علم و وقوف کا یہ حال کہ مختلف زبانوں کی کتابوں کا نچوڑ اس طرح پیش فرمائیں کہ وہ خود ان کا معلوم ہو۔ یوں لگتا تھا کہ معلومات کا ایک بحرِ ذخّار موجیں مار رہا ہے۔ ان کی بعض باتیں سب ہی کو بڑی عجیب سی لگتی تھیں۔ کبھی جوشؔ ملیح آبادی پر علی اختر حیدر آبادی کو ترجیح دے رہے ہیں۔ کبھی بر بنائے تعلقات حسرتؔ موہانی کو اردو کا سب سے بڑا غزل گو ثابت کر رہے ہیں۔ کبھی ایسی باتیں لکھ رہے ہیں جن سے کفر و الحاد کی بُو آئے۔ اردو زبان کو نقصان پہونچانے کی زبردست کوششیں کی گئیں۔ لیکن نیاز صاحب نے کبھی "نگار" کے ملاحظات میں اردو کے لئے کچھ نہیں لکھا۔ ہندوستانی سیاست کو چھوڑ کر وہ اپنے "ملاحظات" میں پاکستانی سیاست سے بحث فرمایا کرتے تھے۔ سیمابؔ، جوشؔ، جگرؔ، فانیؔ، یگانہؔ اور اپنے دور کے مسلّم الثبوت اساتذۂ شعر و ادب کے یہاں انہیں خامیاں ہی خامیاں نظر آئیں۔ ایک زمانہ میں فراقؔ کو اچھالنا شروع کیا تو "نگار" کا کوئی ایسا شمارہ نہیں ہوتا تھا جس میں فراقؔ کا ذکر نہ ہو، اور بعض وجوہ کی بناء پر جب اس سلسلے کو ختم کیا تو پھر فراقؔ جیسے بڑے شاعر کا نام لینا بھی پسند نہ کیا۔ اقبال نمبر، خدا نمبر، داغؔ نمبر، جگر نمبر کی اشاعتوں کا مقصد اردو حلقوں میں ایک طرح کا ہیجان اور سنسنی پیدا کرنا ہی تھا۔ تعمیر و تخریب اور تخلیق و تحریر کے اس سنسنی خیز عمل سے بہت سے لوگ لطف اندوز ہوتے تھے اور بہت سے بدمزہ۔ لیکن مرحوم کے قلم کا جادو تھا کہ ان کی تحریروں کو لوگ پڑھتے ضرور تھے۔ ان کے صحت مند مضامین پر سر دُھنتے تھے۔ مکتوبات کا ایک نہایت دلچسپ اور رنگین سلسلہ انھوں نے نگار میں شروع کیا۔ استفسارات کے باب میں وہ زیادہ تر ایسے موضوعات کو لیتے تھے جو پڑھنے والوں میں دلچسپی پیدا کریں۔ مجنوں گورکھپوری نے ایک

جگہ لکھا ہے ۔

"نیاز ایک زبردست قوتِ آخذہ کے مالک ہیں۔ وہ بڑے سلیقے کے ساتھ دوسری جگہ سے مواد لے سکتے ہیں اور اپنے انفرادی اسلوب سے اس کو اپنا بنا کر پیش کر سکتے ہیں۔"

اس سلسلے میں بارہا بحثیں چلیں۔ پروفیسر عبدالخالق سہسوانی نے تو بھوپال کے ایک اخبار کے صفحے کے صفحے سیاہ کر دیئے اور اخذ و ترجمہ کے سلسلے میں سنگین الزامات عائد کئے۔ مولانا نیاز کے اندر یہ خاص بات تھی کہ وہ خود پر کئے گئے اعتراضات کا نگار میں قطعی جواب نہیں دیتے تھے۔ وہ اپنے اصولوں میں بہت سخت تھے۔ انہیں صرف اپنے کام سے کام تھا۔ ہمہ وقت لکھنا پڑھنا، نئی نسل کو متاثر کرنا اور اردو میں ایسا مواد پیش کرنا جو نیا معلوم ہو، ان کا محبوب مشغلہ تھا، جس پر وہ آخری سانس تک کاربند رہے۔ جہاں وہ ایک اصول پرست ادیب تھے، وہیں کاروباری معاملات میں بھی بہت سخت تھے۔

مذہب سے ان کا تعلق برائے نام ہی تھا۔ وہ ایک گہرا جمالیاتی شعور رکھتے تھے۔ انھوں نے اردو نثر کو اس جمالیاتی شعور سے آشنا کیا۔ آسکر وائلڈ، والٹر پیٹر اور ٹیگور کی انشائے لطیف کو اردو میں عام کیا۔ ٹیگور کی "گیتا نجلی" کا تو ایسا خوبصورت ترجمہ پیش کیا کہ پڑھنے والے عش عش کر اٹھے۔ انھوں نے اپنی یادگار سے ۳۵ - ۳۶ چھوٹی بڑی تصانیف چھوڑی ہیں۔ ان میں انشائے لطیف سے لیکر افسانہ، ناول، شعری تنقید، جنسیات و جمالیات پر مضامین، مذہب، تاریخ و فلسفہ سب ہی کچھ ہے۔ ان کے "رنگین اور سنگین" خطوط کے بھی شاید دو مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ مولانا نیاز سے بعض نظریاتی اور معتقداتی اختلاف کے باوجود ان کی تصانیف کافی پڑھی جاتی ہیں۔ "نگار" کا بڑا خرچ ان کی تصانیف کی آمدنی سے ہی پورا ہوتا تھا۔ حکومتِ ہند نے انہیں "پدم بھوشن" کا خطاب دیا اور غالباً انہیں وظیفہ بھی ملتا تھا۔

مولانا نیاز پٹھان تھے۔ ابتدائی زندگی محکمۂ پولس کی ملازمت میں گزری۔ مزاج میں سختی ز تھی ہی۔ علم و ادب میں غیر معمولی صلاحیت پیدا ہونے کی وجہ سے ان میں ایک زبردست "انا" بھی پیدا ہو گئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ خود کو "ماورائے علم و ادب" سمجھتے ہیں۔ ادب کی بڑی سے بڑی شخصیت کو وہ خاطر میں نہ لاتے تھے۔ انھوں نے اپنے کسی بڑے ہمعصر ادیب یا شاعر کی عظمت کا اعتراف کھلے دل سے نہیں کیا۔ حتیٰ کہ بڑے بڑے ادباء اور شعراء اس دنیا سے اٹھ گئے۔ لیکن کبھی انھوں نے کسی کے لئے بطور تعزیت دو جملے اپنے رسالہ "نگار" میں نہیں لکھے۔ کوئی مرنے والا ان کے نزدیک قابلِ ذکر نہ تھا۔

جو کچھ بھی ہو، وہ اپنے اسلوب، فکر و نظر، اور علم و فضل کے اعتبار سے منفرد حیثیت رکھتے تھے۔ اردو زبان و ادب پر ان کی فکر و نظر کا پرتو گہرا تھا۔ ان کے ساتھ لکھنے والے ارباب علم کا ایک بڑا حلقہ تھا۔ بقول کوثر چاند پوری۔

"وہ حیاتِ انسانی کی ایک عملی تاریخ اور اس کے تجربات کا مکمل اظہار تھے۔"

اگر مولانا نیاز خود اتنے بڑے اور منفرد ادیب و انشاء پرداز نہ ہوتے ہوئے صرف "نگار" کے ایڈیٹر ہی ہوتے تو بھی یاد رکھے جانے کے قابل تھے۔ کسی ادبی رسالہ نے اتنی طویل عمر اور ایسا معیار رہا پایا ہے؟

صلاح الدین پرکار ——— نیاز نے جتنا اثر ابوالکلام آزاد سے قبول کیا شاید ہی اتنا اس دور کے ادیبوں میں سے کسی اور نے کیا ہو۔ وہ جب تک شاعر رہے مولانا کا ہی اثر ان پر حاوی تھا اور جب انشا پردازی کی طرف متوجہ ہوئے تب بھی ان کا اثر رہا مگر انہوں نے جلد ہی اپنا رنگ اختیار کیا اور نئے طرز اسلوب کے موجد بنے۔

نیاز فتحپوری اور فنِ مکتوب نگاری

مسحور قیصر۔ اشرف نگر۔ مونگیر۔ ۸۱۱۲۰۱

اُردو خطوط نگاری کا آغاز رجب علی بیگ سرور کے زمانہ سے ہوتا ہے لیکن توجہ اور مقبولیت مرزا غالب کے عہد سے ملتی ہے۔ غالب کے مکاتیب اوّل اوّل اس فن میں فنی و جمالیاتی اقدار و حس کو جنم دیتے ہیں اور پھر یہیں سے خطوط نگاری کی ایک مستقل روایت قائم ہوتی ہے جو مختلف ادوار اور ادیبوں و شاعروں کی رہنمائی میں اپنا سفر طے کرتی ہوئی موجودہ عہد میں قدم رکھتی ہے۔ نیاز فتحپوری کی عظیم شخصیت اس سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے جنھوں نے دیگر اصنافِ ادب کے علاوہ اس فن پر بھی بالتوجہ طبع آزمائی کی اور اپنے گراں قدر خیالات و افکار کی مدد سے اس فن کی اہمیت، افادیت اور ضرورت میں اضافہ کیا۔

کسی بھی فنکار کے فن کا مکمل محاسبہ کرنا شاید اتنا ہی مشکل کام ہے جتنا کہ فنکار کو اپنے فن کی گہرائی میں اُترنے اور اس پر عبور حاصل کرنے میں دشواریاں درپیش ہوتی ہیں کیونکہ فنکار جس طرح اپنے فن کا حُسن، اس کی افادیت اور اس سے پیدا ہونے والے تاثرات کی تلاش میں کوشاں و سرگرداں رہتا ہے اسی طرح فنکار کے فن کی قدر و منزلت اور اس کی اہمیت و افادیت کی تلاش و تعیّن بھی ایک مشکل مرحلہ ہے۔ بالخصوص ایسا فنکار جس کا زورِ قلم مختلف شعبہ ہائے فن پر عبور رکھتا ہو تب دشواریاں اور بھی بڑھ جاتی ہیں۔ نیاز فتحپوری کا فن ایسی ہی نمایاں حقیقت ہے جو شخصیت کے متنوع رنگ و مزاج اور علوم و فنون کی گہری جانکاری کے بموجب گزشتہ کئی دہائیوں سے اب تک اردو ادب میں موضوعِ بحث رہا ہے۔ ناقدانِ ادب نے مختلف نظریوں اور اصول و آہنگ سے ان کی شخصیت اور فنی اقدار کا تعین کیا ہے۔ ایک مقالہ میں ڈاکٹر محمد حسن نے نیاز کی شخصیت اور ان کے فن کی تعریف نہایت پُرکشش اور پُرحقیقت انداز میں بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

> "نیاز فتحپوری کی شخصیت خاصی متنوع اور رنگارنگ ہے۔ بعض لوگ اُنھیں ایک باغی ایڈیٹر کی حیثیت سے جانتے ہیں جس نے تعصّب، تنگ نظری اور کٹھ ملّائیت کے خلاف سخت جہاد کیا۔ بعض لوگ انہیں ایک ایسے انشا پرداز کی حیثیت سے جانتے ہیں جس کی نثر میں جادو تھا۔ کچھ سمجھتے تھے کچھ نہیں سمجھتے تھے مگر واہ واہ اکثر کی زبان سے نکل جایا کرتی تھی۔ بعض ان کو 'شہاب کی سرگزشت' اور 'شاعر کا انجام' لکھنے والے اس رومانی ادیب کی حیثیت سے جانتے ہیں جس کے کردار حسن کے پرستار اور جس کی ہیروئنیں حُسن و ذہانت کا لاجواب مجسّمہ ہوا کرتی تھیں۔ بعض انہیں تنقید نگار کی حیثیت سے بھی جانتے ہیں جو بڑے بڑے شاعروں پر استفہامیے قائم کرتا اور کلاسیکی شعراء کی اپنے انداز سے چھان پھٹک کرتا رہتا ہے۔"

قطع نظر ہم نیاز فتحپوری کے مضامین و مکاتیب سے بھی چشم پوشی نہیں کر سکتے کیونکہ جس طرح انھوں نے دیگر اصنافِ ادب پر اپنے ذہنی اور شعوری تاثرات کا اظہار کیا ہے اسی طرح مکاتیب اور مضامین بھی ان کی تخلیقی اور تحریری کاوشوں کے شاہکار نمونے ثابت ہوئے ہیں۔ اگر خطوط نگاری کو صحیح معنوں میں ادبی فن یا اصنافِ ادب کا ایک اہم جُز تسلیم کیا جاتا ہے تو نیاز فتحپوری کے مکتوبات کو بھی ان کے تمام فنی کمالات میں ایک مخصوص مقام ملنا چاہئے کیونکہ ان کے مکاتیب کا بیشتر حصّہ ان کی شخصیت اور ان کی تخلیقی عظمت و رفعت کا ثبوت پیش کرتا ہے۔

کسی بھی فن پارے میں فن اور فنکار کی قدر و منزلت قائم کرنے کے لئے سب سے پہلے زبان و بیان اور طرز ادا کی اہمیت کا احساس جاگزیں ہوتا ہے۔ کیونکہ یہی وہ سب سے موثر اور موقر طریقۂ پیشکش ہے جو معمولی سے معمولی خیالات اور مضامین کو بقائے انفرادیت عطا کرنے کی قوت رکھتا ہے اس لئے اسلوب کی انفرادی اہمیت ہر جگہ مسلم و مقدم ہے۔ بالخصوص نثری ادب میں اسلوب کی اہمیت کچھ زیادہ توجہ کی متقاضی ہوتی ہے کیونکہ اس حصۂ ادب میں مضامین اور خیالات کا خلط ملط رشتہ طویل و عریض ہوتا ہے اور فنکار کی صلاحیت اور فکری گرفت بہت محدود ہوتی ہے اس لئے اسلوب کا منفرد پہلو ہی ادیب کی شخصیت میں اضافی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ انگریزی مصنف ایمرسن کہتا ہے:

"اسلوب مصنف کے ذہن کا عکس ہے۔ یعنی پیشکش کی منزل وہ منزل ہے جہاں فنکار کا ذاتی شوق و ذوق، پسند و ناپسند، رجحان و میلان اور افتاد طبع کا سراغ لگایا جاسکے۔"

اور ورس فولڈ لکھتے ہیں:

"فرد کے لئے سلیقہ کی جو اہمیت ہے، ادیب کے لئے وہی اہمیت اسلوب کی ہے۔ سلیقہ مند آدمی کو ہم جس طرح انسان کہتے ہیں، اسی طرح اسی انداز میں صاحب طرز ادیب کو ہم ادیب کہتے ہیں۔"

نیاز فتحپوری کی شخصیت چونکہ کئی معنوں میں اپنی اولین پہچان رکھتی ہے اس لئے ان کی نثر نگاری میں اسلوب کی انفرادیت اکثر موقعوں پر اپنا کمال دکھاتی ہے، ایک رومانی ادیب، ایک بے باک انشا پرداز اور ایک نڈر ناقد کے یہاں اسلوب کی انفرادیت ایک خوبی ہوتی ہے جس کا سہارا لے کر وہ اپنے تخالیق کو زمانے کے سامنے پیش کرتا ہے۔ نیاز نے اپنے مکاتیب میں اس انفرادی خوبی اور اعلیٰ اقدار کو مرکزی پہلو عطا کیا ہے اور خطوط کے تمام زاویوں کو اسی انفرادی پہلو سے دیکھا اور پیش کیا ہے۔ مرزا غالب نے جس طرح اپنے اسلوب میں سنجیدگی، ظرافت اور شوخی کا اہتمام کیا تھا اسی طرح نیاز نے اپنے اسلوب کو طرح طرح کے ہنر عطا کئے ہیں۔ غالب کے یہاں جو سنجیدگی نظر آتی ہے وہی سنجیدگی نیاز کے یہاں بھی بکھری پڑی ہے۔ البتہ شوخی اور ظرافت جو غالب کے خطوط کو ممتاز کرتی ہے اس سے نیاز کے خطوط بالکل عاری ہیں۔ شاید مزاج کی از حد سنجیدگی اور افکار و احساس کی فراوانی مکتوب نگار پر بری طرح حاوی تھی لیکن پھر بھی نیاز کے اسلوب کی انفرادیت ان کے خطوط کو ایک نیا آہنگ اور نئی سمت عطا کرنے میں بھرپور تعاون دیتی ہے۔

تخاطب و تکلم، ڈرامائی انداز و کیفیت، مرقع کشی اور جذبات نگاری، تحریر میں اثر آفرینی، انداز بیان اور طرز ادا، جملوں کے ساخت اور فقروں کا برمحل استعمال، الفاظ میں چاشنی اور برجستگی، محاورے کا خوبصورت استعمال، صوتی کیفیات اور حفظ مراتب القاب و آداب وغیرہ خطوط نگاری کے اہم جز ہیں جن کے سہارے اچھے اور پُر تاثیر خطوط وجود پاتے ہیں۔ ان تمام چیزوں کی موجودگی ادبی پہچان عطا کرتی ہے۔ نجی خطوط میں گرچہ یہ تمام جزئیات شاذ ہی نظر آتے ہیں لیکن تاریخی سطح پر کچھ ادبی خطوط نگار ایسے ہیں جنھوں نے ان رمزیات کو ضروریاتاً نہ صرف اپنے خطوط میں داخل کیا بلکہ ان کی ضرورتوں سے بالواسطہ مستفید بھی ہوئے ہیں۔ نیاز فتحپوری نے بھی ان تمام اجزائے فن کو اپنی تحریروں میں جگہ دی ہے۔ اگرچہ القاب و آداب کے معاملے میں انھوں نے نہ تو کوئی خاص اہتمام کیا نہ ہی ان کی اہمیت اور ضرورت کی طرف توجہ دی۔ بیشتر خطوط بغیر القاب و آداب کے بالواسطہ طور پر مکتوب الیہ سے مخاطب نظر آتے ہیں۔ شاید اس کی کوئی خاص وجہ نہ ہو لیکن مکاتیب نگاری کا فن اس کمی اور بے توجہی سے ایک خاص کشش سے عنقا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ القاب و آداب سے مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کا درمیانی رشتہ واضح ہوتا ہے اور ساتھ ہی دونوں کی شخصیت کی پہچان بھی ہو جاتی ہے۔

نیاز فتحپوری نے الفاظ اور جملوں کی ترتیب و تنظیم میں بڑی نفاست اور حلاوت کا استعمال کیا ہے۔ وہ سجے سجائے جملوں اور فقروں کے ذریعہ خطوط رقم کرتے ہیں۔ یہ ان کی انفرادیت ہے جو ان کی شخصیت کو اضافی حسن اور خوبی عطا تو کرتی ہے لیکن ایک حدِّ امتیاز بھی قائم کر دیتی ہے۔ نیاز کے جملوں اور ان کے پرواز تخیل کا محاسبہ کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد حسن فرماتے ہیں کہ:

"نیاز سجے سجائے کمروں اور تصویروں کے عادی ہیں اس لئے ان کے مضامین اور مکاتیب بھی ان کے ڈرائنگ روم ہیں گھر کا آنگن نہیں ہیں۔ وہ بے ساختہ اور بے جھجک ملنے کے عادی نہیں، وہ کبھی اپنی شخصیت کو بے محابا اور بے غلاف پیش نہیں کرتے جیسے کبھی وہ اپنے ڈرائنگ روم میں تہمد اور بنیان پہن کر کسی کا استقبال نہیں کرتے۔ یہ نفاست، شائستگی اور آراستگی جزو فن ہے۔"

چونکہ انشاء پردازی نیاز کے صرف مضامین میں ہی اپنا کام نہیں کرتی بلکہ ان کی تمام نثری تحریروں پر حاوی ہے اس لئے الفاظ اور جملوں میں نفاست اور سجاوٹ ایک فکری تقاضا بن گئی ہے۔ گرچہ وہ تخیل کے اسیر ٹھہرے اور ذہنی و شعوری طور پر حسن و عشق کے لازوال ارتباط اور فانی جذبوں سے متاثر ہیں، لیکن ان کا تخیل مشینی میکانیکی انداز میں نئی دنیا بناتا اور سنوارتا ہے۔ وہ آرائش جمال اور زیبائش حسن کا خوبصورت تصور تو رکھتے ہیں لیکن اپنے شعوری افکار و احساسات کے تقاضوں کو ان کی بھینٹ نہیں چڑھنے دیتے بلکہ ان کے درمیان ایک خط مستقیم کھینچ کر متوازی صورت پیدا کرنے کی سعی کرتے ہیں اور یہی وہ آرٹ ہے جو ان کی شخصیت کی گوناگوں امتیازیت کو جداگانہ حیثیت عطا کرتا ہے۔ وہ کبھی بھی اپنے داخلی یا خارجی احساسات کے قدموں پر آنکھ بند کرکے سر تسلیم خم نہیں کر دیتے بلکہ اپنے بے باک تصور اور آزاد خیال کی شدت کے سہارے حقیقت کا اظہار کرتے ہیں جس سے ان کے خیال و افکار میں شدت اور باریک بین تجسس پیدا ہو جاتا ہے جو ان کے انداز بیان اور تخاطب و تکلم میں ایک ڈرامائی کیفیت پیدا کر دیتا ہے جس سے جملوں، فقروں اور صوتی کیفیات میں ایک مخصوص ترتیب قائم ہو جاتی ہے۔

نیاز کے یہاں جو چیز ایک قدر مشترک کے طور پر نظر آتی ہے وہ ان کی آزاد خیالی اور بے باکی ہے۔ انھوں نے اپنے احساس کی گرمی اور افکار کی شدت سے مذہبی، ادبی اور تہذیبی جمود و تعطل کو اپنی تحریروں میں توڑ ڈالا ہے جس سے کئی مختلف راہیں نمودار ہوئی ہیں جس کی وجہ سے انھیں اردو ادب میں شعلہ افشاں جرأتِ فکر کا بانی اور آزاد خیالی و آراستگیٔ بیان کا علمبردار تصوّر کیا گیا ہے۔ اور اس حقیقت سے ہم انکار نہیں کر سکتے کہ موجودہ نئی نسل کی ادبی پرداخت اور ادراک نشو و نما میں نیاز کا تعاون بڑی معنویت کا حامل ہے۔

مرقع کشی اور جذبات نگاری دُنیا کی ہر تحریر کو جلا بخشتی ہے۔ اسی کے سہارے تخلیقات اپنے اصل تقاضوں کا بنیادی مقصد اُجاگر کرتی ہیں۔ خاص کر اظہار و ابلاغ کے سلسلے میں ان چیزوں کو بہت ضروری تصوّر کیا جاتا ہے۔ نیاز کی تحریریں بالخصوص مکتوبات اچھے اور نادر خیالوں کی تفہیم ہیں جن میں مرقع کشی اور جذبات نگاری باہم ہو کر ایک نئی بات پیدا کر دیتے ہیں۔ جس طرح ایک انسان تمام بغض و عداوت اور غیر انسانی و غیر مہذبانہ جذبوں سے بالاتر ہو کر صرف انسانیت کا احساس اپنے اندر جذب کر لیتا ہے اور اس کے سہارے انسانیت کا پجاری بن جاتا ہے اسی طرح نیاز نے اپنے فکر و احساس کی پاکیزگی کے ذریعہ اپنی تحریروں میں سچے اور صحیح جذبات و خیالات کا چراغ روشن کیا ہے اور جہاں بھی انھیں سچائی اور اصلیت کی پامالی نظر آئی ہے۔ بے دھڑک اس پامالی کے خلاف آواز اُٹھائی ہے۔ اپنے خطوط میں اکثر جگہوں پر وہ مکتوب الیہ کو مکر و فریب اور غیر انسانی جذبوں سے گریز کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ مذہب کے معاملے میں خواہ ان کا نظریہ جو بھی رہا ہو لیکن وہ جھوٹے پند اور نقلی زہد کا جبہّ اور دستار اتار دینے کی تجویز پیش کرتے ہیں۔ اگر وہ جھوٹی عبادت اور غیر انسانی فعل سے باز رہنے کی دعوت دیتے ہیں تو یہ کوئی عیب کی بات نہیں۔ اس لئے نیاز کی تحریروں میں پائے جانے والے ان تمام نظریاتی اور اصولیاتی فکر و احساس سے قطع نظر ہم یہ کہنے کی جرأت کرتے ہیں کہ نیاز نے اردو نثر کو اپنے خطوط سے بہت کچھ دیا۔

ضروری ہے کہ نیاز فتحپوری کے خطوط کے چند نمونے پیش کئے جائیں جو مختلف موضوعات، مختلف افکار اور حالات و کیفیات کے آئینہ دار ہوں۔ ملاحظہ ہو:-

(۱) "سُنئے صاحب، جیتے جی موت کی باتیں مجھے پسند نہیں۔ مرنا برحق سہی لیکن جب تک آپ جی رہے ہیں اس "واویلا" سے فائدہ بھی کیا ہے۔ آخرت کے خیال کو آپ "مابعدالموت" سے کیوں متعلق کرتے ہیں۔

آخرت سے مراد انجام ہے ہمارے اس کام کا انجام جو ہم آپ اس دُنیا میں کرتے ہیں۔ ورنہ مرد آخر بیں مبارک بندہ است! کے معنی کیا؟ خدا کے لئے اس خیال کو ترک کیجئے، آپ کی صحت پر خراب اثر پڑے گا اور اپنے ساتھ دوسروں کو بھی مایوس کر کے بیکار بنا دیں گے.... لاحول ولا قوۃ۔ آپ سے کس نے کہا کہ اسلام کی تعلیم ہر وقت موت کو یاد کرنا ہے۔ مسلمانوں نے تو موت کا مقابلہ کیا ہے، اس سے جنگ کی ہے اور ایسی جنگ کہ ان میں بہت سے مرنے کے بعد زندہ ہیں اور آپ ہیں کہ زندگی ہی میں مرے جا رہے ہیں۔"

(۲) "حضرت! آپ کے خط کا جواب دوں بھی تو بیکار ہے۔ کیوں کہ جو خدا کو بے دلیل ماننے والا ہو، اس کے سامنے حجت و استدلال پیش کرنا، اب کیا کہوں کہ کیا ہے۔ میں کہوں گا ، عقل تو ایسا نہیں کہتی " آپ فرمائیں گے " عقل کیا چیز ہے"۔ میں عرض کروں گا کہ " اسباب کی دنیا میں ایسا ہونا ممکن نہیں"۔ آپ کہیں گے کہ " مشیت ایزدی" میں کس کو مجال دم زدن ہے"۔
پھر آپ ہی فرمائیے کہ اس " قدرت و مشیت " کا علاج میرے پاس کیا ہو سکتا ہے.........
.... آپ کا خدا اور مذہب دونوں بہت نازک ہیں اس لئے مجھے خاموش ہی رہنے دیجئے تو بہتر ہے۔"

(۳) "مکرمی! آپ کی غزل دیکھی ــــــ آپ کو معلوم نہیں میں مقالاً عرصہ ہوا اپنے آپ کو بیگانۂ " سخن" بنا چکا ہوں اور اسی لئے فکر و احساس کے لحاظ سے میری رائے اس باب میں بہت سخت ہوتی ہے۔ بہ تعمیل ارشاد غزل دیکھ لینے میں مجھے کیا عذر ہو سکتا ہے لیکن اگر " دیکھنا " اصلاح و مشورے کے مفہوم میں آپ نے استعمال کیا ہے تو میری معذرت قبول فرمائیے کیونکہ استاد بننے کا نہ مجھ میں سلیقہ، نہ اہلیت میری زندگی خود یکسر متعلمانہ ہے اور ہر وقت استاد و رہبر کی آرزو مند، البتہ ایک مشورہ آپ کو ضرور دوں گا اور وہ یہ کہ آپ اس مشغلہ کو ترک کر دیں تو بہتر ہے کیونکہ آپ میں غزل گوئی کی اہلیت بہت کم پاتا ہوں۔ ممکن ہے مشق و مطالعہ کے بعد آپ نظمیں اچھی کہنے لگیں لیکن غزل میں آپ کامیاب نہیں ہو سکتے۔!! "

(۴) "محترم! آپ کا افسانہ یعنی آپ کا لکھا ہوا ــــ نظر سے گذر چکا ہے لیکن دل و دماغ سے نہیں ــــ برا نہ مانئے تو عرض کروں کہ اس نے دل و دماغ کو اپنی طرف متوجہ کیا ہی نہیں۔ ــــ الفاظ پاکیزہ ہیں، زبان صاف ہے، خیالات بلند ہیں، موضوع پسندیدہ اور نتیجہ برمحل ہے لیکن پھر بھی جب یہ غور کرتا ہوں کہ یہ فسانہ کیونکر ہوا تو حیران رہ جاتا ہوں ــــــــــ آپ نے چونکہ .... !! "

(۵) ظالم! خدا سمجھے (تم سے تو نہیں مگر) اس سے جس نے تمہیں یہ سمجھا دیا کہ محبت کی

آزمائش یوں بھی ہوا کرتی ہے ـــــ میں پوچھتا ہوں کہ میں نے کیا قصور کیا تھا جو یوں مجھ سے روٹھ گئے، قسم لے لو جو میں نے آپ کی غیبت میں کوئی لفظ بھی آپ کے متعلق ان سے کہا ہو ـــــ یہ آخر آپ نے انھیں اس قدر معصوم اور اپنے آپ کو اس درجہ مستحق کرامت کیوں سمجھ لیا۔ کیا آپ سے زیادہ گناہگار کوئی اور دنیا میں مل ہی نہیں سکتا ؟

میاں ہوش میں آؤ! کیسی محبّت، کہاں کی الفت، جوانی میں بڑھاپے کے سے گلے شکوے کچھ اچھے نہیں معلوم ہوتے ـــــ وہ ایک دفعہ بھلا دینے کی دھمکی دیں تو تم سو مرتبہ منھ موڑ کر چلے آؤ۔ یہ بھی کوئی بڑی بات ہے۔ تمہاری عمر میں تو یہاں دل کے اندر تیر پر تیر پیوست ہوتے تھے اور پھانس کی طرح نکال کر پھینک دیتا تھا۔ !!"

(۶) "بجا ہے۔ صرف ایک بار گلہ کیا تھا، اور وہ بھی "ناتمام" کہ آسمان زمین آپ نے ایک کر دئے۔ اور اب چاہتی ہیں کہ جو کچھ کہنا ہے دل کھول کر کہہ دوں۔ معقول!

طشتے دگر فتادہ ہما ناز بام تو

اگر یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ آخر میں آپ مجھے موردِ الزام قرار دیں تو کاوش بیکار ہے کیونکہ "آپ سے دُور ہوں اور جی رہا ہوں" یہی ایک جرم اتنا بڑا ہے کہ آپ جس قدر ملامت کریں کم ہے۔ زیادہ چھان بین کی ضرورت کیا ؟ "

(۷) "آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب کبھی کوئی روشن ستارہ ٹوٹ کر غائب ہو جاتا ہے تو آنکھوں کے سامنے تھوڑی دیر کے لئے عجیب قسم کا اندھیرا چھا جاتا ہے۔ بالکل یہی حالت آپ کی "پرستش گاہ گاہ" سے بھی ہوتی ہے۔ جس وقت آپ کا خط آتا ہے تو ساری دُنیا مجھے روشن نظر آنے لگتی ہے اور جب آپ سکوت اختیار کر لیتی ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کائنات کی تمام تابناکیاں آپ نے کھینچ کر اپنی مٹھی میں بند کر لی ہیں۔ آج کل میں اسی احساس سے گزر رہا ہوں اور سوائے تاریکی کے مجھے کچھ نظر نہیں آتا۔ !! "

درج بالا خطوط کے اقتباسات میں نیاز فتحپوری کے احساس و افکار کی بھرپور عکاسی ہوئی ہے۔ ان تحریروں میں وہ تمام خصوصیات اور خوبیاں موجود ہیں جو ادبی اور معیاری تحریروں میں ہونی چاہئیں۔ آزادِ خیالی، بے باک نظروں کی شدت اور گہرے فکریاتی محسوسات کی حدّت ان خطوں میں تلاش کئے جا سکتے ہیں۔ نیاز نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ ان کے تخالیق سے خامیاں اور گمرہی دور ہوں جس کے لئے انھوں نے اپنے پیر و مرشد کو بھی نہیں بخشا۔ یہ ایک انفرادی اخلاقی تقاضا ہے جو نیاز کی ذات میں موجود تھا۔

الغرض نیاز فتح پوری کے مکاتیب عصری ادب کے لئے بیش بہا خزینہ ہیں جس سے اُردو داں طبقہ ہمیشہ مستفید ہوتا رہے گا اور جب تک خطوط نگاری کا ادبی معیار بلند رہے گا ان کے مکاتیب اپنی تمام خوبیوں کی بدولت زندہ و تابندہ رہیں گے۔

پروفیسر ریاض صدیقی
PECHS ۶-بے-۷
کراچی - ۷۵۴۰۰

خواتین معاشرہ نیاز کی نظر میں

("گہوارۂ تمدن" اور فیمنسٹ تحریک کی روشنی میں ایک مطالعہ)

اُردو کی علمی و فکری اور ادبی تاریخ نے جیسی اور جو کچھ بھی ہے نثر نویسی کی قلمرو میں کتنی ہی قدآور شخصیات پیدا کی ہیں۔ ان میں سے بعض صرف اس لئے بلند و محترم ہیں کہ ارباب اختیار ادبی مورخوں اور نصاب سازوں نے انہیں اپنے انداز نظر مخصوص علاقائی و سیاسی ماحول اور عزائم کے حق میں مفید پایا۔ حالی۔ مولانا محمد علی جوہر۔ یگانہ چنگیزی۔ حسرت موہانی اور نیاز فتح پوری وغیرہ اتنے منافع بخش نہیں تھے اس لئے ارباب اختیار نے ان کی طرف سے منہ پھیر لیا اور مورخوں و نصاب سازوں نے ان کو اپنی حدود سے باہر رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ قدآور قلمکار صحافی اور شاعر ہمارے اجتماعی مزاج میں رچ بس نہ سکے اور ان کی جڑیں معاشرہ شعور کے اندر پھیل نہیں سکیں۔ اس صورتِ حال کا منطقی نتیجہ یہ ہوا جو کہ ہونا تھا کہ ایک عہد ختم ہونے کے بعد جو نسلیں منظر پر آئیں تو ان کے ذہنوں میں شکوک و تعصبات کی کڑی نے جالا بن رکھا تھا۔ دورِ حاضر میں ایسی صورتِ حال کا سمجھنا یقیناً محال ہوگا تاہم اگر بنیادی حقائق کو سامنے رکھیں تو بات آسانی سے سمجھ میں آجائے گی۔ اول تو ہمارا معاشرہ ناخواندگی۔ پسماندگی اور بے شعوری کے معاملے میں کم سے کم کی انتہائی سطح پر ہے چنانچہ افکار و نظریات ہوں یا قدآور لکھنے والے پڑھے لکھے طبقے اور طالبعلموں تک ان کی پہنچ کا ذریعہ سرکاری ذرائع ابلاغ۔ تعلیمی ادارے اور نصابات ہوتے ہیں۔ چونکہ ان ذریعوں نے بعض قدآور ہستیوں کو نظر انداز ہی نہیں کیا بلکہ ان کے نقطہ ہائے نظر کی غلط تعبیر و تشریح کرکے شکوک و تعصبات کی فضا پیدا کی اس لئے یہی تاثر پڑھے لکھے طبقے اور طالبعلموں نے بھی قبول کیا۔ دوسری طرف آزادیٔ اظہار کی روایت کو پابند کرکے ایک ایسا ماحول پیدا کردیا کہ اگر کوئی حق گو اصل حقیقت کا چہرہ دکھائے اور اس کی صحت و سند پر اصرار کرے تو اسے نہ صرف خود کو بلکہ اپنے افراد خانہ کو بچائے رکھنا مشکل ہوجائے۔ نیاز فتحپوری شکوک و تعصبات کے اسی تیر سے گھائل ہوئے۔ علمی و فکری تاریخ کا غیر جانبداری دیانتداری اور سنجیدگی سے مطالعہ کرنے والے کہیں گے کہ اگر اس پوری تاریخ کو ایک طرف اور ان کو دوسری طرف رکھیں تو نیاز کا پلہ بھاری ہوگا۔ وہ اپنے عہد کی انتہائی فعال اور پھیلی ہوئی شخصیت تھے۔ بیسویں صدی کی غریب نواز آئیڈیالوجی اس کے پیروکار ملکوں اور مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام کو تجزیاتی انداز میں موضوع نہ بنانے اور مومن کی بے جا داد و تحسین کے باوجود ان کی اصل الذکر حیثیت مسلم ہے ان کے معاصرین ہوں یا بعد میں آنے والی قدآور شخصیات کسی کو ان کے مدِمقابل نہیں لایا جاسکتا ہے۔ ان کا ذہن انسائیکلوپیڈیائی تھا۔ آج کے اہل نظر اور طالب علم یقیناً حیرت کریں گے کہ ایسی صحت اور اتنی توجہ کے ساتھ کس طرح دنیائے قدیم و جدید کے علوم و فنون کا انھوں نے احاطہ کیا حتیٰ کہ جنس (Sex) اور ہاتھوں کی لکیر جیسے موضوعات بھی ان کی دسترس میں آئے اور ان پر بھی انھوں نے عالمانہ شان سے قلم اٹھایا۔ عربی فارسی اور انگریزی زبانوں سے وہ خوف واقف تھے۔ قرآن و حدیث اور فقہ پر انہیں عبور تھا اور مذاہب عالم کا انھوں نے تقابلی مطالعہ کیا تھا۔ دینی اداروں سے فارغ التحصیل علما اور مجتہدوں کے لئے وہ چیلنج تھے۔ دینی فکر کو عقلی اور سائنسی بنیادوں پر قائم کرنے والوں میں سر سید کے بعد صرف دو ہی معتبر و مستند نام ملتے ہیں۔ یعنی اقبال اور نیاز فتحپوری۔ نیاز نے شروع سے آزادی فکر و نظر۔ خرد افروزی و روشن خیالی۔ سیکولرزم اور جمہوریت نوازی کو اپنا مسلک بنا لیا تھا اور آخر دم تک اس پر قائم رہے۔ کم ہی لوگوں کو یاد ہوگا کہ نیاز نے خواتین کی آزادی و حقوق کے موضوع پر ان دنوں ایک جامع اور مستند کتاب لکھی تھی جن دنوں برصغیر میں ایسے موضوع کا کوئی نام لیوا تک نہ تھا۔ کانگریس اور مسلم لیگ کی سیاست میں بھی اس قسم کے موضوعات شامل نہیں تھے۔

یہ ۱۹۱۷ء کا سال تھا اور اس زمانے میں خواتین پرانی روایات اور سخت گیر توہمات و پابندیوں کی زنجیر میں جکڑی ہوئی تھیں۔ اور سماج اس اخلاقی اور خاندانی سسٹم کو پسند کرتا تھا۔ اس دور میں خواتین صحیح معنوں میں مردوں کے پاؤں کی جوتی تھیں یعنی مکمل غلام۔ تعلیم نسواں کا نام لینا حرام تھا۔ سرسید بھی تعلیم نسواں کے مخالف تھے اور اقبال جیسے حقیقت پسند و ترقی یافتہ دور کے واقف کار نے بھی تعلیم نسواں کی مخالفت کی۔ خواتین کی تعلیم صرف اولاد اور گھریلو امور کی نگہداشت۔ قدیم اخلاقیات۔ کھانے پکانے و سینے کاڑھنے اور شوہروں کی تابعداری تک محدود تھی۔ یورپ اور امریکہ کی خواتین اسی زمانے میں اپنے حقوق کے لئے جدوجہد کے میدان میں سرگرم عمل ہوئی تھیں۔ فیمنسٹ (Feminist) تحریک کے خدوخال واضح ہونا شروع ہو گئے تھے۔ فرانس و انگلستان میں خواتین کی تنظیمیں فعال تھیں۔ امریکہ میں تو ۱۸۴۸ء کے دوران "ومن رائٹس کنونشن" (Women Rights Convention) منعقد ہوا تھا۔ اس دور کے ہندوستان میں پڑھے لکھوں کو تو چھوڑیئے جدید علما اور اہل نظر بھی خواتین تحریک سے یکسر لاعلم تھے حیرت ہے کہ نیاز نے اس زمانے میں مغربی دنیا سے متعلق ایسی نادر معلومات مع سند حاصل کر لی تھیں اور یہ لکھا بھی تھا کہ مغرب علمی تحقیق و تفتیش میں یقیناً آگے نکل گیا ہے اور یہ مشغلہ ایک ناقابل علاج مرض بن گیا ہے۔ اردو زبان اس لحاظ سے کم مایہ ہے۔ بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں علوم و ادبیات پر جو کتابیں اور رپورٹیں مغرب میں دستیاب تھیں ان میں اکثر کا مطالعہ وہ کر چکے تھے۔

> "کیا حیرت انگیز واقعہ ہے کہ عورت کے مسئلے میں مغرب سے مشرق تک سب ایک رائے
> ہیں۔ جس طرح مغرب میں اس کو نشانۂ ظلم بنایا گیا اسی طرح مشرق میں وہ غریب ہدف
> ہو رہی۔ ہر چند یورپ ان خطرات کو جو عورتوں کی قیامت خیز بیداری سے پیدا ہو سکتے
> ہیں محسوس کر رہا ہے اور وہ جنس لطیف کی ان جارحانہ بے باکیوں کو نظر پسندیدگی سے
> نہیں دیکھتا لیکن اسے اس کا کوئی علاج بھی بظاہر نظر نہیں آتا ہے۔"

ایسی بے باک آرا ان کی کتاب "گہوارۂ تمدن"، مطبوعہ مطبوعات، سلسلہ بلقیسیہ بھوپال ۱۹۱۷ء میں موجود ہیں۔ پچھتر سال پہلے وہ لکھتے ہیں کہ عورت تو خود ایک تاریخ ہے اور جس سلیقے و تسلسل سے وہ واقعات کو یاد رکھتی ہے اس کا مقابلہ مرد نہیں کر سکتے ہیں۔ پچھتر سال گزرنے کے بعد یہ نایاب کتاب پڑھیے تو حیرت ہوتی ہے کیوں کہ اس عرصے میں زمین و آسمان بدل گئے۔ دنیا میں ایک دوسرے سے قریب آ گئیں سات سمندر پار جو کچھ جس لمحے میں ہو رہا ہے ہم اپنی آنکھوں کے سامنے اس منظر کو دیکھ رہے ہیں۔ کتابیں رسائل رپورٹیں اور اطلاعات ہر وقت ہماری دسترس میں ہیں۔ نیاز کے دور میں یہ انقلابات تصور میں بھی نہیں آ سکتے تھے۔ آج ۱۹۱۷ء کے مقابلے میں خواتین ظاہری طور پر آزاد و بے باک نظر آتی ہیں دفتروں میں مردوں کے ساتھ کام کرتی ہیں۔ پردہ مردوں کی عقل پر پڑ چکا ہے۔ مغرب زدگی اور فیشن ان کا مسلک ہے مگر ان کے مسائل۔ حقوق اور اصل صورتِ حالات۔ جیسے موضوع پر کوئی ایک جامع علمی تصنیف اردو میں شاذ ہی ملے۔ گہوارۂ تمدن ہی اس موضوع پر پہلی اور آخری کتاب ہے اور اس وقت بھی اتنی ہی تازہ ہے جتنی کہ ۱۹۱۷ء میں تھی۔ گویا اردو میں معاشر علوم پر کتابوں کا آج بھی اتنا ہی فقدان ہے جتنا کہ پچھتر سال پہلے تھا۔ اس کو پڑھنے کے بعد پوری ذمہ داری کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ہماری ترقی یافتہ۔ تعلیم کے زیور سے مالا مال اور پیروی مغربی کا شوق رکھنے والی خواتین کا معاشرہ آزادی و خود مختاری اور بنیادی انسانی حقوق سے اتنا ہی محروم ہے جتنا کہ بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں تھا۔ اس کی ڈور آج بھی مرد ہی کے ہاتھ میں ہے۔ ترقی یافتہ مغربی ملکوں کی فیمنسٹ تحریک اپنی کھوئی ہوئی نسوانیت کو تلاش کرنے میں منہمک ہے اور مردوں کی تفریح کے لئے ان کی آلۂ کار بننے پر راضی نہیں ہے۔ نیاز نے پچھتر سال پہلے اس صورتِ حال کے آثار کو محسوس کر لیا تھا۔

> "ہندوستان کی عورت بھی اس منزل کی طرف حرکت کرتی ہوئی نظر آ رہی ہے جہاں تک
> پہونچنے کے بعد یورپ کی عورت پلٹ کر اپنی کھوئی ہوئی نسائیت کو ڈھونڈ نہیں سکی۔"

یہ رائے ۱۹۱۷ء میں صحیح ہو سکتی تھی مگر اب صحیح نہیں رہی ہے کیوں کہ ۱۹۱۷ء کے بعد جو سوشلسٹ معاشرے ابھرے انھوں نے عورت کے اصل مقام کو پایا اور دنیا کے سامنے ایک آزاد و خود مختار باوقار۔ مہذب و تعلیم یافتہ اور جدید عورت کا ماڈل پیش کر کے ثابت کر دیا کہ خواتین کو اخلاقی طور پر تباہ کرنے کا کردار بین الاقوامی سرمایہ دارانہ نظام نے ادا کیا ہے۔ اس نے آزادی اور مساوات کا نام لے کر فحاشی و فیشن زدگی

کو رواج دیا بقول فیضؔ ؎ حریفاں شمع محفل کو سرِ بازار لے آئے

"گہوارہ تمدن" کو مصنف نے روایت کی ابتدا کی پہلی اینٹ قرار دیا ہے۔ کتاب کے مقدمے میں انھوں نے لکھا ہے کہ کتاب کا مقصد کوئی عالمانہ تھیسس نہیں بلکہ صرف ایک آئینہ پیش کرنا ہے جو مزید تحقیق و تفتیش کا راستہ کھول دے۔ یہ راستہ تو خیر نہیں کھلا بلکہ مزید بند ہو گیا اور اب اگر کتابیات کی جامع فہرستوں کا مطالعہ کیجیے تو اس میں "گہوارہ تمدن" کا نام شاذ ہی ملے۔ یہی وہ مرد مسلّط رجحان ہے جس کے خلاف فیمنزم Feminism کی عالمگیر تحریک سرگرم عمل ہے اور دعویٰ ہے کہ مردوں نے تاریخ۔ ادب اور شاعری بھی مرد کے نقطۂ نظر سے لکھی ہے اور خواتین کے مجموعی کارناموں کو نظر انداز کیا ہے۔ اردو میں "گہوارہ تمدن" ہی ایک ایسی کتاب ہے جو ہمیں خواتین کے مجموعی کارناموں کی پوری تاریخ کا منظر نامہ دکھاتی ہے۔ اس کا اندازہ تو موضوعات کی فہرست ہی سے ہو جاتا ہے۔ (۱) اسباب و غذا کی فراہمی میں خواتین کے کارناموں کی تاریخ (۲) کپڑا بننے کی صنعت میں خواتین کے کارناموں کی تاریخ (۳) چرم سازی میں خواتین کے کارناموں کی تاریخ (۴) ظروف سازی میں خواتین کے کارناموں کی تاریخ (۵) خدمات بار برداری میں عورت کے کارناموں کی تاریخ (۶) فنون مختلفہ میں عورت کے کارناموں کی تاریخ (۷) فنون لطیفہ میں عورت کے کارناموں کی تاریخ (۸) زبان کی تشکیل و ترقی میں عورت کے کارناموں کی تاریخ (۹) عورت اور معاشرت (۱۰) عورت اور مذہب اور (۱۱) نتیجہ بحث یہ بیانات سرسری نہیں ہیں بلکہ اس وقت تک قدیم و جدید زمانوں کی تاریخ۔ عمرانیات، علم الانسان۔ ثقافت۔ علم الاصنام۔ آثار قدیمہ۔ فنون لطیفہ اور شعر و ادب کا جس قدر بھی تحقیقی مواد کتابیں اور رپورٹیں موجود تھیں ان میں اکثر کا مطالعہ مصنف نے کیا تھا۔ چند جن کے حوالے گہوارۂ تمدن میں دیئے گئے ہیں۔

MASON. WOMEN'S SHARE IN PRIVATE CULTURE.
F.V.COVILLE. American Anthropologist, Washington 1892
Travels in South Africa New York 1858
BANCROFT. Native Reces, New York 1874
Mathew's Fifth Annul Report
H.T.HARRIS. Carpet Weaving.
THOMPSON. The Land and the Books 1880

G. BOSE. Practical Books of Oriental Rugs.
W.S. MURPHY. Textile Industries.
CUSHING. Fourth Annual Report
Journal of Authropological Institute London
LUCIEN CARR. Geological Survey
CARL ENGEL. Music of the Most Ancient Nations.

ان حوالوں کے ہوتے ہوئے یہ سمجھنا کہ "گہوارہ تمدن" سرسری قسم کی کوئی معلوماتی کتاب ہے صحیح نہیں ہوگا بلکہ اس دور میں عموماً قلمکار کتابیات کی فہرست شامل کرنے کے گُر سے بھی واقف نہیں تھے یہی وجہ ہے کہ نیازؔ نے ۱۹۱۷ء میں اہل علم کو بتایا کہ کرہ ارض کی کل آبادی میں آدھی سے زیادہ عورتوں کی تعداد ہے۔ یہ بات آج بھی صحیح ہے اور اب یہ لکھا گیا ہے کہ پاکستان کی کل آبادی کی نصف سے زیادہ یعنی اکیاون فی صد عورتوں پر مشتمل ہے۔
علمی حوالے سے یہ کتاب پہلی جامع دستاویز بھی ہے جس میں مرد و زن کے درمیان مساوات۔ خواتین کی آزادی اور ان کے بنیادی حقوق کے بارے میں مصنف کا انداز نظر ہمدردانہ ہے جو کہ ۱۹۱۷ء کے ہندوستانی سماج میں بغاوت کے مترادف تھا۔ ہمارے یہاں ۱۹۹۴ء میں بھی بعض ایسے علاقے ملیں گے جہاں اس قسم کے اظہار کو ناپسند کیا جاتا ہے۔ مصنف کی بعض آراء دور حاضر کی وسیع تر عالمگیر فیمنسٹ تحریک سے قریب تر ہیں۔

"عورت عورت ہونے کے رشتے سے ساری دنیا میں ایک ہے۔ وہ عورت جو ساری
دنیا کی ماں تمام تہذیب و ارتقا کی ماخذ اور حلبۂ ترقی و شائستگی کی اصل اصول ہے آج کے مہذب
مردوں نے اس کے حقوق دبا رکھے ہیں اگر عورت مرد کے تمام کام انجام نہیں دے سکتی تو مرد

بھی عورت کے بہت سے کام انجام نہیں دے سکتے ہیں۔ عورت نے ہمیشہ مرد کے کاموں میں
اس کا ہاتھ بٹایا ہے اور یہ ریت زمانۂ قدیم سے چلی آرہی ہے۔ عورت نے صدیوں وہ کام
اپنے ضعیف ہاتھوں سے کئے ہیں جو آج مرد مشینوں کے ذریعے کر رہے ہیں۔ آج بھی وہ
صنعتوں میں مرد کی معاون ہے اور اس وقت بھی ایک سو چھتیس[۱۳۶] ایسے پیشے ہیں جن میں عورت
کا کردار بنیادی ہے۔''

نیاز نے کتاب کے ابواب کی فہرست عورت کے پیشہ ورانہ کارناموں کے حوالے سے مرتب کی ہے اور تاریخی تناظر میں سند و حوالوں کی مدد سے بتایا ہے کہ جتنے بھی مشاغل و مظاہر حیات ہیں ان میں اکثر کی ابتداء و ترقی کا سرچشمہ عورت رہی ہے۔ اس موضوع کو انھوں نے قدیم سے قدیم یونانی، مصری، بابلی، ہندی اور یورپی تہذیبوں کی تاریخ کے حوالوں سے مکمل کیا ہے۔ ان مباحث میں انھوں نے اپنے عہد کے علم عمرانیات اور علم الانسان سے بھی استفادہ کیا ہے جس کی ابتدا ان دنوں ہندوستان میں نہیں ہوئی تھی۔

علمائے حق نے عموماً اس بات پر زور دیا ہے کہ عورت طبعاً امن پسند اور پریم وادی ہوتی ہے۔ نیاز نے بھی اس موقف ہی کا اظہار کیا ہے اور لکھا ہے کہ عورت جنگی ساز و سامان کی تیاری میں بہت کم ہی حصہ لیتی ہے سوائے اس کے کہ کارخانوں میں ابتدائی قسم کے کوئی جزوی کام کرتی ہو یا ریڈ کراس کے تحت زخمیوں کی دیکھ بھال کرتی ہو یہ بات آج بھی ایک حقیقت ہے۔

نیاز نے ان مظالم کی جو مرد مسلط معاشرہ عورتوں پر ڈھاتا رہا ہے بڑی درد انگیز تاریخ کا بھی احاطہ کیا ہے مثلاً روم میں راہبوں کے اشارے پر ہزاروں عورتوں کو گلیوں، سڑکوں اور گھروں کے اندر ذبح کرنا۔ ۱۸۸۴ء میں پاپائے روم کے حکم سے ہزاروں عورتوں کو جادوگری کے الزام میں سولی دینا۔ انگلستان کی پارلیمان کا عورتوں اور ان کے معصوم بچوں کو سزائے موت دینا وغیرہ۔ انھوں نے اس تفتیش و تحقیق کے بعد صحیح نتیجہ اخذ کیا کہ عورتوں پر مظالم کے معاملے میں ساری دنیا کے مردوں کا اندازِ نظر ایک جیسا ہے۔ ایسی کوئی قوم نہیں ہے جس نے عورت کے حقوق کو پامال نہ کیا ہو۔ دورِ جدید کی فیمنسٹ تحریک اور اس کے ادب نے اب یہ طلسم بھی توڑ دیا ہے کہ ترقی یافتہ و مہذب مغرب میں عورت آزاد ہے اور اسے تمام بنیادی حقوق حاصل ہیں بلکہ صورتِ حال اس کے برعکس ہے۔ مارچ اپریل ۱۹۷۹ء میں خواتین کی تنظیم کی طرف سے موٹیو (Motive) نامی رسالے کا اجرا ہوا۔ اس کے خلاف امریکہ بھر کے پادریوں نے سخت احتجاج کیا اور کوئی چھاپنے والا ادارہ اس کا مسودہ لینے پر راضی نہیں ہوا۔ بورس میریل پریس نے اس کی طباعت کا خطرہ مول لیا۔ خواتین تنظیموں نے اس رسالے کو پورے امریکہ میں گھر کے دروازوں پر جاکر تقسیم کیا۔ رسالے کے سرورق پر جلی حروف میں درج تھا کہ ''اقتدار ان خواتین کا جو بہر حال انسانوں کی آبادی میں نصف ہیں'' خواتین کا اجتماعی ترانہ جو ولس برادرز (Wills Brothers) کا گیت کہا جاتا ہے اسی دور میں مقبول ہوا۔

"My mistakes are no more worse than yours,
just because I am a women"

''گہوارہ تمدن'' کا مصنف بھی عورت کو بقائے حیات کا سرچشمہ۔ عالم انسان کی ماں۔ تمام تہذیبوں کے ارتقا کی ماخذ اور ترقی و شائستگی کی اصل اصول قرار دیتا ہے۔

دورِ تازہ کے عملی تناظر میں نیاز کی کتاب ''گہوارہ تمدن'' جدید علوم و ادبیات کی صف میں سب سے الگ روشنی و رہنمائی کا ذریعہ محسوس ہوتی ہے۔ ہمارے معاشرے کے لئے جو ترقی و تمدن کے اس مثالی عہد میں زوال کی آخری حد پر آگیا ہے اور اب گلنے سڑنے کے عمل سے گذر رہا ہے اپنی قدامت کے باوجود تر و تازہ ہے۔ اس معاشرے کی بدقسمتی تو یہ بھی ہے کہ اس کے علوم ادبیات اور شاعری بھی اسے زندہ رہنے زندگی کو مثبت خطوط پر استوار کرنے اور جہد و عمل کے ذریعے اپنی قسمت کو بدلنے کا شعور نہیں دیتے ہیں۔ اگر کسی کونے سے روشنی کا کوئی دھارا پھوٹتا بھی ہے تو اسے غداری بغاوت مذہب دشمنی اور نہ جانے کیسے کیسے الزامات سہنے پڑتے ہیں کہ وہ تاریکی کی چادر میں غائب ہو جاتی ہے اور اس قسم کے اہل نظر کو متنازعہ کہا جانے لگتا ہے جیسے کہ نیاز ہیں۔ وہ بھی علم و ادب اور فن کی ایسی روشنی ہیں جو سیاہی کی قبر میں گر گئی ہے ؎

ع شب کی لحد میں صبح کی دستار گر گئی،

کیا ہمارے روشن خیال، خرد افروز اور جمہوریت نواز اہل نظر کی اقلیت[۱] جو نیاز ہی کے مشن کو لے کر آگے بڑھی ہے شب کی لحد سے اس دستار کو باہر لا کر علوم و ادبیات کے مستند منہاج تک لائے گی؟

---

[۱] پاکستان میں سب سے پہلے سید سبط حسن نے نیاز و نگار کی روایت پر تہہ چڑھائی ان کے بعد ڈاکٹر خیال امروہوی، ڈاکٹر مبارک علی، ڈاکٹر قاضی جاوید عبداللہ ملک نے اس طرف رخ کیا۔ ڈاکٹر قاضی جاوید نے فلسفہ، فکریات اور برصغیر کی تاریخ و تہذیب اور ڈاکٹر مبارک نے برصغیر کی تاریخ اور معروضی نظریہ تاریخ پر گراں قدر سرمایہ مہیا کیا ہے۔

کتابیات

نیاز فتح پوری۔ گہوارہ تمدن۔ مطبوعات سلسلہ بلقیسیہ بھوپال ۱۹۱۷ء

نقش تازہ عورت اور فنون لطیفہ نمبر نگار پاکستان سالنامہ دسمبر ۱۹۹۲ء

سائمن ڈی بووائر۔ دی سکنڈ سیکس ہارمنڈ سورتھ نیویارک ۱۹۴۹ء

کیٹ ملٹ۔ سکچول پالٹکس وریگو لندن ۱۹۷۰ء

ایلن شوالٹر۔ اے لٹریچر آف دیر اون پرنسٹن یونیورسٹی پریس ۱۹۷۷ء

ایم۔ بیروٹ ومنز آپریشن ٹوڈے نیو لیفٹ بکس لندن ۱۹۸۰ء

پروفیسر ممتاز حسین ———

صاف کہتا ہوں رہیں خوش یا ہوں ناخوش مولوی
آسماں اب چاہتا ہے مولوی کش مولوی

کیا عجب جو نیاز فتحپوری کو آسمان نے ایک مولوی کش مولوی بنا کر بھیجا ہو۔

قمر زمانی بیگم

علامہ نیاز فتحپوری کی انوکھی داستانِ معاشقہ



از: وھاب تسنیم
لکچرر، وی۔آر۔کالج، نیلور (اے پی)

○ ○ ○

اس عنوان کے تحت ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے ایک کتاب ترتیب دی ہے جسے اردو اکیڈمی سندھ، کراچی نے شائع کیا ہے۔ اس مضمون کی تشکیل و ترتیب میں اس کتاب سے پورا استفادہ کیا گیا ہے — (تسنیم)

○ ○ ○

سیّد نظام الدین شاہ دلگیر تاریخ ادبِ اردو کے اس دور سے تعلق رکھتے ہیں جو مہدی افادی، شبلی، شرر، مولانا آزاد، خلیقی دہلوی، میر ناصر علی، ماجد دریا آبادی، حامد حسن قادری، ل۔ احمد، ملّا واحدی اور نیاز فتحپوری کا دور سمجھا جاتا ہے۔ بچپن ہی سے دلگیر کو شعر و ادب سے گہرا لگاؤ رہا۔ وہ بھی اپنے ہمعصروں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ۱۹۱۳ء میں دلگیر نے ایک ادبی رسالہ "نقاد" جاری کیا۔ عصری رومان نگاری کو اس رسالے کی وجہ سے کافی شہرت اور مقبولیت ملی۔ اس رنگ و آہنگ کے دلدادہ بڑے بڑے انشا پرداز، نقاد سے منسلک تھے۔

انشائے لطیف یا شعرِ منثور کے جتنے قلم کار تھے سب فلسفۂ حسن و عشق سے متاثر تھے۔ اس فلسفہ میں حسن و عشق اور عورت ایک ہی چیز کے دو روپ ہیں۔ 'نقاد' اردو نثر کے اس مزاج و منہاج کا نمائندہ رسالہ تھا۔ اس نے نوجوان نسل کو کافی متاثر بھی کیا تھا۔ اشاعت اچھی خاصی تھی۔ اس کے باوجود، دلگیر نے اس کی اشاعت بند کر دی۔ نقاد کے بند ہوتے ہی جیتی جاگتی ادبی محفلوں پر مُردنی چھا گئی۔ اس کے قلم کاروں میں اداسی اور مایوسی پیدا ہو گئی۔ سر برآوردہ انشا پردازوں نے نقاد کو دوبارہ جاری کرانے کی اپنی سی کوششیں کیں مگر نتیجۃً سب ناکام رہے۔ نقاد کے نوجوان قارئین نے بھی اس سلسلے میں خطوط لکھے، مگر بے سود۔ نیاز، ضیا عباس ہاشمی اور خلیقی نے مدیر نقاد شاہ دلگیر کی ہمت بندھائی مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ انہیں دنوں کی بات ہے کہ مدیر نقاد دلگیر کے نام ایک رومان انگیز خط دہلی سے آیا۔

پھاٹک حبش خاں، دہلی

۳۔ نومبر ۱۹۱۶ء

میری تقدیر میں دلگیر رہنا ہی مقدر ہے!
نہ نکلی آج تک حسرت، میں وہ حسرت بھرا دل ہوں

جناب اڈیٹر صاحب، تسلیم!

آپ اس خط کو دیکھ کر کہیں گے کہ یہ لکھنے والی کون ہے اور یہ بھدا خط کس کا ہے۔ لیجئے سُنئے! بھائی جان قبلہ کے پاس ایک عرصہ سے نقاد آتا رہا۔ چوری چھپے میں بھی اسے دیکھ لیتی تھی۔ ماشاء اللہ کیا طرزِ تحریر ہے اور کیا پیارا کلام ہے۔ غزلوں کو دیکھ کر دل

بے قابو ہوگیا ... میں شاعر نہیں ہوں لیکن تھوڑا بہت مذاقِ سخن ضرور رکھتی ہوں جو میرے تڑپانے کے لئے کافی ہے ... !

خیر اس ذکر کو چھوڑیئے۔ اب آپ یہ بتائیے کہ اگر کوئی دُکھیا آپ سے ملنا چاہے تو کیونکر ملے۔ آپ بڑے آدمی ہیں۔ شاعر ہیں اور ایک مشہور شخص ہیں ... اگر آپ سچ مچ ویسا ہی دردمند دل پہلو میں رکھتے ہیں جیسا کہ آپ کے کلام سے ظاہر ہے تو یقین ہے کہ آپ از راہِ کنیز نوازی کوئی تدبیر ملاقات کی ضرور نکالیں گے۔ میری سمجھ میں تو ایک بات آئی ہے کہ آپ ۷۔ نومبر کی شب دہلی تشریف لاکر احمد بھائی ..... کے کسی بالاخانے میں قیام کریں۔ وہاں یا تو میں خود حاضر ہوں گی یا میری خادمہ پیاری (اس کا نام ہے) میرا خط لے کر آپ کی خدمت میں رات دس بجے حاضر ہوگی اور سواری ساتھ لائے گی۔ اگر آپ تشریف لاکر میری عزت بڑھائیں گے تو بہت شکرگزار ہوں گی۔ یہ تاریخ خاص کر اس لئے مقرر کی ہے کہ اس دن میرے عزیز و اقارب بریلی جائیں گے۔ اور گھر میں سوائے خادمہ کے کوئی نہ ہوگا۔ نقاد میں آپ کی تصویر دیکھ چکی ہوں۔ لیکن اب سامنے بیٹھ کر آپ سے کچھ حالِ دل سننے کو جی چاہتا ہے۔ للّٰہ ملاقات کیجئے۔ پھر خدا جانے کب موقع ملے۔ کیونکہ بہت جلد بنارس جانے والی ہوں۔ (قمر زمانی)

شاہ دلگیر کے بارے میں ان کے قریبی دوستوں کا خیال ہے کہ بحیثیت اڈیٹر نقاد، انہیں یہ خوش فہمی ہوگئی تھی کہ بہت سی لڑکیاں ان کی رومان پرور انشاپردازی پر جان چھڑکتی ہیں۔ جوش نے دلگیر کے بارے میں اپنے خاص انداز میں لکھا ہے کہ :

" رسالہ نقاد کے مدیر خاندانِ مشائخ کے چشم و چراغ تھے۔ ... خانقاہ کی محراب میں قطب الاقطاب، حسینوں کی جناب میں پارۂ سیماب ... حسینوں کو دیکھ کر ان کے حواس بجا نہ رہتے تھے۔ راہ گلی میں ان کے ساتھ چلنا پھرنا بے حد خطرناک تھا۔ اس لئے کہ جب کسی حسین چہرے پر ان کی نگاہ پڑ جاتی، وہ اپنے ساتھی کی پسلیوں پر اس قدر زور سے کہنی مارتے کہ اس بیچارے کے منہ سے چیخ نکل جاتی تھی ... "

اس طبیعت کے مالک دلگیر کو جب قمر زمانی کا خط ملا تو وہ پہلی فرصت میں دہلی پہنچ گئے۔ ملاقات کے درمیان قمر زمانی نے چہرہ سے نقاب نہ اٹھایا۔ بات چیت میں "پردہ" حائل ہی رہا۔ دلگیر چاہتے تھے کہ نقاب الٹ دی جائے۔ انھوں نے اس پر بہت اصرار بھی کیا لیکن قمر زمانی اس پر راضی نہ ہوئیں۔ دلگیر ناخوشگوار اثرات لئے ہوئے چلے آئے۔ مگر قمر نے اسی دن نہایت شوخ اور چبھتے ہوئے انداز میں لکھا :

۷۔ نومبر ۱۹۱۶ء

آداب عرض کرتی ہوں۔

خوب قدر بڑھائی۔ اچھا ذلیل کیا۔ واہ اے دردمند دل والے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ آخر پھر تکلیف فرمانے کی ضرورت کیا تھی ...... میں کیا کہوں مجھے کیسی شرم آتی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ نے مجھے برقعہ اتارنے پر کیوں اس قدر مجبور کیا .... آپ کی خطاوار

قمر زمانی

اس خط کو پاتے ہی دلگیر کے دل گرفتہ جذبات میں پھر سے تازگی اور توانائی پیدا ہوگئی۔ وہ قمر کے لئے ویسے بھی مضطرب رہنے لگے تھے۔ قمر کا خط ملتے ہی انھوں نے ایک طویل خط لکھا۔ اہم اقتباسات ملاحظہ ہوں :

۱۵ار نومبر ۱۹۱۶ء

؎ کیسی معصوم بن رہی ہیں آپ
جان گویا کسی کی لی ہی نہیں

سرکار مجرا عرض ہے۔ دوسرا محبت نامہ ملا۔ شرمندہ ہوں، کیا جواب دوں۔ جس نے آپ کو ذلیل کیا خدا اسے ذلیل کرے۔ آہ میں تو بے درد ہوں۔ دردمند دل میرے پاس کہاں۔ ہوتا تو آپ کو شکایت ہی کیوں ہوتی۔ ہاں سچ ہے ؎

اس دل سے مجھے لاگ ہے بے مہر تو ہوں میں
تم شانِ وفا، جانِ وفا، کانِ وفا ہو

آپ نے جس خلوص و محبت سے مجھے بلایا اور میں بدنصیب چلا آیا، اس کے شایانِ شان وہ حجاب نہ تھا جو برتا گیا۔ آپ کو بے تکلف ہوکر ملنا تھا۔ کیونکہ دو لوٹے ہوئے دلوں میں کوئی بیگانگی اور پردہ نہیں ہوتا ؎

بات کی تم نے یوں کہ کی ہی نہیں
لطف کیا جب نظر ملی ہی نہیں

آپ کو معلوم ہے کہ میں آپ کی صحبت سے کس طرح اٹھا۔ اور اٹھنے کے بعد کیا گذر گئی۔ بس کیفیت یہ تھی ع

درد کی طرح اٹھے، گر پڑے آنسو کی طرح

وہ رات ... آہ وہ دلگیر رات میرے لئے تباہ کن تھی ... خبر نہیں میں کیونکر زندہ رہا۔ صبح ہوتے ہی لوگوں نے دیکھا کہ ایک زندہ جنازہ ریل پر سفر کر رہا ہے ... کاش میں زندہ واپس نہ آتا ... چاہتا ہوں کہ جب تک حیاتِ مستعار ہے آپ سے خط و کتابت ترک نہ ہو ...

آپ کا قصوروار ______ دل گیر

قمر زمانی نے اپنا جواب اس انداز سے لکھا کہ دلگیر بکھرنے نہ پائیں۔

۹۔ دسمبر کو وہ لکھتی ہیں :

" دلگیر۔ اے سبحان اللہ، آپ دلگیر ہوکر دلنواز نہیں بنتے ہیں اور دلنوازی پر مجھ سے شرم و حجاب کی شکایت ہے۔ اور تو مجھ دل گرفتہ کے لئے میری تباہیاں ہی کچھ کم نہیں، اس پر رسوائی کا خوف اور گھر بھر کا ڈر۔ کیوں کر لکھوں ... صبر کرتی ہوں ... دیکھئے کوشش کررہی ہوں کہ آپ سے آخر دسمبر میں دلی میں ملاقات کی صورت نکل آئے۔ کانفرنس میں ہمارے یہاں کے لوگ سبھی جاتے ہیں ... آپ تشریف لائیے گا تو کنیز پر احسان ہوگا۔ آخر عیادت بھی تو فرض ہے ؎

تم یہاں آکر تو دیکھو ہجر میں کیا حال ہے
دل کے ہاتھوں آج سوسو حشر ہیں ٹوٹے ہوئے

یہاں تنہائی سے جی گھبراتا ہے۔ اگر زحمت نہ ہو تو نقاد کے سارے پرچے بھیج دیں ..... خطاوار .... (ق۔ز)

۲۶۔ دسمبر تک قمر زمانی کا کوئی خط "ملاقات کی شکل" لئے ہوئے نہ آیا تو دلگیر سے نہ رہا گیا۔ انھوں نے ۲۶۔ دسمبر کو ایک خط قمر کو لکھا:

" میں یہاں (لکھنؤ) سے پہلی یا دوسری جنوری کو صرف "آستاں بوسی" کے لئے بریلی آنا چاہتا ہوں اور میں ضرور آؤں گا۔ اگر درِ دولت کی حاضری میں کچھ رسوائی کا اندیشہ غالب ہو تو فوراً مطلع فرمائیے۔ ورنہ ضرور تجھ کھٹ کو سلام کرنے آؤں گا۔

میرا پتہ :۔ دفتر دلگداز۔ گڑھ۔ بزن بیگ خاں، لکھنؤ
معرفت مولٰینا عبدالحلیم صاحب شرر
آپ کا (دل)

اپنے پروگرام کے مطابق دلگیر قمر سے ملنے بریلی گئے وہاں پہنچتے ہی قمر کو پھر ایک خط لکھا اور جواب کے لئے اپنا یہ پتہ دیا۔

بریلی عقب کوتوالی بہ مکان سید واجد حسین
انسپکٹر پولس پنشنر

قمر کی طرف سے جواب کے انتظار میں دلگیر ۴ جنوری تک بریلی میں ٹھہرے رہے مگر قمر کا کوئی جواب نہ آیا۔ اس لئے بھاری قدموں سے وہ بریلی سے واپس لوٹے۔ لوٹتے ہوتے بھی ۴ جنوری کو بریلی ہی سے قمر کو لکھا ؎

کیا ہی دلگیر چلے ہیں دلِ مجبور سے ہم
آئے تھے تری زیارت کو بہت دور سے ہم

بے تابی سے تمام دن انتظار میں گذرا ؏
تھک تھک کے گر پڑی نگہہ انتظار آج

دنیا سے جانے والا
"بدنصیب"

لیکن جب قمر کا محبت بھرا خط ملا تو "بدنصیبی" کا سارا احساس کافور ہوگیا۔ دلگیر میں ایک نئی توانائی اور شگفتہ دلی پیدا ہوگئی۔ وہ اپنے ۲۶ جنوری کے خط میں پھر سے تازہ دم نظر آتے ہیں۔ قمر کو اپنی سپردگی کا یقین دلاتے ہیں۔ ان کی انشاء پردازی اور قلم کاری کی داد بھی دیتے ہیں۔ قمر کے خط سے دلکش فقرے منتخب کرتے ہیں اور ان پر اپنی رومان پرور انشاء نگاری کے جوہر دکھلاتے ہیں۔

" جہاں ممکن ہوا آپ سے ملوں گی۔ لو اب تو من جاؤ۔"

کیا عرض کروں اس فقرے نے مجھ پر کیا ستم ڈھایا۔ ہائے ظالم ؏
ڈال کر باہیں گلے میں کردیا پانی مجھے

سچ تو یہ ہے کہ آپ کا ہر فقرہ ریویو کے لئے مستقل عنوان چاہتا ہے اور میں لطف کو قائم رکھنا چاہتا ہوں۔ اس لئے جستہ جستہ داد دیتا ہوں۔

" دل گیر و دل نواز کی دل گرفتہ"

ہائے ترکیب الفاظ ہی تو ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی دل میں چٹکیاں لے رہا ہے۔ میں ان خوبصورت اور بچے تلے الفاظ کو اگر اس طرح ترکیب دے سکتا تو سچ کہتا ہوں تین بوتلوں سے کم نشہ نہ ہوتا۔" اس خوبصورت خط کے جواب میں قمر کی ادائیں بھی کچھ کم نہ تھیں۔ خط پڑھ کر دلگیر تو بس ریشہ خطمی بن گئے۔

"کنیز نواز نہیں بلکہ عاشق نواز (اب تو خوش ہو)

آپ نے میری تحریر کی داد دی۔ کیوں مجھے شرمندہ کرتے ہو میں اگر آپ کے اندازِ تحریر کی داد دینا بھی چاہوں تو الفاظ کہاں سے لاؤں۔ یہ برجستہ فقرے۔ یہ سلاستِ زبان۔ یہ خوبصورت ترکیبیں، یہ محبت سے لبریز فقرے۔ اور پھر موزوں اشعار کا استعمال کس کس کا ذکر کروں۔ آپ ہی کے سر کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ یہ اندازِ تحریر ہی تو تھا جس نے (مجھے) تباہ کردیا۔ قربان اس اندازِ سوال کے۔ مجھ سے تصویر کے متعلق پوچھا جاتا ہے۔ ہائے اللہ، میں تو شرم کے کچھ نہیں کہہ سکتی ..... یہی جی چاہتا ہے کہ تصویر نہیں بلکہ خود صاحبِ تصویر کو اپنے سامنے بٹھاؤں۔ دیکھوں اور پرستش کروں۔ آپ کو میری قسم۔ جانِ دلگیر کی قسم۔ بہت جلد بھیج دیجئے۔ نقاد کے لئے صبر نہیں ہوسکتا .... (ق۔ز)

اس خوبصورت اسلوب میں خط پڑھ کر دلگیر، نقاد کو دوبارہ زندہ کرنے کا ارادہ کرلیتے ہیں اور اس کی ادارت قمر کے حوالے کرنا چاہتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں :

" اگر آپ نقاد کی ادارت اپنے ہاتھ میں لیں تو میں مرحوم نقاد

کو زندہ کرنے کا سامان کروں گا۔ دیکھئے کسی عنوان انکار نہ کیجئے گا ورنہ ع

دل ٹوٹ جائے گا کسی امیدوار کا

آپ کا حسرت ضمیر ـــــ "دلگیر"

قمر زمانی نے نقاد کی ادارت قبول کرتے ہوئے لکھا:

نقاد کی دوبارہ زندگی، میری محبت کی یادگار ہے اس لئے اس یادگار کا واسطہ دلاتی ہوں کہ اسے ضرور جاری فرمائیں۔ اپریل کے پہلے ہفتہ پرچہ میرے ہاتھوں میں ہونا چاہئے اور یہی امتحان محبت ہے۔ ایڈٹ کرنے میں میں آپ کے ساتھ ہوں۔ مجھے کچھ آئے یا نہ آئے۔ لیکن آپ پر اعتماد ہے۔ سنبھال لیجئے گا۔ اگر مناسب سمجھیں تو اپنے نام کے ساتھ میرے نام کا بھی اعلان کر دیجئے ..... کنیز (ق۔ ز)

دلگیر کی ادبی زندگی نے ایک نئی انگڑائی لی۔ ان میں نقاد کے لئے ایک نئی لگن اور ایک نئی تڑپ پیدا ہو گئی۔ انھوں نے فوراً قمر زمانی کو لکھا کہ پہلے پرچہ کے لئے ایک افتتاحیہ مرحمت فرمائیں تاکہ انہیں کے مبارک نام سے نقاد کی بسم اللہ کی جائے۔

قمر نے حسب طلب نقاد کے لئے ایک "افتتاحیہ" روانہ کر دیا۔ اس افتتاحیہ کو پڑھ کر دلگیر کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ انہیں بھی اپنا ایک افتتاحیہ لکھنا ہے جو کسی حیثیت سے بھی قمر کے افتتاحیہ سے کم نہ ہو۔ کچھ سوچ کر انھوں نے یہ ذمہ داری بھی قمر ہی کو سونپ دی اور تاکید بھی کر دی کہ "میرا افتتاحیہ نہ آیا تو پرچہ اپریل کے پہلے ہفتہ میں شائع نہ ہو سکے گا اس لئے بواپسی ڈاک مرحمت فرما کر ممنون کیجئے ..."

مگر بار بار کی یاد دہانی کے باوجود قمر زمانی نے کوئی جواب نہیں لکھا۔ اس لئے دلگیر نے نیاز فتحپوری سے رجوع کیا۔ نیاز خود بھی یہ چاہتے تھے کہ نقاد کسی قیمت دوبارہ جاری ہو، اس لئے انھوں نے قمر زمانی کے افتتاحیہ کے پیش نظر دلگیر کی طرف سے "تقریب افتتاح" کے عنوان سے ایک مقالہ سپرد قلم کیا اور اسی ہفتہ دلگیر کے حوالے بھی کر دیا۔

اس "تقریب افتتاح" کو دلگیر نے قمر زمانی کے ملاحظہ کیلئے روانہ کر دیا اور لکھا۔ "مرمر کے افتتاحیہ کی تقریب کی ہے گویا آپ کا منہ چڑایا ہے۔ بغرض حک و اصلاح بعینہٖ بھیجتا ہوں۔ نظر ثانی بھی نہیں کی۔ دیکھ کر جلد واپس فرمائیے۔"

اپریل ۱۹۱۷ء کا "نقاد" بڑی آب و تاب سے نکلا۔ "نقاد کی زندگی کا دوسرا دور اور میں" کے عنوان کے تحت قمر کا افتتاحیہ شائع کیا گیا۔ دیگر لکھنے والوں میں شرر، مہدی حسن افادی، نیاز، محمد امین خلیقی اور شعرا میں ریاض خیرآبادی، جلیل مانکپوری، حسرت موہانی، ماتی جالسی اور سیماب قابل ذکر ہیں۔

"نقاد" کا دوبارہ زندہ ہونا محبت کا معجزہ سمجھا جا سکتا ہے۔ اسی لئے دلگیر عاشقانہ پیش رفت سے کام لیتے ہوئے قمر کو لکھتے ہیں:

"پیاری قمر

میری تباہی میں جو کسر رہ گئی تھی وہ اس خطاب نے پوری کر دی ..... اللہ کا شکر ہے کہ "افتتاح افتتاحیہ" آپ کو پسند آیا۔ یہ قدر دانی نہیں قدر افزائی ہے۔ اور وہ بھی نا اہل کی... آہ کوئی ایسی تدبیر نہیں کہ ہم ہمیشہ کے لئے مدت العمر... نہ چھوٹنے کیلئے کبھی نہ بچھڑنے کے لئے ایک دوسرے سے مل جائیں۔ اس سوال کے جواب پر میری موت اور حیات منحصر ہے .....

..... پیاری کیا میں دریافت کر سکتا ہوں کہ بریلی میں وجہ اطمینان کیا ہے۔ پیاری کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ دہلی یا لکھنؤ جانے کا ارادہ کس لئے ہے۔ تمہیں میری جان کی قسم سچ سچ بتا دو۔ اپنے حالات کچھ تو لکھو کہ اطمینان ہو۔ میں کوئی مناسب حال مشورہ دے سکوں۔ کچھ کام آسکوں۔ ہمارا ہی جنازہ نکلتے دیکھو جو اب نہ بتاؤ۔

اپنا بنانا ہے تو پھر بنا لو۔ اور رازِ دل کہہ دو۔ کیا ہمارا اعتبار نہیں۔ اپنی سیمیں کلائیوں کی قسم۔ بجنے والی چوڑیوں کی قسم؛ ہیرا تراش انگلیوں کی قسم۔ اس جذبات میں ڈوبے ہوئے خط کا جواب فوراً دینا۔ اپنی قمر کا ..... دلگیر

دلگیر کے ساتھ "شاہ" کا سابقہ قمر کو اچھا نہیں لگا۔ اپنے ایک خط میں انھوں نے لکھا کہ "آئندہ اپنے نام کے ساتھ مہربانی فرما کر شاہ کا لفظ نہ رکھئے۔ بہت بھدی بات ہے۔ کم از کم ایک لٹریری پرچے کے لئے سخت ناموزوں۔"

دلگیر اس کے لئے تیار ہو گئے۔ وہ لکھتے ہیں: "آپ "شاہ" کا لفظ نکلوا کر میری روحانیت مجھ سے چھیننا چاہتی ہیں۔ بہت اچھا۔ میں روحانیت بھی (جسے جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں) آپ پر قربان کر دوں گا۔ جب تک موجودہ سرورق باقی ہے شاہ پر چیپی لگ جائیگی۔ اور نئے سرورق میں صرف "دلگیر" ہوگا۔ آئندہ آپ کی خوشی ہوئی تو دلگیر بھی ندارد۔ صرف قمر ہی قمر۔"

نقاد کی حیات ثانی کا پہلا شمارہ دیکھ کر سجاد حیدر یلدرم کی

بیگم نذر سجاد نے نقاد کے جوائنٹ ایڈیٹر قمر زمانی کے نام ایک خط لکھا:

جاپلنگ روڈ، لکھنؤ

۲۴۔ اپریل ۱۷ء

پیاری جوائنٹ ایڈیٹر صاحبہ "نقاد"

..... خود ہمیں ہی معلوم نہ تھا کہ ہمارے فرقے میں بھی ایک چمکتا ہوا تارہ پوشیدہ ہے۔ جس کی شعاعیں نقاد کے ذریعہ اب عالم کو منور کریں گی۔ لیکن بھئی، میں تو آپ کے گول مول تعارف سے کچھ مطمئن نہیں ہوں ..... پس آئیے۔ اور زیادہ نہیں تو میرے برقعے میں۔ میرے نقاب ہی کے اندر قمر کا چہرہ کر دیجئے تاکہ اور کوئی نہ دیکھے اور میں دیکھ لوں۔ اچھی طرح پہچان لوں ... کہو منظور ہے۔ بھئی ہم سے پوشیدہ نہ رہو۔ بے نقاب ہو کر میرے نقاب میں آؤ۔

ہم سے پردہ نہ کرو، قمر درخشاں ہو کر
آؤ مل جاؤ گلے اب تو مہرباں ہو کر

(خاکسار نذر سجاد حیدر)

قمر نے جواباً بڑی سادگی سے لکھا کہ:

" آپ کو میں جانتی ہوں مگر آپ مجھے نہیں جانتیں۔ میں اپنے متعلق اس سے زیادہ کیا لکھوں کہ ایک مصیبت زدہ عورت ہوں اور سخت تباہ۔ خدا آپ کو خوش رکھے کہ دل پرسی فرمائی ہے۔"

مختلف اخبارات اور رسائل نے نقاد پر ریویو لکھے۔ "گلچیں" اور "ستارۂ صبح" نے قمر زمانی کی انشا پردازی کی تعریف کی۔ "خطیب" "الناظر" اور "دہلی گزٹ" نے اپنے اپنے تبصروں میں قمر کی واجبی تعریف کرتے ہوئے ان کی نسائیت میں شک کا اظہار کیا۔ دلگیر نے اس ضمن میں قمر کو ایک خط لکھا:

(گلچیں اور ستارۂ صبح کے علاوہ) اور اخبارات نے جو ریویو کئے ہیں وہ قابلِ ذکر نہیں۔ سب نے معمولی تعریف کی ہے۔ عام طور پر آپ کی نسائیت میں شک کیا جاتا ہے اور لوگ باور نہیں کرتے کہ یہ مضامین ایک عورت لکھ سکتی ہے۔ اس لئے اکثر پڑھے لکھے لوگ آپ کا پتہ، نشان اور صحیح نام دریافت کرنے کے لئے بے چین ہیں۔ ان تمام شکوک شبہات کا تسکین بخش جواب آپ کی طرف سے نقاد میں جلد شائع ہو جائے۔ ورنہ آپ جانتی ہیں کہ تمام دنیا دلگیر نہیں اور میں بدگمان طبیعتوں کو کس طرح یقین دلاؤں کہ آپ مرد نہیں عورت ہیں اور عورت بھی کیسی۔ مجھ کو مجھ سے چھین لینے والی۔ ... حامد حسن قادری نے بھی آپ کی نسائیت میں شک کیا ہے۔ اور عورت سے یہ خیالات منسوب کرنے میں متامل ہیں لیکن شریفانہ اور مہذب پیرایہ اختیار کیا ہے۔"

دلگیر کا خط ملا تو قمر نے نقاد کے لئے "کچھ اپنی نسبت" لکھ بھیجا جو جون ۱۹۱۷ء کے ابتدائی صفحات میں شائع ہوا۔ "کچھ اپنی نسبت" میں بھی قمر نے واضح طور پر اپنی نسبت کچھ نہیں لکھا۔ بلکہ وہ پوچھتی ہیں — "کیا میں یہ سوال کرنے کی جرأت کر سکتی ہوں کہ عورت اگر ایسے مضامین نہیں لکھ سکتی تو کیا مرد عام طور پر لکھ سکتے ہیں۔ پھر جب مردوں میں صرف دو چار ایسے نکل سکتے ہیں تو اگر عورتوں میں اس وقت تک صرف ایک فرد ایسا نظر آئے تو کیا گناہ ہے .... جو حضرت مجھے نہیں سمجھتے وہ جدا توہین کرتے ہیں اور جو جانتے ہیں وہ ایسی نازیبا حرکتیں کرتے ہیں۔ لیکن آپ لوگ یہ یقین کر لیں کہ ایکدن وہ آنے والا ہے۔ جب میں زبردستی بچّے بچّے سے تسلیم کرا لوں گی کہ ادبِ لطیف کا بہترین نمونہ اگر کوئی پیش کر سکتا ہے تو وہ صرف عورت کا دماغ ہے۔ اور اگر اخلاق کے لحاظ سے اب بھی کوئی فرد دکھایا جا سکتا ہے تو وہ آپ کو جنسِ ضعیف ہی میں ملے گا..... نقاد چونکہ ادبی رسالہ ہے اس لئے میں مجبور ہوں کہ متین اور سنجیدہ لٹریچر سے بحث نہیں کر سکتی۔ ورنہ میں بتاتی کہ مذہب و سیاست کو ایک نسوانی دماغ بھی اسی قدر سمجھ سکتا ہے جتنا ایک مرد کا مغرور دماغ .... (قمر)

لیکن اس جواب سے دلگیر ہی کی تسلی نہ ہوئی تو عام قارئین کیا مطمئن ہوتے۔ کچھ اپنے تلخ تجربات تھے اور کچھ لوگوں کے شکوک و شبہات۔ اور پھر "اپنی نسبت" لکھتے ہوئے "اپنی نسبت" لکھنے سے پہلو تہی کر جانا۔ یہ سب باتیں ایسی تھیں جن سے دلگیر کے دل ہی دل میں یہ گمان سر اٹھانے لگا کہ قمر زمانی شاید عورت نہیں ہے! سچ تو یہ ہے کہ یہ شبہ یقین کی حد تک پہنچ گیا تھا جس کی وجہ سے دلگیر قمر زمانی کے بارے میں کھنچے کھنچے رہنے لگے۔ قمر نے بھی شاید یہ بات محسوس کر لی۔ اس لئے وہ بھی خاموش ہو گئیں۔

قمر زمانی اور دلگیر کے درمیان عاشقانہ خط و کتابت کا یہ دلچسپ "ڈرامائی" سلسلہ کم و بیش دو سال جاری رہا، اور پھر یکلخت بند بھی ہو گیا۔ دلگیر کو جب "حقائق" کی خبر ہوئی تو کچھ جز بز بھی ہوئے کچھ نڈھال بھی ہو گئے۔ اس قدر نڈھال اور مایوس کہ کچھ دنوں بعد انھوں نے نقاد کو ہمیشہ کے لئے بند کر دیا۔

وہ حقائق کیا تھے جو نصف صدی تک وہ پردۂ خفا ہی میں تھے۔ پچاس سال بعد فرمان فتح پوری نے انھیں "قمر زمانی بیگم — علامہ نیاز فتحپوری کی انوکھی داستانِ معاشقہ" میں واضح کر دیا۔

از "ادیبوں کی حیاتِ معاشقہ" (انشاء)

- خشک کتابیں علم کی پیاس بجھانے میں ہمیشہ کامیاب نہیں ہوتیں۔
- بعض آدمی تھکے ہوئے پیدا ہوتے ہیں اور بعض دوسروں کو تھکا دینے والے۔
- مرد زندگی کو "ممکن" بناتا ہے اور عورت اسے "اغلباً" میں تبدیل کر دیتی ہے۔
- اگر تم کوئی غلطی نہیں کر سکتے تو دنیا میں کچھ نہیں کر سکتے۔
- عورت جب کبھی آئینہ دیکھتی ہے تو اسے کوئی نہ کوئی مرد بھی وہاں نظر آتا ہے۔
- اگر ایک مرد کنویں میں کود پڑے تو سمجھو کہ اس کی تہ میں ضرور کوئی عورت ہے۔
- ایک مقرر دوران تقریر میں کہہ رہا تھا کہ "جو آج لڑکے ہیں وہ کل مرد ہونے والے ہیں۔"

مگر جنس لطیف سے اس کا کوئی تعلق نہیں

کیونکہ وہاں تو یہ عالم ہے کہ "جو آج عورتیں ہیں وہ کل لڑکیاں بن جائیں گی۔"
- ایک موتی سے دانت رکھنے والی عورت کا منہ فطری موزونیت کے لحاظ سے سیپی کی طرح بند رہنا چاہئے۔
- قزاق وہ ہے جو دوسروں کو اپنی معاش کا ذمہ دار قرار دیتا ہے۔
- اکثر عورتیں آئینہ کے سامنے گھنٹوں صرف کیا کرتی ہیں، اس کا سبب پندار نہیں بلکہ تصور ہے۔
- احمقوں کی بیوقوفیاں، صاحبانِ عقل کی دانشمندیوں سے زیادہ دلچسپ ہوتی ہے۔
- شاعر پیدا ہوتا ہے۔ اسی لئے اس کا علاج ممکن نہیں۔
- عورت کو دنیا سے علحدہ کر دو، اس کے بعد مرد کی مشکلات کو تمہیں "خورد بین" سے دیکھنا پڑے گا۔

نیازؔ

نیازؔ فتحپوری بحیثیت شاعر

محترمہ اختر یزداں محسن

اگر نغمہ و شعر کی حقیقت پر غور کیا جائے تو اتنا سمجھ میں آتا ہے کہ یہ وہ حرفِ تمنّا ہے جس کو ہم آتش نفس حسن کے رُوبرُو کہنے سے مجبور ہیں۔ شعر جذبات کا وہ اظہار ہے جس میں غنائی عناصر اس طرح پیوست ہوتے ہیں کہ اس کا تاثر روح پر براہ راست ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح ایک تجربہ کار مالی چمن کو آراستہ کرتا ہے اور اس کا جنتِ نگاہ بناتا ہے۔ اسی طرح شاعر منتشر خیالات کو یکجا کر کے فردوسِ گوش بنا دیتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ شاعری بنیادی طور پر عشق کی مرہونِ منت ہے اور عشق وہ جذبہ ہے جو انسان کے تمام جذبات پر فتح حاصل کر لیتا ہے۔ بالکل اسی طرح شاعری بھی دوسرے اصنافِ سخن پر فتح پاتی ہے۔ شاعر اپنے عہد کا مصوّر بھی ہوتا ہے اور اپنے وقت کا مورخ بھی۔ اس کی نگاہ کونین کی وسعت کو پار کر جاتی ہے۔ وہ اپنے جذبۂ شوق کی گرمی سے اپنے فن کو کندن بناتا ہے۔ اس کے خیالات، احساسات و جذبات یکجا ہو کر چند الفاظ میں کچھ اس طرح سما جاتے ہیں کہ بعض وقت ایک شعر امروز و فردا کی ساری داستانیں سُنا دیتا ہے۔ شاعری سنگ و خشت کو موم بنا دیتی ہے اور پتھروں سے آبِ زلال کے چشمے پھوٹ پڑتے ہیں۔ شاعر کا وجود بھی اندھیروں میں اسی طرح اُجالے پیدا کرتا ہے جس طرح شمع تاریکیوں کو روشن کرتی ہے۔ اس کی ایک ٹھوکر سے قوموں کے خفتہ دل و دماغ بیدار ہو جاتے ہیں مگر شرط یہ ہے کہ وہ کائنات کے غموں کو دل کی گہرائیوں میں سمو سکتا ہو تب ہی اس کی شاعری خوشی اور غم کا امتزاجِ حسین بن سکے گی۔ اس وقت کوئی شاعر بڑے ہی پس و پیش میں پڑ جاتا ہے جب اس کی دیوانگی میں ہوش کی آمیزش ہوتی ہے یعنی ایک طرف تو وہ اپنے دلی جذبات کا اظہار کرنے کے لئے شاعری کا انتخاب کرتا ہے اور دوسری طرف اس کی سخت تنقیدی نگاہ شعر کی خامیوں اور خوبیوں کو بے کم و کاست واضح کر دیتی ہے۔ ان حالات کے پیشِ نظر یقیناً ناقدانہ ذہن رکھنے والا انسان اچھا شاعر نہیں ہو پاتا اور ساتھ ہی ساتھ اس کے ذہن میں یہ احساس بھی قائم رہتا ہے کہ جس طرح خود اس کے قلم سے اکثر شاعری کی جراحی ہوئی ہے اس طرح اس کے اشعار بھی انتقاماً فن کی کسوٹی پر بیدردی سے کسے جائیں گے۔ اس لئے اس کا قلم بہت ہی محتاط روی کے ساتھ جنبش کرتا ہے۔

نیازؔ بھی اسی زمرے کے شعراء میں شمار کئے جا سکتے ہیں اگرچہ ان کے اشعار بلند پایہ نہیں ہیں تاہم ان کے فکر رسا کے شاہکار ادبی عیوب اور فنی خامیوں سے بڑی حد تک پاک ہیں۔ ان کی شاعری میں عاشق کے دل کی وہ تڑپ نہیں ہے جو سُننے یا پڑھنے والوں کی آنکھوں میں آنسو لے آئے۔ ان کے اشعار پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کہ وہ اپنے علم اور شعور کو بروئے کار لا کر ضرورتاً شعر کہتے ہوں۔ حسن کے سامنے اگر کبھی اپنے جذبات کے اظہار کرنے کی ہمت کرتے ہیں تو کچھ اس طرح کہ حسن کو اس کی خبر نہ ہو اور پیغام پہنچ جائے۔ کہتے ہیں ؎

عشق میں تم آزاد ہو جتنے اُتنے کیوں مجبور رہیں ہم
دل میں بسو آنکھوں میں سماؤ پھر بھی لب پر نام نہ آئے

؎

دل ہی تو ہے آخر بھر آیا تم چیں بہ جبیں کیوں ہوتے ہو ؎ ہم تم کو بھلا کچھ کہتے ہیں تقدیر کا اپنی رونا ہے

اک بار جو اُن سے کہنا تھا وہ کہہ دیا اس کے بعد مگر
ہم مٹ ہی گئے اظہارِ محبت ہم سے مکرّر ہو نہ سکا

٭

ان اشعار کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ نیاز حُسن سے مرعوب ہیں اور وہ اپنے جذبۂ بے اختیار شوق کا اظہار تو کرنا چاہتے ہیں لیکن کشمکش التماس میں اُلجھ کر رہ جاتے ہیں اور شمشیر کا دم سینۂ شمشیر کے باہر نہیں آپاتا اسی لئے ان کی شاعری میں احساسات کی سچی ترجمانی کم ہی ہوتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ اپنی دل کی تمنّاؤں کو کہہ دینے کے بجائے ان تمنّاؤں کی یاد کو عزیز رکھتے ہیں جو ان کے شعور میں نقش ہیں اور یہ یادیں مختلف پہلوؤں سے اپنا جادو جگانا چاہتی ہیں لیکن ان کی تمنّائیں بحرِ عشق کی تہہ میں موجیں مارتی رہتی ہیں اور یہ سوتا مشکل ہی سے پھوٹتا ہے۔

نیاز چونکہ ایک اچھے انشاپرداز ہیں اور الفاظ و محاورات کے استعمال پر مہارت رکھتے ہیں اس لئے ان کی شاعری کی زبان میں بھی ایک خاص لب و لہجہ پایا جاتا ہے۔ ان کے یہاں جذبہ کی تڑپ اگرچہ کم ہے لیکن ان کے الفاظ شاعری کے سانچے میں ڈھل کر کسی حد تک فن شاعری کے تقاضوں کو پورا کرتے ہیں۔

غزل گوئی کے بارے میں نیاز لکھتے ہیں :

"میری رائے میں غزل گوئی کے تین درجے ہیں۔ ایک یہ کہ شاعر صرف دوسروں کے جذبات کی ترجمانی کرے اور خود اُن سے بے خبر ہو، دوسرے یہ کہ وہ اپنے تاثرات کو ظاہر کرے لیکن دوسروں کو سُنانے کے لئے اور تیسرے یہ کہ شاعر کا مخاطب خود اسی کی ذات ہو۔ اپنی بیتی اپنے آپ کو سُنائے۔ خود ہی قائل ہو اور خود ہی سامع۔ آخرالذکر شاعری کا نہایت بلند درجہ ہے اور دنیائے شعر کا یہ "تخاطب بالنفس" / Soliloquy اگر پوری طرح کسی پر ابتدا ہی میں طاری ہوگئی تو وہ جلد مر جاتا ہے۔ اول تو اس رنگ کا شاعر بہت کم کہتا ہے اور اگر کہے بھی تو صاحبِ دیوان نہیں ہوسکتا۔ وہ دنیا سے بے خبر ہوتا ہے اس لئے دنیا بھی اس کی طرف سے غافل ہوتی ہے۔ وہ گویا جنگل کا گلاب ہے۔ اپنے لئے کھلتا ہے اور چند ساعت کے بعد وہیں مُرجھا کر فنا ہو جاتا ہے۔"

نیاز کو اگر اس قبیلے کا شاعر مان لیں تو ہمیں محسوس ہوگا کہ شہرت اور ناموری سے بیگانگی کے ساتھ ساتھ وہ صرف ذہنی تسکین کے لئے شعر کہتے ہیں۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ ہم نیاز کو انھیں کی مقرر کی ہوئی شاعری کی دوسری صف میں شمار کر سکتے ہیں جس کے تحت دوسروں پر اپنے تاثرات کے اظہار کے لئے شاعری کا وسیلہ اختیار کیا جاتا ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر نیاز کی شاعری کا مقصد کیا ہے! وہ نثر بھی لکھتے ہیں تو اس میں اپنی صلاحیتوں کے جواہر بکھیر دیتے ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ جی جان سے فن کو بلندیوں تک پہنچانا چاہتے ہیں لیکن شاعری میں اپنی کسی تخلیق کو وہ فنکارانہ شاہکار بنانے کی کبھی کوشش نہیں کرتے بلکہ وہ مخصوص سامعین کو اپنا کلام سُنانا چاہتے ہیں اور داد و آفرین کے تمنّائی نہیں ہوتے۔ اس سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ بحیثیت شاعر بے نیازِ رنگِ محفل ہیں اور یہاں وہ مکمل طور پر عقلی دلائل اور فلسفیانہ طرزِ فکر سے بے نیاز ہیں اسی لئے "نگار" کے کئی کئی شمارے مطالعہ کرنے کے بعد بھی مشکل ہی سے نیاز کی کوئی غزل یا ان کے متفرق اشعار دیکھنے کو ملتے ہیں جبکہ ان کا ادبی جریدہ ان کی نثر کی گل فشانیوں سے بھرا ہوا ہے۔ ان کا تحت الشعوری سرمایہ ہر قسم کی دولت سے مالامال ہے جس طرح وہ نثر میں حُسن کو آئینۂ حق سمجھ کر اس کے ایک ایک پہلو کی وضاحت کرتے ہیں اس کے بالکل برعکس شاعری میں بہت ہی سیدھے سادے انداز میں اپنی تمنّاؤں کی تکمیل نہ ہونے پر مایوسی اور حسرت کا اظہار کرتے ہیں۔ شاید وہ یہ چاہتے ہیں کہ عشق کی بدولت حُسن کو رُسوا ہونے سے بچالیں۔ وہ خود کہتے ہیں : ؎

پردہ اُٹھ جانے پہ مٹ جائے گا اے لذتِ دید ؛ وہ جو اک لُطف ہے بجلی سی چمک جانے میں

ہاں ذبح تو مجھ کو کر ہی چکے اِک کام ضروری اور بھی ہے
کیا سوچ رہے ہو گھبراؤ یہ دامن پر خوں دھونا ہے

⁂

نیازؔ کسی طرح بھی حسن کے نام پر حرف نہیں آنے دیتے۔ ان کی تمنا حسن کی نظارہ بازی ضرور کرتی ہے لیکن اس طرح کہ کسی کو خبر نہ ہو۔ نیازؔ کے بعض اشعار میں ان کے جذبات کا ایک طوفان نظر آتا ہے۔ اکثر ان کے اشعار میں ان کی جولانیٔ طبع کا رنگ بھی نظر آتا ہے۔ ان کی طبیعت میں شوخی ہے جو اُن کی تحریروں میں نمایاں ہے۔ شاعری میں شاذ و نادر ہی سہی لیکن موجود ضرور ہے۔ فرماتے ہیں :

ہاں اور جس طرح بھی ہو تڑپایئے مجھے ؎ کچھ ایسا کیجئے کہ نہ یاد آیئے مجھے

⁂

گھڑی گھڑی نہ ادھر دیکھئے کہ دل پہ مجھے ؎ ہے اختیار پر اتنا بھی اختیار نہیں

⁂

گو تم نے لاکھ کام لیا ضبط سے نیازؔ ؎ پہچان ہی گئی نگہ ہوشیار دوست

⁂

ایک حساس فنکار زندگی کے کسی معمولی پہلو میں جو کچھ دیکھ لیتا ہے وہ سطحی نظر رکھنے والے نہیں دیکھ پاتے۔ نیازؔ کی شاعری موضوعاتی اور معاملاتِ حسن و عشق کی مظہر ہے۔ ان کی شاعری میں اس کے علاوہ دوسرے پہلوؤں کی نمائندگی کم ہے۔ وہ ادب برائے ادب کے قائل ہیں۔ اس کو برائے زندگی کہنا اور اس پر بحث کرنا بربادیٔ وقت سمجھتے ہیں۔ وہ ایک ایسے شاعر کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں جو صرف غزل کے اس مفہوم کو سمجھتا ہے کہ غزل میں محبوب سے باتیں کی جاتی ہیں لیکن جب وہ آگے بڑھتا ہے تو کہتا ہے :

سنگ کیا ہے بس سراپا انتظار بت تراش
زندگی کا خواب لوگوں یوں بھی دیکھا جائے ہے

⁂

فلسفہ کی یہ چاشنی اور اس انداز میں نیازؔ کے یہاں کم ملتی ہے کیونکہ ان کی شاعری کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے انھوں نے اس اسلوب کو اپنانے کی کوشش ہی نہیں کی اور ہمیشہ اس جنسِ گراں مایہ کو بے وقعتی کی نگاہ سے دیکھتے رہے گویا کہ ان کے لئے ایک ذہنی ورزش تھی جس سے کبھی کبھی وہ اپنا جی بہلا لیا کرتے تھے۔

نیازؔ کے یہاں جمالیاتی حِس بدرجۂ اتم موجود ہے۔ اُن کی نثری تصانیف خالص جمالیاتی تصورات کی آئینہ دار ہیں لیکن ان کی شاعری میں فطرت کی رنگینیاں زیادہ نمایاں نہیں ہیں بلکہ اس کی تابش خاصی مدھم ہے۔ رشک و حسد کے جذبات دوسرے شعراء کی طرح نیازؔ کے یہاں بھی موجود ہیں اور ساتھ ہی ساتھ دنیائے عشق میں پائی جانے والی بے اعتباری بھی ان کی شاعری میں جا بجا ملتی ہے۔ کہتے ہیں :

ڈرتا ہوں یہ بھی نہ ہو کوئی پردۂ ستم ؎ یوں آج بل رہے ہیں کہ جیسے خفا نہیں
تمہیں نہ کہہ دو کہ ہم تم کو کیا سمجھتے ہیں ؎ ہماری بات کا تو کوئی اعتبار نہیں

⁂

ایک حساس شاعر کے لئے یہ رشک و حسد فطری بات ہے اس لئے کہ جب وہ حسن کو اپنی چشم بینا کی مدد سے دیکھتا ہے تو اس کی عظمت اور آفاقیت کا قائل ہو جاتا ہے۔ اسی جذبے کے تحت وہ حسن کو غیر فانی تسلیم کر لیتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ حسنِ کامل صرف اس کے محبوب کی ذات میں پنہاں ہے۔ اسی لئے وہ اس کو غیر فانی بھی تصور کر لیتا ہے اور اس کی ایک لغزشِ نگاہ کو زلزلۂ کائنات سمجھتا ہے۔

حسن کے معمولی واقعات کی اہمیت بھی اس کی نگاہ میں بڑھ جاتی ہے۔ ذیل کے شعر میں نیازؔ حسن کی خود آرائی پر رائے زن ہیں :

اللہ رے بندوبستِ خود آرائی شباب ؎ غنچے چٹک کے پھول بنے اور سنور گئے

٭ ٭ ٭

حسن کے حضور میں لہجے کی عاجزی اور انکساری بھی قابلِ غور ہے ؎

جو سن سکو تو مری داستان ختم نہ ہو ؎ نہ سن سکو تو کوئی حدِ اختصار نہیں

٭ ٭ ٭

نیازؔ اس قسم کے شاعر ہیں جنہیں ہر وقت پھول کی رنگت، ستاروں کی چمک، دھیمی دھیمی ہواؤں کی رَو، میٹھے میٹھے سُروں میں گاتے دریاؤں میں اپنے محبوب ہی کا عکس نظر آتا ہے بالکل اسی طرح جس طرح تیز آندھیوں میں ورڈس ورتھ (Wordsworth) کو لوسی (Lucy) کی آواز سنائی دیتی تھی۔ نیازؔ بھی یہی سمجھتے اور کہتے ہیں :

حسن کو محدود کب کرتا ہوں لیکن ہر حسین ؎ اتنا ہی دلکش ہے جتنا تجھ سے ہے ملتا ہوا

٭ ٭ ٭

نیازؔ حسن کی منت کرتے بھی نہیں ہچکچاتے۔ اپنے ایک شعر میں کہتے ہیں ؎

وہ کرے کیا کچھ نہ آئے جس کو منت کے سوا
پھر یونہی منت کریں گے ہم خفا ہو جائیے

٭ ٭ ٭

نیازؔ محفلِ حسن کو طائرانہ نظر سے دیکھنا چاہتے ہیں لیکن ان کے ارادوں میں جوانی نہیں ہے۔ وہ راہ میں تھک کر بیٹھ جانے کے قائل معلوم ہوتے ہیں۔

چلے تھے ایک نظر تیری بزم دیکھ آئیں ؎ یہاں جو آئے تو بے اختیار بیٹھ گئے

٭ ٭ ٭

کبھی کبھی تو وہ بالکل دل شکستہ ہو کر کہہ اٹھتے ہیں ؎

طے ہو چکیں شکستِ تمنا کی منزلیں ؎ اب اس کے بعد گریۂ بے اختیار ہے

٭ ٭ ٭

لیکن اس کے باوجود نیازؔ ہمت نہیں ہارتے تھے۔ ان کے دل میں شکست خوردگی کا احساس پیدا نہیں ہوتا اور اپنے تابناک ماضی کو حال میں بھی ماضی ہی کی طرح فروزاں دیکھنا چاہتے ہیں۔ ذیل کے شعر میں ان کے بلند حوصلے، وسیع مشاہدات اور تجربات کی گہری چھاپ ملتی ہے ؎

تھمے طوفاں، ہٹے موجوں کی چادر، تو کھلیں آنکھیں ؎ نگاہوں میں ابھی دھندلے سے کچھ نقشے ہیں ساحل کے

٭ ٭ ٭

غرضیکہ نیازؔ وہ ادیب ہیں جن کے نظریات کے متعلق کسی نتیجہ پر پہنچنا دشوار ہے۔ وہ اگر ایک طرف شعر کی جراحی کو اس کا خون سمجھتے ہیں تو دوسری طرف عملی طور پر انتہائی بے درد جراح ہیں۔ وہ جگر جیسے شاعر کے غنائی حسن کو ٹھکرا کر اس کی شاعری میں حسن و عشق کی حکایتوں کے علاوہ نہ جانے کیا کچھ تلاش کرتے ہیں اور اس کو گھٹیا اور ثانوی درجے کا شاعر سمجھتے ہیں لیکن خود ان کے اشعار پڑھ کر یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ نیازؔ دوسرے شعراء کا پوسٹ مارٹم کرنے میں کہاں تک حق بجانب ہیں۔ خود ان کا شعر دیکھئے ؎

لبوں پہ میرے تبسم تھا ان کی آنکھیں نم ؎ ایک ایسا لمحہ بھی وقتِ وداعِ جاں گزرا

باوجودیکہ مذکورہ بالا شعر نیازؔ جیسے بلند پایہ ادیب کی تخلیق ہے لیکن اسے رسمی شاعری کے عام سلسلے سے کسی طرح بھی علاحدہ نہیں کیا جا سکتا اور نہ اسے اوّل درجے کا شعر ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔ ان کا دوسرا شعر ملاحظہ ہو ؎

یہ آج کیسا چراغاں ہے تیرے کوچے میں ؂ اِدھر سے کون یہ باچشم خوں چکا گزرا

⁂ ⁂ ⁂

چشم خوں چکا سے کوچے میں چراغاں ہونے کی تشبیہہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ غالبؔ نے اسی خیال کو زیادہ اچھے طریقہ سے باندھا ہے۔ یہ شعر دیکھیں ؎

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

⁂ ⁂ ⁂

نیازؔ کے چند اشعار مذکورہ بالا خیال کی تائید میں پیش کئے جاتے ہیں :

ہم گئے جان سے اور صدمۂ جدائی کی گئی ؂ کھالیا تیر کلیجے پہ تو آرام آیا

⁂ ⁂ ⁂

مسافرانِ لحد جاؤ ہم بھی آتے ہیں ؂ وہیں سے مل کے چلیں گے جو پہلی منزل ہے

⁂ ⁂ ⁂

ہوئی نہ ختم مگر کشتگانِ ہجر کی رات ؂ ہزار بار زمیں گزری آسماں گزرا

⁂ ⁂ ⁂

بعض جگہ ان کی پوری پوری غزلیں پھیکی اور بے کیف نظر آتی ہیں۔ ان کی اس قسم کی شاعری کو ہم دلّی اور لکھنؤ کی روایتی شاعری کے حدود سے باہر نکلنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ نیازؔ کے اشعار تمام فنی اور تنقیدی اصولوں پر پورے اترنے کے باوجود صرف "شعر برائے شعر" کی مصداق ہیں۔ ان کی ایک غزل کے چند اشعار دیکھئے :

سوال ہدیۂ جاں مجھ سے اور پھر پس وپیش ؂ میں پوچھتا ہوں یہ کیا آپ کو گماں گزرا
اس التفاتِ فراواں کے جایئے صدقے ؂ وہ میرے پاس سے جب گزرا سرگراں گزرا
الٹ کے رکھ دیا کس نے ورقِ بہار کا آج ؂ چمن سے کون یہ بربادِ خانماں گزرا
امیدِ لطف بجا، یہ بھی کم نہیں ہے نیازؔ ؂ کہ ان کو شکوہ مرا آج کم گراں گزرا

⁂ ⁂ ⁂

بظاہر نیاز شاعری میں نئے رجحانات کے حامی ہیں اور فرسودہ خیالات پر نکتہ چینی کرتے ہیں لیکن ان کی شاعری میں ذبح کرنے کی روایت، کلیجے پر تیر کھانا، لحد، نزع اور کشتگانِ ہجر جیسے اِزکار رفتہ تراکیب اور الفاظ و محاورات کافی تعداد میں ملتے ہیں۔ دراصل نیازؔ بالکل اُسی بلبلِ شوریدہ کی طرح ہیں جس نے گلستانِ اُردو میں حسن و عشق کی روایتی داستانوں کو زمانۂ حال کا پیراہن عطا کرنے میں انتہائی کوشش کی ہے۔ گو کہ وہ خود شاعری کے میدان میں اپنے ان اصولوں کے اسیر ہو کر رہ جاتے ہیں جو انھوں نے دوسروں کے لئے بنائے ہیں لیکن دوسرے ان کے بنائے ہوئے اصولوں سے پوری طرح استفادہ کر کے اپنی محبوب صنفِ سخن کو زیورِ اصلاح سے برابر آراستہ کر رہے ہیں۔

نیازؔ کی شاعری کا ذکر ادھورا رہ جائے گا اگر ان کی نظموں کا جائزہ نہ لیا جائے۔ ان کی اکثر نظمیں گہری علمیت کا رنگ لئے ہوئے ہیں۔ ان کی ایک مشہور نظم ہے "شہرآشوب اور اسلام"۔ یہ ایک ایسی نظم ہے جس میں اخلاقیات کا درس موجود ہے۔ اس نظم میں نیازؔ نے مسلمانوں کی

موجودہ حالت کو قلمبند کیا ہے کہ رفتہ رفتہ مسلمان کا رشتہ قرآن اور اس کے اصولوں سے ہٹتا جارہا ہے۔ یہ وہ قوم ہے جس کے بلند کردار اور حوصلہ مند عمل سے دوسرے لوگ زندگی کا سبق سیکھا کرتے تھے جس کی شجاعت اور دلیری کی تاریخ ساز واقعات اب محض داستانیں بن کر رہ گئی ہیں۔ یہ وہی مسلمان ہیں کہ جن کے مٹھی بھر افراد نے نصف دنیا کو فتح کرلیا تھا۔ اب رفتہ رفتہ ان کے دلوں سے جذبۂ حق پرستی اور ذہنوں سے تصوّرِ حیات مٹتا جارہا ہے۔ اسی صورتحال کا اظہار نیاز کے مندرجہ ذیل اشعار میں ملاحظہ کیجئے۔

نہ مگر نالے میں تیرے شرر افشانی ہے — نہ تیرے سینۂ صدچاک کی عُریانی ہے
وہ رجز ہے نہ وہ انداز خودی خوانی — نہ جنوں کی تری وہ سلسلۂ جنبانی ہے
تو بھلا بیٹھا غضب لذتِ دل سوزی کو — بے قراری کو مذاقِ تپش اندوزی کو

⁂ ⁂ ⁂

اس طویل نظم میں ایک ثابت قدم اور باشعور مسلمان کے سینہ سے نکلی ہوئی وہ آہیں ہیں جو ایک عظیم قوم کے زوال، علم وفن، فکر وعمل اس کی پستی اور ناداری پر دل گرفتہ ہے۔ اس نظم میں شاعر اپنے ذہن میں وہ تصویر اُجاگر کرتا ہے کہ جس میں مسلمانوں کے ولولہ انگیز عہد ساز کارناموں کے خدوخال صاف نمایاں ہوجاتے ہیں۔ اس وقت خوف وہراس، ناامیدی اور بے یقینی نے قوم کے ارادوں کو پامال نہ کیا تھا لیکن موجودہ دور کی عکاسی اور احساسات کی ترجمانی اس نظم میں شاعر نے بہت ہی مؤثر انداز میں کی ہے:

کیف کی اب نہ رہی آنکھ میں سُرخی باقی — نہ وہ رفتار میں ہے لغزشِ مستی باقی
بزم میں ساقی نہ اب بادۂ صافی باقی — ہے فقط تذکرۂ جام و صراحی باقی

⁂ ⁂ ⁂

اس نظم کے ذریعہ نیاز نے مسلمانوں کو آگاہ کیا ہے کہ یہ بادۂ شبانہ کی سرمستیوں میں کھوئے رہنے کا وقت نہیں ہے اور نہ ہی لذتِ خواب سحر لینے کا۔ اس افراتفری کے دور میں وقت آگیا ہے کہ اب ایک بار پھر بیدار ہو اور دنیا کو دکھا دو کہ کس طرح اسلام کی اعلیٰ اقدار کی بنیاد پر مشرق کا سر امغرب سے ملایا جاسکتا ہے۔ اسلام کی فطرت میں اللہ نے لچک دی ہے۔ وہ اتنا ہی ابھرتا ہے جتنا دبایا جائے۔ اس نظم کے مندرجہ ذیل بندوں میں وہ پیغام ہے جو شرر انگیز جذبات کی بھی عکاسی کرتا ہے۔

اے مسلمان نکل خون کا محضر لے کر — گرم پیکار ہو پھر ہاتھ میں خنجر لے کر
ہاں نکل سینہ میں امیدوں کا محشر لے کر — یہ سکوں ہستی میں ظالم دل مضطر لے کر

کھینچ وہ نالہ کہ پیدا ہوں شرر دامن میں
آگ لگ جائے تری شمع کے پیراہن میں

⁂ ⁂ ⁂

اس نظم کے آخری دو بند میں نیاز بڑے مؤثر انداز میں مسلمانوں کو راہِ راست' ثابت قدم اور صراطِ مستقیم پر آنے کی دعوت دیتے ہیں۔

تیرے جلوے سے ہو معمور مرا ذوق نیاز — ناز تجھ پر ہو ہمیں تجھ کو رہے ہم پر ناز
زمزموں سے ترے معمور ہو اسلام کا ساز — نہ رہے لطف نظر شعبدۂ شیشہ باز

لے اڑے مستی صہبا ترے دیوانوں کو
توڑ دیں بزم میں ہم غیر کے پیمانوں کو

⁂ ⁂ ⁂

منتشر میری نوا صورت نکہت ہوجائے — ہر جراحت کا نشاں دیدۂ عبرت ہوجائے

دلِ بے چین مری زیست کی لذّت ہو جائے   کلفتِ درد مجھے مایۂ عشرت ہو جائے
خطِ تقدیر مٹا دوں ترے در پہ گھِس کر
خاک ہو جاؤں تری راہ کی میں پِس پِس کر

⁂   ⁂   ⁂

نیاز مسلمانوں کے عزائم کی شکستگی اور حوصلے کے متزلزل اور ایمان کی عدم پختگی سے تڑپ اُٹھتے ہیں۔ ان کو یہ صدمہ ہے کہ اس قوم کے پاس ایک جاندار پیغام ہوتے ہوئے بھی وہ کیوں راہ سے بھٹک رہے ہیں۔ اپنی ایک اور نظم "درسِ عمل" میں اپنے اس خیال کو یوں پیش کرتے ہیں:

حصولِ مقصدِ فطرت تھا ہجرتِ اسلام   نہاں تھے قصر بہ آغوشِ خانماں تبھی

⁂   ⁂   ⁂

کسے خبر تھی کہ یہ پردۂ جہاں بانی   کرے گا پیشِ نظر منظرِ جہاں سوزی

⁂   ⁂   ⁂

تمہاری تیغِ ستم بھی دو نیم ہو گی اگر   جو اپنی خوئے وفا ہو گئی بد آموزی

⁂   ⁂   ⁂

نیاز فطرت اور مناظرِ فطرت کے دلدادہ ہیں۔ کوئل کی کوک اور پپیہے کی ہوک ان کے دل پر اثر انداز ہوتی ہے۔ وہ ان سے مخاطب ہو کر محبت کے متعلق گفتگو کرتے ہیں کیونکہ یہ وہ طائر ہے جس کے دل میں محبت کی تڑپ، عشق کی شرر انگیزی اور نغموں کا تلاطم ہے اور وہ محوِ ترنم ہے۔ صرف اس وجہ سے کہ وہ اپنے فراق کی تڑپ اور دل کا سوز کائنات پر ظاہر کرکے یہ واضح کرتا ہے کہ محبت ازل سے ابد تک رہے گی۔ محبت لافانی ہے جبکہ انسان کی زندگی فانی ہے۔ نیاز کہتے ہیں:

کیا ہو ہم تجھ سے اگر شیون کی مستی چھین لیں   کیا رہے تجھ میں جو ترا سازِ ہستی چھین لیں
ترے نغموں کا ذرا دیکھوں تو کیسا ساز ہے   تو کہیں ہے بھی کہ بس آواز ہی آواز ہے

⁂   ⁂   ⁂

محبت کی گہرائی سے سطحی ذہن رکھنے والے سمجھنے سے قاصر ہیں لیکن شاعر اس سوز و گداز میں ہستی کا تموّج پا لیتا ہے اور اس کا اعتراف بھی کرتا ہے۔

ہم ہنسا کرتے تھے تیری بیت بازی پر مگر   زخمِ الفت سے حقیقت ہو گئی پیشِ نظر
یعنی تو اک شعر ہے جو درد سے معمور ہے   کچھ نہیں ہے تو مگر اک نالۂ مجبور ہے

⁂   ⁂   ⁂

نیاز کی ایک نظم "جھکی ہوئی نگاہ" میں ان کی عشقیہ فطرت کا عکس نظر آتا ہے۔ وہ جھکی ہوئی نگاہ کو ناتوانی اور مجبوری کی ایک علامت خیال کرتے ہیں اور اس کے اُٹھنے کو ایک طوفانی حشر پیما۔ یہ نگاہِ فتنہ انگیز حشر ساماں بھی ہوتی ہے اور نگہِ لطف و کرم سے زخم پر مرہم کا کام بھی لیا جاتا ہے۔ نیاز کہتے ہیں ـــ

یہ جگائے لاکھ جادو جو ہو اس میں بے حجابی   یہ سُلا کے سب کو دے جو ہو اس میں نیم خوابی
یہ خراب کر دے عالم ہو اگر کبھی شرابی   یہ سِکھا دے بادہ خواری ہو اگر کہیں گلابی

⁂   ⁂   ⁂

نہیں گر خُمار اس کا تو ہے کیوں مجھے خموشی   ہوئی محو اس نشے میں مری لب جنوں فروشی
ہے اسی کے دم سے قائم یہ رواجِ بادہ نوشی   رہے تا ابد سلامت یہ دکانِ مے فروشی

نیازؔ کی نظمیں ان کے ذہن کی وسعت و رفعت، ان کے ادبی شعور، مشاہدے اور تجربہ کی عکاسی کرتی ہیں اور باصلاحیت شاعر ہونے کی شہادت دیتی ہیں۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے بیشتر شعراء اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کرتے رہے۔ یہی روایت آخرکار بیسویں صدی کے نصف اوّل تک کشاں کشاں پہنچی۔ اس دَور میں فارسی شاعری کی نمائندگی کا سہرا علامہ اقبالؔ کے سر ہے۔ اُنھیں کے دَم سے اُس دَور کے اکثر شعراء کے یہاں فارسی کی غزلیں مل جاتی ہیں۔

نیازؔ کے کلام میں بھی فارسی کی غزلیں موجود ہیں اور ان میں بھی اسی جمالیاتی احساس کا پرتو ملتا ہے جو نیازؔ کے خاص اندازِ فکر کا خاصہ ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

زدلم نہ گفتنی نہ زتو شنید نستے　　　ولے ایں قدر بدانم کہ غمت کشید نستے

٭　٭　٭

دوسرے شعر میں دنیاوی لذتوں سے محرومی کا ذکر بھی کامیاب انداز میں کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

تو وصد ہزار کیف نگہہ شراب ریزے　　　من زار و ارتعاش لب ناچشید نستے

٭　٭　٭

اِسی غزل میں آگے چل کر اپنے محبوب کی بعد از وقت آمدے بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں :

بمزارم از چہ آئی، بگزر شتاب بگزر　　　کہ مرا ز شورش اکنوں سر آرمید نستے

٭　٭　٭

مختلف کتب، رسائل و جرائد میں منتشر نیازؔ کا کلام دیکھنے کے بعد ان کی شاعری کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنا اگر ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ نیازؔ ایک بڑے ادیب ہیں اور ادب میں وہ کئی حیثیتوں سے اپنا ایک مقام رکھتے ہیں۔ گوکہ یہ قطعی ضروری نہیں کہ شاعر کی حیثیت سے بھی ان کی شخصیت کو تسلیم کیا جائے۔ اگر بحیثیت شاعر ادب میں ان کا شمار نہ بھی کیا جائے تو بہرحال وہ ایک قدآور ادبی شخصیت کے مالک ہیں۔ نیازؔ شاعری میں جن ناقدانہ اصولوں کے قائل ہیں ان کی شاعری ان اصولوں پر پوری اُترتی ہے یہی ان کی ایک انفرادیت ہے اور صرف اسی خوبی کی بنا پر ان کو بحیثیت شاعر بھی تسلیم کیا جاتا ہے۔

جس طرح کوئی بڑا عہدیدار یا بڑا آدمی چشم زدن میں بڑا شاعر بھی بن جاتا ہے اُسی طرح نیازؔ بھی بڑے ہی شاعر تھے لیکن اصلیت یہ ہے کہ مختلف شعراء پر سخت تنقیدی مضامین لکھنے کے بعد ان کے نظریات کافی سخت ہوگئے تھے اور نیازؔ کی شاعری سے رنگینی، دلکشی، چاشنی، شگفتگی، لوچ اور لچک وغیرہ وغیرہ سب یکے بعد دیگرے رخصت ہوگئے تھے۔ اگر کچھ باقی تھا تو وہی بندھی ٹکی شاعری کا مزاج جو ایک عروضی یا قواعد داں کے یہاں ہونا لازمی ہے۔ اس کے باوجود ان کی شاعری کو یکسر فراموش نہیں کیا جاسکتا اس لئے کہ جب ایسے ہی دوسرے ناقدین کے کلام پر نظر پڑتی ہے تو سخت مایوسی ہوتی ہے۔ نیازؔ کے کلام میں ہمیں رنگینیوں اور دلچسپیوں کی عدم موجودگی کے باوجود ایک قسم کا جاندار اور صحت مند شعری احساس اور تخیل کا بانکپن نظر آتا ہے جسے کسی طرح بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔

اگر نیازؔ کی شعری حیثیت کو تسلیم نہ کیا جائے تو ان کی ادبی حیثیت پر ذرہ برابر فرق نہیں پڑتا اور اگر انھیں بڑا شاعر تسلیم کر بھی لیا جائے تو ان کی ادبی حیثیت میں کوئی خاطر خواہ اضافہ نہ ہوسکے گا اس لئے اگر ان کی زندگی کے تمام ادبی گوشوں کو نظرانداز کرکے صرف ان کی شعری صلاحیتوں کا جائزہ لیا جائے تو شاید ان کی شخصیت کے ساتھ انصاف ہوسکے گا اور میدانِ شعراء میں ان کی صحیح قدر و قیمت متعین کی جاسکے گی۔ ورنہ ادیب، صحافی، تنقید نگار، انشاپرداز اور افسانہ نگار نیازؔ شاعری میں وہ نیاز ہرگز نظر نہ آئے گا جس کی اس سے توقع ہے۔

معین الدین راہی ایم۔ اے
موضع: پچھیل پورہ۔ پوسٹ: کوپاگنج
ضلع۔ مئو ۲۷۵۳۰۵ (یوپی)

آزادیٔ فکر کا علمبردار نیاز فتحپوری

سو سال کے عرصے میں اردو ادب کو جو قدآور شخصیتیں ملیں ان میں نیاز کا نام ایک اہم مقام کا حامل ہے۔ انھوں نے تاریخ، تنقید، تشریح، ناول، جنسیات، افسانہ، خطوط غرض نہایت متنوع موضوعات پر قلم اٹھایا اور اپنے عہد کو اس طرح متاثر کیا کہ اس نسل نے شعور کی آنکھیں کھول لیں اور ان کی تحریروں کا سہارا لیکر بہت کچھ سیکھا اور حاصل کیا۔

نیاز ایک مخصوص طرز فکر کے مالک تھے۔ وہ کسی بھی بات کو بے چوں و چرا تسلیم کرنے کے بجائے انہیں میزان عقل پر تول کر دیکھتے۔ انھیں جدید علوم کی کسوٹی پر کس کر کھرے کھوٹے میں تمیز کرنے کے وہ عادی تھے۔ اپنے اسی زاویۂ نگاہ کی بدولت بعض حلقوں میں انھیں ہدف ملامت بننا پڑا۔

نیاز کی قلمی کاوشیں عالمی ادب میں بلند معیاری کا ثبوت اور اردو ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہیں۔ نیاز کی تصنیفات کو اگر شمار میں نہ بھی رکھا جائے تو انھوں نے اردو صحافت کی جو خدمت "نگار" کے صفحات کے وسیلے سے کی ہے، وہی ان کو دوام بخشنے کے لئے کافی ہے۔

نیاز کی اگر تمام تحریروں کا مطالعہ کیا جائے تو ان میں سب سے زیادہ چونکا دینے والی تحریر مذہبی مباحث سے متعلق ہوگی۔ دوسری تحریر کا قابل ذکر حصہ وہ ہے جس میں زبان و بیان کے مباحث اس طرح معرض وجود میں آئے ہیں کہ ان میں بھی وہی رنگ اور وہی انداز ہے جو ادبی اور لسانی شعور کو ایک طرح کی کشمکش سے دوچار کر دیتا ہے۔ ان کی مذہبی اور ادبی تحریروں میں اگر دیکھا جائے تو شعور کی آبیاری جگہ بہ جگہ ملیگی جو ادبی تحقیق کے فروغ میں زبردست معاون ہے۔

نیاز نے درس نظامی کے طالب علم رہکر مذہبی تعلیم بھی باضابطہ طور پر پائی تھی۔ مدرسہ کی فضاء اس کا نصاب تعلیم اور طریقۂ تعلیم کے اثرات کو انھوں نے اچھی طرح سے دیکھا اور سمجھا تھا۔

انھوں نے یہ بھی محسوس کیا تھا کہ ان مدارس کے ذہین طالب علموں پر کیا گزرتی ہے اور وہ کن کن ذہنی کیفیتوں سے دوچار ہوتے ہیں۔ ان کے دور تعلیم میں عربی کی تعلیم اس طرح دی جاتی تھی کہ ذہن کی بیشتر صلاحیت صرف و نحو کی غیر ضروری کتابوں کو پڑھنے اور رٹنے میں صرف ہو جایا کرتی تھی، اس کے بعد منطق کی بھول بھلیوں میں بہت کچھ پھرنا پڑتا تھا۔ نصاب میں شامل زیادہ تر کتابیں ایسی تھیں جو پرانے متنوں کی شرحیں تھیں۔ مختصر سا متن، اس کی طویل شرح۔ ہر شرح پر مفصل حاشیہ موجود، بعض شرحوں کے ساتھ کئی کئی حواشی طلبہ کے لئے ضروری تھے۔ اس طرح کی پر پیچ اور نڈھال کر دینے والی پڑھائی میں عربی میں چار جملے لکھنے کی بھی صلاحیت پیدا نہیں ہو پاتی تھی۔ دنیا میں کیا ہو رہا ہے، خیال اور فکر نے کتنے نئے سوالات پیدا کئے ہیں، علم کی وسعت اور ترقی نے کتنے نئے موضوعات کو نمایاں کیا ہے، ان مدرسوں کے طالب علم ان سب امور سے ناواقف رہتے تھے۔ گرد و پیش اور فکر و نظر کے نئے تقاضوں سے بے خبری گویا لازمۂ تعلیم بن کر رہ گئی تھی۔ بحثیں اس پر ہوا کرتی تھی کہ ضمیر کا مرجع کہاں ہے اور فلاں لفظ کی اصل کیا ہے اور اس جملے کی ترکیب نحوی کیسے ہوئی۔ یہ تمام باتیں نیاز صاحب کو بری طرح سے ستاتی رہی تھیں۔ ان کی تحریریں ہمیشہ اس بات کی نشاندہی ہوا کرتی تھی کہ علم کی اصل ماہیت اور اس کے حقائق پر نظر رکھ کر تعلیم حاصل کرنی چاہیے۔ یہ چیز لوگوں کو گراں گذرتی تھی اور ان کو برا بھلا کہنے میں کسی طرح کا تامل نہیں ہوتا تھا۔

یہاں پر علامہ شبلی کے دو اقتباسات پیش ہیں جن سے آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ نیاز کی باتوں میں کس قدر سچائی تھی۔

مولانا لکھتے ہیں:-

"ایک طرف تو ہمارے مولوی مسلمانوں کے کافر بنانے میں معروف ہیں اور اس کام میں وہ کوشش کرتے ہیں، جو صحابہ کافروں کے مسلمان بنانے میں کرتے تھے۔ دوسری طرف یورپ کی علمی فیاضیوں کا بادل، عالم پر آب حیات برسا رہا ہے، دنیا کی تمام قوموں کے مردہ علوم، فنون، تاریخ اور یادگاریں زمین کے طبقے الٹ الٹ کر نکالے جا رہے ہیں اور دنیا کی نمائش گاہ، ان گم شدہ جواہرات سے اس طرح سجا دی گئی ہے گویا پچھلا زمانہ اسی سرو سامانی سے دوبارہ سامنے آگیا ہے۔"

عربی کی قدیم کتابوں کو یورپ نے جس دلچسپی اور دیدہ ریزی کے ساتھ جدید اصول تدوین کے مطابق مرتب کر کے شائع کیا ہے، ایک مقالے میں اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"دنیا کو ہم سے اس کام کی توقع تھی۔ لیکن ابھی ہم کو اور ضروری کاموں سے فرصت کہاں ہے۔ حمد اللہ کے بعض ضروری مقامات ابتک حل ناشدہ ہیں۔ شرح ملا کی ایک ضمیر کا مرجع ابتک متعین نہیں ہوا۔ اور خیر، یہ سب کام تو اٹھا رکھے جا سکتے تھے۔ لیکن شیعوں کی تکفیر تو بہرحال مقدم ہے اور گو وہابیوں کا استیصال اس قدر ضروری نہ ہو۔ لیکن آخر اس کی اہمیت سے تو انکار نہیں ہو سکتا۔"

یہ عام صورت حال تھی عربی مدارس کی۔ ذہنوں پر پہرے بیٹھے ہوئے تھے اور فکر و نظر کی جولانیوں کے لئے اور نئے شعور کی کارفرمائیوں کے لئے گویا گنجائش ہی نہیں تھی۔ جس تنگ نظری اور کٹرپن کے خلاف نیاز نے اس وقت لکھا تھا۔ آج بھی وہ تنگ نظری اور کٹرپن پورے طور پر موجود ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اضافوں کے ساتھ موجود ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ فروعات کو اصل سے بڑھا دینا آج ہماری روش بن چکی ہے اور دنیا سے بے خبری طبقۂ علما میں عام ہے۔ جب تک یہ صورت حال برقرار رہے گی، نیاز کی تحریریں اپنی معنویت کو برقرار رکھیں گی۔

سچ پوچھئے تو نیاز کی تحریروں نے آزادیٔ فکر کو ایک اور پہلو دیا ہے، اور وہ پہلو خالص ادبی ہے۔ شخصیت پرستی ہماری معاشرت کا طرۂ امتیاز رہی ہے۔ اسی غیر علمی اور غیر حقیقت پسندانہ روش نے اردو میں ادبی تحقیق کو ایک زمانے تک فروغ سے محروم رکھا اور تنقید کو ایک مدت تک صاف گوئی کے زیادہ قریب نہیں آنے دیا۔ نیاز تنقید کے اس دبستان سے تعلق رکھتے تھے، جسے تاثراتی تنقید کا اسکول کہا جاتا ہے۔ ان کا خاص انداز نگارش بھی اس طرز انتقاد کے لئے موزوں قرار پایا۔ نیاز کی ایسی تنقیدی تحریریں شدید شخصی پسند و ناپسند سے اور مبالغہ پسندی کے عناصر سے معمور ہیں۔ اس لحاظ سے وہ مثالی نقاد بن کر منفرد نظر آتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ شخصیت کسی کی بھی ہو، کتنا ہی بڑا شاعر ہو اور کیسا ہی عالم فاضل ہو، اس کے کلام کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ کسی تکلف کے بغیر اور مکمل آزادی کے ساتھ اور پوری وضاحت کے ساتھ اپنی رائے ظاہر کرنی چاہئے۔ نیاز نے اس تسلسل کو قائم رکھا اور ایک دن ایسا بھی آیا کہ اس انداز نے ایک روش اور روایت کی حیثیت اختیار کر لی اور اسی روایت نے جرأتِ فکر اور آزادیٔ اظہار کے فروغ میں نمایاں حصہ لیا۔ ان کی مذہبی تحریروں اور شعری احتساب سے متعلق نگارشات نے بالواسطہ طور پر ادبی تحقیق کے فروغ میں مدد دی ہے اور یہ ان کی تحریروں کے اثرات کا وہ حصہ ہے جس کا ذکر ابتدائے مضمون میں کیا جا چکا ہے۔

ادبی تحقیق میں شک کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ جو شخص شک نہیں کر سکتا وہ تحقیق بھی نہیں کر سکتا۔ ادبی تحقیق میں صحیح طور پر نتائج اخذ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ مزاج کو سائنسی حقیقت پسندی سے علاقہ ہو، جذباتیت سے قطع تعلق پر قدرت حاصل ہو اور نتائج کو صحیح طور پر مرتب کرنے کی صلاحیت ہو۔ نیاز کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے صدی کی پانچ دہائیوں میں نوجوان ذہنوں کو اس شک کی ناگزیر ضرورت سے آگاہ کیا اور اس کا ذائقہ شناس بنایا اور یہ ادبی تحقیق کے لئے ذہنی فضا ہموار کرنے کا بنیادی عمل تھا۔ اس اعتبار سے اعتماد کے ساتھ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اردو میں ادبی تحقیق کے فروغ میں نیاز کا بہت بڑا حصہ رہا ہے۔ مختصر یہ کہ نیاز نے اپنی تحریروں کے ذریعہ اپنے انداز سے آزادی فکر و اظہار کی اس روایت کی توسیع کی جس کا سنگ بنیاد سرسید نے رکھا تھا۔ نیا تعلیم یافتہ طبقہ اور وہ معروف تعلیم نوجوان جو مذہبی تعلیم سے تعلق رکھتے ہوں، یا نئی تعلیم سے متعلق ہوں، ان کے ایک بڑے

حصے کو فکر و خیال کی آزادی کے نئے شعور سے آشنا کیا۔ ان کو جرأت اظہار سے روشناس کیا اور ذہنوں میں یہ خیال بٹھا دیا کہ جو کچھ کہا جا چکا ہے اس پر اکتفا کر لینے کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نئی دریافتوں سے اور پرانی حقیقتوں کے عرفان سے محروم رہ جائیں گے۔ ان کا کہنا ہے کہ اجتہاد کا دروازہ بند نہیں ہوا ہے۔ اور بند ہونا بھی نہیں چاہئے کیوں کہ دین اسلام کو دین فطرت کہتے ہیں اور یہ بھی ہمارا دعویٰ ہے کہ یہ زندگی کے جملہ مسائل و معاملات اور کائنات کے سارے مظاہر و محرکات پر حاوی ہے۔ اس دعوے کو ثابت کرنے کے لئے یہ لازم ہے کہ تحقیق اور تفحص کے دروازے کھلے رہیں۔

جن لوگوں نے نیاز پر سخت اعتراضات کئے ہیں، وہ کم مرتبہ کے لوگ نہیں تھے بلکہ متعدد حضرات تو علم و فضل کے لحاظ سے اعلیٰ درجہ کے مالک تھے۔ بات اگر صرف علم و فضل کی ہوتی تو نیاز ان لوگوں کے مقابلہ میں یقیناً کمتر تھے لیکن مسئلہ قدیم علوم سے واقفیت کا اس قدر نہیں تھا جس قدر نئے شعور کی آب یاری اور پرانی حقیقتوں کے نئے عرفان کا تھا اور یہ ان کے معترضین اور فاضل اکابر کی پیہم مخالفت کے باوجود نیاز کے اثرات اپنے دائرے کو وسیع کرتے رہے اور آج ہم ان اثرات کی کارفرمائی کو زیادہ اچھی طرح سے محسوس کر سکتے ہیں۔ ان حالات کے پیش نظر ہمیں شدت سے محسوس ہوتا ہے کہ کاش اس وقت ہمارے پاس کوئی ایسا شخص ہوتا جو اس روایت کی توسیع کر سکتا اور اسے ایک نئے انداز سے عام کر سکنے پر قدرت رکھتا جس کا آغاز سر سید سے ہوا تھا اور جس کو استحکام نیاز نے بخشا۔ یہ شدید احساس ہی نیاز کی شخصیت اور تاریخی اہمیت کو واضح کرنے کے لئے کافی ہے۔

نیاز صاحب کی شخصیت کا مجموعی مگر سرسری طور پر جائزہ لینے کے بعد ان کے خطوط کے آئینہ میں بھی ذرا تاک جھانک کر لینا ضروری سا معلوم ہوتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ خط کا حسن سادگی میں پوشیدہ ہے۔ اس میں رنگ و رعنائی خیالات کے بے تکلفانہ اظہار سے پیدا ہوتی ہے۔ خط اگر بے ربط ہے تو بھی سچے اظہار اور پر خلوص جذبے کے شامل ہونے سے شاہکار بن جاتا ہے۔ خط کے اندر بے تکلفی، بے ساختگی اور فطری رنگ ہو تو اس میں خود بخود انفرادیت جھلکنے لگتی ہے۔ خط کے اندر فلسفیانہ خیالات، حکیمانہ انداز اور عالمانہ طرز نگارش سبھی قسم کے مضامین سما سکتے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ یہ ساری باتیں نیاز کے اندر موجود ہیں۔

اردو میں دراصل غالب ہی سے فن خطوط نگاری کی شروعات ہوتی ہے۔ غالب کے بعد خطوط نگاری کا ایک رواج سا چل پڑا۔ حالی، شبلی، سر سید، اکبر، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی۔ مہدی افادی، قاضی عبدالغفار، مولانا عبدالماجد، مجنوں اور نیاز سے لیکر ایک سلسلہ ہے جو آج تک قائم ہے۔

خطوں کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ حسن تحریر کا آئینہ اور شخصیت کا عکس ہوتے ہیں۔ آیئے اسی آئینہ اور عکس میں ہم نیاز کو بہ حیثیت مکتوب نگار دیکھنے کی کوشش کریں۔

اس میں شک نہیں کہ نیاز نے خطوط کے سہارے اپنے دل کی ایک ایک بات سمجھا دی ہے۔ ان کی نگاہ ہر چہار طرف تھی۔ نگاہ کی گہرائی اور ذہانت نے ہر ہر گوشہ کی چھان بین کی اور، ہر مسئلہ پر بحث کی۔ ان کا موضوع ہمیشہ انسان اور انسانیت رہا ہے۔ ان کے خط میں دنیا کی اقتصادی اور سیاسی تحریکوں کا ذکر بھی ہے اور زندگی کا مقصد اور جینے کا سلیقہ بھی۔ نیاز کا مطالعہ بڑا وسیع ہے۔ وہ شعر و ادب کے مختلف پہلوؤں کو پہچاننے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ ان کے خطوط پڑھنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا ذہن آرٹ کو اس وقت تک آرٹ ماننے کو تیار نہیں جب تک کہ وہ اسلوب ادا اور طرز ادا کی ندرت اور انفرادیت کا حامل نہ ہو۔ نیاز کے یہاں محبت کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ وہ محبت کو لطف و کرم کا مرقع سمجھتے ہیں۔ ان کا ایک خط ملاحظہ ہو۔

> "مولانا! میں جو کائنات میں صرف محبت کا قائل ہوں اور محبت کے صرف اس حصہ پر
> ایمان رکھتا ہوں جو کسی نہ کسی نہج سے درس محبت دینے والا ہے، خدا کے جبار و قہار
> ہونے کا ابھی تک کوئی مفہوم میرے ذہن میں متعین نہیں ہوا، صرف اس کی شان کرم
> پر جیتا ہوں۔"

نیاز کا ذہن محبت کو بلند کرداری سے ہم آہنگ کرنا چاہتا ہے۔ وہ عشق کو اصل حیات تصور کرتے ہیں۔ ان کا ذہن رنگینی اور رعنائی، پاکیزگی اور

تقویٰ ان تمام اچھائیوں کے حصول کا متمنی ہے۔ وہ صنم کدے کے ان بتوں کو توڑ دینا چاہتے ہیں جو آپس میں بیر رکھنا سکھاتے ہیں۔ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"آپ بھی کیا داستان لے کر بیٹھ گئے۔ اے حضرت، آج کل کافر و مسلمان دونوں کا ایک حال ہے۔ نہ اس کو شیوۂ کافری کا پاس نہ اس کو آئین مسلمانی کا لحاظ......
دنیا بدل گئی، اس کا تمدن بدل گیا، عورت مرد ہو گئی اور مرد عورت بن گیا اور آپ کو ہنوز اصرار ہے کہ ریش دراز بھی او رمنت کش شانہ بھی........اب مذہب نام ہے صرف سیاست کا اور سیاست کی غایت ہے صرف صنعت و تجارت کی ترقی۔
اس لئے اگر آپ کو واقعی مذہبی نزاع سے دلچسپی ہے تو اس طرف آیئے کہ تاریخ مذہب کے باقیات میں اب یہی ایک چیز دنیا کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہے۔ اب زمانہ حی علی الصلوٰۃ کی پکار کا نہیں بلکہ حی علی العمل کا ہے۔"

نیازؔ کے خطوط دراصل مذہبی پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں۔ وہ مذہبی تعلیم کی ناکامیابی کا ذمہ دار نام نہاد مولویوں کو قرار دیتے ہیں۔ ایک خط میں فرماتے ہیں:۔

"حضرت سلامت، آپ نے بھی کس طبقہ کا ذکر کیا۔ آپ اتنا وقت کسی اور گناہ میں صرف کرتے تو بہتر تھا۔ یہ محراب و منبر سے حلقۂ دام تیار کرنے والے یہ باوجود کوتہ آستینی کے انتہائی درازدستی سے کبھی نہ چوکنے والے اور یہ سب کچھ کر گذرنے والے جو دوسروں کے لئے ممنوع ہے ہماری قوم کے وہ افراد ہیں جنھیں پاؤں کا چھالا کہنا چاہئے کہ جب تک آپ انہیں پھوڑ نہ ڈالیں راستہ چلنا ممکن نہیں۔ انھوں نے سلطنتوں کو کھالیا، قوموں کو ہضم کر لیا، مذہب کیا چیز ہے وہ ملک و ملت کے لئے بیماری ہے اور بیماری بھی دق کی جس سے چھٹکارا ممکن نہیں.........آپ خدا کے لئے سب کچھ کہئے لیکن اس گروہ کی باتیں مجھ سے نہ کہئے۔ اگر آپ کہیں گے کہ آفتاب مغرب سے نکلتا ہے تو مان لوں گا لیکن یہ کبھی نہیں مان سکتا کہ اس طبقہ میں کوئی فرد صالح پیدا ہو سکتا ہے۔"

نیازؔ الفاظ سے مجسمہ سازی کا فن خوب جانتے ہیں۔ ان کے لفظی مرقعے شوخی اور شگفتگی کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ نیازؔ کے خطوط یقینی طور پر انشا پردازی کے بہترین نمونوں میں شمار کئے جا سکتے ہیں۔ ان کے خطوط ادب کی ایک نادر مثال ہیں۔
اس لئے بڑی صفائی سے کہا جا سکتا ہے کہ نیازؔ چاہے مضمون لکھ رہے ہوں یا خط، تاریخ لکھ رہے ہوں یا ناول، تنقید کر رہے ہوں یا تشریح، جنسیات پر لکھ رہے ہوں یا افسانہ وہ اپنے نظریات کی حمایت میں اور اپنی بات کو منوانے کے لئے اپنے قلم کی پوری قوت صرف کرتے ہیں۔ یہی چیز نیازؔ کو ادبی دنیا میں اعلیٰ مقام پر پہنچا کر اپنی شخصیت میں منفرد بنا دیتی ہے۔



نگار۔ ایک تبصرہ

عبدالقوی ضیاء (علیگ)

میرا مولد و مسکن لکھنؤ ہے جہاں نیاز فتحپوری صاحب آکر رہائش پذیر بھی ہوئے اور "نگار" کا اجراء بھی کیا۔

جس وقت نگار کی شہرت ایک مقتدر اور معتبر جریدے کی حیثیت سے نصف النہار پر تھی میں جوبلی کالج کا طالب علم تھا۔ نگار کی باقاعدہ خریداری ممکن نہ تھی مگر میرے والد میرے ادبی ذوق کو دیکھتے ہوئے اسے بازار سے خرید لاتے تھے۔ جب کبھی لانا بھول جاتے تھے تو میں کالج کی لائبریری میں اس کا مطالعہ بصد ذوق و شوق کیا کرتا۔ نگار کی جو ادا مجھے بے حد پسند تھی وہ یہ کہ اس میں کلام چھپتا تھا نام نہیں۔ اس کی پالیسی میں نہ تو خویش پروری شامل تھی نہ احباب نوازی۔ سچ کا راستہ ہمیشہ دشوار گذار ہوتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کی منزل بڑی اطمینان بخش ہوتی ہے۔ نگار جب تک لکھنؤ سے نکلتا رہا اسی روش پر قائم رہا اور آج بھی ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی ادارت میں اسی حقیقت پسندانہ رویّہ پر قائم ہے۔

یہ اِس صدی کی تیسری دہائی کے اواخر اور چوتھی دہائی کی بات ہے جب لکھنؤ بڑے منفرد، ممتاز اور باکمال شعراء کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ ان میں سے بیشتر خود نمائی اور خود ستائی کے شکار تھے اور خود آرائی وہاں کی ایک مستقل روش تھی۔ ایک طرف احقر موہانی کا طوطی بول رہا تھا جن کے شاگردوں کی تعداد بے شمار تھی جو اپنے استاد کے شعروں کی داد جب مشاعروں میں سخن سرا ہوتے تھے اس طرح دیتے تھے کہ چھتیں اُڑ جاتیں۔ دوسری طرف صفی، عزیز، ثاقب، آرزو (یہ کچھ عرصہ کے لئے کلکتہ چلے گئے تھے جہاں فلم انڈسٹری سے وابستہ تھے)۔ سراج۔ قدیر اور دوسرے کئی شعراء کے اشعار کی خوشبو سے پورا گلستانِ ادب مہک رہا تھا۔ ان کے علاوہ مشاعروں میں جوش و جگر کی بڑی دھاک جمی ہوئی تھی۔ ان کے بغیر کوئی مشاعرہ باوقار اور کامیاب سمجھا ہی نہیں جاتا تھا۔ عموماً شعراء گروہ بندی اور مصلحت اندیشی کے شکار تھے۔ جو شاعر کسی حلقے سے وابستہ نہیں تھے وہ یونہی ہوا میں معلّق تھے۔ نگار میں ان میں سے بیشتر کا کلام چھپتا تھا مگر کسی خاص اہتمام یا التزام کے ساتھ نہیں کہ یہ جریدہ تمام مصلحت انگیزیوں سے بلند و بالا ہو کر حق گوئی اور حق بینی کی طرف مائل تھا۔ دلیری، بے باکی، بے خوفی سے بات کہنا اس کا علامتی نشان بن گیا تھا۔ اس کا ثبوت یہ تھا کہ نگار نے فراق گورکھپوری اور منظور حسین شور کو اس وقت چھاپا جب وہ بالکل ہی معروف نہ تھے اور ان کے کلام کی گھن گرج کہیں سُنائی نہیں دیتی تھی۔ مگر نیاز صاحب کو ان میں ایک اُبھرتا ہوا عظیم شاعر نظر آیا۔ اسی لئے ان کے اور ان کے جیسے بہت سے لکھنے والوں کو نگار میں خصوصی جگہ دی۔ ایسے بہت سے شعراء تھے جو لکھنؤ یا اس کے مضافات میں رہتے تھے مگر حلقہ بندی کے قائل نہ ہونے کی وجہ سے ان کو وہ شہرت یا عظمت حاصل نہ تھی جو صفی، عزیز یا ثاقب کے لئے مقسوم تھی ان میں مولینا ناطق گلاوٹھی، امید امیٹھوی، مانی جائسی وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ میں نے جب اُمید صاحب کا کلام 'نگار' میں پڑھا تو مجھے تعجب ہوا کہ وہ نہ تو مشاعروں میں عموماً مدعو ہوتے تھے اور نہ ہی اُن کا کلام دوسرے جرائد مثلاً ساقی، نیا دور، ادب لطیف وغیرہ میں شائع ہوتا تھا مگر ان کے اشعار میں جو پختگی، شائستگی اور شستگی نظر

آتی تھی وہ صرف ایک مسلم الثبوت استاد ہی کے کلام میں مل سکتی تھی۔ وہ سکہ بند اور گروہ بند شاعروں کے ہجوم سے الگ تھلگ خود اپنی ایک انفرادی اور امتیازی حیثیت رکھتے تھے جس سے صرف نیازؔ صاحب اور قارئین نگار ہی واقف تھے۔ میں طالب علم ہونے کے باوجود اُمیدؔ صاحب کی فکری سطح اور بلندیٔ تخیل سے اس قدر متاثر ہوا کہ ان سے ملنے کی خواہش میرے دل میں جاگزیں ہونے لگی۔ قدرت نے ایک موقع بہم کردیا۔ اُمیدؔ امیٹھوی کی ایک بھانجی میرے محلّہ میں ایک دوری عزیز سے بیاہی تھیں جن سے ملنے وہ کبھی کبھار آتے رہتے تھے۔ مچھلی محلّہ جہاں ان کا قیام، تھا وہاں سے میرے محلہ کا فاصلہ ۷ - ۸ میل ہوگا مگر وہ ہمیشہ پیدل چل کر تشریف لاتے تھے کہ تنگ دستی کی بنا پر سواری کا کرایہ برداشت نہیں کرسکتے تھے۔ حالانکہ اس وقت پورا تانگہ یا یکّہ کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ ہر سواری اپنا کرایہ علاحدہ علاحدہ دے سکتی تھی مگر امید صاحب کی دسترس سے یہ بھی باہر تھا۔ میں نے اپنے عزیز سے کہا کہ آئندہ جب کبھی اُمیدؔ صاحب آپ کے یہاں تشریف لائیں مجھے بھی اطلاع دے دیجئے گا کہ میں ان سے ملنے کا مشتاق ہوں۔ ان کی آئندہ آمد پر وہ صاحب اپنے مہمان کو لئے ہوئے میرے ہی گھر تشریف لے آئے۔ مجھے بڑی شرمندگی ہوئی ساتھ ہی خوشی بھی۔ وہ بڑی دیر تک باتیں کرتے رہے اور میں دل ہی دل میں ان کی تخلیقی صلاحیتوں، فکری شعور و ادراک کا اعتراف کرتا رہا۔

اُمیدؔ صاحب کا کلام دور از کار تمثیلوں، کرم خوردہ استعاروں اور گھسی پٹی ہوئی تشبیہوں سے پاک تھا۔ بے معنی علامات اور بے کیف موضوعات ان کے یہاں نظر نہیں آتے تھے۔ وہ نہ مرقع نگاری کے قائل تھے نہ مرصع کاری کے۔ یہ اوصاف لکھنوی شعراء کے کلام میں بدرجۂ اتم پائے جاتے تھے۔ ان کو بڑا تعجب ہوا جب میں نے ان کے اشعار جو نگار میں پڑھے تھے ان کی طرف اشارہ بھی کیا اور صحیح داد دی۔ ان میں جو رموز و نکات پنہاں تھے ان کے بارے میں گفتگو بھی کی۔ پھر یہ ان کا معمول بن گیا تھا کہ وہ جب کبھی بھی اپنی عزیزہ سے ملنے آتے مجھ سے ملے بغیر نہیں جاتے تھے۔ میں نے کئی بار ان کی سواری کا انتظام کرنا چاہا مگر ان کی غیرت اس کو قبول کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہوئی۔ کبھی کبھی وہ مجھ سے دریافت فرماتے تھے کہ کیا میں بھی کچھ کہتا ہوں۔ اگر ایسا ہے تو بلا تکلف سناؤں۔ میں بڑی جھجک کے ساتھ جو کچھ کہا ہوتا ان کے گوش گزار کردیتا۔ سن کر خوش ہوتے داد دیتے۔ جہاں کہیں اصلاح کی گنجائش ہوتی اور شعری در و بست میں کمی نظر آتی اسے درست کر دیتے۔ ہر بار مجھے وہ یہ ہدایت ضرور کرتے کہ کچھ کہوں۔ سنجیدگی اور خلوص نیتی سے اور شاعری کو تفریح کا ذریعہ نہ سمجھوں۔

اُمیدؔ صاحب سے ملاقات کا یہ سلسلہ اس وقت تک چلتا رہا جب تک علی گڑھ نہیں چلا آیا۔ مجھے ان کے انتقال کی خبر ملی۔ ان کی تجہیز و تکفین میں بھی شریک نہ ہو سکا۔ مجھے یہ بھی علم نہیں کہ ان کا مجموعۂ کلام ابھی تک شائع ہوا بھی کہ نہیں۔ گمان غالب ہے کہ ایسا ممکن نہ ہو پایا ہوگا کہ ان کے مالی حالات اس کے مقتضی نہ تھے اور ان کے اعزا میں اس کا کوئی سلیقہ نہیں تھا۔ مگر جو بات مجھے کبھی نہ بھولے گی وہ یہ کہ ان کا کلام 'نگار' میں ہمیشہ مقتدر اور موقر جگہ پاتا رہا بہ ایں سبب کہ نیازؔ صاحب ادیب نواز بھی تھے اور ادب شناس بھی۔ وہ سب سے بڑے مخلصانہ اور محبتانہ انداز میں ملتے تھے۔ قطع نظر اس کے کہ اس شخص کا سماجی مقام کیا ہے۔ وہ صاحب اختیار ہے یا مجبور و لاچار۔ وہ اپنے ملاقاتی سے انسانیت کا درد اور انسانی وقار کو سامنے رکھ کر ملتے تھے۔ صرف ایک جذبہ تھا جس سے وہ تادم آخر متاثر اور جس کے مقلد رہے وہ تھا HUMANITARIANISM (انسانیت پرستی)۔ ان کو نہ دولت کی حرص و ہوس تھی اور نہ ہی بااختیار لوگوں کے سامنے جبیں سائی کی خواہش۔ ان کی شخصیت کے اس رُخ کے بارے میں بہت کم لکھا گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ کوئی نہ کوئی کسی نہ کسی دن ان کی علم دوستی کے ماسوا ان کی انسان پرستی کے بارے میں بھی ضرور قلم اُٹھائے گا۔

اُنہیں دنوں کی بات ہے کہ یگانہؔ چنگیزی بھی لکھنؤ میں آکر اقامت گزیں ہو گئے تھے۔ ان کا انداز سخن مروجہ لکھنوی مدرسہ فکر سے ذرا مختلف تھا اور خود اپنی ایک سج دھج رکھتا تھا۔ وہاں کے شعراء کو یگانہؔ کی موجودگی لکھنؤ میں بری طرح کھٹکتی تھی مگر نگار میں ان کا کلام بھی مستقل چھپتا تھا اور قارئین نگار کی توجہ کا مرکز بنتا جاتا تھا۔ استادانِ فن کو بڑی تشویش ہوئی کہ یہ ایک باہر والا ان کے شہر میں آکر انہیں پر طعنہ زنی کر رہا ہے اور ان سے سبقت اور ان پر فوقیت لے جانے کی فکر میں ہے۔ نتیجتاً انھوں نے طرح طرح کی خامیاں یگانہؔ کے کلام میں نکالنا شروع کیں جس کا جواب یگانہ بڑی دنداں شکنی سے دیتے تھے۔ کبھی کبھی بحث کا سلسلہ طول کھینچ جاتا تھا اور دل شکنی کا موجب بن جاتا۔ نگار میں یہ روئیداد

اختصار کے ساتھ بغیر کسی حاشیہ آرائی غیر جانبدارانہ انداز میں چھپتی رہی۔ اساتذۂ کرام کو یہ بات بہت کھلتی کہ نیاز صاحب یگانہ کی مذمت کیوں نہیں کرتے۔ مگر نیاز صاحب کسی کی خوشنودی کی خاطر اپنی پالیسی میں تبدیلی کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔

شروع شروع میں یگانہ غالب کے طرفدار اور پیروکار تھے۔ ان کی زمینوں میں شعر کہتے تھے۔ ان کی برتری کا اعتراف کرتے۔ پھر نہ جانے ان کو کیا سوجھی کہ وہ غالب پرست سے غالب شکن بن گئے اور اپنے آپ کو غالب سے بہتر سمجھنے لگے۔ آگے چل کر ان کی یہ انا پرستی ان کے لئے مہلک ثابت ہوئی مگر قطع نظر اس کے اہل لکھنؤ نے برملا یہ کہنا شروع کر دیا کہ نیاز صاحب اپنے پرچہ کی توسیع و اشاعت کے لئے غالب کی پگڑی بھی اچھلوانے سے باز نہیں آرہے ہیں اور دیدہ و دانستہ ہمارا مذاق بھی اڑوا رہے ہیں۔ نیاز صاحب ان تمام اعتراضات سے بالاتر ہو کر ایجاز و اختصار کے ساتھ دونوں کی آراء شائع کر دیتے تھے۔ وہ دل سے یگانہ کے مداح اور ان کی شاعری کے قدرشناس تھے۔ ان کی فکرانگیزی اور تخیل افروزی سے متاثر بھی۔ آج ہمارے ادب میں جو فضیلت اور اہمیت یگانہ کو حاصل ہے وہ مشکل ہی سے کسی لکھنوی استاد کو میسر آسکی۔ اس بات کو نیاز صاحب کی دُوربین اور دُوررس نگاہوں نے بہت پہلے بھانپ لیا تھا۔

یہ بات بھی یہاں قابل غور ہے کہ 'انتقادیات' میں نیاز صاحب نے جوش و جگر جو اس وقت شہرت کی بلندیوں پر تھے ان کے فن کا جائزہ بھی انھوں نے تمام تعلق خاطر اور دوستی کو بالائے طاق رکھ کر انتہائی منصفانہ اور غیر جانبدارانہ انداز میں لیا ہے۔ ان دونوں کی شہرت یا مقبولیت سے مرعوب ہو کر نہیں اس لئے کہ نیاز صاحب کی تنقیدی بصیرت بلاشبہ بے بصارت نہیں تھی۔ صحت مند تنقیدی نظریات سے بے نیاز ہو کر وہ کسی کی طرفداری پر آمادہ ہو جائیں یہ ان کے مزاج کے خلاف تھا۔ اپنے نظریات، رجحانات اور معتقدات کو وہ ذاتیات سے بلند ہو کر متوازن اور متناسب لہجہ میں پیش کرنے کے قائل تھے۔ ان کو قطعاً یہ گوارا نہیں تھا کہ وہ کسی معروف یا صاحب اقتدار شاعر یا ادیب کی بلاوجہ تعریف و توصیف کر کے نگار کی عظمت کو دھکا پہنچائیں۔ ان کی نظر ہمیشہ ہنر اور ہنرمندوں پر رہتی تھی۔ عہدوں اور دولتمندوں پر نہیں۔ ان کی تنقید میں جو صدق و صفا، خلوص اور بے ریائی کے اثرات نمایاں ہیں۔ اس کا اصل سبب یہی ہے کہ وہ افہام و تفہیم، مطالب و معانی کے رموز و نکات سے پوری طرح آشنا تھے۔ جو کچھ بھی لکھتے تھے پورے اعتماد کے ساتھ۔

نیاز صاحب کے اداریئے، تبصرے، افسانے، خطوط اور تنقیدی مضامین جو شاملِ نگار ہوئے وہ سب کے سب ان کی جرأت مندی اور دیانتداری سے سرشار ہیں۔ وہ کبھی زہر ہلاہل کو قند کہنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ ان کے احساسات، مشاہدات، تفکرات اور تجربات پوری طرح ان کی نگارشات میں منعکس ہوئے۔ خارجی اثرات یا دباؤ نہیں۔ ان کے خطوط جو نگار میں ہر ماہ چھپتے تھے وہ ایک عجیب و غریب کیفیت اور لذت کے حامل ہوتے تھے۔ ان کا انداز دوستانہ بے تکلفانہ اور مروتانہ ہوتا تھا۔ ان کے خطوط کا مزاج بڑی نرمی اور شگفتگی لئے ہوتا تھا۔ وہ مکتوب الیہ کو ہمیشہ "حضت" کہہ کر تخاطب کرتے تھے جو "حضرت" کا مخفف تھا اور بڑی ہی محبتانہ اور مخلصانہ فضا پیدا کر دیتا تھا۔ وہ اپنے مخاطب سے مستقل باتیں کرتے چلے جاتے تھے۔ جیسے وہ سامنے بیٹھا ہوا اور وہ اس سے ہمہ تن مصروفِ گفتگو ہوں۔ غالب کے بعد خطوط میں موسیقیت اور شیرینیت اور اس کے ساتھ اپنائیت میں نے نیاز صاحب کے یہاں ہی پائی۔ بہت لوگوں نے چاہا کہ وہ اس سلسلہ میں نیاز صاحب کی پیروی کریں مگر کسی کو " نہ ہوا پر نہ ہوا ... ان کا سا انداز نصیب "۔ یہ انھیں کا اعجاز ہے کہ انھوں نے اتنے بہت سے خطوط نذر نگار کر کے "خط نگاری" کو ہمارے اصناف ادب میں ایک ممتاز مقام عطا کر دیا جو صداقت، شرافت، متانت، چاہت ان کی فطرت کا خاصا تھی وہی ان کی 'خط نگاری' کا بنیادی وصف بنی۔

۵۸ - ۱۹۵۷ میں میری پہلی تصنیف "تاریخ اندلس" اشاعت پذیر ہوئی جو کئی سال کی مشقت، محنت، تحقیق و تدقیق کا نتیجہ تھی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اس کی ایک جلد نیاز صاحب کی خدمت میں لکھنؤ روانہ کر دی اس گزارش کے ساتھ کہ اگر مناسب سمجھیں تو چند حروف لکھ کر زینت نگار کر دیں۔ اس وقت مجھے یہ بھی یقین نہیں تھا کہ نیاز صاحب اپنی عدیم الفرصتی کی بنا پر اتنا وقت بھی نکال سکیں گے کہ وہ ایک ہزار صفحات پر پھیلی ہوئی ضخیم کتاب کو پڑھنا گوارا فرما کر اس کے بارے میں کچھ لکھنا پسند کریں گے۔ جب مجھے کچھ عرصہ تک اس کی رسید بھی نہیں ملی تو مایوس ہو کر خاموش ہو گیا۔ البتہ

اپنے والد صاحب کو لکھا کہ وہ نگار کو ہر ماہ ضرور کھنگالتے رہا کریں مبادا اس میں میری کتاب پر تبصرہ شامل ہو۔ پھر ایک دن مجھے اپنے والد صاحب کا خط ملا جو میرے لئے انتہائی مسرت کا موجب ہوا کہ اس میں تبصرے کی نقل شامل تھی۔ نیاز صاحب نے بڑی دلجوئی اور دلچسپی کے ساتھ "تاریخ اندلس" اول تا آخر پڑھی بھی اور اس پر اپنی مستند رائے کا اظہار بھی کیا۔

۱۹۶۰ میں میں امریکہ فل برائٹ اسکالرشپ پر چلا آیا اس وقت تک ساتھ صرف ۴۴ پونڈ سامان لے جایا سکتا تھا۔ اس لئے بجز ملبوسات اور کچھ ضروری چیزوں کے کچھ ساتھ نہ لا سکا۔ سارے سامان کے ساتھ تبصرہ بھی گھر چھوڑ آیا۔ لیکن دل کو بڑی خلش تھی کہ کسی طرح اس کی نقل حاصل کی جائے اور اسے "تاریخ اندلس" کے نئے ایڈیشن میں شامل کر دیا جائے۔ میں نے جب اپنی تازہ کاوش "وژن اینڈ اِن وِژن" ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی خدمت میں روانہ کی تو ان سے یہ بھی درخواست کی کہ اگر نگار کا وہ شمارہ ان کے پاس موجود ہو تو اس کی ایک نقل مرحمت فرما دیں۔ فرمان صاحب نے میری مشکل حل کر دی اور "وژن اینڈ اِن وِژن" پر اپنی رائے کے ساتھ تبصرے کی فوٹو اسٹیٹ کاپی بھی بھجوا دی جو اب نذر "انشاء" نیاز فتحپوری نمبر ہے اور اس مختصر سی تحریر کا محرک ہے۔

جہاں تک میرا تجربہ ہے نیاز صاحب نہ کسی کا دل دکھانے کے قائل تھے نہ مضحکہ اڑانے کے۔ وہ بات ہمیشہ کھرے انداز میں کہتے تھے کھردرے طریقہ پر نہیں۔ جب تک جئے نہ کسی کی مداحی کی نہ قصیدہ سرائی اور نہ ہی ہجوگوئی۔ ان کی باتوں میں تدبّر اور تفکر ہوتا تھا۔ ہمارے ادب میں بہت کم نقّاد ہیں جو ان کی سی اہلیت، ذہانت، فطانت، دانش و بینش رکھتے ہوں۔ ان کے طرز نگارش میں جو جدیدیت، عصری حسیت، ادبیت اور علمیت جھلکی پڑتی تھی وہ نگار کا بھی اہم ترین حصّہ تھی۔ جس کی بنا پر نگار کو ہمارے ادب میں جو امتیازی اور انفرادی حیثیت کل حاصل تھی وہ آج بھی ہے۔

ذیل میں مصنف کی کتاب "تاریخ اندلس" پر نیاز صاحب کا تبصرہ مطابق اصل منقول ہے ——— مدیر انشاء :

تاریخ اندلس

تصنیف ہے جناب پروفیسر عبدالقوی ضیاؔ ام۔ اے کی جسے ایجوکیشنل بک ڈپو اسکول روڈ حیدرآباد (پاکستان) نے شائع کیا ہے۔ تاریخ اسلام میں اندلس کا دورِ بنی امیہ جو ۵۰۰ سال تک عظمتِ اسلام کی داستان بنا رہا خاص اہمیت رکھتا ہے، کیونکہ مسلمانوں کی بہت سی علمی ترقیوں کی جھلک ہمیں اسی دور میں نظر آتی ہے۔

فاضل مصنف نے اس کی ترتیب و تسوید میں جس بسط و وضاحت سے کام لیا ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ کتاب کا حجم تقریباً ایک ہزار صفحات تک پہونچ گیا اور اسے ۶۰ ابواب میں تقسیم کرنا پڑا۔ اندلس کی تاریخ مغربی مصنفین کے ہاتھوں بہت مسخ ہو گئی تھی اور ضرورت تھی کہ ان تاریخی اغلاط کو جو انگریزی متعصب مؤرخین کی کتابوں میں پائے جاتے ہیں دور کیا جاتا۔

فاضل مصنف نے چونکہ اس کی تصنیف میں زیادہ تر تاریخ کی اصلی کتابوں سے کام لیا ہے اور یوروپی مؤرخین پر اعتماد نہیں کیا، اس لئے یہ تصنیف اپنی جگہ خاص اہمیت رکھتی ہے اور صحیح واقعات و حالات جاننے کا بہترین ذریعہ ہے۔ اس موضوع پر اس سے پہلے بعض کتابیں اردو میں لکھی جا چکی ہیں لیکن وہ زیادہ تر انگریزی کتابوں کا ترجمہ یا ان کا اقتباس تھیں اس لئے پروفیسر ضیاؔ کی یہ کتاب اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل پہلی چیز ہے اور تاریخی لٹریچر میں بڑا مفید اضافہ۔

کتاب کی زبان بھی بہت صاف و سلیس ہے جو تاریخی کتابوں کے لئے ضروری ہے اور تقسیم ابواب میں صحیح تاریخی تسلسل کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔

اس کتاب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے فتوحانہ اقدامات کے ساتھ ساتھ تہذیب و شائستگی، علوم و فنون کی ایجادات، اصلاحات اور اخلاق و کردار کی تعمیر میں بھی کتنا نمایاں حصّہ لیا۔ یعنی ان کی فتوحات ملک گیری سے زیادہ تعمیر انسانیت و آدمیت کے قریب تھیں اور انھوں نے اپنی وسیع رواداری سے اسلامی تعلیمات کی کتنی صحیح نمایندگی کی۔

اس کتاب میں متعدد نقشے اور تصاویر بھی ہیں جن سے کتاب کی دلچسپی اور افادیت میں اور اس کی قدر و قیمت میں اضافہ ہو گیا ہے۔ فاضل مصنف نے اس کتاب کی تصنیف میں جس محنت و کاوش اور عزم و استقلال سے کام لیا ہے اس پر انھیں سراہا جانا چاہئے۔

کتاب مجلد نفیس کاغذ پر شایع کی گئی ہے اور پندرہ روپیہ میں ناشر سے مل سکتی ہے۔

("نگار" مارچ ۱۹۵۸ء)

انوار احمد
زکریا یونیورسٹی ملتان

نیاز اور باب الاستفسار

آج، جبکہ ہمارے ذرائع ابلاغ یہ خبرِ عام کر چکے ہیں کہ ہم بحمداللہ تاریخ، سیاست، فلسفہ، سائنس اور اخلاق کی ہر گتھی سلجھا چکے ہیں اور درباری طوطے یہ کہانیاں سُنا رہے ہیں کہ سوال کرنا مومن اور محبِ وطن کی شان کے منافی ہے تو ظاہر ہے اس بات پر تعجب ہی ہوگا کہ ہم میں ایک شخص ایسا بھی تھا جس نے چوالیس برس تک فلسفہ، شعر و ادب، سائنس، تاریخ، جغرافیہ، سیاست، سوانح علومِ اجتماعیہ، ریاضی، ہیئت، لغت اور فنونِ جمیلہ سے متعلق چھ سو سے زائد سوالات کے جواب دیئے، سوال گماں سے پھوٹتا ہے، مگر یقین اسے پروان چڑھاتا ہے، جواب دینے والے پر اعتمادِ ذوقِ کنہ اور بڑھاتا ہے اور یوں معرفت کی وہ شمع روشن ہوتی ہے، جس میں

سوال آہستہ آہستہ، جواب آہستہ آہستہ

نیاز اپنی داستانِ حیات میں اپنے دو استادوں مولوی نور محمد اور مولانا محمد حسین خاں کوٹی کا ذکر کرتے ہیں، جو نیاز کے سوالات سُننے میں قہرِ خداوندی ثابت ہوتے [1] مگر یہ علم و فن کی خوش قسمتی ہے کہ انہیں مولانا وزیر محمد خاں ایسے استاد بھی ملے، جو اُن کی کج بحثی کا سامنا بھی خندہ پیشانی سے کرتے، میرے خیال میں یہ مولانا وزیر محمد خان کی محبت کا قرض تھا جسے نیاز نے چوالیس برسوں میں چکانے کی کوشش کی۔ ویسے بھی نگار محبت کی نشانی ہے۔ نیاز نے علم کا یہ الاؤ ترک شاعرہ نگار بنت عثمان کی الفت میں روشن کیا [2] نگار کے چھ شماروں کے بعد ہی یعنی اگست ۱۹۲۲ء سے استفسارات کا سلسلہ شروع ہوا (ص ۷۲ تا ۷۵) جو مئی ۱۹۲۸ء سے باب استفسارات کے عنوان میں بدل گیا (ص ۸۲ تا ۸۴) اور عجیب اتفاق ہے کہ اپنی زندگی کے آخری دو جواب بھی انھوں نے ۱۹۶۶ء کے مئی کے شمارے میں دیئے (ص ۷۵ تا ۷۹) اور یہ بھی انتہائی معنی خیز ہے کہ ان دونوں سوالوں کا نیاز کے دائرۂ فکر سے براہِ راست تعلق تھا، وہ خود کہتے ہیں: "میرے ذہنی انقلاب اور ادبی رجحانات کا تعلق زیادہ تر مولوی اور عورت ہی سے ہے [3]" اس لئے وہ دونوں سے بے تعلق نہیں رہ سکتے، چنانچہ ان سے جو آخری دو سوال ہوئے تو ایک قرآن مجید میں مذکور نماز کے اوقات سے متعلق تھا تو دوسرا عشوہ و غمزہ و اَدا کے نازک امتیاز کے بارے میں۔ نیاز پہلے سوال کے جواب میں قابلِ فہم جھلاہٹ کا مظاہرہ کرتے ہیں، "میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ آپ کو اِس تحقیق کی ضرورت ہی کیا ہے، اگر آپ نماز کو اچھا سمجھتے ہیں، جیسا کہ آپ نے ظاہر کیا ہے پڑھیے، پانچ وقت نہ سہی، ایک ہی وقت سہی، پڑھیے تو۔ (ص ۷۶)" [4]

جبکہ دوسرے سوال یعنی عشوہ و غمزہ و ادا کے نازک امتیاز کا جواب وہ بڑی دلجمعی سے دیتے ہیں۔

نیاز عموماً سوالوں کا جواب عالمانہ وقار اور تحمّل سے دیتے ہیں، لیکن بعض سوالات کی نوعیت اور نیّت ہی ایسی ہوتی ہے کہ جواب

---

[1] نگار، جولائی ۱۹۶۶ء ص ۳۰ تا ۳۳ [2] نگار، جولائی ۱۹۶۶ء ص ۳۹ [3] نگار، جولائی ۱۹۶۶ء ص ۳۷

[4] سید عبدالکریم (مرزاپور) کا یہی سوال اور نیاز کا بعینہٖ یہی جواب مارچ ۱۹۶۰ء کے نگار (صفحات ۳۹، ۴۰) میں موجود ہے، قیاس ہے کہ مئی ۶۶ کے شمارے میں اِسے دوبارہ شائع کیا گیا۔ (انوار)

دینے والے کا اضطراب اور ارتعاش لطف دیتا ہے مثلاً جولائی ۱۹۲۶ء کے نگار میں حکیم عبدالحفیظ کے اس استفسار پر کہ کیا بعض حاجی صاحبان کی یہ روایت درست ہے کہ خانۂ کعبہ کو آنکھ بھر کے دیکھنے سے بینائی جاتی رہتی ہے! نیاز کے ہونٹوں پر ایک قاتل قسم کی مسکراہٹ کھیلنے لگتی ہے اور کہتے ہیں:

" جو حاجی ایسا بیان کرتا ہے، وہ غالباً اندھا ہوگا اور اس نے اپنی بصارت زائل ہونے کے سبب یہ بیان کیا ہوگا، تاکہ اس میں اہمیت پیدا ہو جائے، ورنہ ظاہر ہے کعبے کے دیکھنے سے بینائی میں کوئی فتور واقع نہیں ہو سکتا، اس سے تو بینائی اور بڑھنی چاہئے۔" (ص ۹۰)

اسی طرح اکتوبر ۱۹۲۶ء کے شمارے میں بمبئی میں شاید سمندر کے کنارے رہنے والے دو اصحاب الٰہی بخش اور عبدالغنی کا مشترکہ سوال شائع ہوا کہ "کیا پانی کو بھی فنا ہے اور کیا آخر ایک روز یہ بھی خشک ہو جائے گا؟" تو نیاز جواباً ایک سوال ارسال کرتے ہیں۔ "یہ پانی کے ساتھ آپ کو کیا خاص لگاؤ ہے کہ اس کے فنا ہونے سے آپ کا جی دُکھتا ہے اور اس کے معدوم ہو جانے پر آپ کو تعجب ہوتا ہے؟" (ص ۸۶)

بعض سوال نیاز کے وسیع تر "انسانی ہمدردی" کے جذبات میں ہلچل پیدا کر دیتے ہیں، جیسے اسی شمارے میں (اکتوبر ۱۹۲۶ء) بہاولپور کے خواجہ سید مبارک شاہ جیلانی نے کوئی تدبیر پوچھی کہ عشق و محبت کے مرض پر قابو پایا جاسکے، نیاز نے جو جواب دیا، اس کی تمہید ہی دلچسپ ہے " آپ کا استفسار جواب طلب تو نہ تھا، لیکن اس خیال سے کہ شاید آپ محبت میں مبتلا ہیں اور ایسے آدمی کا جی دُکھانا اچھا معلوم نہیں ہوتا" (ص ۸۸)۔ اس کے بعد 'علاج' بھی تجویز کرتے ہیں کہ " آپ کو اپنی خواجہ زادگی کی رعایت بہت منظور ہے تو ہدفِ عشق کو بدل ڈالئے اور غور سے دیکھتے رہئے کہ پردہ سے نمودار ہونے والے ہاتھوں میں کس دستِ ارادت کی نرمی قابلِ توجہ ہے، توجہ کو ذرا طویل کر دیجئے اور ریاکارانہ خشونتِ دور اندیشی کو کچھ کم۔" (ص ۸۸)

ستمبر ۱۹۳۲ء میں ایک سوال 'ازدواج بے خلوت' کے عنوان سے شائع ہوا، جس میں بڑی معصومیت سے پوچھا گیا تھا کہ بدن کی بجائے روح پر ہی اکتفا کرنے سے بیوی کی محبت حاصل کی جاسکتی ہے؟" تو تین مرتبہ شادی شدہ کہلانے والے نیاز[1] یوں جواب دیتے ہیں " میرے نزدیک شادی کا تعلق محبت سے ہو ہی نہیں سکتا اور نہ محبت کے اصول پر رشتۂ ازدواج قائم کرنا کوئی فعل مستحسن ہے (ص ۷۰) ..... بیوی کو معشوقہ بنا کر رکھنے میں کوئی حرج نہیں، لیکن اس کو معشوقہ سمجھنا سخت اصولی غلطی ہے۔" (ص ۷۲)

نیاز کے بعض جوابات ایسے ہیں، جن کی معنویت کو ہمارے عہد اور تجربے نے حدِ امکان تک بڑھا دیا ہے، مثال کے طور پر اپریل ۱۹۵۱ء میں ان سے سوال کیا گیا کہ اسلامی دنیا میں فوجی بینڈ کا رواج کب سے ہوا اور اس کا شرعی جواز کیا ہے؟ نیاز کا جواب آج کے علامتی افسانے کا ایک بلیغ ٹکڑا محسوس ہوتا ہے، فرماتے ہیں "اسلامی حکومتوں میں نقارخانے کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور فوجی بینڈ کا اطلاق اسی پر ہوتا ہے۔" (ص ۳۷)

جس بے باکی اور مصلحت سوزی سے نیاز اپنے نقطۂ نظر کا اظہار کرتے ہیں، ممکن ہے آج ہم اسے قابلِ رشک نہ کہہ سکتے ہوں تاہم تعجب کا اظہار تو کر سکتے ہیں مثلاً فروری ۱۹۲۹ء میں ان سے سوال کیا گیا کہ دنیا کا کون سا مذہب بہتر ہے؟ تو مولانا نیاز فتح پوری نے ارشاد کیا۔ " دنیا کے تمام مذاہب انسان کی ذہنی آزادی چھیننے کے لحاظ سے ایک سے ہیں اور ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دی جاسکتی۔" (ص ۶۸)

تاہم ایک وقت ایسا بھی نیاز پر آیا، جب انھوں نے مابعد الطبیعات سے متعلق سوالوں کا براہِ راست جواب دینے سے گریز کیا، اگرچہ اس وقفے کی عمر زیادہ نہ تھی، تاہم یہ موڑ دلچسپی سے خالی نہیں، مئی ۱۹۴۲ء میں مذہب اور عقل کے تعلق کے مسئلے پر ایک سوال

---

[1] اس جواب کی اشاعت تک نیاز صاحب نے تیسری شادی نہیں کی تھی۔ (انوار)

کا جواب یوں دیتے ہیں :

" میری رائے یہ ہے کہ خاموشی اختیار کی جائے کیونکہ جس دور سے ہم گزر رہے ہیں اس میں اس قسم کی لایعنی گفتگو کی گنجائش ہی نہیں۔ اس قسم کی باتیں اگر سنجیدگی سے کی جائیں تو جھگڑا پیدا کرتی ہیں اور اگر محض تفریحی مشغلہ ہو تو بے نتیجہ ہے۔" (ص ۳۴)

چنانچہ وقتاً فوقتاً ایسے کئی مہینے بلکہ سال آتے ہیں، جن میں باب الاستفسار عارضی طور بند دکھائی دیتا ہے، مگر نیاز ہر دستک پر بے قرار ہو اٹھتے ہیں۔ چنانچہ جون ۱۹۵۹ء میں ایک سوال پر بے اختیار ہو کر لکھتے ہیں :

" اس زمانے میں جب کوئی شخص اس قسم کی باتیں چھیڑ دیتا ہے، تو میں محسوس کرتا ہوں، گویا بہت دنوں کا بچھڑا ہوا دوست مل گیا اور دل کھول کر اس سے باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے۔" (ص ۳۳)

'پردے'، 'تعلیم نسواں' اور 'آزادیٔ نسواں' سے متعلق سوالوں کا جواب دیتے وقت نیاز جذباتی دکھائی دیتے ہیں مگر اس کا سبب بھی تنگ نظری اور جہالت کی قوتوں کی جانب سے شاید مزاحمت ہے۔

جون ۱۹۲۴ء میں طبقۂ نسواں کی تعلیم و تربیت سے متعلق ایک سوال کا جواب یوں دیتے ہیں :

" سب سے پہلے اپنی تعلیم و تربیت کی طرف توجہ کیجئے اور اپنی اصلاح کے درپے ہو جائیے کہ عالم نسواں میں خرابی کے تمام تر ذمہ دار مرد ہی ہیں۔" (ص ۷۲)

اسی طرح جولائی ۱۹۳۶ء کے باب الاستفسار میں فرماتے ہیں :

" ہندوستان کی عورت ہنوز غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے اور اس پر تعجب نہ ہونا چاہئے کیونکہ مسلمان مردوں کی ذہنیت کونسی ایسی بلند ہے کہ عورتوں کی پستی پر حیرت کی جائے۔" (ص ۶۸)

اگرچہ نیاز کے اپنے سات بچے تھے، تاہم یہ ان کی روشن خیالی کی ایک اور دلیل ہے کہ فروری ۱۹۳۵ء میں برتھ کنٹرول سے متعلق ایک سوال کا جواب یوں دیتے ہیں :

" ہندوستان کی سب سے بڑی لعنت یہی ہے کہ غریب و جاہل، بیمار و ضعیف، بے عقل و معتوب افراد میں برابر اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور عسرت و افلاس اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ اس کا چارہ بجز اس کے اور کوئی نہیں کہ فطرت پھر ان کو ہلاک کر ڈالے۔ اس لئے اگر افزائش نسل صرف اس لئے چاہی جاتی ہے کہ ہم بار بار ان کی ہلاکت کا تماشہ دیکھتے رہیں، تو کیا اس سے زیادہ مناسب یہ نہیں ہے کہ ابتدا ہی سے ہم اس کی احتیاط کریں۔" (ص ۷۵)

کانگریس کے مقابلے پر مسلم لیگ کے سیاسی عزائم کے بارے میں نیاز اپنا ایک نقطۂ نظر رکھتے تھے۔ مگر نومبر ۱۹۴۵ء میں کسی شخص نے نیاز کے نقطۂ نظر سے آگہی کا غلط فائدہ اٹھانے کی کوشش کی، مساجد اور سیاسی جلسوں کے بارے میں اس پہلو سے سوال کیا کہ مولانا جواب میں مسلم لیگ کو مطعون کریں کہ وہ مساجد میں سیاسی جلسے کر رہی تھی، مگر نیاز نے واضح طور پر جواب دیا " مسلم لیگ کے جلسے، مساجد میں منعقد کرنا کسی طرح روایاتِ اسلامی کے منافی نہیں۔" (ص ۵۱) حالانکہ نومبر ۲۹ء میں عبدالباقی کے سوال کے جواب میں نیاز ہندو مسلم اتحاد کے مسئلے پر کھل کر کہہ چکے تھے " اگر مسلمان اس کو اپنی توہین سمجھتے ہیں کہ وہ ہندی کہلائیں تو پھر غیر ملکیوں کے ساتھ ان کا بھی حشر ہونے والا ہے۔" (ص ۸۶)

اگر بدگمانی کو ایک لمحے کے لئے جگہ دی جائے اور یہ تصور کیا جائے کہ کہیں نیاز نے ایسا تو نہیں کیا کہ ع " ان کی طرف سے آپ لکھے خط سوال" ہیں" تو اس بارے میں یہی وضاحت کافی ہوگی کہ 'نگار' میں ہر سوال کرنے والے کا نام اور پتہ دیا جاتا تھا۔ نومبر ۱۹۲۶ء کے شمارے میں

نیاؔز نے لکھا ہے :

> "حال ہی میں حکیم منزل بریلی سے کسی صاحب کا استفسار آیا ہے، جس میں بجائے نام کے ش، ت، ی، ا، ے، ا، م لکھا ہوا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ استفسارات اچھے ہیں اور اگر ان کا جواب دیا جائے تو لوگ بہت دلچسپی سے پڑھیں گے لیکن افسوس ہے کہ میں گمنام ہونے کی وجہ سے ان کو ضائع کرنے پر مجبور ہوتا ہوں، اگر وہ چاہتے ہیں کہ نگار میں جواب شائع ہو، تو براہِ کرم اپنے نام سے مطلع فرمائیں، یہ راقم الحروف قسم کا تسمیہ مجھے پسند نہیں۔" (ص ۳، ۴)

اس باب میں نیاؔز سے ہر طرح کے سوال کئے جاتے مثلاً بچّہ ماں کے پیٹ میں کیوں نہیں روتا (ستمبر ۲۲۔ ص ۷۸)۔ کیا ایک بیوی سے بیسویں بچے کی پیدائش کے بعد تجدید نکاح ضروری ہے (فروری۔ ۳۶، ص ۷۰)۔ حضرت آدم کون سی زبان استعمال کرتے تھے؟ (اپریل ۲۳، ص ۳۱۶۔ ۳۱۷)۔ مونٹ کارلو کے جوا خانے کی تفصیل بتائیے (جنوری ۲۶، ص ۸۰)۔ فری مشن یا فری میسن کیا ہے؟ (اگست ۲۵، ص ۸۶)۔ اپریل فول کا آغاز کب ہوا؟ (مئی ۲۶۔ ص ۸۹)۔ نورِ محمدی اور پل صراط پر روشنی ڈالئے (اپریل ۳۵۔ ص ۴۷)۔ قارون کی دولت کے بارے میں بتائیے (ا/مئی ۱۹۲۸ء، ص ۸۶)۔ امریکہ کی دولت پر روشنی ڈالئے (مئی ۲۶، ص ۹۱)۔ کیا خواب میں تصنیف و تالیف ممکن ہے؟ (ستمبر ۳۶، ص ۶۵)۔ سرطان ملکۂ چین، ہالہ اور مد و جزر پر روشنی ڈالئے (دسمبر ۲۵، ص ۷۵ تا ۸۰)۔ اس کے علاوہ ترکی، عربی، فارسی اور اُردو زبان و ادب سے متعلق سوالات کی تو بھرمار رہی ہوتی۔ نیاز بلاشبہ حوالہ جاتی کتب سے مدد لیتے ہوں گے مگر اول تو وہ بکی پکائی کھیر یا ڈاکٹر سلیم اختر کے الفاظ میں علم کے کیپسول کا زمانہ نہ تھا، دوسرے نیاز کا تبحرِ علمی مشکوک یا ادھورے جذبات کا قائل نہ تھا۔ چنانچہ وہ تجسّس، تحقیق اور تدقیق میں لذّت محسوس کرتے، تاہم کبھی کبھار بیکار سوالوں پر چڑ بھی جاتے، جیسے جولائی ۲۶ء میں لکھا: "آپ نے یہ استفسارات کر کے گویا مجھ سے مطالبہ کیا ہے کہ دنیا کے سارے کام چھوڑ کر اپنی ساری عمر ان مسائل کی تحقیق میں صرف کر دوں اور پھر بھی نتیجہ میں سوائے دردِ سری کے اور کچھ حاصل نہ ہو۔" (ص ۸۹)

'باب الاستفسار' کے حوالے سے نیاز کو معلّم کہوں، تو ان معلّموں کی حالت دیدنی ہوگی جنھیں تدریس کے لئے صرف مثبت الفاظ کا کوٹہ فراہم ہوتا ہے۔ ایک عظیم جریدے کا مدیر کہوں، تو ان تمام مدیروں کے جذبات کو ٹھیس پہنچے گی جن کا اپنے ضخیم نمبروں سے وہی تعلق ہوتا ہے جو کسی پلازا اور سیٹھ کا ہوتا ہے۔ تحریک کہوں تو امن و امان قائم رکھنے کے ذمہ دار متحرک ہو جائیں گے، مگر میں نیاز کے لئے مناسب القاب کی تلاش کا کام دانشوروں کے سپرد کرتا ہوں جنھیں ابھی یہ معلوم نہیں ہوا کہ ہمارے معاشرے میں صفات گھٹ رہی ہیں اور اسمائے صفات بڑھ رہے ہیں۔

" .... "

فضل حق قریشی دہلوی ـــــــ اگر بعض مفکرین کے قول کے مطابق یہ تسلیم کیا جائے کہ شعر کے لئے وزن اور ردیف و قافیہ کی ضرورت نہیں بلکہ ہر شاعرانہ اندازِ بیان ایک مکمل شعر کہلا سکتا ہے تو لامحالہ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ نیاز کا ہر افسانہ بہ لحاظ رنگینیٔ بیان ایک نظم ہے ـــ ایک ایسی نظم جس پر سے متعدد شعراء کا کلام موزوں قربان کیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر آغا سہیل۔
A-۳۵۵، محمد علی جوہر ٹاؤن
نزد اکبر چوک۔ لاہور۔ ۵۴۷۰۰ (پاکستان)

ڈاکٹر فرمان فتحپوری کا تنقیدی شعور اور نیاز فتحپوری

اگر پروفیسر ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے سوانحی حالات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کی تصانیف کا احاطہ کیا جائے اور ان کی تمام چالیس بیالیس کتابوں پر ایجاز اور اجمال کے ساتھ تبصرہ کیا جائے تو ایک مختصری کتاب تیار ہو سکتی ہے جو میرا منصب نہیں۔ ان تمام کتابوں اور مقالوں کے موضوعات اور ان جملہ موضوعات کے تحقیقی اور تنقیدی مزاج اور مذاق کے تعینات اور مضمرات سے بحث کی جائے تو بجائے خود ایک مقالہ تیار ہو سکتا ہے جو بہرحال میرے مجوزہ موضوع اور دائرہ فکر سے باہر ہے۔ تحقیق اور تدقیق کی باریکیوں اور موشگافیوں کے لئے بھی جس طرح کے طبائع اردو ادب میں موجود رہے ہیں اور جس جس طرح کے روایات محققین نے قائم کئے ہیں، ان سے اردو کا عام قاری کچھ زیادہ طبعاً مناسبت نہیں رکھتا لیکن فرمان فتحپوری کی سلیم المزاقی خوش طبعی اور خوش فکری نے اس میدان میں جو چراغ روشن کئے ان سے نوجوان محقیقین کی تربیت اور تہذیب بھی ہوئی، ان کے ذہنی افق میں وسعت و پہنائی بھی پیدا ہوئی اور ان کے نفس میں کسی قسم کی بیماری اور خرابی بھی پیدا نہیں ہوئی کہ عموماً متنازعہ مسائل کو سلجھاتے اور تحقیقی نتائج کو پیش کرتے وقت بعض جذباتی سطحی اور سطلہ خو نوجوان تبختر گھمنڈ اور متمردانہ بدنفسی کا شکار ہو جاتے ہیں اور تنقیدی شعور سے عاری ہونے کے سبب خوردہ گیری ہی کو تحقیق کی کل کائنات سمجھنے لگتے ہیں۔ گویا تحقیق کا مزاج بنانے اور محقق کو اپنے مزاج اور مذاق کی تربیت کے لئے جس تنقیدی شعور کی ضرورت ہوتی ہے وہ ان زمانہ عنقا ہے لیکن فرمان فتحپوری ایک منکسر المزاج شریف النفس خوش فکر اور خوش طبع محقق ہیں اور ان کی عالمانہ ظرفی نتائج کے استنباط اور نظریات کے استخراج میں معروضی تجزیے کی ڈگر پر قائم رہتی ہے جو بہرحال بہترین تربیت کا نتیجہ ہے۔

اچھے محقق کے لئے ضروری ہے کہ وہ اچھا نقاد بھی ہو اور اچھے نقاد کے لئے ضروری ہے کہ معروضی اور بے لاگ محقق بھی ہو۔ میں اگرچہ شخصیتوں کے باہم موازنے اور مقابلے کا زیادہ قائل نہیں ہوں۔ لیکن کبھی کبھی موازنے اور مقابلے یا تقابلی مطالعے سے شعر و ادب کے بعض مباحث کے نئے راستے منور و مستنیر ہوتے ہیں اور کچھ ایسی راہیں بھی کھلتی ہیں جن سے تخلیق کے کچھ نئے سوتے پھوٹتے ہیں۔ چنانچہ مجھے فرمان فتحپوری کی شخصیت اور فن میں جو کہیں نیاز فتحپوری کی شخصیت اور فن کے پرتو نظر آئے ان کی طرف چند اشارے کر دینے میں کچھ مضائقہ نہیں ہے۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ اس مطابقت کے باوجود دونوں کی شخصیتوں اور دونوں کے فن میں زمانی مکانی فرق کے علاوہ بھی بسا اوقات اس قدر فاصلہ نظر آتا ہے کہ اسے بعد مشرقین قرار دیا جا سکتا ہے تاہم فاصلوں کے باوصف جو قربت نظر آتی ہے وہ اس قدر واضح ہے کہ فرمان صاحب کو نیاز صاحب کا معنوی فرزند کہنے میں بھی کوئی تکلف اور تامل نہیں ہوتا۔ بہرحال فرمان فتحپوری کے تنقیدی شعور میں نیاز فتحپوری کی شخصیت اور ان کے نظریات کی کس حد تک جھلک پائی جاتی ہے اس کا جائزہ لینے کے لئے اولاً نیاز فتحپوری کے باب میں چند معروضات ملاحظہ فرمایئے؛

بڑی حد تک اس بات کو درست تسلیم کیا جاتا ہے کہ رومانی دبستان تنقید اور تاثراتی تنقید کے ڈانڈے ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ رومانی اور تاثراتی دبستان خیال پرستوں کے ترجمان ہیں اور اس دبستان کے نقاد جذبے خیال اور وجدان سے تحریک پاتے ہیں اور فکر اور عقل سے بہت کم رجوع ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان کی باتیں زیادہ تر ہوائی ماورائی اور منطقی استدلال سے تہی ہوتی ہیں۔ تاہم علامہ نیاز فتحپوری کے باب میں سہل انگاری سے

سہل انگار مبصر بھی یہ کہکر سرسری نہیں گزر سکتا کہ وہ محض تاثراتی اور رومانی نقاد تھے۔ اس لئے ان کے مقالات فی زمانہ سائنٹیفک اور منطقی استدلال کے موجودہ دور میں درخور اعتنا نہیں۔ اصل قصہ یہ ہے کہ علامہ موصوف کا رومانی اور تاثراتی دبستانوں سے کہیں زیادہ جمالیاتی دبستان سے فطری اور ذہنی تعلق رہا ہے۔ ان کے بعض آرا جو بادی النظر میں تاثراتی اور رومانی نظر بھی آتے ہیں۔ اگر بہ نظر غائر دیکھے جائیں تو احساس جمالی سے تحریک پاتے ہیں۔

یہ بھی درست ہے کہ علامہ موصوف نے مغرب کے جمالیاتی دبستان کے بڑے بڑے جغادری فلسفیوں کے علمی اور اکیڈمک نصاب کو ملحوظ رکھ کر اپنے مقالات نہیں لکھے۔ بفرض محال انہیں ایسی نصابی ضرورتیں لاحق ہوتیں کہ کسی کالج یا یونیورسٹی میں درس کے لئے مجبوراً بام گارٹن، ہیگل اسرائیل ناکس ISRAEL KNOX ڈیکارٹ، برکلے ہیوم کانٹ فشتے شیلنگ، شوپنہار اوپ زومر DOPZOMER گرتے نائٹ KNIGHT ہاربرٹ اور کروچے کو پڑھانا پڑجاتا تو علاوہ ان میں سے کسی ایک یا ان میں سے چند کے متبع نہ ہوتے بلکہ اولاً ان سب سے الگ اپنی راہ نکالتے۔ دوسرے یہ کہ ان کے جملہ مقالات سے نظریات کا استنباط اور استخراج کرنے والوں کو یہ بات بخوبی سمجھ لینا چاہئے کہ جمالیات کے دبستان سے ان کا تعلق فطری اور طبعی مناسبت رکھتا ہے اور مغرب یا مشرق کے کسی مفکر، دانشور یا ادیب سے ان کے کسی نظریئے کا تطابق محض حسن اتفاق یا سوئے اتفاق ہے۔ اس گزارش میں کسی قسم کی طرفداری نہیں بلکہ سخن فہمی کو دخل ہے۔ ان سے مشرق کے متقدمین میں آزاد اور شبلی متاخرین میں حسن عسکری اور سلیم احمد، معاصرین میں عبدالرحمٰن بجنوری، اثر لکھنوی اور فراق گورکھپوری قابل ذکر رومانی، جمالیاتی اور نفسیاتی نقاد تھے۔

یہ بات درست ہے کہ نقاد بھی تخلیق کار ہوتا ہے۔ علامہ نیاز ایک ایسے ہی نقاد تھے جنھوں نے جمالیات کے دبستان میں تخلیقی تنقید کا اضافہ کیا۔ رومانی اور تاثراتی دبستان پر کیا ٹھیک ہے۔ ہر دبستان کا نقاد تخلیق کار ہوتا ہے کہ اپنے مشاہدے مطالعے، احساسات، جذبات، خیالات اور نظریات کی اپنی متخیلہ کے زور پر بار بار ترتیب تہذیب، تنظیم اور تدوین کرنے کے مرحلوں سے گزر کر تخلیق کرتا ہے۔ لیکن بطور خاص علامہ نیاز کا مسئلہ غور طلب ہے کہ ان مرحلوں سے گزرتے وقت اور گزرنے کے بعد ان کی متخیلہ جو صورت اختیار کرتی ہے اور ان کا مافی الضمیر جس طرح قرطاس پر ظاہر ہوتا ہے۔ اس کی قدر و قیمت کس طرح اور کیسے متعین کی جائے۔ یہ بھی ایک غور طلب بات ہے کہ یہ احساس جمال ہے کیا اور اس کے محرکات و عوامل کیا ہیں اور ان عناصر کے دوائر کیا ہیں۔ علامہ موصوف کی کل متاع نثر کو ملحوظ رکھا جائے۔ جو مقالات، افسانوں، انشائیوں، شذرات اور مجلاتی اداریوں پر مشتمل ہے۔ تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان کا احساس جمال محض حسی نہیں عقلی بھی ہے۔ مشاہداتی ہی نہیں مطالعاتی بھی ہے کہ حسیات کے دوائر حواس خمسہ تک محدود ہوتے ہیں اور تفکر و تعقل کے تعینات عالم امکان میں دور دور تک پھیلے ہوئے ہوتے ہیں۔ عقلی دوائر میں ماضی، حال اور مستقبل سب داخل ہیں۔ حسی میں محض مشاہدات کے حدود تک کسی فن کار کی رسائی ہو سکتی ہے اور مفروضات تک اس کی متخیلہ زقند لگا سکتی ہے۔ میرے اس ناچیز معروضے کے ثبوت میں علامہ موصوف کا وہ مطالعاتی مقالہ پیش کیا جا سکتا ہے جس میں انھوں نے غالب کے کلام پر تبصرہ کیا ہے اور مرزا کے فارسی کلام کا بیدل، عرفی، طالب آملی اور حافظ کے کلام سے نہ صرف موازنہ کیا ہے بلکہ مرزا کی متخیلہ کی بلندی کو بالموازنہ فائق ٹھہراتے وقت متذکرہ بالا شعرا کے متخیلہ کی کوتاہیوں کی نشاندہی بھی کی ہے۔ واضح رہے کہ یہ تمام فارسی گو شعرا اساتذہ کا درجہ رکھتے ہیں اور ان کے کلام تک رسائی صرف اس معدودے چند دانشوروں کا کمال ہے جو علوم متداولہ پر دسترس رکھنے کے ساتھ ساتھ ذوق سلیم اور رشتۂ لطیف سے بھی متصف ہوں۔ جس کا صاف واضح اور دانشگاف الفاظ میں مطلب یہ نکلتا ہے کہ علامہ موصوف کا ذہنی افق نہایت کشادہ اور وسیع تھا، مشرق و مغرب کے علوم سے بھی انہوں نے بخوبی سیر چشمی سے استفادہ کیا تھا اور اپنی سوچ اور فکر سے تمام ممکن الحصول اور عسیر الحصول ماخذ استعمال کرکے اپنی انفرادی لیکھ الگ بنائی تھی، طین

جو ماحول فضا اور نسل پر زور دیتا ہے اور کہتا ہے کہ ہر تخلیق میں ماحول اور فضا کی جھلکیاں ہوتی ہیں سو یہ علامہ کے یہاں بھی کارفرما ہیں۔ لیکن وہ تمام طرح کے خیالات اور نظریات کو من و عن تسلیم نہیں کرتے اور نہ فوری قبول کرتے ہیں بلکہ اجتہاد کرکے اور رد و قبول کے مراحل سے گزار کر کچھ حصہ قبول کرتے ہیں اگر ایسا نہ ہوتا تو لکھنؤ کے دوران قیام میں جب بعض انتہا پسند نظریات کی یلغار تھی وہ کسی ایک رخ پر بہہ جاتے، عین اس زمانے میں جب ایک طرف لکھنؤ میں قدامت پسندوں کا زور تھا اور دوسری جانب ترقی پسند تحریک زور پر تھی، علامہ نیاز نے اعتدال کی روش اختیار کی۔ اگر ایک گروہ نے انہیں ان کے فکری اجتہاد پر دہریہ کہا اور دوسرے نے کسی اور طرح مطعون کیا تو انھوں نے کسی کی پروا کئے بغیر اپنی ذاتی پسند کی منفرد روش کو قائم رکھا۔ اگر اس زمانے کے "نگار" کے مجلاتی، ادبی اور علمی شذرات کو سامنے رکھا جائے تو علامہ موصوف کی عالمانہ بصیرت

اور مجتہدانہ فکر سامنے آتی ہے جس میں ایک طرف ان کا طبعی رجحان یعنی احساس جمال غالب ہے تو دوسری طرف روح عصران تحریروں کے بین السطور سے جھلکتی ہے۔ قدیم لکھنؤ کے اساتذہ زبان کی نوک پلک روزمرہ اور محاورے پر جان چھڑکتے تھے اور عروض میں ناسخیت کو بڑی حد تک دخل دیتے تھے۔ علامہ نے اس گروہ کو ناراض بھی نہیں کیا اور اکثر اوقات ان کے بارے میں جاکر انہیں کے ہتھیاروں سے انہیں قائل کیا تو ترقی پسندوں کی کوتاہیوں اور خامیوں پر ان کی افراط اور تفریط پر ٹوکا اور انہیں متنبہ کیا تاکہ وہ معتدل اور متوازن راستہ اختیار کریں۔ ان کی تنقید ہر دور ہر زمانے میں خوردہ گیری کے عیب سے پاک رہی۔

جمالیات کے دبستان میں یوں تو ہیگل، کانٹ، گوئٹے اور کروچے کے نظریات نے سب سے زیادہ مغرب اور مشرق دونوں کو متاثر کیا، لیکن کروچے بوجوہ مقبول عام رہا۔ مجنوں گورکھپوری (اور حال میں محمد علی صدیقی) دونوں نے نہایت تفصیل سے کروچے کے نظریات کو اردو دنیا میں متعارف کرایا، یوں تو بیشتر ترقی پسند کروچے کے قائل رہے ہیں لیکن بطور خاص مارکسی نقادوں نے اس سے بیش از بیش استفادہ کیا ہے کہ اس نے مابعدالطبیعیاتی نظریات اور فنی لوازم کو باقاعدہ جمالیات کے دائرے میں داخل کر دیا۔ اگرچہ کروچے منطق کے بجائے تاریخ اور جمالیاتی اقدار پر زور دیتا ہے اور " روح " اس کا محبوب موضوع ہے اور جمالیاتی وجدان کو وہ حقیقی فعلیت قرار دیتا ہے، لیکن اس کا یہ بھی خیال ہے کہ کسی شے کو مکمل طور پر سمجھنے کے بعد متخیلہ کا حصہ بنایا جاتا ہے۔ مجنوں گورکھپوری اس مقام پر کروچے کی ترجمانی کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جب ہم لکھتے یا گاتے ہیں تو اس سے پہلے ہم اسے لکھ چکے یا گا چکے ہوتے ہیں، یعنی وہ حسن اظہار کا قائل ہے۔ حسن جمال سے لذت اور لطف حاصل کرنے کا وہ بہت زیادہ قائل ہے۔ اس روشنی میں حضرت علامہ کے دو اقتباسات ملاحظہ فرمائیے۔ دونوں کا تعلق انتقادیات حصہ دوم ص ۱۱۶ اور ص ۸۴ سے ہے۔

"جس طرح ایک نقاش کا کمال یہ ہے کہ وہ خطوط کے امتزاج سے اصل منظر آپ کے سامنے لے آوے، اسی طرح ایک شاعر کا کمال یہ ہے کہ جو تاثرات اس کے دل میں پیدا ہوتے ہیں، ان کو ایسے الفاظ و انداز سے ظاہر کرے کہ دوسرا بھی وہی کیفیت اپنے اندر محسوس کرنے لگے۔"

"ہر چند یہ بالکل درست ہے کہ ہم کو کسی تصنیف پر نقد کرنے کے لئے پورا مواد جمع کر کے اس کا تجزیہ اور اس کی دلکشی و لذت اندوزی کی صراحت کرنا چاہیئے کہ وہ تصنیف واقعی کوئی ایسی چیز ہے' جس سے انسانی روح لذت حاصل کر سکتی ہے اور اس اکتساب لذت کے کیا کیا اثبات ہیں؟"

یہ دونوں اقتباسات چونکہ حضرت علامہ کے نقطۂ نظر کی وضاحت بھی کرتے ہیں اور یہ بھی ثابت کرتے ہیں کہ جمالیات میں ان کے نظریات کروچے سے کس قدر قریب ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اس بات کے باور کرانے میں معین و مددگار ہوتے ہیں کہ ان کے احساس جمال میں لایعنیت اور ماورائیت کی گنجائش نہیں ہے۔ زمان و مکان کی ارضیت بھی ہے۔ تحلیل و تجزیے کی افادیت بھی ظاہر ہو رہی ہے، لذت اندوزی کی ضرورت بھی ہے۔ لہذا یہ رومانی نظریہ زیادہ صحت مند صالح اور قوی اس لئے ہے کہ اس کا جمالیاتی پہلو نہایت نمایاں اور واضح ہے۔

نیاز فتحپوری اور عبدالرحمٰن بجنوری کو بعض ناقدین ایک ہی خانے میں رکھتے ہیں اور ایک ہی فیتے سے ناپتے ہیں۔ ہر چند کہ دونوں میں بعض چیزیں قریب قریب مشترک ہیں جیسے کہ دونوں اپنے ذاتی تاثرات کا فوری اور بے تکلف اظہار کرتے ہیں اپنے قاری کو اپنی مضبوط گرفت میں لے لیتے ہیں، لیکن یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ نیاز تاثرات کے اظہار میں محض جذبے، خیال اور وجدان کو کام میں نہیں لاتے، فکر اور عقل کی راہ سے دلیل اور منطق سے بھی رجوع ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بجنوری کا طلسم جلد ہی اور فوری ٹوٹ جاتا ہے جبکہ نیاز فتحپوری فکر اور عقل کے راستے سے اپنا دیرپا نقش قائم کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ دونوں بزرگوں کی مثال میر اور غالب کے دو ہم مضمون اور ہم موضوع اشعار کے مختلف النوع اسالیب کی مدد سے سمجھئے۔ میر صاحب فرماتے ہیں ——

ہم طور عشق سے تو واقف نہیں مگر ہاں
سینے میں جیسے کوئی دل کو ملا کرے ہے

مرزا غالب کا ارشاد ہے۔

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزہ پایا
درد کی دوا پائی درد بے دوا پایا

بجنوری اپنے مفروضات کو غالب کے مزاج میں زبردستی داخل کرکے بھی وہ بات پیدا نہیں کرسکے جو علامہ نیاز غالب کی تشریح اور توضیح کرتے وقت فارسی اساتذہ کے کلام کی تشریحات سے غالب کے کلام کی تفہیم کا حق ادا کر دیتے ہیں اور اس فرق کا سبب وہی دونوں کے افتاد مزاج کا فرق ہے اور دونوں کے نقاط نظر کا بیّن اور واضح فرق ہے۔ یعنی بجنوری محض تاثراتی اور رومانی مفروضات کے دائرے میں رہتے ہیں، نیاز جمالیات سے رجوع ہوتے ہیں اور احساس جمال کے ان لوازم کو بروئے کار لاتے ہیں جو کروچے کے حوالے سے بیان ہو چکے ہیں۔

غالب فہمی میں نیاز کا ایک اہم کردار یہ بھی ہے کہ انھوں نے اپنے جمالیاتی نقطۂ نظر سے غالب کی متخیلہ کو تجزیے اور تحلیل کے مراحل سے گذارا ہے۔ اس ضمن میں بجنوری ان سے اس لئے بھی پیچھے رہ جاتے ہیں کہ ان کے مفروضات کا یعنی رومانی اور تاثراتی احساسات، جذبات اور خیالات کا پیمانہ غالب کے فنی قدوقامت سے چھوٹا رہ جاتا ہے۔

اب ذرا فرمان فتحپوری کی شخصیت اور فن پر غور فرمایئے اور دیکھئے کہ جن حالات میں اور جس ماحول میں انھوں نے آنکھ کھولی اور تعلیم و تربیت سے بہرہ ور ہوئے وہ کیا تھے اور ان کے اثرات کس طرح ان کے دل و دماغ پر مرتب ہوئے۔ نیز یہ کہ ان کی تخلیقات میں کیوں کر نمایاں ہوئے۔ اولاً دو باتوں پر توجہ فرمایئے کہ نیاز صاحب کی تخلیقات کا زمانہ اور اس زمانے کے خاص خاص واقعات کیا تھے؟ جو ان کی تحریروں کا مضبوط پس منظر بنے اور دوسرے یہ کہ ان کا مبلغ علم کیا تھا اور اس سے کام لیکر انھوں نے کیسے کیسے اجتہادات کئے۔ پھر اسی طرح اس بات پر غور فرمایئے کہ فرمان صاحب کا زمانہ کیا ہے اور اس زمانے کے خاص خاص واقعات کیا ہیں جو ان کی تحریروں کا مضبوط پس منظر بنتے ہیں۔ فرمان صاحب کا مبلغ علم کیا ہے اور اس سے انھوں نے کیا کیا کام لئے اور کیسے کیسے اجتہادات کئے ہیں۔ سو ظاہر ہے کہ دونوں معاصرین ہوتے ہوئے بھی بعد زمانی اور بعد مکانی کے مابین سانس لیتے رہے۔ نصابی علم فرمان صاحب کا زیادہ ہے لیکن مبلغ علم و تحصیل اور تجربے مشاہدے اور مطالعے سے دل و دماغ میں کشادگی نہادگی وسعت اور پہنائی پیدا کرتا ہے اور تخلیقی جوہر کو نکھارتا بناتا اور سنوارتا ہے اس سے نیاز صاحب بدرجہ اولیٰ متصف تھے۔ دانشوروں کا ایک طبقہ اسے ودیعت الٰہی کہتا ہے اور دوسرا اسے ذہنی مشقت غور و فکر تجربے اور تربیت کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔ فرمان صاحب مرنجاں مرنج منکسر المزاج حلیم الطبع اور شریف النفس انسان بھی ہیں، نقاد بھی اور محقق بھی، جو کسی شخص کی کسی عنوان سے بھی دل آزاری نہیں کرتے، نیاز صاحب کی سرشت میں ہر بات من و عن تسلیم کر لینے اور ہر ایک کی بات کو بلا چوں و چرا مان لینے کا جوہر نہیں تھا کہ وہ مروت اور رواداری بھی نہیں جو "سید" فرمان فتحپوری میں موجود ہے جو ان کے بزرگوں اور ان کے مورث اعلیٰ سے وراثتاً انہیں منتقل ہوتی چلی آرہی ہے۔ نیاز فتحپوری خالص "پٹھان" ہیں اور اپنی بات کا ہر طرح بھرم قائم رکھنے کے لئے اڑنا اور ڈٹ جانا ان کا دین دھرم ہے۔ ان کا رومانی انداز نظر کہ اگر "میرے سامنے جملہ اردو شعرا کے دواوین رکھ دیئے جائیں اور کہا جائے کہ کسی ایک کا انتخاب کر لو تو میں بلا تامل مومن خان مومن کا دیوان اٹھا لوں گا۔" عبدالرحمٰن بجنوری کے رومانی انداز نظر سے قطعاً مختلف نہیں ہے جہاں وہ فرماتے ہیں کہ "ہندوستان کی الہامی کتابیں دو آئیں ایک وید مقدس اور دوسرے دیوان غالب" جبکہ فرمان فتحپوری سیدھے اور سپاٹ انداز میں کوئی بات نہیں کہتے۔ ہزار ہزار توجیہات، لاکھ لاکھ تکلفات اور کروڑوں معذرتوں کے ساتھ کوئی اعتراض کریں گے کہ کسی کی دل آزاری نہ ہو۔ نیاز صاحب بلا تامل دھڑلے سے ایسی بات کہہ گذریں گے کہ جسے وہ صحیح اور درست سمجھتے ہیں۔ نیاز صاحب اور جوش ملیح آبادی میں ٹھن گئی۔ دونوں اصیل پٹھان اپنی اپنی آن پر اڑ جانے والے زبان قلم سے وہ وہ لٹھ چلے اور وہ وہ ایک دوسرے کو سنائی کہ اللہ دے اور بندہ لے، لیکن نیاز صاحب رہیجھے بھی تو جوش کی زبان پر کہ بقول شاعر

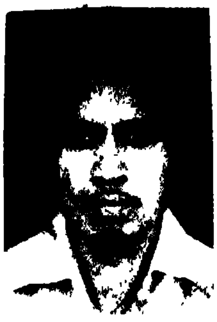
دشنام یار طبع حزیں پہ گراں نہیں
اے ہم نفس نزاکت آواز دیکھنا

کے مصداق یہ بھی نیاز صاحب کے فطری رجحان طبع یعنی رومانی اندازِ نظر کا کرشمہ تھا۔ فرمان صاحب یہاں نیاز صاحب کے مقابلے میں زیادہ بہتر حکم منصف اور نقاد ہیں۔ وہ منطقی استدلال اور معروضی تجزیے سے کام لیتے ہیں اور پر میں نے کہیں یہ بات لکھی ہے کہ نیاز صاحب اپنے معاصرین خصوصاً ان کے قبیل کے معاصرین یعنی رومانی دبستان سے تعلق رکھنے والے معاصرین میں بڑی حد تک فکری اور عقلی دلائل سے کام لیتے ہیں، اس کی وجہ بھی میں نے یہ عرض کی ہے کہ چونکہ وہ محض رومانی نقاد نہیں بلکہ جمالیاتی دبستان سے بھی تعلق رکھتے ہیں۔ لہٰذا جمالیاتی نقطۂ نظر سے حسن و قبح کے موازنے میں دلیل کا پلہ جدھر بھاری ہوتا ہے ادھر ان کی رائے مثبت انداز اختیار کرتی ہے۔ اس لحاظ سے وہ شبلی کے استدلالی دائرے میں پہنچ جاتے ہیں، لیکن فرمان صاحب کسی حد تک (بڑی حد تک نہیں) حالی کے قبیلے میں پہنچتے ہیں اور مادی جدلیت کے ارتقائی اور تاریخی حقائق محققہ کے استدلالی دبستان کے مطابق اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں، لیکن انتہائی احتیاط سے، فرمان صاحب اسقدر شریف نقاد ہیں کہ جملہ متنازعہ فیہ موضوعات سے دامن بچا بچاکر اور ڈر ڈر کر بلکہ پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں۔ برخلاف اس کے نیاز صاحب کے مزاج میں چھیڑ چھاڑ بھی تھی اور ہر موضوع پر اپنے تیکھے انداز میں رائے دینے اور اپنے مخصوص اسلوب میں اظہار کرنے سے وہ باز نہیں رہتے تھے، بلکہ ایسا کرنے میں انہیں لطف آتا تھا اور وہ لذت اندوز ہوتے تھے۔ اپنے مبلغ علم سے حسب ضرورت اور حسب منشا کام لینے سے وہ محظوظ ہوتے تھے۔ فرمان صاحب یہاں بھی کسی طرح کا لاٹھی پونگا پسند نہیں کرتے۔ مصالحانہ اور صلح جویانہ طریق کار اختیار کرتے ہیں اور سب کو حتی الامکان راضی رکھنے کی کوشش کرتے ہیں جس مقام پر نیاز صاحب تمام رشتے ناتوں کو جوتی کی نوک پر رکھتے ہیں اس مقام پر فرمان صاحب میر انیس کے اس شعر کے مصداق حسن سلوک کے قائل نظر آتے ہیں۔

خیال خاطر احباب چاہیئے ہردم
انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

بسا اوقات یہی قباحت ہوتی ہے کہ شخصیتوں پر توجہ مرتکز رہتی ہے۔ نظری تنقید میں میلانات رجحانات اور موضوعات زیادہ واضح طور پر پیش نظر ہوتے ہیں اور کسی نہ کسی دبستان سے گہری وابستگی کی صورت میں شخصیات کا طلسم ٹوٹ جاتا ہے۔ جذبۂ خیال اور وجدان سے نقاد قطع نظر کرکے محض تفکر و تعقل کے دوائر میں رہتے ہوئے مصالح کو نظر انداز کرکے معروضی تجزیے کرتا ہے، جن میں ماورائیت نہیں ارضیت ہوتی ہے۔ فرمان صاحب نے یوں تو مضامین نو کے انبار لگادیئے، لیکن قریب قریب ہر دبستان سے عمومی تعلق رکھا۔ تخصیص ذرا کم کی، نتیجہ یہ ہے کہ ماشاء اللہ وہ چالیس بیالیس متنوع موضوعات پر خامہ فرسائی کرچکے ہیں اور چالیس بیالیس کتابیں لکھ چکے ہیں جن میں بہرحال تعمیم تو ہے تخصیص نہیں ہے۔ ان کی پہچان "نگار" بھی ہے اور نیاز بھی ان کا تعارف ان کی چالیس کتابیں بھی ہیں اور پچاس سالہ علمی ادبی خدمت بھی ـــــ انھوں نے بیسویں صدی کی تمام تر سائنس اور ٹیکنالوجی کے علم سے اپنے اور اپنے قارئین کے ذہنی افق کو وسیع کیا ہے۔ اپنے آرا کا برملا نسبی پر تکلف، تہذیبی اور ثقافتی پردوں میں اظہار بھی کیا ہے، لیکن اپنی ایسی منفرد اور نادر پہچان جیسی اختر حسین رائے پوری، مجنوں گورکھپوری، سید احتشام حسین یا خود حضرت علامہ نیاز فتحپوری نے قائم کی تھی، ابھی تک اجاگر نہیں کی۔

ڈاکٹر عبدالقیوم ـــــ غرض نیاز کو خواہ ہم بڑا نقاد نہ مانیں لیکن ان کو نظر انداز نہیں کرسکتے۔ پروفیسر کلیم الدین نے اُردو تنقید پر ایک نظر میں انہیں نظر انداز کرکے اردو تنقید کے ارتقا کی ایک کڑی کو چھوڑ دیا ہے۔



ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط
کل گاؤں ۴۴۵۲۰۳

مولانا نیاز فتحپوری کا سیاسی شعور

ایک برطانوی مفکر T. H. S. ESCOTT اپنی کتاب "PILLARS OF EMPIRE" میں رقم طراز ہے۔

"کسی اخبار یا رسالے کو پڑھنے والے یا اس سے متاثر ہونے والے قارئین کی حقیقی تعداد کا اندازہ کرنے کے لئے اس کی تعداد اشاعت یا خریداروں کی فہرست صحیح نمائندگی نہیں کرتی۔ اکثر لوگ اخبار خریدے یا پڑھے بغیر بھی اس سے متاثر ہو جاتے ہیں۔ اہم بات تو یہ ہے کہ اس قسم کے جرائد ان طبقات کے حالات کی ترجمانی کرتے ہیں جو عامۃ الناس کو متاثر کرتے ہیں۔"

(ایسکاٹ: پلرس آف امپائر بحوالہ "ہندوستانی سیاست میں مسلمانوں کا عروج" ص ۳۱۹)

اردو جرائد میں گنے چنے نام ہی لئے جا سکتے ہیں جو ایسکاٹ کے بیان کردہ معیار پر پورے پورے اترتے ہوں۔ دراصل اردو صحافت کی خفتہ بختی کا یہ عالم ہے کہ اس کا سورج طلوع ہوتے ہی گہنا گیا اور آج تک وہ اس سے آزاد نہیں ہو سکا۔ خام صحافتی تکنیک اردو صحافت کی ترقی میں سدِ راہ ثابت ہوئی۔ جس کی وجہ سے اردو جرائد اس بلند معیار کو نہیں پہنچ سکے جہاں دیگر زبانوں کے معروف جرائد بین الاقوامی سطح پر دکھائی دیتے ہیں۔ فنِ صحافت جن ضوابط و شرائط کا مقتضی ہوتا ہے یا اسے ہونا چاہئے، ہماری اردو صحافت میں اس کا یکسر فقدان رہا ہے۔ صحیح صورتِ حال تو یہ ہے کہ صحافت کے نام پر اردو میں "ادبی صحافت"، تو خوب چمکی لیکن "صحافتی ادب"، کا اس میں کال ہی رہا۔ سرسید احمد خاں کے رفیق حاجی محمد اسمٰعیل نے غیر معیاری اردو صحافت کی جانب اس دور میں اشارہ کیا تھا، جب اردو صحافت کا نصف النہار تھا۔ آسمانِ صحافت پر کئی موقر و مشہور جرائد و اخبار اپنی تمام تر تابناکیوں کے ساتھ جگمگا رہے تھے اور ان کی درخشندگی سے آنکھیں خیرہ ہوئی جا رہی تھیں۔ اس وقت انھوں نے کہا تھا۔

"اردو اخبارات بلیک بیری Black Berry کی طرح تعداد میں تو بہت زیادہ ہیں لیکن ان کی کوئی مضبوط معاشی اساس نہیں ہے اور چونکہ ان کی کوئی معینہ پالیسی نہیں ہے اس لئے وہ اپنے پڑھنے والوں کے اذہان پر تندرست اور صحت بخش اثر نہیں ڈال سکتے۔"

(سید ابو محمد: ہمارے اردو اخبارات، مشمولہ "علیگڑھ منتھلی" جنوری ۱۹۰۴ء)

اسی دور میں سٹری گوپال پانیکر اور مولوی عزیز مرزا نے بالترتیب "کلکتہ ریویو" اور "عصرِ جدید" ۱۹۰۲ء۔ اور ۱۹۰۳ء میں دیسی اخبارات بالخصوص اردو صحافت کی عدم مقصدیت اور اس کے پست معیار ہونے پر اظہارِ تاسف کیا تھا۔ آج جبکہ صحافت (اردو) جہد للبقاء میں ہزاروں آزمائشوں سے گزر رہی ہے۔ اس میں اب اتنی بھی سکت نہیں رہی کہ اپنی قوتِ نمو ہی کو آزمائے۔ ایسے پر آشوب دور میں اردو کے صحافتی معیار کے متعلق سوچنا بھی عبث ٹھہرے گا۔ لیکن جب ہم اس کے ماضی میں جھانکتے ہیں تو چند ایسے موقر رسائل ہمیں اپنی جانب متوجہ کر لیتے ہیں جنھوں نے اپنے قارئین کے اذہان کی تربیت کی۔ اگر چہ وہ "رائے عامہ" کو مکمل طور پر ہموار نہیں کر سکے تاہم اپنی معینہ پالیسی کے دائرے ہی میں

انھوں نے مسلمانوں کے فکر و عمل پر اثر ڈالا۔ مولانا نیاز فتح پوری کا "نگار"، ان ہی میں سے ایک ہے۔

نگار کی شہرت کو جو دوام حاصل ہے میں سمجھتا ہوں برصغیر میں یہ مرتبہ بہت ہی کم رسائل کو ملا۔ نیاز نے اپنے دل کی دھڑکن سے قلم کی سیاہی کو روانی بخشی۔ اور جو دل میں سماتا گیا نوکِ قلم سے نگار کے صفحات پر ایسا نقش کر دیا کہ ان کے "جمالستان" میں "حسن کی عیاریاں" قارئین کو "ترغیبات جنسی" دیتی ہیں تو "نگارستان" میں "من و یزداں" کا خیال دامن گیر رہتا ہے۔ وہ "مالہ و ماعلیہ" کی تحریریں ہوں یا "انتقادیات" افسانے ہوں یا تاریخی واقعات، نیاز کا قلم ہر موضوع پر اپنی جولانی دکھاتا ہے۔ اور الفاظ کی گوہر افشانی سے "نگارستانِ ادب" کو جگمگا دیتا ہے۔ موضوعات چاہے جو بھی ہوں، نیاز کے افکار کی بڑی منطقیانہ ہوتی ہے اور جو نتائج وہ مستنبط کرتے ہیں حرفِ آخر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہاں! البتہ "مذہبیات" میں ان کی ذاتی رائے کو کبھی بھی مقبولیت حاصل نہ ہو سکی اور نہ وہ "اہل جمہور" کے ہم نوا ہوسکے۔

بحیثیتِ مدیر نیاز کے شعور و تحت الشعور کی پرتیں "ملاحظات" میں کھلتی چلی گئی ہیں۔ کوئی ایسا موضوع شاید ہی رہا ہو جس پر نیاز نے اظہارِ خیال نہ فرمایا ہو۔ جہاں تک ان کے سیاسی اداریوں کا تعلق ہے جن میں انھوں نے مختلف مواقع پر اپنے خیالات کا برملا اظہار کیا تھا، ان میں تعمق و وسعت پائی جاتی ہے۔ ان کی دوربین نگاہوں کی زد میں مقامی منصۂ سیاست ہی نہیں عالمی سیاست کا میدان رہا کرتا تھا۔ انھوں نے سیاسی اتھل پتھل کا جائزہ لے کر مستقبل کے لئے جو حتمی دعوے کئے ہیں (جو آج صحیح ثابت ہو رہے ہیں) ان کی سیاسی بصارت کا پتہ دیتے ہیں۔ اس دور کے سیاسی معاملات کو سامنے رکھ کر اگر ہم نیاز کے تجزیات کا مطالعہ کریں تو بلا تامل یہ کہہ سکتے ہیں کہ نیاز نے صحیح نتائج اخذ کرنے میں بڑی حد تک غلطی نہیں کی ہے۔

نگار کے اجرا کے چند برسوں بعد تک نیاز نے اپنے اداریوں کو سیاسی موضوعات سے علاحدہ رکھا، لیکن جب انھوں نے اس موضوع پر قلم اٹھایا تو ساری عالمی سیاست ان کے قلمرو میں داخل ہو گئی۔ سیاسی سطح پر رونما ہونے والے عالمی واقعات پر اس دور میں نظر رکھنا آسان نہیں تھا، لیکن نگار کے صفحات میں ہم دیکھتے ہیں کہ انھوں نے اپنے قارئین کے ذوق اور رسالے کی پالیسی کی مناسبت سے سیاسی معاملات پر بڑے ماہرانہ انداز سے قلم اٹھایا ہے اور ان کا صحیح تجزیہ کر کے اپنے قارئین کو متوازی و موزوں راہِ عمل کی جانب رہنمائی کی ہے۔ عالمی سیاست پر ان کی نظر اور رونما ہونے والے سیاسی واقعات سے استنباط کئے ہوئے نتائج ان کی سیاسی بصیرت و تدبر کے غماز ہیں۔ امریکہ و اسرائیل کی فلسطین کے خلاف پس پردہ گٹھ جوڑ کی وجوہات کا تجزیہ کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے۔

> "اگر یہ صحیح ہے کہ فلسطین میں یہودیوں کو بسانے کے ذمہ دار برطانیہ و امریکہ ہیں تو یہ بھی غلط نہیں کہ برطانیہ و امریکہ کا یہ طرز عمل کسی مذہبی یا انسانی ہمدردی کی بنا پر نہ تھا بلکہ نتیجہ تھا یہودیوں کے علمی و اقتصادی اقتدار کا جو جنگ کے دوران ہی قائم ہو چکا تھا اور جس نے بعد از جنگ ایسی جذباتی رد کی شکل اختیار کر لی کہ اس کا مقابلہ امریکہ و برطانیہ کے بس کی بات بھی نہ تھی۔"
>
> (نگار: جنوری۔ فروری ۵۱ء ص ۱۱۱)

آج معاشیات کے ماہرین اور امریکہ میں رونما ہونے والے اقتصادی حالات بتا رہے ہیں کہ امریکہ کی اقتصادیات مکمل طور پر اسرائیل کے کنٹرول میں ہے جس کی وجہ سے امریکہ اس کے سامنے "بلّی" بنا ہوا ہے۔

جنوری ۵۲ء میں نیاز چند دنوں کے لئے پاکستان گئے تھے۔ دورانِ قیام انھوں نے نئے پاکستان کے سیاسی حالات کا جائزہ لیا اور جن نتائج پر وہ پہنچے انھیں نگار کے صفحات میں یوں پیش کر دیا۔

> "(پاکستان کے) اندرونی مسایل میں اس وقت اہم ترین مسئلہ مہاجرین کی آبادی کا ہے اور بیرونی مسایل میں کشمیر کا جو وہاں کے بہت سے تعمیری منصوبوں میں حایل ہے۔"
>
> (نگار: اپریل ۵۲ء ص ۵)

ان مسائل کے حل کی جو تجاویز نیاز نے پیش کی ہیں، یقیناً وہ سیاسی بصیرت رکھنے والے ہی کا کام ہے۔ فرماتے ہیں ——

"ضرورت ایسے انتظام کی ہے کہ وہ (مہاجرین) اپنی اہلیت کے لحاظ سے ملک کے مختلف حصوں میں تقسیم کر دیئے جائیں اور کوئی مخصوص مقام ان کا مرکز نہ بننے پائے۔" (ایضاً ص ۶)

رہا پاکستان کا بیرونی مسئلہ یعنی مسئلہ کشمیر جو آج بھی ہند و پاک کے لئے ایک چیلنج بنا ہوا ہے۔ نیاز کے خیال میں ——

"کشمیر کا مسئلہ اس میں شک نہیں بڑا نازک مسئلہ ہے اور اس کا حل بظاہر کوئی نظر نہیں آتا کیونکہ جن کے ہاتھ میں اس کا فیصلہ دے دیا گیا ہے ان کے مصالح کا تقاضہ یہی ہے کہ اس کو برابر ملتوی کرتے جائیں۔" (ایضاً ص ۶)

فیصلہ کرنے والوں کی مصلحت کوشی کا تجزیہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا۔

"ان کے سامنے سوال نہ ہندوستان کی دوستی کا ہے نہ پاکستان کی حمایت کا بلکہ صرف اپنی مصلحت کا اور اس مصلحت کا تعلق صرف کمیونسٹ تحریک سے ہے ....
اشتراکیت امریکن بلاک کے لئے حد درجہ تشویش ناک صورت اختیار کرتی جا رہی ہے، اس لئے وہ کشمیر کا سودا اسی کے ساتھ کریں گے جو اشتراکیت کا مقابلہ کرنے میں ان کا سب سے زیادہ قوی حلیف ثابت ہوگا۔ اور اس فیصلہ کا وقت شاید ابھی نہیں آیا ہے۔" (ایضاً ص ۶)

نیاز کی یہ دور اندیشی اور سیاسی سطح پر پیش آنے والے واقعات پر قبل از وقت پیشگوئی آج صدفی صد صحیح ثابت ہو رہی ہے۔ ہم سبھی جانتے ہیں کہ جب تک کمیونزم اور کمیونسٹ بلاک U.S.S.R. برسر اقتدار تھے اور امریکہ کا زیادہ جھکاؤ بجائے ہند کے پاکستان کی طرف تھا، کیونکہ اسلامی ملک (نام نہاد ہی سہی) ہونے کی وجہ سے "کمیونزم" کے لئے بغض و عناد پاکستانی عوام کی اجتماعی نفسیات بن گئے تھے اور اسی نفسیات کا امریکہ نے خوب خوب فائدہ اٹھایا۔ دشمن کے دشمن کو دوست اور دشمن کے دوست کو دشمن سمجھنے کی" چانکیہ نیتی" کو اس نے اپنا لیا تھا۔ لیکن روس عالمی سیاست میں جیسے ہی مفلوج ہوا امریکہ کا جھکاؤ بجائے پاکستان کے ہندوستان کی جانب ہو گیا۔ ہندوستان میں B. J. P. کی دہشت گردی کے سامنے کانگریس حکومت جب اپاہج ہو گئی اور ملک کی سب سے بڑی اقلیت گاجر مولی کی طرح کاٹی گئی، اس کے عبادت خانوں کو ڈھایا گیا لیکن حکومت اور حکومت کے کارندے مخنث بن کر تماشا دیکھتے رہے، اس وقت سے ہندوستان میں کمیونزم کی سمت رجحان بڑھ گیا ہے اور کچھ بعید نہیں کہ آئندہ انتخابات کمیونزم کے حق میں فیصلہ کر دیں۔ ضمنی چناؤ میں یہ امید افزا کرن صاف دکھائی دے رہی ہے۔ کمیونزم کو ہندوستان میں پنپتے دیکھ کر امریکہ کی در پردہ B. J. P. کی پشت پناہی واضح نظر آ رہی ہے۔ اس طرح ہند و پاک کے حق میں امریکہ اور اس کی زرخرید لونڈی U.N.O. کی دوغلی پالیسی کو نیاز نے قبل از وقت جان لیا تھا۔ نیاز نے سلامتی کونسل کے جانب دارانہ رویہ اور بے ضابطگیوں پر کڑی تنقید کرتے ہوئے مستقبل قریب میں اس کے بے قیمت اور غیر اہم ہو جانے کی پیشین گوئی بھی کر دی تھی۔

"ان بے ضابطگیوں (جنگ کوریا میں دانستہ طور پر امریکہ کی طرفداری) سے یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ سیکورٹی کونسل صرف امریکہ کی خواہش و مرضی کی پابند ہے اور اس کی ساکھ ختم ہونے والی ہے۔" (نگار: اگست ۵۰ء ص ۷)

آج سلامتی کانسل امریکہ کے ہاتھوں کی "کٹھ پتلی" بنی ہوئی ہے۔ عراق، فلسطین اور اسرائیل کے مسائل میں وہ اول الذکر دونوں ملکوں کے خلاف امریکہ کی ایماء پر کارروائی کر سکتی ہے اور اقتصادی بائیکاٹ کو ان کے حق میں روا رکھ سکتی ہے لیکن ثانی الذکر (اسرائیل) کی بے جا ریشہ دوانیوں اور انسانیت و اخلاق سوز کارروائیوں کے خلاف اقدام تو کیا ایک معمولی سی قرار داد منظور کرنے کی بھی روادار نہیں ہے۔ جس کی وجہ سے مشرق وسطی، فرانس اور چین جیسے کئی ممالک بھی اس کی جانب شک کی نگاہ سے دیکھنے لگے ہیں۔

نیاز نے مارس ہنڈس کے سیاحت نامہ "ایک مستقبل کی تلاش" کو جب نگار جنوری فروری ۵۱ء کے خاص نمبر کے لئے منتخب کیا تو مشرق وسطی

کی سیاحت سے مصنف نے اخذ کئے ہوئے نتائج کا نیاز نے ۳۲ صفحات میں ایسا زبردست تجزیہ کیا کہ وہ آج بھی صحیح ثابت ہو رہا ہے۔ انھوں نے عرب ممالک کے بالمقابل اسرائیل کے ترقی کر جانے کی وجوہات کا بڑا تفصیلی جائزہ لیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ (۱) علمی پس ماندگی، (۲) زراعت میں سائنسی اور تکنیکی پچھڑا پن، (۳) اقتصادیاتی بدنظمی، (۴) عدم اتحاد اور (۵) سب سے بڑھ کر ان کی کاہلی عربوں کے لئے سدِ راہ بنی ہوئی ہیں۔

بیرونی سیاسی معاملات کا تجزیہ کرنے میں مولانا نیاز کا سیاسی شعور اور ان کی بیدار ذہنیت جس طرح کام کرتے رہے ہیں، ملک کے اندرونی سیاسی معاملات کا صحیح جائزہ لینے میں بھی انھوں نے اپنی تبحرِ علمی اور سیاسی بصیرت کا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔ ہندوستان میں کانگریس کے ممبران کی ہندو ذہنیت اور ہندوتووادی سیاسی افکار و نظریات کو انھوں نے سیاست و انتظامیہ میں پیچیدگی کی اصل وجوہات گردانا ہے۔ اور انہیں ہی فرقہ وارانہ کشیدگی کی اصل جڑ قرار دیا ہے۔

فسادات؎ ہندوستان کا مقدر بن گئے ہیں۔ جن کی وجہ سے ہندو مسلمان ہر دو قوموں میں ایک دوسرے کے متعلق عدم اعتمادی، دشمنی اور باہمی رنجش کی خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی گئی۔ فسادات کی مرقوم تاریخ میں اولین فساد آسام کے سلہٹ شہر میں ۱۷۸۲ء میں ہوا تھا۔ یہ پہلا ہندو مسلم فساد تھا۔ جس نے فورٹ سینٹ ولیم کے عہدیداروں اور انگریز حکام کو سخت تشویش میں ڈال دیا تھا1؎۔ اس کے بعد سے تو فسادات کا نا ختم سلسلہ شروع ہو گیا اور اس میں تا حال اقلیتوں بالخصوص مسلمانوں ہی کے خون کی ارزانی ثابت ہو رہی ہے۔

۱۸۰۹ء میں ہوا بنارس کا فساد جو ہندوؤں کی سراسر ہٹ دھرمی اور غنڈہ گردی کا بدترین نمونہ ہے اور جو ہندوؤں کی غلطی کی وجہ سے رونما ہوا تھا۔ اس فساد میں "تقریباً ۵۰ مساجد مسمار کر دی گئی تھیں اور کئی سو مسلمان شہید کر دیئے گئے تھے۔" 2؎

۱۸۵۱ء اور ۱۸۷۴ء میں بمبئی میں ہوئے فسادات پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ کی شان میں گستاخانہ مضمون لکھنے کی وجہ سے ہوئے۔ 3؎

۱۸۸۶ء میں اٹاوہ اور دہلی میں ہوئے فسادات تو اتنے منصوبہ بند اور سنگین تھے کہ "بڑی تعداد میں بااثر مسلمانوں کو اس شہر کے ڈپٹی کمشنر کے حضور یہ معروضہ پیش کرنا پڑا کہ وہ اس بارے میں مداخلت کریں اور مسلمانوں کو تحفظ فراہم کریں۔" 4؎

ہندو مسلمانوں کے درمیان بڑھتی ہوئی باہمی منافرت اور کشیدگی سے برپا ہونے والے فسادات کے نتائج کا جائزہ لیتے ہوئے بالآخر "THE TIMES" کے نامہ نگار کو لکھنا پڑا کہ۔

> "ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین پائی جانے والی مذہبی اور قومی رقابتوں میں وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ کمی ہونے کے کوئی آثار نظر نہیں آتے اور اگر برطانوی عہدیدار سخت اور سرد قسم کی غیر جانب داری کا رویہ نہ اپنائیں تو کوئی عجب نہیں یہ فرقہ وارانہ رقابتیں جلد ہی پورے ملک کو خانہ جنگی کی آگ میں لپیٹ لیں۔" 5؎

آئے دن تواتر سے ہونے والے فسادات نے ہندو مسلم باشعور اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کے اذہان میں بھی نفرت کے لئے جگہ پیدا کر لی ہے جس کی وجہ سے دونوں قوموں کے ایسے افراد جنھوں نے کبھی فسادات میں حصہ تک نہیں لیا تھا جارحانہ قسم کی فرقہ واریت کے مؤید بن گئے۔ اور اس نفسیات نے

؎ فسادات کے متعلق ساری معلومات ڈاکٹر رفیق زکریا کی معروف کتاب "ہندوستانی سیاست میں مسلمانوں کا عروج" ترقی اردو بیورو دہلی ۱۹۸۵ء سے ماخوذ ہیں۔

1؎ WALTER F. FIRMINGER : The Sylhet District' Records Vol. 1 (1770-1785) P-123-31

2؎ Report of the Indian Statutory Commission Vol-IV, Part I-P 96

3؎ The Bombay Gazette, Feb. 13-1874

4؎ ڈاکٹر رفیق زکریا: "ہندوستانی سیاست میں مسلمانوں کا عروج"، دہلی ۱۹۸۵ء ص ۳۸۵

5؎ ایضاً ص ۸۶ — ۳۸۵

بڑھتے بڑھتے تشویش ناک مرض کی صورت اختیار کرلی ہے کہ برسر اقتدار حکام بھی اس کا صحیح نسخہ تجویز کرنے میں اپنے آپ کو بے بس و مجبور سمجھ رہے ہیں۔
سطحی طور پر ہر فساد کے بعد امن کمیٹی تشکیل دی جاتی ہے اور ایک کمیشن بھی ترتیب دے دیا جاتا ہے، جس کی رپورٹ اس وقت تک مکمل نہیں ہوتی جب تک کہ ۵-۱۰ فساد نہیں ہو جاتے اور پھر اس رپورٹ پر پارلیمنٹ میں ایک تو بحث نہیں ہوتی اور اگر ہوتی بھی ہے تو اسے بہت جلد سرد خانے میں ڈال دیا جاتا ہے۔ نہ فسادیوں کو کبھی سزا ہوتی ہے نہ اصل وجہ فساد کی کبھی سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ بلکہ آزاد ہندوستان میں تو "امن کمیٹی" اور "کمیشن" فرصت کے لمحات بتانے اور "خالہ کے گھر" کی دولت اڑانے کا بہترین ذریعہ بن گئے ہیں۔ ۴۷ء کے بعد سے آج تک کمیشن کی کتنی رپورٹوں پر عمل ہوا ہے؟ ہاں انگریزوں کے دور حکومت میں بھی ان نام نہاد کمیشنوں کی حالت کچھ ٹھیک نہیں تھی، مگر ایماندار انگریزوں نے اس حقیقت کو بخوبی سمجھ لیا تھا۔ چنانچہ سر ولیم ویڈر برن نے انڈر سیکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا کو سرکاری و غیر سرکاری ارکان پر مشتمل ایک کمیشن ترتیب دے کر فسادات کے محرکات کو بہتر طریقہ سے ختم کروانے کا مشورہ دیا تھا تو انڈر سیکریٹری لارڈ رسل Lord Russell کو کہنا پڑا۔

> "ہندوستان میں مذہبی فسادات تو تقریباً ہر سال ہوتے رہتے ہیں اس لئے سیکریٹری آف اسٹیٹ یہ سمجھتے ہیں کہ حکومت ہند کو اس کمیشن کے قیام کی ہدایت دینے کی ضرورت نہیں .... دوسرے لفظوں میں یہ کہا گیا کہ مرض اتنا شدید ہو چکا ہے کہ کسی بھی ڈاکٹر کو بلانے یا تشخیص کروانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔" [۲۶]

انگریزوں کے باوصف ہمارے حکام جان کر بھی نہیں جانتے کہ امن کمیٹیاں اور کمیشنس اپنے معنی و مفہوم یکسر بھول چکی ہیں۔ لہٰذا ان کا قیام عبث ہے۔ امید دلا کر دھوکا دینا ان کا کام رہ گیا ہے۔

باشعور تعلیم یافتہ ہندوؤں کے اذہان جارحانہ فرقہ واریت کو کیسی ہوا دیتے ہیں اس کی مثال ہمیں لوک مانیہ تلک کے اخبار "مرہٹہ" کے اس بیان میں مل سکتی ہے۔ جب گنپتی اتسو کی تقاریب میں مسلمانوں پر رکیک قسم کی طعنہ زنی کی جارہی تھی۔ ہیرس نے انھیں "بدنظمی" اور "قانون شکنی" سے تعبیر کرتے ہوئے مہاراشٹر کے برہمنوں کے خلاف سخت رویہ اختیار کیا تھا جس پر مذکورہ اخبار نے لکھا تھا۔

> ایسے حالات میں سب سے بہتر خدمت جو ایک گورنر سرانجام دے سکتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ بالکل خاموشی اختیار کرے اور جہاں تک ہیرس کا تعلق ہے تو اس کے لئے تو "ان حالات میں خاموشی سے بہتر اور کوئی خدمت نہیں ہو سکتی"۔ [۲۷]

تعلیم یافتہ ہندوؤں کی ایسی متعصبانہ ذہنیت پر اظہار تاسف کرتے ہوئے نیاز نے کہا تھا۔

> "ہندوستان کی بدقسمتی یہ ہے کہ جو مذہبی تنگ نظری یہاں کے ایک جاہل پوجاری میں پائی جاتی ہے وہی ٹنڈن جی اور کاٹجو ایسی تعلیم یافتہ ذمہ دار ہستیوں میں بھی نظر آتی ہے اور جس طرح ایک معمولی جاتری مندر کے پوجاری کے پاؤں دھونا مکتی کا ذریعہ سمجھتا ہے اسی طرح ہندوستان کا ایک بڑے سے بڑا ڈاکٹریٹ کی ڈگری رکھنے والا تعلیم یافتہ انسان بھی اس حرکت کو باعث نجات خیال کرتا ہے۔"
>
> (نگار: نومبر ۵۴ ص ۴)

ہندوؤں کا تعلیم یافتہ طبقہ آج اسی نہج پر سوچ رہا ہے۔ BJP کے مقتدر لیڈران اس کی زندہ مثالیں ہیں۔ عصبیت کو فروغ دینے والی ایسی ذہنیت کے چند افراد کانگریس حکومت میں در آئے ہیں۔ جن کی بدولت اس حکومت نے ہی بابری مسجد کا تالا کھلوایا۔ اسی کے (کانگریس کے) دور حکومت میں پوجا پاٹ کی اجازت ہندوؤں کو دے دی گئی اور اسی کے زمانۂ اقتدار میں باوجود سپریم کورٹ کا ریسور ایودھیا میں تعینات کرنے کے پولس اور ریزرو فورس کے محاصرے میں بابری مسجد ڈھا دی گئی اور حکومت اور اس کے کارندے منہ دیکھتے رہ گئے۔ دراصل اس کے پس پشت کانگریسیوں کی ہندو ذہنیت کو بڑا دخل ہے اور یہ کوئی نئی بات نہیں۔ پنڈت جواہر لعل نہرو کو بھی ایسے حالات سے گزرنا پڑا، لیکن وہ چونکہ پاک طینت اور مخلص انسان تھے

---

[۲۶] ایضاً ص ۳۸۹ — [۲۷] ایضاً ص ۳۹۴

اس لئے اپنی پارٹی میں موجود ایسے لوگوں کو ہمیشہ کچل دیا کرتے تھے۔ چنانچہ نیاز لکھتے ہیں۔

"سب سے زیادہ خطرناک چیز جو کانگریس کے اندر باہر پھیلتی جا رہی تھی فرقہ وارانہ ذہنیت تھی اور نہرو نے سب سے پہلے اسی کو دور کرنا ضروری سمجھا۔........ لیکن یہ کہنا کہ کانگریس کے وہ افراد بھی جو حکومت میں شامل ہیں یا حکومت سے قریب تر ہیں، اس عصبیت سے پاک ہو گئے، صحیح نہ ہوگا۔"

(نگار: مارچ ۵۴ء ص ۴)

پنڈت جواہر لعل نہرو کو کانگریسیوں کی ایسی ذہنیت پر جب بھی شک ہوا، انھوں نے اپنی فراست اور حکمت عملی سے ایسے زہریلے لوگوں کا صفایا کر دیا۔ چنانچہ تقسیم ہند کے بعد جب فسادات کی کثرت، مہاجرین کا مسئلہ، مخالف پارٹیوں کی نکتہ چینی، کانگریسیوں کی باہمی عداوت، اور پارٹی میں افتراق و انتشار ان تمام مسائل نے حکومت کو کمزور کر دیا تھا اس پر طرفہ ٹنڈن جی کی رجعت پسندی، انھوں نے کانگریس کی صدارت ہاتھ میں لیتے ہی چند ایسے فیصلے صادر کر دیئے جن سے محسوس ہونے لگا تھا کہ وہ ہندوستان کو سیکڑوں برس پیچھے لے جانے کا ارادہ رکھتے ہیں تو نہرو نے اس موقع کی نزاکت کو بھانپ لیا اور ٹنڈن جی سے استعفےٰ لے کر کانگریس کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی اور فسادات کے لئے محرک بننے والے ایسے لیڈروں کو ناکارہ کر کے رکھ دیا۔

فسادات کی ایسی ہولناکیوں سے بچنے کے لئے آج کل حکومت ہی کے نہیں بلکہ مسلم دشمن تنظیموں کے Paid Agent مولوی صاحبان مسلمانوں کو صبر و ضبط سے کام لے کر آئینی طور پر فسادات کا مقابلہ کرنے کی تلقین کرنے لگے ہیں اور ان مولویوں کے "بصیرت افروز"، مشوروں پر وہ تنظیمیں بغلیں بجا رہی ہیں۔ نیاز نے فسادات میں مسلمانوں کی حفاظت اور ان کی عزت و ناموس اور جان و مال کی محافظت کے لئے جو موثر اور دیرپا حل تلاش کئے ہیں وہ ان کی مدبرانہ سیاسی ذہنیت کے عکاس ہیں۔ سب سے پہلے تو انھوں نے نفسیاتی نقطۂ نظر سے یک طرفہ صبر و ضبط کی نفی کر دی۔ انھوں نے لکھا ہے۔

"مسلمانوں کو صبر و ضبط سے کام لے کر آئینی طور پر (فسادات) کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ لیکن اس مشورہ کی سطح اس قدر بلند ہے کہ اس پر عمل کرنے کے لئے پہلے فلسفیانہ رجحان پیدا کرنے کی ضرورت ہے اور جب کسی جماعت پر پے در پے مصائب آنا شروع ہوتے ہیں تو اس وقت نہ فلسفہ کام دیتا ہے نہ تصوف بلکہ قدرتاً دو ہی جذبے پیدا ہوتے ہیں۔ انتقام یا فراریت۔ اور یہ دونوں بُرے ہیں۔ انتقام اس لئے برا ہے کہ اس سے فساد بڑھتا ہے گھٹتا نہیں۔ اور فراریت اس لئے بری ہے کہ وہ انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی معصیت ہے۔"

(نگار: ستمبر ۵۴ء ص ۲-۳)

آج کے چند مولوی مسلمانوں کو "اجتماعی معصیت"، میں مبتلا کروا کر اپنی روزی روٹی کا معاملہ حل کروانا چاہ رہے ہیں۔ لیکن ان دونوں مذمومات سے بچنے کے لئے نیاز نے بڑا مفید مشورہ دیا ہے۔

"ہر جگہ ایک ایسی جماعت پیدا کی جائے جن کا مقصود ہی ان خطرات کا سدباب ہو۔.... خود ہندوؤں ہی کے ہاتھ سے اس تنظیم کی بنیاد ڈالی جائے اور اگر مسلمان اپنا نقطۂ نظر صحیح زاویہ سے پیش کریں تو میں سمجھتا ہوں کہ ہندوؤں کی کافی تعداد ان کی ہمدردی کے لئے آمادہ ہو سکتی ہے۔ ہندوؤں کی شرکت سے یہ فائدہ ہوگا کہ اول تو "عناصر شر و فساد" کو ابھرنے کا موقع ملے گا ہی نہیں اور اگر وہ ابھرے بھی تو ہم حکومت اور عمالِ حکومت کے خلاف زیادہ قوت کے ساتھ احتجاج کر سکیں گے۔ (ایضاً ص ۳)

نیاز کے اس لائحہ عمل کو جب تادل حکومت نے اپنایا تو اس کے خوشگوار اثرات پورے ملک میں پھیلے تھے اور "شر پسند" دم دبائے بیٹھے رہ گئے تھے۔ آج بھی اگر "کاشی ہیو پار منڈل" جیسی ہندو تنظیموں کے اشتراک سے ایسی جماعت تشکیل دے دی جائے تو فسادات سے بڑی حد تک محفوظ رہنے

میں کامیابی مل سکتی ہے۔

فسادات سے اپنے آپ کو بچائے رکھنے کے لئے دوسرا مشورہ نیاز نے یوں دیا ہے ـــ

"مسلمانوں کو کانگریس میں مسلمان کی حیثیت سے نہیں بلکہ باشندۂ ہندوستان کی حیثیت سے شریک ہونا چاہئے۔" (نگار : دسمبر ۴۷ء ص ۴)

آج جبکہ ہندوؤں کے نزدیک بقول نیاز "ہندوستان کا مسلمان .... زیادہ مسلمان ہے۔ نیاز کا درج بالا مشورہ بڑا اہم دکھائی دیتا ہے۔ لیکن بھلے ہی اس میں نیاز کا خلوص جھلک رہا ہو یہ تو صریحًا قومی دھارے میں بہہ جانے کی دعوت ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کو اپنا تشخص برقرار رکھتے ہوئے جینا ہے۔ ہاں! ذاتی مفاد کی خاطر ملک کو داؤ پر لگانے کی ذہنیت اس میں نہ ہو کہ یہ مکینہ صفتی اسلام کے عین منافی ہے۔ بحیثیت مسلمان اگر کوئی شخص اپنے خالص اسلامی اخلاق کا مظاہرہ کھلم کھلا کرتا ہے تو اس سے اجتماعی فائدہ ہوگا اور ملک کی ترقی کی راہیں اس کے چھوٹے چھوٹے نورانی اخلاق سے کھلتی چلی جائیں گی۔

باطل قومیں اپنے مذہب پر فخر کا نعرہ لگا سکتی ہیں تو دینِ حق کے اظہار میں اور اس پر نازاں و شاداں رہنے میں ہم کیوں پیچھے رہیں۔

پتہ نہیں، نیاز نے کس بنیاد پر اس " انفرادی معصیت " کو اچھا سمجھ لیا؟ بہرحال! نیاز نے اپنے دور کی مناسبت سے جس میں وہ سانس لے رہے تھے، ملکی سیاست کا بغور جائزہ لیا اور اپنی فہم و فراست سے جو نتائج اخذ کئے اور لائحۂ عمل دیا وہ ان کے سیاسی شعور کے غماز ہیں۔

""

....

رشید حسن خاں ـــــــ نیاز صاحب نے اردو میں علمی تنقید کو تنقید کا جزو مستقل بنا دیا جس سے غلط نگاری، خوش فہمی اور ناتواں بینی کے بہت سے پردے چاک ہوگئے اور احتیاط کا رجحانِ خاص پیدا ہوا۔

پروفیسر حسرت نعمانی ـــــــ مولانا نیاز فتح پوری تنقید نگاری کی صلاحیت قدرت کی طرف سے لے کر آئے ہیں اور شاید ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم سے زیادہ خطرناک قسم کے ذہین آدمی ہیں۔ فنی نکات و نقد سے واقف ہیں اور شعر اور آرٹ کی مختلف قدروں کو پہچاننے کی اہلیت رکھتے ہیں۔

پروفیسر سیّد وقار عظیم ـــــــ نیاز کے افسانے پریم چند یا سدرشن کی طرح کسی مخصوص سوسائٹی کے مرقعے نہیں ہیں۔ غالبًا وہ مقامی رنگ یا کسی مقصد کا شامل کرنا افسانہ کے لئے غیر شاعرانہ سا خیال کرتے ہیں جس سے افسانہ کی نزاکت اور حسن کو ٹھیس لگتی ہے۔

وقت کی کسوٹی پر نیاز فتحپوری کے اداریے

رضوان احمد
مشیر ادارت
روزنامہ قومی تنظیم
پٹنہ ۸۰۰۰۰۴



[**رضوان احمد** منجھے ہوئے صحافی اور افسانہ نگار ہیں۔ یہ مضمون انھوں نے ہماری فرمائش پر ترتیب دیا ہے۔ ظاہر ہے فاضل مصنف نے حضرت نیاز سے تحریر کردہ اداریوں کا جائزہ اپنے طور پر لیا ہے۔ لیکن ایک بات کی وضاحت یہاں ضروری معلوم ہوتی ہے۔ رضوان احمد صاحب نے حضرت نیاز کے ترک وطن کا حوالہ مضمون میں بار بار دیا ہے۔ نیاز ۱۹۶۲ء میں ہندوستان سے پاکستان چلے گئے تھے۔ ان کے ترک وطن کے ظاہری اور معلوم اسباب کئی مضامین میں بیان کیے جا چکے ہیں۔ ہندوستان سے ہجرت کرکے پاکستان کی وطنیت اختیار کرنے کا فیصلہ ذاتی اور اچانک ہو سکتا ہے۔ لیکن تقسیم ہند کے بعد سے ہی نیاز صاحب خیال ترک وطن کی طرف مائل تھے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر شوکت سبزواری کے مضمون "نیاز کا مذہب" مشمولہ نگار پاکستان سالنامہ [نیاز نمبر] ۱۹۶۳ء صفحہ نمبر ۱۱۱ سے یہ اقتباس پیش کیا جا سکتا ہے جس میں انھوں نے صاف لکھا ہے کہ ۱۹۵۱ء میں نیاز ہندوستان چھوڑ دینا چاہتے تھے۔

" مئی ۱۹۵۱ء میں نیاز صاحب میری کتاب "اردو زبان کا ارتقا" شائع کرنا چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں ڈھاکہ سے میرٹھ جاتے ہوئے لکھنؤ میں ان سے نیاز حاصل ہوا۔ تو انھوں نے فرمایا "میں ترک وطن کرنا چاہتا ہوں۔ ڈھاکہ میں قیام کروں گا اور وہیں سے "نگار" نکالوں گا۔ "نگار" کے لیے ایک مکان کی ضرورت ہوگی۔ فضلی صاحب سے (جو اس وقت مشرقی پاکستان میں معتمد تعلیمات تھے) کہیے، میں کچھ نہیں چاہتا "نگار" کے لیے کوئی مکان یا بدرجہ اقل مقام کا انتظام کر دیا جائے۔ جہاں بیٹھ کر میں اردو زبان و ادب کی خدمت کر سکوں۔ نیاز صاحب کی یہ درخواست لے کر میں ڈھاکہ پہنچا تو ایک بزرگ سے جن کا میں احترام کرتا تھا اس کا ذکر کیا۔ میں نے کہا خوشی کی بات ہے نیاز صاحب پاکستان آنا چاہتے ہیں اور انھوں نے غالباً اردو کی خدمت کی غرض سے پاکستان کے اس حصے کو منتخب کیا ہے۔ فضلی صاحب کے نام میں ان کا پیغام لایا ہوں۔ نگار کے لیے کوئی مناسب مکان مل جائے تو وہ ڈھاکہ چلے آئیں گے۔ یہ سن کر وہ صاحب برہم ہوئے اور کہنے لگے۔ "نیاز صاحب کا یہاں آنا مناسب نہیں۔ ان کے مذہبی خیالات سے تم واقف ہی ہو۔ یہاں آکر وہ بے نیل بھیانہیں گے"۔ میں نے نیاز صاحب کی تائید میں کچھ کہنا چاہا تو انھوں نے یہ کہہ کر خاموش کر دیا۔ "تم ابھی مشرقی پاکستان کے حالات سے واقف نہیں۔ میں جانتا ہوں۔ ہرگز اس امر کی اجازت نہ دوں گا کہ تم فضلی صاحب سے اس کا ذکر کرو"۔

ہرچند میں ان بزرگ کی اس رائے سے متفق نہ تھا لیکن ان کا احترام مد نظر تھا۔ مجھے ان کی خاطر عزیز تھی۔ اس لیے ان کی اجازت کے بغیر فضلی صاحب تک نیاز صاحب کا پیغام پہنچانے کی میں جسارت نہ کر سکا۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ نیاز صاحب کو پاکستان آنے کے لیے گیارہ سال انتظار کرنا پڑا اور مشرقی پاکستان جسے نیاز جیسے اردو نواز انشاء پرداز کی سخت ضرورت تھی نیاز و نگار کی ادبی و لسانی خدمات سے محروم رہ گیا۔ کیا اس سے اردو کو نقصان نہیں پہنچا۔ ؟

افسوس کہ اس حقیقت کی طرف نیاز کے محققین کی نظر نہیں جا سکی۔ اور لکھنے والے یہی لکھتے ہیں کہ نیاز صاحب نے ذاتی اور گھریلو معاملات کی بنا پر پاکستان جانے کا فیصلہ اچانک کر لیا۔

بہرحال رضوان احمد کے پاس اپنے دلائل ہیں جن کی بنیاد پر انھوں نے اپنے مضمون کو کھڑا کیا۔

مدیر انشا۔]

اداریے ہنگامی موضوعات پر لکھے جاتے ہیں اور ان کی حیثیت وقتی ہوتی ہے۔ مگر جب علامہ نیاز فتحپوری جیسی ہنگامہ خیز شخصیت اداریے لکھے تو ان کی حیثیت وقتی نہیں ہو سکتی۔ اس لیے وہ اداریے ہنگامی موضوعات پر ہونے کے باوجود زمان و مکان سے پرے نکل جاتے ہیں۔

نیاز فتحپوری "نگار" میں ملاحظات کے عنوان سے اداریے لکھا کرتے تھے۔ اگرچہ "نگار" ایک ادبی رسالہ تھا مگر اس کے اداریے حالات حاضرہ پر ہوا کرتے تھے، جلتے اور سلگتے ہوئے موضوعات کا احاطہ کرتے تھے۔ اداریوں میں وہ ادبی موضوعات پر کم ہی بحث کرتے تھے شاید اس خیال سے کہ زیادہ مواد تو ادبی ہی ہوا کرتا تھا۔ وہ اکثر و بیشتر سیاسی مسائل پر رائے زنی کرتے تھے۔ کبھی کبھی مذہبی، لسانی، ثقافتی موضوعات پر بھی اظہار خیال کرتے تھے۔

اس سے تو کسی کو کلام نہیں کہ نیاز فتحپوری ایک عبقری شخصیت تھے جو تمام اصناف پر حاوی تھی۔ نیاز نے کبھی آغاز میں شاعری کی تھی مگر ان کی شاعری کا ذکر کم ہی ہوتا ہے لیکن ان کی نثر پڑھنے سے احساس ہوتا ہے کہ وہ سر تا سر شاعر تھے۔ ان کی طلسمی اور رومانی کہانیوں کی نثر بالکل شاعری ہے۔ ان کی تنقیدی نثر پر بھی شعری زبان کا اثر ہے مگر ان کے اداریوں کی زبان بالکل مختلف ہے۔ ان میں وہ شاعری والی نازک سبک ی ر نگی و پھ پھ ی آرائشگی نہیں ملتی بلکہ اس میں کھردراپن ہے۔ ظاہر ہے کہ انھوں نے دانستہ طور پر نثر میں یہ لب و لہجہ اختیار کیا ہے۔ نیاز کی نباضی حالات حاضرہ ی ملاں کرنے میں بے حد کامیاب ہے۔ انھوں نے اداریے صرف ملکی حالات پر نہیں لکھے بلکہ بین الاقوامی سطح پر ان دنوں جو بھی مسئلہ ابھر کر سامنے آیا وہ نیاز کے قلم کی زد میں ضرور آیا ہے۔ یہی ایک سچے اور کھرے صحافی کا منصب بھی ہے کہ وہ گرد و پیش کے تمام حالات پر نظر رکھے اور ان کو اپنے قلم کی گرفت میں لے۔ نیاز جہاں اپنے افسانوں میں زمین اور آسمان کے درمیان معلق نظر آتے ہیں وہیں وہ اپنے اداریوں میں سخت زمین پر کھڑے نظر آتے ہیں۔ حقائق سے آنکھیں چار کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور حالات سے برد آزمائی کرتے ہوئے مل جاتے ہیں اور ایسے میں ان کا پورا ... صرف لہجہ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

ایک طرح سے "نگار" کے اداریے اپنے زمانے کی تاریخ بھی ہیں۔ انھوں نے گزرنے والے ہر واقعے کو قلم بند کر لیا ہے اور اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے اپنا نظریہ بھی واضح کر دیا ہے۔ نیاز کی خوبی یہی ہے کہ وہ جس بات سے اتفاق نہیں کرتے اس کا برملا اظہار کر دیتے ہیں اور ایسا ہر جگہ جاتے تو اس مسئلے پر ان کی رائے دوسروں سے مختلف ہوتی ہے۔ یعنی ہر مسئلے پر وہ ایک مختلف زاویہ نظر رکھتے ہیں اب یہ الگ بات ہے کہ آپ اس سے اتفاق کریں یا نہیں مگر ان کی تحریر پڑھتے وقت تک تو آپ ان کے استدلال کے قائل ہو ہی جاتے ہیں یعنی ایک طرح سے وہ قاری کو اپنے سحر میں مبتلا کر رکھتے ہیں۔

نیاز کے اداریوں کا ایک اہم عنصر ان کا طنز ہے ان کے طنز کی کاٹ بڑی شدید ہوتی ہے چونکہ وہ باتیں منطقی انداز میں لکھتے ہیں اس لیے اس کو رد کرنا آسان نہیں ہوتا۔ ۱۹۴۷ء سے قبل تو اظہار خیال کی ویسی آزادی نہیں تھی اس لیے حکومت کو تنقید کا نشانہ بنانے سے بہت سے مسائل تھے مگر آزادی کے بعد انہوں نے کھل کر حکومت کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ مثلاً تین برس کسی قوم کی زندگی میں کوئی بڑا عرصہ نہیں ہوتا یہ بات سبھی جانتے ہیں ان کو اندازہ ہے کہ وہ آزادی کے صرف تین برس بعد ناکارکردگی کا نشانہ حکومت کو بنائیں گے تو ان کی بات مجذوب کی بڑ سمجھی جانے کی اس لیے وہ اسے بانداز دگر کہتے ہیں۔ ایک اداریے میں وہ ہندوستان کا موازنہ چین سے کرتے ہیں جس کی آزادی کو صرف ایک برس ہوا ہے اور نشان ...بر توڑتے ہیں۔

> ہندوستان کو جب آزادی ملی تو صدیوں سے اس پر کسی ملک نے حملہ نہ کیا تھا اور وہ بالکل منظم حالت میں تھا۔ چین جب آزاد ہوا تو اس حال میں کہ ... خون ریزی و غارت گری کا آماج گاہ بنا ہوا تھا۔ ہندوستان کو آزادی ملی تو اس طرح جیسے کسی کو چلتی ہوئی مشین مل جائے، چین کو آزادی ملی تو اس حال میں جیسے کسی کو کھنڈر سونپ دیے جائیں لیکن باوجود اس کے ہندوستان تین سال میں کچھ بھی

نہ کر سکا اور چین نے ایک سال میں وہ کچھ کر دکھایا جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اس فرق کا سبب یہ ہو کہ چین نے اپنی آزادی اپنا خون بہا کر حاصل کی ہے اور ہندوستان کو یہ سعادت نصیب نہیں ہوئی۔"

نگار - مارچ ۱۹۵۱ء

یہ ہے نیاز کے طنز کا انداز کہ کچھ نہ کہہ کر بھی بہت کچھ کہہ گئے اور حقیقتاً جو کچھ کہنا تھا وہ سب بین السطور بیان کر دیا وہ ایک دیدہ ور تھے اس لیے ان کا سارا جسم آنکھیں بن کر ساری دنیا کا جائزہ لیتا تھا، پیش آنے والے واقعات و حادثات پر نظر رکھتا تھا صرف گرد و پیش پر ہی نہیں دور از دور پر بھی۔ مگر ان کو الفاظ میں اسیر کرنے کی جو مجبوری سب کے ساتھ ہوتی ہے خواہ وہ کتنا بڑا پختہ کار صاحب قلم ہی کیوں نہ ہو وہ نیاز کے سامنے بھی تھی۔ نیاز زبان پر تو حاوی تھے ہی تمام اصناف پر بھی ورک رکھتے تھے اس کے باوجود اپنی مجبوری ظاہر کرتے ہیں۔

"آج کل حالات اس قدر تیزی سے بدل رہے ہیں کہ ان کو سامنے رکھ کر مستقبل کے متعلق کوئی پیشن گوئی نہیں کی جا سکتی اختلافات پہلے بھی ہوتے تھے اور یقیناً بغیر اسباب کے نہ ہوتے تھے۔ لیکن وہ اس قدر جلد پیدا ہوتے تھے۔ ان کے نتائج میں اتنی شدت و تیزی ہوتی تھی پہلے صدیوں کا اندازہ سو سال کے زمانہ ہی کو سامنے رکھ کر کیا جاتا تھا اس لیے غور و تدبیر دونوں کے لیے کافی وقت مل جاتا تھا۔ لیکن اب کہ صدیاں ہفتوں کے اندر گزر جاتی ہیں اور پلک جھپکانے کا وقفہ سالہا سال کے برابر ہے انسان کیا سوچے اور اہل تدبیر کی درماندگی کی شکایت کس سے کرے۔ تاہم ایک بات ضرور سمجھ میں آتی ہے اور وہ یہ کہ دنیا کا نقشہ بدلنا ضروری ہے۔

نگار - اپریل ۱۹۵۱ء

مندرجہ بالا اداریہ کوریا کی جنگ کی تمہید ہے۔ ساری دنیا کی شورش کا جائزہ لیتے ہوئے وہ کوریا سے چل کر ایران اور پھر کشمیر پر آجاتے ہیں اگلے ہی شمارہ میں یہی موضوع ان کے لیے زیادہ کشش اختیار کرتا ہے اور وہ "کوریا کی جنگ عالمگیر جنگ کی تمہید ہے" کے عنوان سے اظہار خیال کرتے ہیں۔

"اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے ایک مریض شدید تپ میں مبتلا ہو اور کسی وقت جب اس کا ہذیان کم ہو جائے تو اس کے تیمار دار یہ سمجھ کر خوش ہو جائیں کہ اب بیمار اچھا ہو چلا ہے حالانکہ طبیب جانتا ہے کہ تپ اس وقت تک دور نہیں ہو سکتی جب تک اس کا حقیقی سبب زائل نہ ہو۔ بالکل یہی حال کوریا کی لڑائی کا ہے کہ اس کا تعلق نہ جنرل میک آرتھر کی ذات سے ہے نہ ٹرومین کی شخصیت سے بلکہ اس عالم خوف و جنون سے ہے جو اشتراکیت کے اندیشہ سے اس وقت تمام سرمایہ پرست حکومتوں پر طاری ہے اور جس کے دور ہونے کی بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی۔"

اسی اداریہ میں آگے چل کر لکھتے ہیں "تازہ خبروں سے پتہ چلتا ہے کہ کوریا کی اشتراکی فوجوں نے ۷ لاکھ کی سپاہ سے پھر حملہ کر دیا ہے اور اتحادی فوجوں کو پیچھے ہٹنا پڑ رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ دباؤ زیادہ بڑھ کر اتحادی افواج کو پھر اسی خط دفاع تک پہونچا دے جہاں سے ان کا جارحانہ اقدام شروع ہوا تھا۔ لیکن اشتراکی فوجوں کی یہ کامیابی بھی کوئی فیصلہ کن چیز ثابت نہ ہوگی۔ اس سے قبل یہ مد و جزر کتنی بار دیکھا جا چکا ہے اور آئندہ بھی یہی سلسلہ برابر جاری رہے گا تاآنکہ امریکہ کی پالیسی نہ بدلے اور اتحادی افواج کوریا سے واپس نہ آجائیں یا یہ کہ چین کی اشتراکی فوجوں کی قوت بالکل ٹوٹ نہ جائے اور یہ دونوں بظاہر ناممکن العمل نظر آتی ہیں"۔

نگار - مئی ۱۹۵۱ء

یوں تو نیاز نے "ملاحظات" میں مختلف النوع موضوعات پر اظہار خیال کیا ہے مگر بین الاقوامی اور ملکی خانوں میں تقسیم کر دیا جائے تو

بین الاقوامی سطح پر ان کے موضوعات گھوم پھر کر امریکہ اور روس کی سیاست پر آکر تھم جاتے ہیں۔ خواہ مشرق وسطی کے مسائل ہوں یا ایران کے، کوریا کی جنگ ہو یا منچوریا کی ان کو دو طاقتیں ہی نبرد آزما نظر آتی ہیں اور یہ امریکہ و روس ہیں۔ یہی حقیقت بھی ہے۔ تمام مسائل کے پس پشت یہی دونوں طاقتیں رہی ہیں۔ نیاز عام طور پر امریکہ کو ہدف ملامت بناتے ہیں۔ اشتراکیت کے حامی نہیں ہیں مگر اس کے تئیں نرم گوشہ ضرور رکھتے ہیں۔ زمانے میں اٹھنے والے ہر فتنے کے لیے وہ امریکہ کو ہی مورد الزام ٹھہراتے ہیں۔ ان کو سب سے بڑی شکایت یہ ہے کہ

"روس کے پاس ۲۰۰ ڈویژن فوج کیوں موجود ہے، وہ کیوں اپنی بحری قوت کو نہایت تیزی سے بڑھاتا جارہا ہے، اس کے ہوائی جہازوں کی تعداد کیوں روز بروز زیادہ ہوتی جارہی ہے۔ آٹم بم اس نے کیوں تیار کر لیا، مختلف قسم کی مہلک گیسیں اس نے کیوں دریافت کر لیں، اس کے پاس ذخائر حرب کی کمی کیوں نہیں۔ اس نے یہ اندیشہ کیوں پیدا کر دیا ہے کہ معلوم نہیں وہ کس وقت مغربی یوروپ پر حملہ کر دے اور بحرالکاہل پر چھا جائے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر یہ سب کچھ صحیح ہے تو کیا یہ اشتراکی نظام کی برتری کا ثبوت نہیں ہے اور اگر آہستہ آہستہ یہی نظام دنیا میں پھیلتا جارہا ہے تو امریکہ کو اس سے کیوں تکلیف پہونچتی ہے اور وہ کیوں اس کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا ہے۔

نگار -- مئی ۱۹۵۱ء

"نگار" کے اس نگار خانے میں مختلف النوع تصویریں نظر آتی ہیں مگر ایک بات غور کرنے کی ہے کہ نیاز جب عالمی موضوعات پر لکھتے ہیں تو بہت کھل کر لکھتے ہیں۔ اپنے ما فی الضمیر کو واضح طور پر ادا کرتے ہیں جس کو بھی ہدف بناتے ہیں اس کے بخئے ادھیڑ کر رکھ دیتے ہیں مگر جب وہ ملکی مسائل پر لکھتے ہیں تو ان کا لہجہ یا تو دھیما ہو جاتا ہے یا اشارے کنائے سے کام لینے لگتے ہیں یا نظریں بچا کر نکل جاتے ہیں صورتحال اور ابتر اس وقت ہو جاتی ہے جب وہ ہجرت کرتے ہیں لکھنو سے کراچی چلے جاتے ہیں اور "نگار لکھنو" کے بجائے وہ "نگار پاکستان" بن جاتا ہے۔ ان کی ہجرت خاندانی چپقلش کی مجبوریاں تھیں مگر وہاں ان کا مارشل لاء سے سامنا ہوتا ہے اور ان کی آواز گھٹ کر رہ جاتی ہے وہ ایک طرح سے بالکل confuse ہو کر رہ جاتے ہیں۔

"نگار لکھنو" اور "نگار پاکستان" دونوں کے ملکی موضوعات میں انھوں نے ہند۔ پاک تعلقات، مسئلہ کشمیر، مسلمانوں کے مسائل پر زیادہ اظہار خیال کیا ہے۔
مثلاً مسئلہ کشمیر کو ہی لے لیجئے۔

"ہندوستان پاکستان کی راہ میں نزاع کشمیر ایک ایسا سنگ گراں ہے جس کے ہٹائے بغیر دونوں کے تعلقات کا خوشگوار ہونا ممکن نہیں ہے لیکن بد قسمتی سے اس کے ہٹنے کی بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی ہے۔"

نگار - اگست ۱۹۵۵ء

"کشمیر کے مسئلہ پر اس وقت تک مختلف پہلوؤں سے غور کیا گیا ہے جن کا تعلق زیادہ تر سیاسی و قانونی نقطۂ نظر سے ہے۔ قانونی حیثیت سے اس سلسلہ میں بھارت و پاکستان دونوں اپنے دلائل رکھتے ہیں اور دونوں اپنے اپنے دلایل کی معقولیت پر دستاویزی شہادتیں پیش کرتے ہیں لیکن اول تو قانون خود اپنی جگہ کوئی ایسی قطعی اور فیصلہ کن چیز نہیں کہ اس میں کسی تاویل کی گنجائش نہ ہو اور فریقین کو ہر طرح سے مطمئن کیا جا سکے"۔

مسئلہ کشمیر عقلی نقطۂ نظر سے "نگار - اپریل ۵۸۔

مگر پاکستان جاتے ہی کشمیر کے مسئلے پر نیاز کا ذہن یکسر تبدیل ہو جاتا ہے ان کی فکر کا انداز بدل جاتا ہے ایک لحاظ سے وہ بالکل ہی ذہنی خلفشار میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اپنی ادارت میں شائع ہونے والے نگار پاکستان کے پہلے ہی شمارے میں وہ "مسئلہ کشمیر" کے عنوان سے اظہار خیال کرتے ہیں

"بھارت و چین کی آویزش کے سلسلے میں بعض ایسے سیاسی مسائل بھی سامنے آگئے ہے جن کو تعطل میں ڈال دیا گیا تھا اور ان میں سے ایک مسئلہ کشمیر بھی ہے جس کے متعلق اس دوران میں بعض عجیب و غریب خبریں سننے میں آئیں۔ مغرب کے بعض اخبارات نے یہ تجویز پیش کی کہ "بھارت و پاکستان" کو وفاقی حکومت میں تبدیل ہو جانا چاہیے بعض نے یہ کہا کہ کشمیر پر بھارت و پاکستان دونوں کا مشترکہ اقتدار مناسب ہے۔ خیر یہ باتیں تو صرف تفریحی حیثیت رکھتی ہیں لیکن حیرت کی بات ہے کہ خود پنڈت نہرو کا بھی یہ ارشاد کہ اگر پاکستان رائے شماری کو ضروری چیز قرار دیتا ہے تو اس کی بنیاد مذہب پر نہیں بلکہ سیاسی و اقتصادی سوال پر ہونا چاہیے اگر مذاق نہیں تو ایک معمہ ضرور ہے جسے شاید وہ خود بھی حل نہیں کر سکتے۔ مگر وہ یہ سمجھتے ہیں اور بالکل درست سمجھتے ہیں کہ آزاد رائے شماری کا نتیجہ ان کے خلاف ہوگا تو پھر اس کی ضمانت کیا ہے کہ محض سیاسی و اقتصادی اصول کی صوابدید اہل کشمیر کے مذہبی جذبات پر غالب آجائے گی اور وہ غلط یا صحیح یہ نہ کہہ سکیں گے کہ پاکستان نے ہمارا الحاق سیاسی و اقتصادی اصول ہی کی بنیاد پر مناسب ہے۔ ہم یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ مسئلہ کشمیر کا احیاء خود بھارت کی سیاسی فکر کا نتیجہ ہے یا امریکن بلاک کی خواہش و اصرار کا تاہم یہ ضرور ہے کہ وہ ایک بار پھر سامنے آگیا ہے اور وزارتی سطح پر دونوں ملکوں کی گفتگو جو حال ہی میں ہوئی ہے اس سیاسی ہلچل کا نتیجہ ہے جو چین کے جارحانہ (یا بقول اس کے مدافعانہ) اقدامات سے پیدا ہو گئی تھی"۔

نگار پاکستان - جنوری ۱۹۶۳ء

نیاز لکھنو سے ہجرت کر کے جب کراچی پہونچے وہ مارشل لاء کا زمانہ تھا۔ فکر پر پہرے بیٹھے ہوئے تھے۔ فکر کی پرواز کو اسیر کرنے کے دام بچھے ہوئے تھے۔ جمہوری نظام سے آمرانہ نظام میں آجانا ایسا ہی تھا جیسے اجالے میں چلتے چلتے گھنگھور اندھیرے میں قدم رکھ دیئے جائیں اور اندھیرے میں یہ کوئی دیکھ ہی نہیں سکتا کہ اس کے قدم کہاں پڑ رہے ہیں۔ وہ ٹامک ٹوئیاں مارنے لگتا ہے۔ اس بے راہ روی کا احساس خود نیاز کو بھی ہے اس لیے وہ کہتے ہیں۔

"ایک صاحب نے جو پاکستان سے تعلق رکھتے ہیں مجھے لکھا ہے کہ جب تک نگار ہندوستان سے نکلتا رہا اس نے بڑی آزادی و بیباکی سے وہاں کی حکومت و سیاست پر نکتہ چینیاں کیں۔ لیکن یہاں آنے کے بعد اس نے پاکستان کی حکومت و سیاست پر اس وقت تک کوئی رائے زنی نہیں کی اس کا سبب کیا ہے؟ چونکہ یہ سوال پبلک حیثیت رکھتا ہے اس لیے اس کا جواب بھی مجھے اسی حیثیت سے دینا چاہیے۔

اس میں شک نہیں کہ مجھے یہاں آئے ہوئے تقریباً ڈیڑھ سال کی مدت گزر چکی ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ میں نے یہ زمانہ یہاں آنکھ بند کر کے نہیں گزارا تاہم پاکستان کے تمام اندرونی و بیرونی مسائل سمجھنے کے لیے جتنی فرصت کی ضرورت ہے۔ وہ ہنوز مجھے حاصل نہیں ہوئی اور اس لیے میں اس وقت تک اس موضوع پر گفتگو کرنے سے محترز رہا"۔

"حکومت پاکستان"۔ نگار پاکستان - اپریل ۱۹۶۴ء

لیکن دراصل بات یہ نہیں ہے نیاز کو احساس ہو چکا تھا کہ اب انھیں جو کچھ بولنا ہے بہت ناپ تول کر بولنا ہے جو کچھ لکھنا ہے اس پر سو بار غور کرنا ہے کیوں کہ اس کے دور رس نتائج ہو سکتے ہیں اس لیے "نگار پاکستان" میں لکھے "ملاحظات" میں ایک طرح کی اکتاہٹ اور جھنجلاہٹ ہے یہ صرف ڈھلتی عمر کے اضمحلال کا نتیجہ نہیں ہے۔ بلکہ اس قید و بند کا نتیجہ ہے جس کا عکس پاکستان کے شاعر اقبال ساجد کے اس شعر میں ملتا ہے۔

پتہ کیسے چلے لوگوں کو قصر دل کے جلنے کا
دھوئیں کو راستہ ملتا نہیں باہر نکلنے کا

پندرہ سولہ سال قبل میں نے پاکستان کے سب سے بڑے اخبار "جنگ" کے مدیر اعلیٰ مرحوم میر خلیل الرحمان سے دریافت کیا تھا کہ آپ اپنے اخبار میں زیادہ تر ہندوستان کی خبریں شائع کرتے ہیں اور سارا نزلہ اس ملک پر نکالتے ہیں سخت سے سخت تنقید کرتے ہیں مگر اپنے ملک کی حکومت پر قطعی تنقید نہیں کرتے انھوں نے مسکرا کر کہا "اس کی بالکل صاف وجہ ہے کہ ہندوستان کی خبروں یا تنقیدی رشحات پر ہمیں سنسر افسر کی منظوری نہیں لینی پڑتی"۔

آزادیٔ فکر پاکستان کے صحافیوں کے لیے ایک سراب کے سوا اور کچھ نہیں رہی البتہ اس کو حاصل کرنے کی خواہش اور چھٹپٹاہٹ ان کے اندر ضرور رہی ہے نیاز فتحپوری کے جانشین ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے "نگار پاکستان" میں میرے اداریوں کے مجموعہ "مجھے بولنے دو" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا" رضوان احمد جس انداز سے حکومت کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں وہ ہمارے لیے باعث رشک ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ "مجھے بولنے دو" کا مطالعہ پاکستان کا ہر صحافی کرے تاکہ وہ بھی رضوان احمد کی طرح نڈر، بے باک اور بے خوف بن سکے"۔

نگار پاکستان – جنوری ۱۹۸۴ء

ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے الفاظ میں جو بے بسی ہے وہ صاف ظاہر ہے۔ اس سے پاکستان کی پوری صحافت کی بے بسی کا اندازہ ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ وہاں کے صحافی اور اہل قلم آزادی اظہار کے پیاسے رہے ہیں اور اس طرح سے کئی دہائیاں گزر گئی ہیں۔ ہمارے ملک میں صرف سولہ مہینوں تک ایمر جنسی تھی اور اخبارات پر سنسر شپ نافذ تھی تو اس ماحول میں سبھوں کا دم گھٹنے لگا تھا اور اس نظام کو عوام نے اپنے کندھوں سے اتار پھینکا لیکن جمہوری نظام آنے پر بھی وہاں آزادی اظہار کا کال ہے، آزادی فکر ایک خواب و خیال ہے۔

یہ خدشہ نیاز کے ذہن میں بھی جاگزیں تھا کہ آگے چل کر پاکستان کے علاقائی باشندے مستقل قوم ہونے کا اعلان کر دیں گے اور آپس میں ہی دست بہ گریباں ہو جائیں گے اس لیے وہ ایک اداریہ میں لکھتے ہیں

> " پاکستان تو خیر بننے کو بن گیا لیکن پنجاب، سندھ، پختونستان اور بنگال کا جداگانہ تصور اب تک محو نہیں ہو سکا ہے اور کوئی شخص اب تک ایسا پیدا نہیں ہوا جو ان لڑیوں کو ملا کر ایک رسی میں تبدیل کر سکتا"۔
>
> انتخاب صدارت کے بعد۔ نگار پاکستان – فروری ۱۹۶۵ء

بنگال تو خیر اس تحریر کے چھ برسوں بعد ہی علاحدہ ہو گیا اور بنگلہ دیش وجود میں آیا۔ سندھ میں شورش جاری ہے اور مہاجروں پر مظالم کا سلسلہ لامتناہی ہے جس کا سلسلہ ایوب خان کے صدارتی انتخاب جیتنے کے بعد ہی شروع ہو گیا تھا کیوں کہ مہاجروں نے ایوب خان کے مقابلے میں محترمہ فاطمہ جناح کا ساتھ دیا تھا جس پر نیاز یوں دبی زبان سے رائے زنی کرتے ہیں" ۶۵ فی صد آبادی نے ایوب خان کے حق میں رائے دی اور تقریباً ۳۵ فی صد نے محترمہ فاطمہ جناح کے حق میں، اور یہ بات، ہم آپ نہیں بلکہ صرف ایوب خان کے سوچنے کی ہی کہ ملک کی دس کروڑ آبادی میں تین کروڑ آبادی کیوں ان کی مخالف ہے"۔

انتخاب صدارت پاکستان۔ نگار پاکستان – جنوری ۱۹۶۵ء

آج سندھیوں اور مہاجروں کے درمیان جو خونی تصادم جاری ہے اس کا پیش خیمہ یہی واقعات تھے۔ جس کے نتیجے میں "مہاجر قومی موومنٹ" جیسی تحریک ابھری اور الطاف حسین نے علحدگی پسندی کا راستہ اختیار کر لیا۔

اس ملک میں چار قومیتوں کی حیثیت مستند اور تسلیم شدہ ہے جب کہ ایک بڑا تہذیبی، تاریخی، ثقافتی اور لسانی گروہ جسے عرف عام میں "مہاجر"

کہا جاتا ہے اس ملک اور معاشرے میں کسی قسم کے تشخص یا کسی آئینی شناخت سے قطعاً محروم ہے۔ اس ضمن میں ایک المیہ یہ بھی ہے کہ خود اس گروہ سے تعلق رکھنے والے بہت سے افراد بھی ان تلخ حقائق کو تسلیم نہیں کرتے۔ جس کے نتیجے میں آج وہ اس ملک میں سیاسی نفرت اور معاشی عتاب کا شکار ہیں مزید یہ کہ مہاجروں کے اس گروہ نے اپنے آپ کو بحیثیت ایک قومیت سمجھنے، سمجھانے اور منوانے کی کبھی کوئی کوشش نہیں کی اور "جب مہاجر قومی موومنٹ" نے مہاجر عوام میں ان کی شناخت کا جذبہ روشناس کرانے کی کوشش کی تو انھیں متعصب اور ملک دشمن قرار دیا جانے لگا۔

مہاجر ایک علحدہ قومیت ۔ الطاف حسین (سفر زندگی) صفحہ ۹۷

لیکن نیاز کے ہی ایک ہم عصر امام الہند مولانا ابو الکلام آزاد نے ان حالات کی پیشگوئی تقسیم کے وقت ہی کر دی تھی۔ ان کے الفاظ کو تو پیغمبرانہ کہا جا سکتا ہے۔

"آپ مادر وطن چھوڑ کر جا رہے ہیں، آپ نے سوچا اس کا انجام کیا ہوگا؟ آپ کے اس طرح فرار ہوتے رہنے سے ہندوستان میں بسنے والے مسلمان کمزور ہو جائیں گے اور ایک وقت ایسا بھی آسکتا ہے جب پاکستان کے علاقائی باشندے اپنی اپنی جداگانہ حیثیتوں کا دعویٰ لے کر اٹھ کھڑے ہوں۔ بنگالی، پنجابی، سندھی، بلوچ اور پٹھان خود کو مستقل قومیں قرار دیتے ہیں۔

کیا اس وقت آپ کی پوزیشن پاکستان میں بن بلائے مہمان کی طرح نازک اور بے کسانہ نہیں رہے گی؟ ہندو آپ کا مذہبی مخالف تو ہو سکتا ہے، قومی اور وطنی مخالف نہیں، آپ اس صورتحال سے نمٹ سکتے ہیں۔

مگر پاکستان میں آپ کو کسی وقت بھی قومی اور وطنی مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑ جائے گا جس کے آگے آپ بے بس ہو جائیں گے"۔

(یوپی سے پاکستان جانے والے ایک گروہ سے گفتگو)

اور نیاز نے تو ۱۹۶۲ء میں، ہجرت کی، ہندوستان کا سب سے بڑا شہری انعام "پدم بھوشن" پانے کے بعد، ایسے میں انھیں وہاں کون قابل اعتنا تصور کرتا۔ اس سے قبل ایک دوسرے "پدم بھوشن" جوش ملیح آبادی بھی دہلی سے ہجرت کر کے کراچی جا چکے تھے۔ مگر ان دونوں کے ہی قدم پاکستان کی سرزمین میں جم نہیں سکے اور دونوں کی تحریروں میں گھن گرج کے بجائے بے بسی اور بے کسی نے جگہ لے لی۔

"نگار" لکھنؤ میں جو بے باکی اور کاٹ محسوس ہوتی ہے وہ نگار پاکستان کے "ملاحظات" میں یکسر ناپید ہے اسی کا ایک سبب تو اپنی زمین سے اکھڑ جانا لگتا ہے اور دوسری سرزمین پر نہ جم پانا کیوں کہ دونوں کی آب و ہوا میں زمین آسمان کا فرق تھا ایک جانب جہاں آزادی تھی سوچ و فکر پر پہرے نہیں تھے وہیں دوسری جانب قید و بند تھی ذہن پر خوف و ہراس کا عالم طاری تھا۔

"نگار پاکستان" کے "ملاحظات" میں نیاز نے زیادہ تر اپنے آپ کو دہرایا ہے۔ انھوں نے زیادہ تر وہ موضوعات لیے ہیں جن کا تعلق ہندوستانی مسلمانوں سے ہے۔ مثلاً مہاتما گاندھی پر لکھتے ہوئے "کانگریس اور گاندھی جی میری نگاہ میں اب سے ۲۵ سال قبل جب میں ہندوستان میں تھا"۔ وہ گاندھی کو کافی ملعون کرتے ہیں حالانکہ پہلے وہ مہاتما گاندھی کے کافی مداح رہ چکے ہیں مگر کراچی جاتے ہی ان کے نظریات میں تبدیلی واضح ہو جاتی ہے اور وہ اپنے آپ کو ہی رد کرنے لگتے ہیں "پورنا سوراج" غالباً گاندھی جی کا ہی وضع کیا ہوا لفظ ہے اور اس کی جو تفسیر انھوں نے بیان کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ترجمہ آزادی کامل ہی ہو سکتا ہے لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ لفظ "پورنا سوراج" کی جو عملی شکل گاندھی جی کے ذہن میں ہے وہ یا تو اتنی ناقص ہے کہ ہم اس کا ترجمہ "کامل" کر ہی نہیں سکتے یا پھر وہ اتنی انتہا پسند ہے جسے ہم صرف عصبیت کہہ سکتے ہیں یا زیادہ واضح الفاظ میں "ہندو راج"۔

نگار پاکستان ۔ مارچ ۱۹۶۴ء

"اس میں شک نہیں بھارت (جس حد تک اس کے آئین و دستور کا تعلق ہے) غیر مذہبی جمہوری حکومت ہے لیکن عملاً وہ یکسر ہندو حکومت ہے وہاں کے اکثر عمال و حکام تنگ ہندو ذہنیت رکھتے ہیں اور کھلم کھلا مسلمانوں کی مخالفت کرتے ہیں۔ میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ کسی ہندو مسلم فساد

میں (جس کا آغاز ہندوؤں کی طرف سے ہی ہوتا ہے) مسلمانوں کو ہی زیادہ گرفتار نہ کیا گیا ہو اور انھیں پر مقدمے نہ چلائے گئے ہوں۔ بہر حال اس سے انکار ممکن نہیں کہ وہاں کے ارباب حکومت سخت متعصب ہندو ہیں اور وہ مسلمانوں کو بڑی حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں"۔

بھارت کا جمہوری مستقبل۔ نگار پاکستان - اپریل ۶۴۔

"جس زمانے میں فیروز آباد وغیرہ میں ہندو مسلم فسادات ہوتے اور باوجود اس حقیقت کے انکشاف کے کہ ان کے محرک خود ہندو ہی تھے گرفتاری زیادہ تر مسلمانوں کی ہی ہوتی تو میں نے اس کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ان فسادات کا باعث دراصل حکام نظم و نسق ہیں اور اگر حکومت ایک عام حکم یہ جاری کر دے کہ جس جگہ فساد رونما ہو گا سب سے پہلے وہاں کے کلکٹر اور سپرنٹنڈنٹ پولیس کو برطرف کر دیا جائے گا تو فوراً اس بدامنی کا سدباب ہو سکتا ہے لیکن یہ بات حکومت کی سمجھ میں نہ آسکتی تھی، کیوں کہ اس کے بہت سے افراد چاہتے ہیں کہ بھارت کی زمین مسلمانوں پر تنگ کر دی جائے، وہ یہاں سے چلے جائیں۔

بھارت میں مسلمانوں کا موجودہ موقف۔ نگار پاکستان ستمبر ۶۴۔

"نگار پاکستان" میں نیاز نے زیادہ تر ہندوستان کے مسائل پر اداریے لکھے ہیں ان میں ہندوستان کا غذائی بحران، ہندوستان میں تعلیمی مسئلہ۔ ہندوستان کا لسانی مسئلہ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، اردو کا موقف اور ان سب موضوعات پر انھوں نے اس طرح خامہ فرسائی کی ہے جیسے وہ لکھنؤ میں بیٹھ کر خامہ فرسائی کر رہے ہوں ان میں خوب گھن گرج ہے مگر جب وہ پاکستان کے کسی موضوع پر لکھتے ہیں تو ان کا قلم کند ہو جاتا ہے۔ جس کا سبب بھی واضح ہے۔ قاری کو صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ حقائق سے روگردانی کر رہے ہیں۔ انھوں نے لکھنؤ میں بیٹھ کر اپنی تحریروں سے جو فتنے جگائے تھے وہ کراچی میں یکسر ناپید ہیں۔

ڈاکٹر حامد حسین نے نیاز کے بارے میں لکھا تھا کہ ان کی شخصیت ایک پہلودار آئینہ PRISM ہے جس کے سامنے سفید رو آتی ہے تو وہ اسے سات رنگوں میں تبدیل کر کے اس کی جزئیات بیان کرتے ہیں اس کی تحلیل نفسی کر دیتے ہیں اور میں نے آغاز ہی میں لکھا ہے کہ میں محسوس کرتا ہوں کہ ان کے جسم پر آنکھیں ہی آنکھیں ہیں جو حالات حاضرہ پر منجمد ہیں اور سب کچھ من و عن بیان کر دیتی ہیں مگر یہ صورت حال صرف اس وقت تک ہے جب تک نیاز لکھنؤ میں تھے اور نگار وہاں سے شائع ہوتا تھا۔ نیاز اور ان کے ساتھ نگار کی ہجرت نے اس نگار خانے کو یکسر تبدیل کر دیا۔ اس میں ایسے جدیدی آرٹ در آئے جو سمجھ میں ہی نہیں آتے۔ ان کا PRISM ٹوٹ کر بکھر گیا اور انھوں نے دانستہ اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ شعور کی آنکھیں بھی کھلی نہیں رکھیں اور ان کی تحریر سے بے کسی جھلکنے لگی۔

ادیب کی تحریر اس کے ذہن کا پرتو ہوتی ہے۔ ہجرت نیاز کی مجبوری تھی انھوں نے بہت مشکل سے یہ فیصلہ کیا تھا۔ اس لیے نئی آب و ہوا کا فکر اور قلم پر اثر ہونا بھی فطری تھا۔ جہاں ایک طرف نصف صدی کی پرورش لوح و قلم تھی، قلم کی جولانی تھی، فکر کا ابال تھا وہیں دوسری جانب بے بسی اور مجبوری تھی۔ کیا کرتے آخر کو وہ تو ایک تھکے ہوئے انسان تھے۔ ٹوٹے اور بکھرے ہوئے، ستائے ہوئے تھے زمانے کے بھی غیروں کے اور اپنوں کے بھی۔ ایسے میں ان کی تحریر بھی بے ربط ہو گئی تو اس میں تعجب کی کون سی بات ہے۔

٭٭ .... ٭٭

مجنوں گورکھپوری ــــــــ نیاز ایک اونچے درجے کے رومان نگار ہوتے ہوئے بھی روز اول سے ایک سنجیدہ اور صاحب عقل و ہوش آدمی ہیں۔ انہوں نے اپنے کو نہ تو کبھی شعر میں کھویا اور نہ کبھی رومان میں ڈبویا حالانکہ وہ شعر و رومان دونوں کی بھڑکتی ہوئی رگیں پکڑ لینے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔

ہندو اسلاف اور مسلمان

ڈاکٹر سمپورنا نند (سابق چیف منسٹر یو۔پی) کا خیال ہے کہ ہندوستان کے ہر باشندہ کو خواہ وہ ہندو ہو یا غیر ہندو، ملک کے اکابر اسلاف کا احترام کرنا چاہئے کیونکہ (غالباً ان کے خیال کے مطابق) جب تک یہ جذبہ دل میں پیدا نہ ہو، صحیح معنی میں وطن یا دیس کی محبت جاگزیں نہیں ہو سکتی۔ اس سلسلہ میں جو مزید تصریحات سامنے آئی ہیں ان سے گو بظاہر یہی مترشح ہوتا ہے کہ سمپورنا نند جی کا یہ خطاب ہندو مسلمان دونوں سے ہے۔ لیکن یہ گلہ دراصل ان کو صرف مسلمانوں سے ہے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے غور طلب امر یہ ہے کہ احترام سے سمپورنا نند جی کا مقصود کیا ہے، احترام کوئی ایسا لفظ نہیں جس کا مفہوم متعین ہو چکا ہو اور حیاتِ انسانی کی ضروریات میں شامل ہو۔ احترام کا تعلق جذبات انسانی سے ہے اور انہیں کی نوعیت کے لحاظ سے اس کا مفہوم بھی بدلتا رہتا ہے۔

سمپورنا نند جی نے اس لفظ کا استعمال کس معنی میں کیا ہے، یہ ہنوز تشنۂ صراحت ہے۔ ہر چند یہ مثال پیش کر کے کہ وہ اورنگ زیب کو اکابر ہند میں سے سمجھتے ہیں اور اس کا احترام کرتے ہیں، اشارتاً یہ ضرور بتا دیا ہے کہ احترام سے ان کی مراد کیا ہے۔ لیکن اگر ان سے دریافت کیا جائے کہ کیا وہ اورنگ زیب کا احترام بالکل اسی طرح کرتے ہیں جیسے رام چندر جی یا کرشن جی کا، تو وہ یقیناً اس سے انکار کر دیں گے کیونکہ ہندو دیومالا کے افراد کا احترام بالکل دوسری چیز ہے جس کا تعلق خالص عبودیت یا پرستاری سے ہے اور اکابر ملک و قوم کا احترام محض صفات انسانی کی عظمت سے تعلق رکھتا ہے۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ سمپورنا نند جی نے یہ بات کچھ مکمل کر نہیں کہی۔ اکابر ہندو سے ان کی مراد غالباً ہندوستان کی تمام وہ بڑی بڑی ہستیاں ہیں، جنہوں نے دیوتاؤں کی حیثیت اختیار کر لی ہے اور انہیں کے احترام کا مطالبہ وہ مسلمانوں سے کرتے ہیں۔ لیکن وہ کیسا احترام چاہتے ہیں؟۔ اس کی صراحت میں انہوں نے کافی احتیاط سے کام لیا اور اورنگ زیب کا ذکر کر کے بات کا رخ بدل دیا۔ اگر مسلمان اس کے جواب میں یہ کہیں کہ وہ بھی رام چندر جی کا احترام اسی طرح کرتے ہیں، جس طرح سمپورنا نند جی اورنگ زیب کا تو کیا یہ سن کر وہ مطمئن ہو جائیں گے۔ غالباً نہیں کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ تمام پڑھے لکھے مسلمان، اکابر ہندو مذہب کا کافی احترام کرتے ہیں اور اس کے باوجود وہ مسلمانوں کو مزید احترام کی تلقین فرماتے ہیں، اور اس مزید احترام کی نوعیت ظاہر نہیں کرتے۔

اس باب میں یہاں کی مہاسبھائی اور جن سنگھ جماعتوں کی میں تعریف کروں گا کیونکہ جو کچھ ان کے دل میں ہے وہ زبان پر بھی ہے، ان کا عقیدہ ہے کہ بھارت میں صرف انہیں لوگوں کو رہنے بسنے کا حق حاصل ہے، جو "ہندو جاتی" کہلاتے ہیں اور ایک غیر شخص اگر یہاں رہنا چاہتا ہے تو اسے بھی ہندو مذہب اختیار کر لینا چاہئے۔ حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ ہندو کوئی مذہب نہیں بلکہ محض سوشل نظام ہے جو عقاید مذہبی سے کوئی تعلق نہیں رکھتا، یہاں تک کہ اگر ایک ہندو رام چندر جی اور کرشن جی کی توہین پر آمادہ ہو جائے اور گائے کا گوشت کھانے لگے تو بھی وہ بدستور ہندو ہی رہے گا، تاہم وہ اپنے دل کی بات صاف صاف کہہ دیتے ہیں اور کوئی لگی لپٹی نہیں رکھتے۔

"سمپورنا نند جی" بڑے فاضل انسان ہیں، ان کا شمار اہلِ فکر میں ہوتا ہے، کانگریس کے اہم رکن ہیں، اس لئے مہاسبھائی زبان میں تو وہ کچھ نہیں کہہ سکتے، لیکن اگر ان سے پوچھا جائے کہ اگر یہاں کے تمام مسلمان شدھی ہو جائیں تو کیا وہ خوش نہ ہوں گے۔ ممکن ہے پوچھنے پر وہ اس کا جواب کچھ اور دیں، لیکن ان کا دل یقیناً مسرتوں سے لبریز ہو گا۔

اس وقت جب کہ انتخاب کا مرحلہ سامنے ہے، ان کا ہندوستانی "مہاپرشوں" کی عظمت کا جذباتی سوال اٹھا کر "مسلم و غیر مسلم" تفریق کے پہلو کو نمایاں کرنا مناسب نہ تھا۔ اس بحث کا تعلق مذہبی جذبات سے ہے اور ایسے موقع پر کوئی بحث ایسی چھیڑ دینا جو ہندو مسلم مغایرت کی یاد دلائے قطعاً مناسب نہ تھا۔

یہ بالکل درست ہے کہ ہندو مہاپرشوں کے ساتھ مسلمانوں کی عقیدت کوئی مذہبی حیثیت اختیار نہیں کر سکتی، بالکل اسی طرح جیسے ہندو، اکابر اسلام کو اپنا مذہبی پیشوا نہیں سمجھ سکتے، لیکن یہ اختلاف کوئی ایسا اختلاف نہیں جو انسانی تعلقات کی راہ میں حایل ہو، اور اگر کوئی شخص یہ بحث اس لئے چھیڑتا ہے کہ ایک ملک کی دو قوموں کے درمیان مغایرت کو اور تقویت پہنچائے تو اس کا یہ فعل یقیناً کبھی قابل تعریف نہ سمجھا جائے گا۔

کاش کہ یہ بات کسی اور کی زبان سے نکلتی اور سمپورنا نند اس کی تردید کرنے والوں میں ہوتے۔

ہمارا مستقبل

تحریر نیاز فتحپوری

[اس مضمون میں نیاز صاحب نے بتایا ہے کہ ہندوستان کے ووٹ دہندگان میں تفریق و اختلاف کا سبب مذہب کی وہ غلط تعبیر ہے جو ہندو و مسلم علماء مذہب کی طرف سے پیش کی جاتی ہے۔

مدیر انشاء]

پیشین گوئیاں دو قسم کی ہوا کرتی ہیں۔ ایک وہ جو انبیاء اولیاء کی زبان پر جاری ہوتی ہے اور دوسری وہ جو علم و تجربہ کا نتیجہ ہوا کرتی ہے قسم اول کی پیشنگوئی وحی و الہام ہو یا دور بینی (Telepathy) ہمیں اس سے بحث نہیں کیونکہ اول تو ایسی پیشن گوئیاں کرنے والے اب موجود نہیں اور اگر ہوں بھی اس دور تعقل میں کون ان کی سنتا ہے لیکن قسم دوم کی پیشن گوئی ہر صاحب عقل آسانی سے کر سکتا ہے اور اکثر و بیشتر وہ صحیح بھی نکلتی ہے کیونکہ کاروبار عالم مقررہ اصول پر چل رہا ہے۔ اور اسباب و علامات کو دیکھ کر نتائج پر حکم لگانا زیادہ دشوار نہیں۔

ابتداء آفرینش سے لے کر اس وقت تک انسان نے کہاں کہاں اور کس کس طرح زندگی بسر کی، حیات اجتماعی کے لیے اس نے کیا کیا اصول مقرر کئے، ارتقاء کی کیا کیا صورتیں ہم نے اختیار کیں، اور اقوام عالم عروج و زوال کی منزلوں سے کیونکر گزرتی ہیں، یہ اور اسی طرح کے بہت سے موضوع ہیں جن سے تاریخ کی کتابیں بھری پڑی ہیں، لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ جس وقت کوئی قوم عروج و ترقی سے گزر رہی تھی، اس کو کبھی ایک لمحہ کے لیے یہ اندیشہ پیدا ہوا تھا کہ اسے انحطاط و زوال کی منزل سے گزرنا پڑے گا اور آخر کار ایک دن فنا ہو جائے گی؟ کبھی نہیں۔

دنیا میں سب سے بڑی حکومت جس کی سطوت و جبروت نے تقریباً تمام کرۂ ارض کا احاطہ کر لیا تھا، سلطنت رومہ تھی، لیکن آج وہ کہاں ہے؟ چنگیز و ہلاکو جنھوں نے سارے عالم کو لرزہ براندام کر رکھا تھا، آج ان کی اولاد کہاں اور کس عالم میں ہے؟۔ بابل و اسیریا کے محیر العقول تمدن کی بنیاد ڈالنے والے فرمانرواؤں کے نشانات کیا ان کھنڈروں کے علاوہ کچھ اور ہیں جو اب صرف درندوں کو پناہ دے سکتے ہیں، اسی طرح تم فراعنۂ مصر کا سرۂ جم اور دیگر جبابرہ عالم کی تاریخ اٹھا کر دیکھو تو معلوم ہوگا کہ جب وہ دور ترقی سے گزر رہے تھے تو اپنے کو غیر فانی سمجھتے تھے۔ لیکن آج جب کہ وہ فنا ہو چکے ہیں ہمیں یہ تسلیم کرنے میں بھی تامل ہو سکتا ہے کہ وہ کبھی تھے بھی یا نہیں۔

زیادہ نہیں صرف ساڑھے تیرہ سو سال قبل کی بات ہے کہ ایک صحرا نشین امی ریگزار عرب سے پیدا ہوتا ہے اور اپنے بعد ایک ایسے تمدن کی بنیاد چھوڑ جاتا ہے کہ اس کے جانشین مغرب و مشرق پر چھا جاتے ہیں، لیکن آج اس قوم کا کیا حال اس کے تمدن و تہذیب کا کیا رنگ ہے اور وہ انحطاط کے کس دور سے گزر رہی ہو؟

این سخن را چہ جواب ست تو ہم میدانی

لیکن غور طلب امر یہ ہے کہ کیا اس کا یہ دور ختم ہو گیا ہے اور کیا اس کے انجام کے متعلق حکم لگانا کوئی ایسی پیش گوئی کرنا ہے جو صرف انبیاء کے لیے مخصوص تھی؟

اگر اقوام عالم کی ترقی اسباب کی محتاج ہے تو ان کے تنزل کو بھی اصولاً اسباب کا پابند ہونا چاہیئے۔ اور اس لیے تاریخ عالم کے مطالعہ کے بعد بھی یہ معلوم کر لینا دشوار نہیں کہ ایک قوم کا مستقبل ہمیشہ اس کے حال میں پوشیدہ ہوا کرتا ہے اور مسلمانوں کا جو حال ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔

اسلامی تہذیب دنیا کی تمام گزشتہ تہذیبوں سے ایک ممتاز حیثیت رکھتی تھی اور وہ حیثیت صرف یہ تھی کہ اس نے انسانی زندگی کے سامنے ایک ایسا لائحہ عمل پیش کیا جو مادی ترقی کے ساتھ ساتھ اخلاقی ترقی کا بھی ضامن تھا، بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ اس کی تمام مادی ترقیاں منحصر تھیں صرف اخلاق کی بلندی پر۔

موجودہ تہذیب میں مادی ترقی کی جو صورتیں نظر آرہی ہیں وہ یقیناً تمام ازمنۂ گزشتہ سے زیادہ وسیع ہیں لیکن چونکہ اخلاق کا پہلو نظر انداز کر دیا گیا ہے اسی لیے وہ نوع انسانی کو فائدہ پہونچانے کے بجائے اور زیادہ نقصان پہنچا رہی ہیں اور ظاہر ہے کہ وہ مادی ترقی جو خود بنی نوع انسان کی تباہی کی طرف منجر ہو کبھی صحیح معنی میں ترقی نہیں کہلائی جا سکتی۔

اسلام نے اس توازن کے قیام کے لیے سب سے پہلے جس تعلیم کو پیش کیا وہ یہ تھی کہ تمام انسان برابر ہیں اور دولت کی کمی یا زیادتی کی وجہ سے جذبہ ساوات و اخوت کو متاثر نہ ہونا چاہیئے۔ پھر یہ تعلیم صرف زبانی نہ تھی یا کسی علمی نظریہ کے طور پر پیش نہیں کی گئی تھی، بلکہ عملاً روز پانچ وقت شاہ و گدا کو پہلو بہ پہلو کھڑا کر کے اس کا درس دیا جاتا تھا۔

جب یہ تعلیم رائج ہو گئی تو ان کو بتایا گیا انسان دنیا میں صرف کام کرنے کے لیے آیا ہے اور اس کو بے کار کبھی نہ بیٹھنا چاہیئے، اور اس کے ساتھ یہ بھی سمجھا دیا گیا کہ دنیا میں ترقی کی جتنی راہیں ہو گئی ہیں ان سب کو اختیار کرنا چاہیئے۔

پھر ظاہر ہے کہ دنیا میں جو قوم اس اصول پر کار بند ہو وہ کبھی زوال پذیر نہیں ہو سکتی، اور اگر آج مسلمان پستی کے عالم میں ہیں تو ا . ا سوا اس کے کچھ نہیں ہو سکتا کہ اس نے اس تعلیم کی روح کو پس پشت ڈال دیا ہے اور اگر حالت یہی رہی تو اس کا فنا ہو جانا بالکل یقینی ہے۔

تعلیم مساوات سے بے خبری و بے تعلقی کا یہ عالم ہے کہ نوع انسانی تو خیر بڑی چیز ہے وہ خود اپنی ہی قوم کا شیرازہ پراگندہ کر چکے ہیں اور محض فروعی مسائل کے اختلاف پر ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کے لیے طیار ہیں عملی زندگی کی یہ کیفیت ہے کہ تقدیر پر بھروسہ کر کے ہاتھ پاؤں ڈال دینا جزو مذہب قرار دیا جاتا ہے اور اس کا اصطلاحی نام صبر و توکل رکھا گیا ہے۔

رہ گیا دنیاوی ترقی میں زمانہ کا ساتھ دینا، سو اس کے متعلق کیا کہا جا سکتا ہے جب کہ ایک زمانہ تک علوم جدیدہ کا حصول کفر کے مترادف سمجھا گیا اور اب بھی ہمارے یہاں کے مذہبی علماء اور قائدین امت ان سے بالکل نابلد ہیں اور نابلد رہنے ہی میں اپنی اخروی نجات سمجھتے ہیں۔

پھر غور کیجئے ایسا کیوں ہے؟ تاریخ کے صفحات اٹھا کر دیکھیئے کہ مسلمانوں کے زوال کی تاریخ کب سے شروع ہوتی ہے اور خود ہی فیصلہ کیجئے کہ کیا اس کی ابتداء علماء مذہب سے نہیں ہوئی اور کیا ذہنی غلامی کی بنیاد ڈالنے والی کوئی اور جماعت تھی؟ بنو امیہ کی سلطنت کو تباہ کرنے والے، بنو عباس کی حکومت کا تختہ الٹ دینے والے یہی لوگ تھے جو شاہان وقت کی ناجائز، خواہشوں کی تکمیل کے لیے بھی حدیثیں گھڑا کرتے تھے اور جنھوں نے صرف طمع نفس کی بناء پر رفتہ رفتہ اسلام کے لٹریچر کو اس قدر گندگی سے آلودہ کر دیا کہ آج اس کے صحیح خط و خال کا مطالعہ از بس دشوار ہو گیا ہے۔

پھر ظاہر ہے کہ جب قرون اولی میں اس جماعت کا یہ رنگ تھا تو عہد حاضر میں اس کی بے بصری کا کیا عالم ہو گا اور جو قوم اپنا مستقبل ان کی تعلیم و ہدایت پر منحصر رکھے گی اس کی تباہی میں کس کو کلام ہو سکتا ہے۔

یقیناً اس وقت تمام دنیا کے مسلمان ایک رشتہ سے وابستہ نہیں ہیں اور نہ ایسا ہونا ممکن ہے، لیکن اس کا علاج نہ پان اسلامزم سے ممکن ہے اور نہ فلسطین میں کسی یونیورسٹی کے قیام سے بلکہ اس کا تعلق صرف احساس وطنیت سے ہے اور افسوس ہے کہ ہندوستان کا بدنصیب مسلمان اس احساس سے محروم ہے اور اب تک یہ سودا اس کے دماغ سے نہیں نکلا کہ وہ ہندوستان میں حکمراں ہو کر آیا تھا اور حکمراں قوم کا فرد ہونے کی حیثیت سے اس کو ایسا تفوق حاصل ہے جس کے سامنے یہاں کے تمام باشندوں کو اس کے سامنے گردن جھکا دینا چاہیئے۔

ہندوستان میں صدیوں تک قیام کرنے کے بعد یہ اجنبیت کیوں ہے؟ اس کا سررشتہ بھی علماء مذہب ہی کے ہاتھ میں ہے جنھوں نے سرزمین ہند کو دار الحرب و کفرستان اور یہاں کے رہنے والے کو ہمیشہ کافر کہہ کر اختلاف و دشمنی کی وسیع خلیج حائل کر دی، درانحالیکہ نہ ہندوستان کفرستان ہے

اور نہ ہندو کافر و مشرک۔

ایک ہندو مندر میں جاکر بت کے سامنے جھک جاتا ہے تو کافر ہے لیکن ایک مسلمان مسجد میں جاکر محراب کے سامنے سربہ سجود ہوجاتا ہے تو کافر نہیں۔ ایک ہندو پتھر کی مورتی کو بوسہ دیتا ہے تو مشرک ہے، لیکن ایک مسلمان طواف کعبہ کے وقت سنگ اسود کو چومتا ہے تو مشرک نہیں۔ کیوں؟

اگر مسلمان کے یہ مذہبی مراسم خالصتاً للہ ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہندو کا مقصود اس سے علاحدہ ہو۔ اگر ایک مسلمان سنگ اسود کو صرف اس لیے چومتا ہے کہ وہ ایک بڑے شخص کی یادگار ہے تو آپ کیوں یقین کریں کہ بتوں کی پرستش کسی اور جذبہ کے تحت کی جاتی ہے، میں نہیں سمجھ سکتا کہ وہ کونسا ہندو ہے جو بتوں کو خدا سمجھ کر ان کی پوجا کرتا ہے۔ اور اگر بعض جاہل افراد ان میں ایسے ہیں تو پھر ان مسلمانوں کو کیا کہا جائے گا جو قبروں کی خاک چاٹ چاٹ کر تعزیوں اور مقبروں کی جالیوں میں منت کی دھجیاں باندھ باندھ کر ہندوؤں سے زیادہ کفر و شرک میں مبتلا نظر آتے ہیں۔

بہرحال مدعا یہ ہے کہ ہندوستان کی دو بڑی آبادیوں میں تفریق و اختلاف کا سبب صرف مذہب کی وہ غلط تعبیر ہے جو ہندوستان میں دونوں کے علماء مذہب کی طرف سے پیش کی گئی اور اب بھی پیش کی جا رہی ہے۔

اس لیے اگر ہندوستان کی ترقی و آزادی کے لیے ہندو و مسلمان کا اتحاد ضروری ہے تو سب سے پہلے دونوں جماعتوں کو مذہبی تعصب ترک کر کے اپنا شعار صرف انسانیت کی پرستش قرار دینا چاہیے۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب پنڈتوں کی گرفت سے ہندو اور علماء کے چنگل سے مسلمان آزاد ہوجائیں۔

**

ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی ـــــــ ہم اگر چاہیں کہ ان کی شخصیت دیکھ لیں تو یہ ممکن نہیں ہے۔ وہ صرف ان ہی گوشوں کی نمائش روا رکھتے ہیں جن کی نمائش وہ چاہتے ہیں کہ ہو۔ ان کی شخصیت پر اس قدر دبیز اور تہہ بہ تہہ نقاب پڑے ہوئے ہیں کہ محرومیاں سر پٹک پٹک رہ جاتی ہیں۔

پروفیسر ارشد کاکوی ـــــــ شاد کے مکاتیب شاد کی شخصی حیثیت کو underrate کرتے ہیں۔ حالی کے خطوط حالی کی پاکیزہ سرشت کے عکاس ہیں۔ وحشت کے مکاتیب ان کی خاکساری و انکساری کے نمائندہ ہیں۔ شبلی کے نامہائے شوق اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہ انسان تھے اور ان کے پہلو میں دل اور دل میں جذب و شوق بلکہ ہوا و ہوس کی لہر تھی۔ غالب کے خطوط ایک دور کی تاریخ اور خود غالب کی زندگی کے فوٹو ہیں۔ اقبال کے مکاتیب محض علمی دستاویز ہیں لیکن نیاز کے مکاتیب میں یہ تمام چیزیں ایک جگہ جمع ہیں اور ان کے مطالعہ کے بعد ان کی شخصیت کے بہت سارے پہلو اور ان کے عقیدے و نظریے کے تمام گوشے سامنے آجاتے ہیں۔

نیاز اور جنسیات

شمیم رضوی

نیاز فتحپوری اردو کے ڈاکٹر جانسن ہیں۔ شاعر، نثرنگار، نقاد اور افسانہ نویس کے علاوہ وہ عربی، فارسی، اردو اور ہندی کے شعری و نثری ادب کے بہت بڑے عالم بھی ہیں۔ علاوہ ازیں، مذاہب عالم کا گہرا مطالعہ، دین اسلام کا مکمل عرفان، لسانیات میں مہارت، ادبیات عالم پر قدرت، معاشیات کا علم، سیاسیات حاضرہ سے لگاؤ، غرضیکہ مختلف علوم و فنون سے واقفیت و شناوری کے سبب اور اپنے تبحر علمی و وسعت معلومات کی بنا پر نیاز کی حیثیت ایک جیتے جاگتے انسائیکلوپیڈیا سے کم نہیں۔ ان کے شذرات و ملاحظات ہوں یا مضامین و مقالات، استفسارات کے جواب ہوں یا مکتوبات، مالہٗ وماعلیہ ہوں یا تنقید و تبصرات ہر جگہ نیاز معلومات کے دریا بہاتے دکھائی دیتے ہیں۔ مختصر یہ کہ علم و فن پر نیاز کی عالمانہ، محققانہ اور ناقدانہ نظر رہی ہے۔ چنانچہ "جنسیات" بھی ان کی دسترس سے باہر نہیں رہا۔

سگمنڈ فرائڈ کے نظریہ جنس کے مطابق جنس کا تعلق مرد و عورت کے محض فعل و کردار سے نہیں ہے بلکہ تمام انسانی اعمال جنسی جذبے کی پیداوار ہیں اور مشہور ماہر جنسیات ہیولاک ایلس کے نزدیک، ہم زندگی کا احترام اس وقت تک نہیں کر سکتے جب تک، ہم جنس کا احترام کرنا نہ سیکھیں اور جنس تمام علوم و فنون کا سرچشمہ ہے۔ چنانچہ فرائڈ کے نظریے کی قبولیت عام اور ہیولاک ایلس کی مستند و وقیع رائے کے نتیجے میں اہل فکر و نظر و اصحاب قلم جنسیات سے بہ حیثیت علم و فن کے دلچسپی لینے لگے اور تعلیم جنسی کی افادیت و ضرورت کے پیش نظر یورپ و امریکہ میں سوسائٹیاں اور انجمنیں قائم ہونا شروع ہو گئیں۔

لیکن جرمنی میں ہٹلر نے برسراقتدار آتے ہی، جنسیات کے خلاف اعلان جنگ کر دیا اور نازی پارٹی کے سرپھرے سرگرم کارکنوں نے مئی ۱۹۳۳ء میں ڈاکٹر میگنس ہرش فلڈ کی قائم کردہ شہرۂ آفاق Institute of Sexual Science پر دھاوا بول دیا اور جنسیات سے متعلق نادر سے نادر اور قیمتی سے قیمتی کتابوں، مسودوں، اعداد و شمار، خاکوں، تصویروں اور مجسموں کو جن کی مجموعی تعداد ہزاروں تھی اور جو لائبریری و میوزیم کی زینت تھے، توڑ پھوڑ کر جلا ڈالا (۱)۔ یہی حادثہ سگمنڈ فرائڈ کے ساتھ پیش آیا۔ ۱۹۳۸ء میں نازیوں نے آسٹریا پر قابض ہونے کے بعد وایانا میں فرائڈ کے مکان کو گھیر لیا اور اس کی لائبریری کی کل کتابوں اور دارالتجربہ کی تمام چیزوں کو نیست و نابود کر دیا۔ فرائڈ بے چارہ انگلستان میں پناہ لینے پر مجبور ہوا جہاں وہ تھوڑے ہی عرصہ بعد فوت ہو گیا۔

نفس مضمون کے لحاظ سے اردو زبان میں ادب جنسیات کا سرسری جائزہ لینا ضروری ہے۔ سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر "بھوگ پھل" ہے۔ جسے بیدر کے برید شاہی سلطنت (۹۰۰ - ۹۵۰ھ مطابق سولہویں صدی عیسوی) کے ایک درباری شاعر قریشی نے دکن زبان میں لکھا۔ بقول قریشی، اس نے اسے فارسی سے ترجمہ کیا مگر فارسی کتاب کا نام نہیں لکھا۔ اس کتاب میں سنسکرت کتابوں کی طرح پہلے عورتوں کی قسمیں بیان ہوئی ہیں پھر مختلف آسنوں کی صراحت کی گئی ہے۔ ۲۸ رنگین تصاویر مختلف آسنوں کی اور ۷ تصویریں عورتوں کی اقسام سے متعلق ہیں۔ پوری کتاب منظوم ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ امپیریل لائبریری کلکتہ میں ہے اور دوسرا نواب سالار جنگ مرحوم کے کتب خانہ حیدرآباد میں ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو

ضرور ہے بجن لاحشہ سات رنگ　　　کرے مرد می جائے کرتوں درنگ (۲)

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء تک اردو ادب کے شعری اصناف سخن اور نثری داستانوں میں اس وقت کے جنسی تصورات اور میلانات کا پتہ چلتا ہے۔

مثال کے طور پر نظیر اکبر آبادی کی نظم " برہ کی کوک " کو لیجئے جو عورتوں میں ہم جنس پرستی کے شوق و رجحان کو ظاہر کرتی ہے۔

شام گزر گئی ، یار نہ آیا ، رات بھی آدھی آن ڈھلی
آؤ پڑوسن چپٹی کھیلیں ، بیٹھے سے بیگار بھلی

ریختی کے بعض اشعار سے اس حقیقت کا اظہار ہوتا ہے کہ شوہروں کی طوائف پرستی و بے التفاتی کے باعث اکثر عورتیں جنسی گھٹن کا شکار تھیں اور وہ اپنی پیاس بجھانے کے واسطے " استلذاذ بالمثل " کے علاوہ " استلذاذ بالنفس " کی طرف بھی مائل تھیں۔ بیشتر مثنویوں اور داستانوں سے اور ناولوں (مثلاً مرزا رسوائی " امراؤ جان ادا " اور قاضی سرفراز حسین کی تصانیف) سے دنیا کے قدیم ترین پیشہ قحبگی اور طوائف کی اقسام اور ان کی تمدنی، سماجی و معاشی زندگی (جو جنسیات کے موضوعات میں سے ہے) پر روشنی پڑتی ہے۔ قدیم غزلوں میں ایسے اشعار کا اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہے جن سے مردوں میں " استلذاذ بالمثل " کے شوق و عادات کا پتہ چلتا ہے۔

لیکن مغلوں کے زمانے میں اور وکٹوریا کے عہد حکومت میں " جنسیات " پر علمی کتابوں کی تصنیف و تالیف کا سلسلہ یک گونہ موقوف ہو گیا۔ اور مذہبی تنگ نظری و خوف تعزیرات ہند کے اثر سے ریاکاری کا بول بالا ہوا اور اخلاق کی طنابیں اتنی کس دی گئیں کہ ڈپٹی نذیر احمد کو اپنے ناول " توبۃ النصوح " میں " فسانہ عجائب " - " قصہ گل بکاؤلی " - آرائش محفل " - مثنوی میر حسن " - " بہار دانش " - اندر سبھا " - انشائی دریائے لطافت " - کلیات رند " - دیوان نظیر اکبر آبادی - " واسوخت امانت " وغیرہ وغیرہ کو خلاف تہذیب، مزخرافات اور اخلاق سوز قرار دے کر نذر آتش کرنا پڑا۔ ڈپٹی صاحب تو محض خیالی دنیا میں ان کتابوں کو آگ لگا کر خوش ہو گئے ہوں گے مگر جب لوگوں نے ان کی کتاب " ازواج مطہرات پر " کی تمام کاپیوں کو اکٹھا کر کے بر سر عام جلاڈالا تو ڈپٹی صاحب مارے صدمہ کے دماغی توازن کھو بیٹھے۔ چاہ کن را چاہ در پیش۔

" بھوگ پھل " کے بعد اردو میں جنسیات پر جو کتاب قابل ذکر ملتی ہے وہ امریکی ڈاکٹر سلوانوس سٹال کی تصنیف what a young husband ought to know (مطبوعہ ۲۰/ جولائی ۱۸۹۹ء) کا ترجمہ ہے جسے پنجاب ریلیجیس بک سوسائٹی انار کلی لاہور نے ۱۹۰۶ء میں " شوہر کا رہنما " کے نام سے شائع کیا۔ یہ کتاب گرچہ ترجمہ ہی، تاہم جدید تحقیقات و معلومات کی بنیاد پر اور سائنٹیفک اصول پر لکھی ہوئی اردو زبان میں پہلی کتاب ہے۔ اس کتاب کے ابواب " توالد و تناسل کا جسم سے تعلق " اور " ایام حمل اور وضع حمل سے پہلے، درمیان اور مابعد کی تبدیلیاں " جدید معلومات و نظریات پر مبنی ہیں۔

بیسویں صدی میں مغرب سے جنسی موضوعات پر مبنی ناولوں اور کہانیوں اور خالص جنسیات پر علمی و تحقیقی کتابوں کی درآمد شروع ہو گئی۔ سنسکرت زبان میں لکھی ہوئی وتسایانا، کلیان مل، پنڈت کوکا وغیرہ کی تصانیف کے انگریزی میں اور ہندوستان کی مختلف صوبائی زبانوں میں ترجمے ہو گئے۔ طباعت و اشاعت میں سہولتوں کے باعث اور پہلی جنگ عظیم کے دوران و مابعد سماجی تبدیلیوں اور ذہنی انقلاب کی وجہ سے بھی اخباروں و رسالوں میں جنسیات پر مضامین لکھے جانے لگے اور جنسیاتی پرچوں کا اجرا بھی ہونے لگا۔ ان سب باتوں کا اثر و نتیجہ یہ ہوا کہ اردو میں " کوک شاستر " - " اصلی کوک شاستر " - " چینی کوک شاستر " اور اسی قبیل کی کتابیں بازاروں میں آنے لگیں۔ ان میں ہندوؤں کے نظریات کے مطابق محبت کی قسمیں، مردوں کی اقسام ششک، مرگ، برشب، اشو، عورتوں کی قسمیں (پدمنی، چترانی، سنکھنی، ہستنی) اور ۶۵ یا ۸۴ آسنوں کے سرسری بیان کے بعد آخر میں ممسک دواؤں کے نسخے یا اشتہارات ہوتے تھے۔ پھر ان کتابوں کا سلسلہ شروع ہوا جو " دلہن کی ڈائری " - " دلہنوں کی کانفرنس " - " پانچ سہیلیوں کا جھگڑا " - " داستان شب عروسی " - " شادی کی رات " - " سہاگ رات " وغیرہ کے نام سے بازاروں میں ملتی ہیں۔ ان کے مصنفین کا مقصد بزعم خود نیک اور اصلاحی ہے، جیسا کہ بطور نمونہ اس تمہید سے ظاہر ہوتا ہے۔

" ناظرین ! یہ کتاب عام بازاری کتابوں کی طرح دل خوش کرنے اور اخلاق خراب کرنے کے لیے نہیں لکھی گئی بلکہ اس کتاب میں

شادی کی رات سے لے کر ۳۰ دن کے مکمل مرد عورت کے پوشیدہ تعلقات پر پوری پوری روشنی ڈالی گئی ہے اور تمام وہ باتیں تفصیل کے ساتھ لکھ دی گئی ہیں جن کا جاننا نوجوان جوڑوں کے لیے بہت ضروری ہے"۔

لیکن در حقیقت اس طرح کی تمام کتابیں جو افسانوی رنگ میں ہیں، بازاری اور مخرب اخلاق ہیں۔

جب سنسکرت کی کتابوں سے "براہ راست ترجمے" کا ڈھونگ ختم ہوا تو "عربی و فارسی کتابوں سے ترجمے کا ڈھونگ شروع ہوا۔ اور "قانون مواصلت"۔ "جنس لطیف"۔ "عروس و نوشاہ"۔ "شادی کی پہلی رات کے پوشیدہ تجربے"۔ "لذت النساء"۔ "میاں بیوی"۔ "دولہا دلہن"۔ "مرد عورت"۔ "ہدایت نامہ دولہا و دلہن" وغیرہ کے نام سے کتابیں چھپنے اور بکنے لگیں۔ پہلی کتاب "قانون مواصلت" کو لیجئے۔

اس کے مصنف منشی حامد حسین قریشی ہیں۔ یہ کتاب فروری ۱۹۳۰ء میں شائع ہوئی۔ اس کے سرورق پر اعلان ہے "عربی زبان کی ایک نہایت مستند کتاب کا ترجمہ"۔ لیکن کون سی عربی کتاب کا ترجمہ ہے، کہیں درج نہیں۔ اور نہ یہ کسی عربی کتاب کا ترجمہ معلوم ہوتی ہے۔ کیوں کہ اس میں کئی مقام پر انیسویں صدی عیسوی تک کے یورپی مصنفوں کے اقوال و تجاریر کے حوالے دیئے گئے ہیں۔ بہر حال یہ کتاب عام تصنیفوں کی طرح سنسنی خیز اور گھٹیا نہیں۔

اس زمانے میں سرقہ عام تھا۔ اور ایک کی تصنیف دوسرے کے نام سے، معمولی رد و بدل کے بعد شائع ہو جاتی تھی۔ مثال کے طور پر "ہدایت نامہ دولہا دلہن" جس کے مؤلف فدائے حکمت فخرالحکماء حکیم شیخ محمد ذکی قریشی ہیں قانون مواصلت کا دہرا چربہ ہے۔ حیدر آباد دکن سے نفیس اکادمی نے "جنسیات" پر بعض عمدہ کتابیں شائع کیں جن میں وتسایانا کی "کام سترا" اور کلیان مل کی "انگ رنگ" کے ترجمے قابل ذکر ہیں۔ پنڈت ہرنام داس بی اے نے "ہدایت نامۂ خاوند"۔ "ہدایت نامۂ بیوی" وغیرہ کتابیں لکھیں۔ لاہور ہی کے ایک ادارہ نے "پریم شاستر"۔ "کام شاستر"۔ "گربھ شاستر" وغیرہ کتابیں شائع کیں۔ اسٹینو ایجنسی امرت سر کی خدمات بھی ادب جنسیات کی نشر و اشاعت کے سلسلہ میں بھلائی نہیں جاسکتیں۔ اردو میں پہلا جنسیاتی ماہنامہ "خضر راہ" ہے جو لاہور سے نکلا۔

رسالہ "نگار" کا اجراء ۱۹۲۲ء میں ہوا۔ اس وقت سے نیاز وقتاً فوقتاً جنسیات پر لکھتے رہے ہیں۔ ان کا قلم کبھی نہیں رکا۔ جنسیاب کا مطالعہ وہ امر ضروری سمجھتے ہیں کیوں کہ ان کے نزدیک

"انسان کے فرائض علمی میں ایک بڑا اہم فرض "مطالعہ ذات" بھی ہے یہاں "ذات" سے فلسفۂ تصوف کی "ذات خداوندی" مراد نہیں، بلکہ "ذات انسانی" مقصود ہے جس میں اس کے صفات و خواہشات یا "وظائف و کوائف" سب شامل ہیں"۔ (۳)

جنسیات کی اہمیت کے بارے میں نیاز کا خیال بالکل صحیح ہے کہ

"جس طرح انسان نے اپنی اور تمام خواہشات میں اعتدال پیدا کرنے کے لیے تعقل کے ذریعہ سے متعدد علوم و فنون کی بنیاد ڈالی اسی طرح اس نے اپنی خواہش جنسی کو جائز حدود میں رکھنے کے لیے جنسیات (Sexology) کو پیدا کیا اور اگر انصاف سے کام لیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ اس علم کی اہمیت اور تمام علوم کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے کیونکہ تمدن کا بڑا ہنگامہ اسی خواہش پر منحصر ہے"۔ (۴)

جنسیات پر قلم اٹھانے کا جواز نیاز نے یوں پیش کیا ہے۔

"مغربی زبانوں میں اس فن پر کثرت سے کتابیں لکھی گئی ہیں، خصوصیات کے ساتھ گزشتہ ربع صدی میں تو نہایت زیادہ انہماک کے ساتھ اس پر توجہ کی گئی اور غیر معمولی طور پر بہت زیادہ لٹریچر اس موضوع پر شائع ہوا۔ لیکن مشرقی زبانوں اور خاص کر اردو میں

کوئی قابل ذکر کتاب اس مسئلہ پر نہیں لکھی گئی ۔ اس میں شک نہیں کہ بعض کتابیں کوک شاستر کے اصول پر تو ضرور مرتب کی گئیں لیکن ان کا مقصود بجائے اصلاح کے اور زیادہ ہیجان پیدا کرنا ہے اور ان سے صرف وہی ادنیٰ ذہنیت اور معمولی ذوق کے آدمی لطف اٹھا سکتے ہیں جو اس فن کے علمی پہلو کی جگہ عملی پہلو کو دیکھنا پسند کرتے ہیں ۔ چنانچہ عرصہ سے میرا خیال تھا کہ ایک بسیط تالیف اس موضوع پر پیش کروں اور لوگوں کو بتاؤں کہ اس مسئلہ کے کون کون سے پہلو غور کرنے کے قابل ہیں اور تاریخ و علم کی روشنی میں اس کا مطالعہ کرنے سے کیا فائدے ہم کو حاصل ہو سکتے ہیں" ۔ (۵)

نیاز کا جنسیات سے دلچسپی لینا بلاوجہ اور خالی از سبب نہیں ۔ ان کے جنسیات کی طرف متوجہ ہونے کی کہانی بڑی دلچسپ اور اہم ہے اور اس کہانی کا تعلق ان کی پچھلی زندگی سے ہے جس نے ان کے خیالات و افکار اور اعتقادات کی دنیا کو ایک نئے سانچے میں ڈھال دیا ۔ نیاز کی کہانی ان ہی کی زبانی سنئے !

" اپنی زندگی میں سب سے زیادہ اثر میں نے جس کا لیا وہ مولویوں کی جماعت تھی لیکن یہ اثر بالکل منفی قسم کا تھا ۔ یعنی میں ان سے متاثر تو ہوا لیکن یہ تاثر ایک نوع کا انکاری تاثر تھا .... دفعتاً فضائے مذہب و مولویت سے ہٹ کر عشق و محبت یا بالفاظ دیگر جنسی رجحان و ہیجان کی دنیا میں آجانا میری زندگی کا ایسا واقعہ ہے جس کا ذکر کئے بغیر آگے گزر جانا اچھا نہیں معلوم ہوتا .....

میرے والد عجیب و غریب اصول کے انسان تھے اور بچوں کی تربیت کے باب میں وہ اس قدر وسیع الخیال تھے کہ موجودہ عہد ترقی میں بھی اس کا تصور نہیں کیا جاسکتا ۔ میں نے اپنے والد کا عہد شباب نہیں دیکھا لیکن جو کچھ میں نے سنا اس سے مجھے اس بات کا علم ہو گیا تھا کہ انہوں نے اپنی جوانی بالکل ایسی فضا میں گزاری تھی جس کا اصطلاحی نام بعد کو " شام اودھ " قرار پایا اور اپنے ذوق شباب کی تسکین میں انہوں نے وہ سب کچھ کیا جو ایک رنگین مزاج ، دولتمند انسان لکھنو کی نشہ بخش اور عشق خیز سرزمین میں کر سکتا تھا ۔ یہ امر بھی بالکل اتفاقی بات ہے کہ میرے عہد شباب کی وہ جھرجھری جو عورت کے جسم سے مس ہونے کے بعد پیدا ہوتی ہے ، سب سے پہلے میرے جسم میں بھی یہیں پیدا ہوئی ۔

جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا ، تربیت اخلاق کے باب میں میرے والد کا نظریہ بڑا عجیب و غریب تھا ۔ وہ جنسی داعیات کو دبانے کے قائل نہ تھے ، بلکہ ان کی تسکین ہی کو ذہنی و جسمانی نشوونما کا صحیح ذریعہ قرار دیتے تھے ۔ اس لیے جب میں اپنی عمر کے ان حدود میں آگیا ، جہاں ان کو اپنے نظریئے کا عملی تجربہ کرنا تھا ، تو انہوں نے مجھے بالکل آزاد چھوڑ دیا ۔ لیکن آپ کے لیے اس امر کا تصور بھی مشکل ہو گا کہ اب سے ۶۰ سال قبل لکھنو کیا چیز تھا اور اس میں کسی نوجوان کا آزاد چھوڑ دیا جانا کیا معنی رکھ سکتا تھا ۔ ... ...

پھر اس دور آزادی میں میں نے وہاں کیا کیا دیکھا ، کن کن گلیوں کی خاک چھانی ، کن کن دیواروں کے سائے میں اور کن کن راہ گزاروں کی خاک پر میں نے اپنے لمحات شباب صرف کئے یہ بڑی طویل داستان ہے .... میرے والد نے بھی مجھے اس دربار (بزم طوائف) میں بھیجنا شروع کیا اور یہیں سے میرے شباب کا وہ دور شروع ہوا جسے میں اپنے ادبی دور کا بھی آغاز کہہ سکتا ہوں .... میرے ذہنی انقلاب اور ادبی رجحانات کا تعلق زیادہ تر " مولوی " اور " عورت " ہی سے ہے ۔ اس لیے مولوی کے ذکر کی تلخی کے بعد " عورت " کا ذکر آگیا ہے تو جی چاہتا ہے کہ اس سلسلہ میں وہ سب کچھ کہہ جاؤں جس کے اظہار کا موقع شاید مجھے پھر نہ مل سکے ... . میرے عشق و جنوں کا یہ دور مختلف مقامات سے تعلق رکھتا ہے ، جن میں لکھنو ، الہ آباد ، مسوری ، سری نگر ، ہانسی ، بھوپال رامپور اور کلکتہ کو زیادہ اہمیت حاصل ہے ۔ ان تمام مقامات میں ، میں اور میرا ذوق ادب عورت سے کس کس طرح متاثر ہوا اور اس میں کیا تدریجی تبدیلیاں پیدا ہوئیں ، بڑی طویل داستان ہے " ۔ (۶)

نیاز کے اعترافات سے یہ واضح ہے کہ ان کے ذہنی انقلاب اور ذوق ادب کی نشو و نما میں عورت کا اہم و نمایاں کردار رہا ہے اور عورت کے بارے میں ان کا جی چاہتا ہے کہ وہ سب کچھ کہہ جائیں جس کے اظہار کا موقع شاید نہ مل سکے اور چونکہ، نیاز کا خیال ہے کہ

"تمدن کا بڑا ہنگامہ خواہش جنسی پر منحصر ہے اور اس کا تعلق ایسی جنس سے ہے جو انسان کا بہترین نصف حصہ کہلاتی ہے اور دنیا کی تقریباً آدھی آبادی ہے"۔

اس لیے نیاز کے نزدیک

"جنسیات کی اہمیت اور تمام علوم کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے"۔

اور یہی وجہ ہے کہ جنسیات کو نیاز نے ایک محبوب علم اور مرغوب فن کا درجہ دیا ہے۔ نیاز مانتے ہیں

"جنسی جذبات کی "پیداوار" کوئی نئی چیز نہیں، انسان ہمیشہ اس کے لیے تڑپا ہے۔ اسی جذبہ کی آزادی نے قوموں میں کشت و خون کا بازار گرم کیا اور اسی جذبہ کی پابندی کی طرف سب سے پہلے سوسائٹی نے توجہ کی۔ اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ جس جذبہ کا کھلم کھلا عمل میں لانا معیوب ہو، اس کا اظہار مستحسن سمجھا جائے۔ لیکن اگر اس طرح بے باکی سے اس کا اظہار کیا جاتا ہے تو پھر اس کو علی الاعلان عمل سے بھی ظاہر کرنے کی جرأت کرنا چاہئیے"۔ (۷)

آخری جملہ تو خیر جملۂ معترضہ تھا، لیکن یہ حقیقت ہے کہ جنسیات کی اہمیت و افادیت کے قائل ہوتے ہوئے بھی نیاز اس باب میں مغرب کی اندھی تقلید کو برا سمجھتے ہیں۔ خود فرماتے ہیں۔

"افسوس ہے کہ ہمارا نوجوان طبقہ مغربی تعلیم کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ وہاں کی عمرانی و معاشرتی برائیوں کو بھی اختیار کر لیتا ہے اور کورانہ تقلید مطلق غور کرنے کی اجازت نہیں دیتی، خصوصیت کے ساتھ جنسیات کے مسائل میں تو بالکل ہی عقل و تمیز سے کام نہیں لیا جاتا اور اس کا ایک سبب غالباً یہ بھی ہے کہ جوانی میں وہی باتیں زیادہ قرین عقل معلوم ہوتی ہیں، جو زیادہ فحش و عریاں ہیں"۔ (۸)

"عشق و محبت" کے بارے میں نیاز نے بارہا اپنے خیال کا اظہار کیا ہے۔ "محبت" پر کبھی فلسفیانہ نظر ڈالی ہے تو کبھی جنسی نقطۂ نگاہ سے اسے دیکھا ہے۔ چنانچہ نیاز ایک استفسار کے جواب میں لکھتے ہیں۔

"غالباً انہوں نے (اہل عرب) نے بہت زیادہ محبت کی ہے یا اس لیے کہ وہ نسبتاً اس کے زیادہ اہل ہیں۔ عشق و محبت کے جتنے مدارج انہوں نے مقرر کئے ہیں وہ کسی ملک یا زبان میں نہیں پائے جاتے۔ مختلف کیفیات کے لیے انہوں نے جدا نام وضع کیا اور ہر کیفیت کے اظہار میں دفتر کے دفتر سیاہ کر دیئے۔ شہاب الدین نویری نے لکھا ہے کہ سب سے پہلے جذبہ۔ پسندیدگی پیدا ہوتا ہے۔ اس کے بعد قرب و نزدیکی کی خواہش پیدا ہوتی ہے جو مودت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد محبت ہوتی ہے، پھر درجہ ہوئی کا ہے اور اس کے بعد عشق کا۔ لیکن عشق آخری منزل نہیں ہے کیونکہ عشق بڑھ جانے کے بعد تیتیم ہو جاتا ہے اور تیتیم میں زیادتی ہونے سے ولہہ کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور جنون کا درجہ غالباً ولہہ کے بعد ہے"۔ (۹)

اپنے ایک خط میں (۱۰) نیاز نیاز فرماتے ہیں۔

"حقیقت یہ ہے کہ "عشق" نام ہے صرف حماقت کا خواہ قبل مسیح ہو یا بعد مسیح۔ حیرت ہے کہ ایسے گوش و ہوش والے انسان بھی اس

کوچہ میں آکر اتنے احمق ہوجاتے ہیں" ۔

نیاز نے شہاب الدین نویری کے مندرجہ بالا اقوال دہرانے کے بعد باہمی کشش کا ایک انوکھا سبب یوں بیان کیا کہ

"جدید ترین تحقیق سے ثابت ہے کہ ہر شخص کے جسم سے غیر مرئی کہربائی شرارے پیدا ہوتے رہتے ہیں اور بالکل ممکن ہے کہ جس وقت دو انسان کے برقی پارے اپنی کیمیاوی حقیقت کے لحاظ سے یکساں ہوتے ہوں، اس وقت دونوں میں محبت ہوجاتی ہے اور جب ان میں تضاد ہو تو نفرت ہوجاتی ہے ۔ یہ بالکل جدید ترین تاویل ہے لیکن کس قدر حیرتناک امر ہے کہ اب سے تیرہ سو سال قبل جب رسول اللہ سے نفرت و محبت کی ماہیت دریافت کی گئی تو آپ نے بھی یہی فرمایا تھا کہ **الارواح جنود مجندۃ ماتعارف**" ۔ (۱۱)

ایک اور جگہ (۱۲) نیاز نے شہاب الدین نویری ہی کے خیال کو دہراتے ہوئے لکھا ہے کہ

"محبت یا عشق فی الحقیقت ایک شدید قسم کا احساس پسندیدگی ہے ۔ پھر اگر یہی جذبہ، پسندیدگی افراد نوع انسانی میں سے کسی کے ساتھ ہو تو وہ بھی محبت کہلاتا ہے .... بعض احباب کو میں نے کہتے ہوئے سنا ہے کہ علاوہ جنسی محبت کے ایک چیز ذہنی و روحانی محبت بھی ہے جسے Platonic love کہتے ہیں ۔ لیکن میں اس کو محض شاعری سمجھتا ہوں اور اس کا وجود جنسی کیفیات سے علیحدہ میری سمجھ میں نہیں آتا" ۔

نیاز افلاطونی محبت کو محض ڈھونگ سمجھتے ہیں اور اس کے سرے سے قائل نہیں ۔ لیکن وہ فرائڈ کے بنیادی نظریہ، جنسی کے بھی قائل نہیں کہ محبت کی ہر قسم، خواہ وہ ماں کی بیٹے سے ہو یا باپ کی اپنی بیٹی سے، جنسی ہوتی ہے، گو شعوری طور پر اس کا احساس اور یقین دونوں میں کسی کو نہ ہو ۔ ایک استفسار کے جواب میں کہ کیا محبت لوث جنسی سے منزہ ہو سکتی ہے "نیاز نے فرائڈی نظریہ کے خلاف اپنی رائے کا اظہار کیا کہ

"محبت کی اگر تقسیم کی جائے تو بہ ظاہر اس کی چھ صورتیں ہو سکتی ہیں ۔ (۱) محبت اپنی ذات سے (۲) اولاد و اقارب سے (۳) احباب و اصدقاء سے (۴) مذہب اور ملت وطن سے (۵) عام نوع انسانی سے اور (۶) حب جنسی یعنی عورت مرد کی محبت ۔ محبت کو صرف لوث جنسی سے متعلق سمجھنا نہایت کوتاہ نظری کی بات ہے" ۔ (۱۳)

البتہ نیاز مذہبی ہیجان کا سبب جوش جنسی کو قرار دیتے ہیں ۔ "مذہب و شہوانیات" کے عنوان سے اپنے ایک مقالہ (۱۴) میں نیاز لکھتے ہیں :

"اس میں شک نہیں کہ غذا کے بعد سب سے زیادہ قوی جذبہ، جنسی میلان ہی کا ہے جس سے انسان انتہائی لطف و مسرت حاصل کرتا ہے (۱۵) ۔ اور زمانۂ حال کے ماہر نفسیات بھی کافی تحقیق و جستجو کے بعد اسی نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ مذاہب عالم کے بہت سے عقائد و مراسم کی بنیاد انسان کے اسی جذبہ پر قائم ہے ۔ دیکھا جاتا ہے بعض لوگوں میں مذہبی جوش و ہیجان بہت زیادہ پایا جاتا ہے اور اس کا سبب عام طور پر مذہبی شغف کو قرار دیا جاتا ہے لیکن نفسیاتی نقطۂ نظر سے اس ہیجان کا سبب صرف یہ ہے کہ مذہبی ریاضت و اعمال میں جنسی خواہش کو سختی کے ساتھ دبایا جاتا ہے اور یہی جنسی جوش مذہبی خیالات میں منتقل ہو کر انتہائی تقشف کی صورت اختیار کر لیتا ہے ۔ چنانچہ صوفیہ کے یہاں مشہور ہے کہ جذبات جنسی کی کمزوری کبھی ایک شخص کو صاحب حال اور اہل دل نہیں بنا سکتی .... مذہبی ہیجان کے مظاہرہ میں ایک منزل وہ بھی آتی ہے جسے "حب الہیٰ" کہتے ہیں ۔ لیکن سچ پوچھئے تو یہ خیال بھی اسی دبائے ہوئے جذبہ، شہوانی سے پیدا ہوا ہے ۔ چنانچہ کلیسا کی تاریخ قدیم سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت جذبہ، شہوانی اور احترام الوہیت

دونوں نے مل کر ایسی عجیب صورت اختیار کر لی تھی کہ بعض راہب اس خیال سے مست رہتے تھے کہ مریم کے ساتھ ان کی روحانی شادی ہو چکی ہے اور کلیسا کی کنواریاں اپنے آپ کو مسیح کی دلہن سمجھا کرتی تھیں یہ جذبہ ان میں محض اسی وجہ سے پیدا ہوتا تھا کہ وہ گوشت و پوست کی مخلوق ہونے کی حیثیت سے اپنی جنسی خواہش کو فطری طریقہ پر پورا نہ ہونے دیتے تھے اور ان کی یہی ناآسودہ آرزو انہیں مجبور کرتی تھی کہ وہ مریم اور مسیح کے ساتھ اس نوع کا روحانی مگر غیر فطری تعلق ظاہر کر کے اپنے جنسی ہیجان کی تسکین کر لیا کریں۔ ہو سکتا ہے کہ یہی چیز بعد میں استلذاذ بالنفس اور استلذاذ بالخیال کے رواج کا باعث ہوئی ہو۔ خدا اور انسان کے درمیان عشق و محبت کی داستان بہت پرانی ہے اور عہد قدیم کے تمام مذاہب میں اس قسم کی روایات پائی جاتی ہیں جن میں مختلف دیوتاؤں نے زمین پر آکر حسین لڑکیوں سے عشق کیا اور ہو سکتا ہے کہ مسیح کا بطن مریم سے بغیر وساطت مرد پیدا ہونا اسی خدائی عشق کے عقیدہ کا کرشمہ ہو .... ہندوستان کے مذاہب میں اعضائے جنسی کی پرستش کا علم تقریباً ہر شخص کو ہے لیکن یہ چیز صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ دوسرے ممالک میں بھی پائی گئی ہے"۔

نیاز نے "حب الٰہی کے بارے میں اپنے ایک خط (۱۶) میں صاف صاف لکھا ہے کہ

"حسن مجرد" کے پرستاروں کا میلان اس (امرد پرستی) کی طرف زیادہ ہوتا ہے ... محبت کے باب میں روحانیت و حقانیت میری سمجھ میں آتی نہیں"۔

نیاز نے جو کچھ لکھا ہے وہ حقیقت پر مبنی ہے اور مذہب کے نام پر جو ظلم و ستم ہوئے ہیں ان کے منجملہ اسباب میں ایک سبب جنسی ناآسودگی بھی ہے۔ اس سلسلہ میں کیتھراین ڈی میڈیچی (۸۹ - ۱۵۱۹ء) ملکۂ فرانس کی مثال کافی ہے جس نے جوشِ مذہبی میں ۱۵۷۲ء میں پروٹسٹنٹ مذہب کے ایک فرقہ کے ہزاروں آدمیوں کو مروا ڈالا اور جس کے بارے میں رچرڈ لیونسن نے لکھا ہے۔ (۱۷)

" Catharine has earned the reputation of being one of the craftiest sadiats of modern history ...... it was a thwarted sex life that turned her into the patts of cruetty.

اور نیاز کا یہ خیال کہ

"ہو سکتا ہے کہ یہی چیز (ناآسودہ خواہش جنسی) بعد میں استلذاذ بالنفس اور استلذاذ بالخیال کے رواج کا باعث ہوئی ہو"۔

بھی بالکل صحیح ہے۔ اسی ملکہ کیتھراین کے بارے میں اس کے ہم عصر مورخ اور اس کے دربار سے وابستہ امیر برانتم (۱۶۱۴ - ۱۵۴۰ء) نے لکھا (۱۸) ہے کہ

" کیتھراین جب بیاہ کر کے فرانس آئی تو اطلی سے اپنے ساتھ استلذاذ بالمثل کی بیماری بھی لائی اور فرانس کی عورتوں میں اس شوق کے رواج پانے کا باعث یہی عورت ہے"۔

مسئلہ ازدواج اور ازدواجی زندگی کے بارے میں بھی نیاز نے اکثر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور ان کی رائے اس باب میں کتنی وقیع ہے۔ مندرجہ ذیل اقتباسات سے ظاہر ہوگی۔

۱۔ "ایک بیوی کے مرجانے کے بعد دوسری شادی کرنا ظاہر ہے کوئی شرعی گناہ تو ہے نہیں لیکن اخلاق و معاشرتی معصیت ضرور ہے اگر کسی کے حالات اس کے مقتضی نہیں"۔ (۱۹)

۲- "رشتۂ ازدواج یقیناً جنسی داعیات پورا کرنے کا ذریعہ ہے اور اس سلسلہ میں میاں بیوی کو لذت اندوزی کی پوری آزادی حاصل ہے، لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ آپ اس آزادی سے ناجائز یا غلط فائدہ اٹھائیں۔ اس جگہ مجھے ذرا وضاحت کے ساتھ بتادینا چاہیئے کہ "ناجائز فائدہ سے میری مراد کیا ہے۔ اتنا تو آپ بھی جانتے ہوں گے کہ انسان و حیوان میں کچھ فرق ہے اور یہ فرق تعلق رکھتا ہے صرف ذہن و تعقل سے۔ بقاء زندگی کی جو اصولی اور سادہ ضروریات ہیں، ان میں تو انسان و حیوان دونوں برابر ہیں، لیکن انسان چونکہ تمدنی حیوان ہے اور اس کی زندگی کا مقصد محض زندہ رہنا نہیں بلکہ ذہنی و عمرانی ترقی کرنا بھی ہے، اس لیے حیوانی خواہشات کے لحاظ سے اسے صرف اسی حد تک آزادی مل سکتی ہے کہ ذہنی، عمرانی و اخلاقی ترقیوں کو اس سے کوئی نقصان نہ پہنچے۔ اور چونکہ جنسی جذبات کا تعلق یکسر حیوانی خواہشات سے ہے، اس لیے ان کے پورا کرنے میں بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے اور اس باب میں صرف لذت اندوزی کو سامنے رکھ کر بغیر کسی امتیاز کے وہ سب کچھ کر گزرنا جو جی میں آئے کبھی جائز قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اسی لیے تمام شریعتوں اور سماجی اداروں نے رسم ازدواج کے قیام کے ساتھ ساتھ کچھ اصول بھی مقرر کردیئے تاکہ انسان محض جنسی لذت اندوزی کے لیے حیوان نہ بن جائے اور رشتۂ ازدواج کا حقیقی مقصد وفوت نہ ہونے پائے۔ اگر جنسی ہیجان کی تسکین ہی مرد عورت کے باہمی تعلق کا واحد مقصود ہوتا تو پھر نکاح کی کوئی ضرورت نہ تھی، انسان کو اس باب میں جانوروں کی طرح آزاد ہونا چاہیئے تھا، لیکن چونکہ مرد عورت کی باہمی وابستگی انسانی تمدن کی بھی بنیاد ہے، اس لیے وہ نکاح کبھی حقیقی معنے میں نکاح نہیں ہوسکتا جو اس ضرورت کو پورا نہ کرے۔ انسان ہمیشہ جوان ہی نہیں رہتا، بلکہ ایک وقت آتا ہے کہ وہ جوانی کی باتیں کرنے سے بھی گریز کرنے لگتا ہے اور یہی وہ وقت ہوتا ہے جب وہ محسوس کرتا ہے کہ مرد عورت کا حقیقی تعلق جذبہ حیوانی سے علحدہ کسی اور جذبہ سے بھی ہے اور وہ جذبہ ہمارے سماج اور ہماری معاشرت اور ہمارے اجتماعی اخلاق و تمدن سے تعلق رکھتا ہے۔ اور اسی لیے ٹالسٹائی کا فیصلہ ہے کہ شادی کا زمانہ ۴۰ سال کے بعد آتا ہے جب کہ جذبات حیوانی میں اعتدال پیدا ہوجاتا ہے۔ اگر انسان کی عمر طبعی ۶۰ سال کی قرار دی جائے تو اس میں جوانی کے پر جوش ہیجان کا زمانہ (۲۰ سال کی عمر سے لے کر زیادہ سے زیادہ ۴۰ سال تک) صرف ۲۰ سال رہتا ہے اور باقی ۴۰ سال کی مدت وہ ہوتی ہے جب یہ جذبہ کارفرما نہیں ہوتا۔ اس لیے یوں بھی عقل انسانی یہی کہتی ہے کہ ۲۰ سال کے لیے ۴۰ سال ضائع کردینا کسی طرح مناسب نہیں۔ اور اگر کسی شخص نے ہیجان شباب کا زمانہ بے احتیاطی سے بسر کیا تو اس کے متعلق یقیناً یہی کہا جائے گا کہ اس نے اپنی عمر کے بڑے حصے کو چھوٹے حصہ عمر کی لذتوں پر قربان کردیا"۔ (۲۰)

"میاں بیوی کا رشتہ بڑا نازک و پیچیدہ رشتہ ہے۔ کیوں کہ اس کا تعلق ایک طرف ذاتیات سے ہے اور دوسری طرف اجتماعیات سے بھی۔ یعنی اس تعلق کا ایک پہلو وہ ہے جو میاں بیوی کے ذاتی میلانات سے وابستہ ہے اور دوسرا وہ ہے جو سوسائٹی اور سماج کے نظام سے تعلق رکھتا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس میں جنسی میلانات کو اتنی زیادہ اہمیت حاصل نہیں ہے جتنی اجتماعی و تمدنی مصالح کو اور اسی کو پیش نظر رکھ کر "ادارۂ نکاح" قائم کیا گیا ورنہ جنسی خواہش تو بغیر نکاح کے بھی پوری ہوسکتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جنسی میلان اس سے بالکل بے نیاز ہے کہ وہ کسی نتیجہ پر غور کرے کیونکہ بھوک پیاس کی طرح وہ بھی ایک فطری خواہش ہے جس کو انسان پورا کرتا ہے، لیکن جس طرح غذا کا مقصود صرف زندہ رہنا نہیں بلکہ زندہ رہ کر مفید کام کرنا ہے، اسی طرح نکاح کا مقصود بھی صرف جنسی خواہش پورا کرنا نہیں بلکہ توالد و تناسل قائم رکھ کر اچھے افراد قوم پیدا کرنا ہے"۔ (۲۱)

عرض کر چکا ہوں کہ نیاز کے نظریات کو فکر کے سانچے میں ڈھالنے والی ہستی "عورت" کی ہے اور نیاز کے الفاظ میں :

"عورت کے باب میں میرا نظریہ یہ ہے کہ وہ انتہائی گناہگار ہونے کے باوجود بھی اویس و بایزید سے زیادہ معصوم ہے"۔ (۲۲)

عورت کے فرائض و ذمہ داریوں کی بابت نیاز فرماتے ہیں

"جنسیات سے تعلق رکھنے والی باتوں کو چھوڑ کر آپ تمدنی حیثیت سے غور کریں تو حالت اور زیادہ افسوسناک نظر آئے گی۔ خانہ داری، تربیت اولاد، اقتصادی نگہداشت وغیرہ جن میں دستگاہ رکھنا عورت کا حقیقی حسن ہے۔ تعلیم بے شک عورت کے لیے ضروری ہے لیکن اس کے لیے یہ لازم نہیں کہ وہ بے پردہ ہو کر سوسائٹی کا تفریحی عنصر بن جائے"۔ (۲۳) کامیاب ازدواجی زندگی کے لیے بیوی میں کن خصوصیات کا ہونا ضروری ہے، اس پر نیاز کی رائے ہے کہ

"بیوی کا تعلق "جذبہ شہوانی" سے اتنا نہیں جتنا "مصلحت عمرانی" سے ہے۔ اس کا صاحب حسن و جمال ہونا اتنا ضروری نہیں جتنا خوش خصال ہونا .... یہ جو مذہب اسلام میں کفو کے درمیان شادی کرنے کی ہدایت کی گئی ہے، اس کا مفہوم سب لوگ غلط سمجھتے ہیں۔ کفو سے یہ لوگ خاندان یا برادری مراد لیتے ہیں۔ درآں حالیکہ کفو کے معنی مماثل کے ہیں۔ یعنی جو لوگ تہذیب و شرافت، تعلیم و تربیت، سیرت و صورت میں باہمدگر مماثل ہیں ان میں ایک دوسرے کے ساتھ رشتۂ ازدواج قائم ہونا چاہئے پھر اس کے لیے خاندان یا برادری کی قید بیکار ہے"۔ (۲۴)

عورت کے احترام کے باوجود نیاز جب میاں بیوی کی باہمی کشمکش اور آپس میں چپقلش پر غور کرتے ہیں تو شوہر سے زیادہ بیوی کو قصوروار ٹھہراتے ہیں۔ سنئے کیا فرماتے ہیں۔

"دوسری بات جو میرے خیال میں عام طور پر باہمی کشمکش کا سبب ہوا کرتی ہے عورت کا جذبہ رشک اور اس کی "کاوش پسندی" ہے۔ یعنی وہ اس کوشش میں کہ مرد پر پوری طرح مستولی ہو جائے اس کی جائز تفریحوں اور ضروری آزادیوں میں بھی مخل ہونے لگتی ہے اور ہر وقت اس فکر میں لگی رہتی ہے کہ مرد کہاں جاتا ہے، کس کس سے ملتا ہے اور کس جگہ کتنا وقت صرف کرتا ہے۔ زیادہ محبت کرنے والی عورتوں میں "جاسوسی" کی یہ کیفیت زیادہ پیدا ہو جاتی ہے اور رات دن وہ اسی فکر میں مبتلا رہتی ہیں۔ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ ہندوستان میں (اور پاکستان میں بھی) زن و شوہر کی ناچاقی کا سبب ۸۰ فیصدی یہی ہوتا ہے اور میں اس باب میں یقیناً عورت کو خطاوار ٹھہراتا ہوں"۔ (۲۵)

کامیاب ازدواجی زندگی گزارنے کے لیے نیاز عورتوں کے لیے تعلیم کی بہ نسبت امور خانہ داری پر زیادہ زور دیتے ہیں ۔ ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں ۔

"میں لڑکیوں کے لیے امتحانات میں شریک ہو کر اسناد حاصل کرنا غیر ضروری سمجھتا ہوں ۔ ..... اگر ہمارے خیالات کی بلندی بھی یہی ہے اور اصلاح کا مفہوم صرف اس قدر ہے کہ لڑکیاں مشن اسکولوں میں جاکر تھوڑی سی انگریزی اور بہت سی فیشن طرازی سیکھ لیں تو نتیجہ معلوم اور عورتوں کے ساتھ مردوں کا حشر بھی مستحق" ۔ (۲۶)

رابعہ پنہاں کے استفسار کے جواب میں نیاز فرماتے ہیں ۔

"میں یقیناً اس کا مخالف ہوں کہ خواتین ہند غزل گوئی کی طرف متوجہ ہوں کیوں کہ ان کے عشق حقیقی کو بھی میں نے مجاز میں بہت جلد بدل جاتے ہوئے دیکھا ہے اور اس سے دنیا ناآشنا نہیں کہ وہ عورت جو محبت کرنا سیکھ جاتی ہے ، سوسائٹی کے لیے کچھ مفید چیز نہیں ۔ افسوس کہ میں اپنے اس خیال سے کسی طرح نہیں ہٹ سکتا" ۔ (۲۷)

اسی طرح پردہ کے متعلق فرماتے ہیں ۔

"عورتوں کے لیے چار دیواری کے اندر بند رہنے کا کہیں حکم نہیں ہے ، وہ مناسب و ضروری پردہ کے ساتھ باہر نکل سکتی ہیں ، پردہ ایسا ہونا چاہیئے جس سے ان کی آرائش وغیرہ ظاہر نہ ہو سکے (اس لیے ہمارے ہاں کا موجودہ برقع عین اس حکم (قرآنی) کے مطابق ہے) اور اگر کوئی حصہ جسم کھل جائے تو جو چلنے میں چھپایا نہیں جاسکتا جیسے پاؤں یا ہاتھ یا آنکھ تو کوئی حرج نہیں" ۔ (۲۸)

بہت ممکن ہے ، نیاز کے ان خیالات کو پڑھ کر لوگ ان کو دقیانوسی ، قدامت پرست اور رجعت پسند ہونے کا طعنہ دیں مگر نیاز نے آج سے اکتیس سال پہلے (یعنی ۱۹۳۲ء میں) جو کہا تھا کہ

"یہ واقعہ ہے کہ اب یہ آزادی کی رو کسی طرح رکنے والی نہیں اور زمانہ جو عبارت ہے اس نوع کے مد و جزر سے کہ جب تک ایک بار مرد کو عورت اور عورت کو پوری طرح مرد نہ بنالے چین نہیں لینے دے گا" ۔ (۲۹)

تو کیا غلط کہا تھا ۔ کیا آج کی عورت مرد بننے کی کوششوں میں مصروف نہیں ہے ؟ اور پھر نیاز کے اس قول سے کہ

"اب تعلیم جدید نے ہندوستان کی (اور پاکستان کی بھی) عورتوں میں یہ میلان ضرور پیدا کر دیا ہے کہ وہ گھر کے کاموں سے الگ رہیں اور یہ میلان حد درجہ خطرناک ہے" ۔ (۳۰)

کس ہوشمند کو اختلاف ہو سکتا ہے ۔

نیاز بعض حالات کے تحت ضبط تولید کے موافق ہیں اور فرماتے ہیں ۔

"یہ مسئلہ بھی منجملہ ان مسائل کے ہے جن کا تعلق مذہب و شریعت سے کوئی نہیں بلکہ اقتصادی و معاشی حالات سے ہے ۔ اگر واقعی کوئی شخص مفلس و نادار ہے تو اس کے لیے سب سے زیادہ عذاب دنیا میں یہی ہے کہ اولاد کی کثرت ہو ۔ اس لیے اس کا ذاتی و انفرادی فرض یہ ہے کہ وہ قطعاً اس سلسلہ کو روک دے ...... اگر کسی شخص کی مالی حالت اتنی کمزور ہے کہ وہ اپنی اولاد کی صحیح تربیت کا انتظام نہیں کر سکتا اور پھر بھی اولاد پیدا کرتا جاتا ہے تو میرے نزدیک ایسا شخص قوم کا مجرم ہے اور اس کو سخت سے سخت سزا دینا چاہیئے ۔ کیونکہ وہ سوسائٹی میں نااہل نااہل افراد کا اضافہ کر رہا ہے جو قومی زندگی کے لیے سخت تباہ کن امر ہے ۔ لیکن اگر کوئی

شخص تعلیم و تربیت کا پورا انتظام کر سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اولاد سے گھبرائے اور قطع نسل کی طرف مائل ہو ..... اس وقت مسلمانوں کی مالی حالت یقیناً نہایت خستہ ہو رہی ہے اور منجملہ دیگر اصلاحی تدبیروں کے ایک تدبیر یہ بھی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اولاد کم پیدا کی جائے"۔ (۳۱)

جنسیات سے متعلق موضوعات پر نیاز کے افکار و خیالات، جن کا بیان و تجزیہ اوپر ہو چکا ہے، زیادہ تر ان کے مکتوبات، استفسارات کے جواب اور گنتی کے چند مضمون میں ملتے ہیں۔ علاوہ ازیں، کتابی صورت میں نیاز کی ایک علیحدہ مستقل تصنیف بھی ہے، جو "ترغیبات جنسی یا شہوانیات" کے نام سے موسوم اور مشہور ہے۔ اس کتاب میں دعوی کیا گیا ہے، انسان کے میلان شہوانی پر تاریخی، علمی و نفسیاتی نقطۂ نظر سے بسیط نظر ڈالی گئی ہے۔ یہ کتاب ۱۹۳۲ء میں پہلی بار منظر عام پر آئی اور اب تک اس کے تین ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

جنسیات بہ حیثیت علم و فن کے ایک بحر ذخار ہے۔ چونکہ یہ علم الانسان، علم الاعضاء، علم الحیات، عمرانیات، نفسیات و دیگر علوم و فنون کا مجموعہ ہے، اس لیے اس کے موضوعات متنوع اور نہایت وسیع ہیں۔ چنانچہ اس کے تمام پہلوؤں پر بہ یک وقت روشنی ڈالنا، کسی فرد واحد کے بس کی بات نہیں، ہیولاک ایلس نے اکتیس سال (۱۸۹۷ء تا ۱۹۲۸ء) کے عرصہ میں Studies in the psychology of sex کی سات ضخیم جلدیں شائع کیں جو نہایت معتبر و مستند تسلیم کی جاتی ہیں، تاہم وہ جنسیات کے تمام پہلوؤں پر محیط و حاوی نہیں ہیں۔ نیاز نے اپنی کتاب میں ابنارمل جنسی رجحانات و میلانات سے بحث کی ہے، جنہیں انگریزی میں Sexual abnormalties, Abberrations Anamalies, Deviations Perversions کہتے ہیں۔ جنسی گمراہیاں ایک دو نہیں ہزاروں ہیں اور ماہرین جنسیات، خصوصیت سے جرمن زبان میں کرافٹ ایبنگ، میگنس، ہرش فلڈ، مول، بلاخ اور اسٹیکل نے جنسی گمراہیوں پر بلند پایہ تحقیقی کتابیں لکھی ہیں جن سے ہیولاک ایلس و دیگر مصنفوں نے بے تحاشہ استفادہ کیا ہے۔ حال ہی میں امریکہ کے دو ڈاکٹروں، لندن اور کارپو، نے مل کر سات سو صفحات پر مشتمل کتاب موسوم بہ Sexual Deviations میں جنسی گمراہی کی تمام اقسام کا اجمالی جائزہ لیا ہے۔ مگر نیاز نے محض چند جنسی گمراہیوں۔ فحگی، استلذاذ بالمثل، استلذاذ بالوحوش، استلذاذ بالنفس کو زیر بحث لانے پر اکتفا کیا ہے لیکن ان پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

دو چار سال پہلے کراچی کے ایک ماہنامہ نے "چہ دلاور است دزدے کہ چراغ بکف دارد" کے مستقل کالم میں نیاز پر سرقہ کا الزام لگایا تھا کہ ان کی "ترغیبات جنسی" ہیولاک ایلس کے شہرہ آفاق شاہکار کا دھرا چربہ ہے۔ اول یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ہزاروں صفحات پر پھیلی ہوئی سات جلدوں کی مشمولات کی چوری چار سو صفحوں میں کس طرح سما سکتی ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ نیاز نے ہیولاک ایلس سے استفادہ کیا ہے اور جہاں جہاں انہوں نے جرمن و دیگر مغربی ماہر جنسیات کے حوالہ سے باتیں لکھی ہیں تو ان کا علم بھی ہیولاک ایلس ہی کی وساطت سے ہوا ہے نہ کہ براہ راست۔ یہ غلطی نیاز سے ضرور ہوئی کہ انہوں نے اصل ماخذات جن تک ان کی رسائی نہیں تھی، کے حوالے وساطت کا نام لیے بغیر دے دیئے رہا معاملہ استفادہ کا تو بقول جناب غلام رسول مہر صاحب

"اساتذہ ایک دوسرے کے کلام سے استفادہ بھی کرتے رہتے ہیں، جسے حق ناشناس لوگ سرقہ قرار دے لیتے ہیں"۔

اگر استفادہ سرقہ ہے تو دنیا کی کوئی کتاب حتی کہ الہامی کتاب بھی اس الزام سے بچ نہیں سکتی۔

ماارانا نقول الامعارا۔ او معادامن قولنا مکرورا۔ (کعب ابن زہیر)

(ہم جو کہتے ہیں وہ اگلوں سے مستعار لیا ہوا خیال ہوتا ہے یا اپنے ہی کہے ہوئے کو دہراتے ہیں)

"ترغیبات جنسی" اپنی نوعیت کی اردو زبان میں واحد کتاب ہے۔ اس سے پہلے اور نہ اس کے بعد اردو میں کوئی اور کتاب نظر آتی ہے جس میں اتنی تفصیل سے شادی، اعضائے جنسی کی پرستش، فحگی، ہم جنس پرستی، خود لذتی اور جانوروں سے لطف اندوزی کی ابتداء و ارتقاء سے، مثالوں اور

مستند حوالوں کے ساتھ بحث کی گئی ہو۔ ان موضوعات پر یہ منفرد اور مستند کتاب ہے۔ بعض معاملوں میں نیاز سے اختلاف کیا جاسکتا ہے، مثلاً فحاشی کی تعریف میں اور بعض جگہ نیاز نے ایک طرفہ بات کہی ہے مثلاً عورتوں میں خود لذتی سے پیدا شدہ نقصانات کے سلسلہ میں لکھتے ہیں"۔ (۳۲)

" چنانچہ ڈاکٹروں اور طبیبوں نے استلذاذ بالمثل (ہم جنس پرستی) یا استلذاذ بالنفس (خود لذتی) کے جو نقصانات لکھے ہیں ان کی فہرست بہت طویل ہے۔ ہم ذیل میں ایک نقشہ درج کرتے ہیں جس سے استلذاذ بالنفس کے نقصانات کے متعلق ڈاکٹروں کی رائیں ظاہر ہوتی ہیں"۔

اور نیاز نے ۲۸ ڈاکٹروں کے نام اور ان کے بتائے ہوئے نقصانات کی فہرست درج کر دی ہے۔ اس سلسلہ میں عرض ہے کہ یہ بیان محض ایک طرفہ ہے، کیوں کہ بعض ڈاکٹروں کی رائے میں اگر چہ صرف نقصانات ہی نقصانات ہیں لیکن دو گنی تعداد ڈاکٹروں اور ماہر جنسیات کی ایسی ہے جو نقصانات کے قائل نہیں ہیں بلکہ خود لذتی کو عورتوں کے لیے مفید اور سود مند بتاتے ہیں بہ خوف طوالت، میں صرف چند مشہور و معروف ڈاکٹروں و ماہر جنسیات کے نام اور ان کی مستند رائے لکھنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

نام	رائے
۱- ہنٹر	میں اس بات کی تصدیق کر سکتا ہوں کہ یہ فعل (خود لذتی) بذات خود، جسمانی صحت کو مباشرت کے فطری فعل سے کم ہی نقصان پہنچاتا ہے۔
۲- ارسی	خود لذتی محبت کی ایک قسم ہے اور وہ لوگ جو اسے برا بھلا کہتے ہیں، حق بجانب نہیں ہیں۔
۳- لیبز	کم سنوں کے لیے اتنا ہی نارمل ہے جتنا کہ کھانا اور سونا۔
۴- برل	اس سے کبھی کوئی نقصان نہیں بلکہ یہ اچھی چیز ہے۔
۵- اسٹرین	سائنس اس کے نقصانات کی تردید کر چکا ہے۔
۶- اسٹوکس	کم سنوں کے لیے نارمل اور ہر عمر کے لیے بے ضرر۔
۷- ڈیر بارن	ضرورت اس بات کی ہے کہ عام پبلک کو اس کے بے ضرر ہونے اور اس کے مفید اثرات سے آگاہ کیا جائے۔
۸- اسٹیکل	اس سے پرہیز نیوراتی بیماریاں پیدا کرتا ہے۔
۹- مول	اعصاب کے لیے فائدہ مند اور تسکین دہ ہے۔
۱۰- لونگ	ہونے والی دلہنوں، ایک دوسرے سے جدا میاں بیوی، بیواؤں اور کنواریوں کے لیے سفارش کرتا ہوں۔
۱۱- ابرہارڈ	عورتوں میں ذہن کی تیزی کو جلا دیتی ہے۔
۱۲- روبی	بہت سی حالتوں میں سود مند ہے۔
۱۳- ہوئیر	خصوصیت کے ساتھ عورتوں کے لیے مفید ہے۔
۱۴- بلنچارڈ ومناسیز	ایک مفید مقصد پورا کرتی ہے۔
۱۵- ہرش فلڈ	جوانوں کے واسطے حد اعتدال میں خود لذتی باعث سکون ہوتی ہے۔
۱۶- ہٹن	مجرد عورتوں کو سکون بخشتی ہے۔
۱۷- ہنڈر	بچوں کی نارمل نشوونما کا نہایت ہی اہم حصہ ہے۔
۱۸- آوہنر	کوئی وجہ نہیں کہ اسے جنسی ہیجان کی تسکین کا بیہودہ ذریعہ سمجھا جائے۔

۱۹- بار پر   بہت سوں کے لیے جنسی ہیجان کی تسکین کا بے ضرر ذریعہ ہے۔

غلطیاں کس نے نہیں کیں، ٹھوکریں کون نہیں کھاتا۔ ہیولاک ایلس جیسا عالم و محقق جب استلذاذ بالنفس کے باب میں ریختی کے مشہور شاعر جان صاحب کو عورت قرار دے کر ایک فاش غلطی کر سکتا ہے تو نیاز کی ایک دو معمولی غلطیاں اس علم کے بیان میں جو ان کے وقت تک شجر ممنوعہ تھا، کوئی حساب میں نہیں، حق تو یہ ہے کہ جنسیات کے باب میں نیاز کی خدمات بھلائی جا نہیں سکتیں اور ان کی تصنیف "ترغیبات جنسی" ادب جنسیات کا بیش بہا سرمایہ ہے۔   (از "نگار پاکستان" سالنامہ ۱۹۶۳ء)

حوالہ جات

(۱) Rana yugufan کی کتاب Sexual freedom پر ڈاکٹر نارمن ہیر کا مقدمہ

(۲) بحوالہ "نوائے ادب" بمبئی، جلد ۱۰ نمبر ۱، جنوری-مارچ ۱۹۵۹ء الشوع

(۳) تمہید "ترغیبات جنسی" از نیاز فتح پوری پہلا ایڈیشن ۱۹۳۳ء

(۴) تمہید "ترغیبات جنسی" از نیاز فتح پوری پہلا ایڈیشن ۱۹۳۳ء

(۵) تمہید ترغیبات جنسی از نیاز فتحپوری پہلا ایڈیشن ۱۹۳۳ء

(۶) "میری زندگی کے دو موڑ، از نیاز فتحپوری، مطبوعہ "نگار" اگست ۱۹۶۰ء

(۷) "نگار" جنوری و فروری ۱۹۴۴ء

(۸) "نگار" دسمبر ۱۹۴۵ء

(۹) مجموعۂ استفسار و جواب

(۱۰) مکتوبات نیاز حصہ اول

(۱۱) مجموعۂ استفسار و جواب

(۱۲) "نگار" جولائی ۱۹۴۵ء

(۱۳) کیا اب نہیں کرتا ہے ؟ ش-ر

(۱۴) A History of Sexual customs - Lives of Fair and Gallant Ladies

(۱۵) مکتوبات نیاز حصہ اول

(۱۶) "نگار" دسمبر ۱۹۴۵ء - باب المراسلہ

(۱۷) "نگار" جون ۱۹۴۶ء - باب الاستفسار

(۱۸) مکتوبات نیاز، حصہ سوم

(۱۹) مکتوبات نیاز، حصہ سوم

(۲۰) مکتوبات نیاز، حصہ اول

(۲۱) مکتوبات نیاز، حصہ اول

(۲۲) مجموعہ استفسار و جواب

(۲۳) مجموعہ استفسار و جواب

(۲۴) مجموعہ استفسار و جواب

(۲۵) "نگار" نومبر ۱۹۳۱ء

(۲۶) "نگار" جون ۱۹۴۶ء

(۲۷) مجموعہ استفسار و جواب جلد سوم

(۲۸) ترغیبات جنسی بار دوم ۱۹۴۱ء ص ۲۹۱

".."

"میں تو مظہر (جانجاں) کے ذوق شاعری کا پرستار ہوں اور اس سے بحث نہیں کہ وہ امرد پرست تھے یا کیا کیونکہ ایسا ہو بھی تو کیا گناہ ہے۔ شاید تم اس راز سے آگاہ نہیں کہ "حسن مجرد" کے پرستاروں کا میلان اس طرف زیادہ ہے گو خود میرا مشرب یہ نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے، کیونکہ محبت کے باب میں روحانیت و حقانیت میری سمجھ میں آتی نہیں اور کسی صوفی کی خدمت میں بیٹھ کر یہ فن سیکھنے کی کوشش کبھی کی نہیں۔ میں محبت کرتا ہوں اور گناہ سمجھ کر تا ہوں تاکہ اس کی لذت باقی رہے، عورت کے ساتھ جانماز کا سا شرعی تعلق میرے بس کی بات نہیں۔"

نیاز

انتخاب "من ویزداں"



مرتب رئیس الدین فریدی

"من ویزداں" علامہ فتحپوری مرحوم کے رسالے نگار میں چھپے ہوئے ۵۰ سے کچھ زیادہ مکمل مضامین پر مشتمل ہے جن کے موضوع اور خیالات اچھوتے ہیں اور جن پر اس زمانے میں کافی بحث بھی ہوتی رہی۔ ظاہر ہے کہ ان کی اشاعت کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ "انشاء" کو ان سے اتفاق ہے۔ وہ اس مسلمہ صحافتی اصول کے مطابق شائع کئے جارہے ہیں کہ۔ ایڈیٹر کا مضمون نگاروں کی رائے سے اتفاق ضروری نہیں۔ چونکہ قارئین اس نمبر میں نیاز فتحپوری کے ان مضامین کے بعض اہم حصوں کا مطالعہ کرنا چاہیں گے لہذا اردو کے اس بڑے ادیب اور محقق کے خیالات ایک بار پھر ارباب دانش و بینش کے مطالعہ اور غور و فکر کے لئے پیش کئے جارہے ہیں۔ "من ویز داں" کے زیر نظر انتخاب اور اقتباس کے لئے ہم جناب رئیس الدین فریدی مدیر "روزانہ ہند" کلکتہ کے تعاون کے شکر گزار ہیں۔

ف۔س۔اعجاز

نظریہء اسلام میری نظر میں

[نیاز صاحب کے اس مضمون پر کافی لے دے ہوئی تھی جس کے جواب میں انہوں نے متعدد مضامین لکھے تھے۔ یقیناً اس میں مروجہ عقائد کے اعتبار سے تجاوز پایا جاتا ہے۔ مگر فلسفہ ہمہ اوست سے اس کا تعلق ضرور ہے اور اس میں وسعت نظر اور وحدت انسانیت کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔ جن کی آج کم و بیش ساری دنیا میں تبلیغ ہورہی ہے اگرچہ ابھی تک منزل قریب نظر نہیں آرہی ہے۔

مرتب]

میں نے جہاں تک اسلام کی تعلیم پر غور کیا ہے اس میں کوئی تنگ نظری ایسی نہیں ہے جیسی آج کل مسلمانوں میں پائی جاتی ہے کیونکہ اس نے عوائد و مراسم کی بیخکنی کر کے صرف اخلاق کی تعلیم دی ہے اور بتایا ہے کہ حقیقتاً مسلمان وہی ہے جس کے اخلاق پاکیزہ ہوں۔

سب سے پہلی غلطی جو مذہب کے باب میں لوگوں سے ظاہر ہوتی ہے وہ کفر و اسلام اور شرک و توحید کے مفہوم کے امتیاز میں ہوتی ہے اور چونکہ یہ غلطی صدیوں سے چلی آرہی ہے اس لیے اس اس کا دور ہونا آسان نہیں ہے، تاہم چونکہ اس وقت بات آپڑی ہے اس لیے مجبور ہوں کہ مختصراً اس مسئلہ پر روشنی ڈالوں۔

انسان و خدا یا خالق و مخلوق کا جس حد تک یا جیسا تعلق ہے اس کو دیکھتے ہوئے کوئی شخص اس امر سے انکار نہیں کر سکتا کہ خالق اور خدا کی ذات بالکل بے نیاز ہے اور انسان کی کوئی بد عنوانی، کوئی نامعقولیت، یہاں تک کہ بتوں کو پوجنا بھی اس کو کوئی مضرت نہیں پہونچا سکتا۔ اس کی برہمی نہ انسان کی سی برہمی ہے کہ اس کے جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہے اور وہ خفا ہو جاتا ہے اور نہ اس کی مسرت ہماری مسرت ہے کہ کوئی امر مفید کسی سے ظاہر

ہوا، اور ہم اس سے خوش ہوگئے۔

چونکہ خدا کی ذات ہمارے فلسفہ حسرت و الم سے بلند ہے اس لیے ظاہر ہے کہ اس کی خوشنودی یا برہمی کا مفہوم بھی کچھ اور ہوگا پھر اس مفہوم کی جب جستجو کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے جس امر کو اپنی خوشنودی سے تعبیر کیا ہے، وہ حقیقتاً ہماری بہتری سے متعلق ہے اور جس امر کو وہ اپنی برہمی سے تعبیر کرتا ہے اس کا واسطہ ہماری مضرت سے ہے۔ اس لیے ظاہر ہوا کہ خدا کا منشاء صرف یہی ہو سکتا ہے کہ انسان اپنے فلاح و اصلاح کی تدبیر اختیار کرے جیسا کہ " ان ارید الا الاصلاح " سے ثابت ہوتا ہے اور ان مکارم اخلاق سے آپ اپنے کو آراستہ کرے جو تمام نوع انسانی کی ترقی کا باعث ہوتے ہیں۔ اب آپ اسی اصول کو پیش نظر رکھ کر کفر و اسلام، شرک و توحید کے مفہوم پر غور کریں گے تو آسانی سے یہ بات سمجھ میں آجائے گی کہ اسلام و توحید نام ہے صرف "استقامت فی العمل" کا بلندی اخلاق کا، اخوت عامہ کا اور کفر و شرک کہتے ہیں، نظم و نسق سے منحرف ہوجانے کو، ترک عمل کو، انحطاط اخلاق کو، انتشار و افتراق کو، فرقہ بندی کو، تفریق جامعۂ انسانیت کو اور انسانی اجتماعیت کے خراب کرنے کو، کلام مجید کی یہی تعلیم ہے اور رسول چونکہ اسی مقصد کو پورا کرنے کے لیے آئے تھے اسی لیے ان کو " کافۃ للناس " اور " رحمۃ للعالمین " کے لقب سے یاد کیا گیا ہے۔ رسول نے فرقہ بندی کے خلاف اور تفریق مذاہب کے باوجود "اخوت عامہ" کی موافقت میں جو کیا یا کہا اس کا ثبوت کلام مجید سے ملتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے

قل امنا بالله وما انزل علینا وما انزل علی ابراهیم و اسماعیل واسحق ویعقوب والاسباط وما اوتی موسی وعیسے والنبیون من ربهم لا نفرق بین احد منهم ونحن له مسلمون ۔ پھر کیا نبیوں میں آپ رام، کوشن، بودھ، کنفوشس وغیرہ کو شامل نہیں کرتے۔ کیا ان کی نبوت سے کسی کو انکار ہو سکتا ہے " **ولقد بعثنا فی کل امة رسولا** " ہم نے ہر قوم میں کوئی نہ کوئی نبی مبعوث کیا، ارشاد خداوندی ہے۔ پھر اگر ایسا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ **ونحن له مسلمون** " میں دنیا کے تمام ممالک و مذاہب کو شامل نہ کیا جائے۔

کلام پاک کے متعدد مقام سے ظاہر ہوتا ہے کہ منشاء خداوندی یہی ہے کہ ساری دنیا ایک جماعت، ایک امت ہو کر زندگی بسر کرے اور جو لوگ اپنے عمل سے اس کی مخالفت کرتے ہیں وہ حقیقتاً فطرت کی مخالفت کرتے ہیں۔ **ولوشاء الله لجعلکم امة واحدة ولکن یضل من یشاء ویهدی من یشاء ولتسئلن عما کنتم تعلمون** ۔

" **ولوشاء الله** " کے معنی یہ نہیں ہیں کہ "اگر اللہ چاہتا" بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ خدا کے نزدیک پسندیدہ یہ ہے کہ تم سب کو ایک امت بنادے ----- لیکن وہ گمراہ کر دیتا ہے اس کو جو اپنی گمراہی چاہتا ہے اور ہدایت دیتا ہے اس کو جو اپنی ہدایت چاہتا ہے۔ لیکن اے لوگو تم مطمئن نہ رہو خدا تم سے ضرور باز پرس کرے گا۔ تمہارے افعال و اعمال پر وہ تم سے پوچھے گا کہ کیوں تم نے ہدایت کے مقابلہ میں گمراہی کو اختیار کیا اور کیوں تم نے اپنے عمل سے اپنی وسعت نظر سے اپنی رواداری سے اور اپنے اصول زندگی سے اس "اخوت عامہ" کو دنیا میں پیدا نہیں کیا جو خدا کے نزدیک محبوب ہے۔ " **یضل من یشاء** اور **یهدی من یشاء** " کے معنی بھی بعض مفسرین و مترجمین نے صحیح نہیں کئے ہیں اس کا ترجمہ عام طور پر یہ کیا جاتا ہے کہ اللہ گمراہ کرتا ہے جس کو چاہتا ہے اور ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے یعنی انھوں نے " **یشاء** " کا فاعل اللہ کو قرار دیا ہے۔ حالانکہ حقیقتاً " **یشاء** " کا فاعل " **من** " ہے کیونکہ آپ یہ معنی مراد نہ لیں گے تو پھر " **ولتسئلن عما کنتم تعلمون** " بالکل بیکار ہو جائے گا۔ کیونکہ جب ہدایت و گمراہی صرف خداداد بات ہوگئی تو باز پرس کیوں، اور کس سے ؟

کلام پاک میں اسلام کے صحیح مفہوم کو ایک جگہ نہایت ہی پاکیزہ انداز میں بیان فرمایا ہے اور اس کی وسعت و ہمہ گیری کو ان الفاظ میں ظاہر کیا گیا ہے :

" **صبغة الله ومن احسن من الله صبغة ونحن له عابدون** "

یعنی اے رسول لوگوں سے کہہ دو کہ ایمان و اسلام جس چیز کا نام ہے وہ تو وہی اتحاد و یکرنگی ہے جسے ہم خدائی رنگ کہتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس

رنگ سے بہتر لون رنگ ہوسکتا ہے ۔ اس لیے اسلام کی دعوت جن مختصر الفاظ میں کی گئی ہے اور جس آسانی کے ساتھ تمام افتراق و انتشار کو مٹانے کی کوشش کی گئی وہ یہ تھی کہ :

" قل یا اھل الکتاب تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا و بینکم الا نعبد الا اللہ و لا نشرک بہ شیئا و لا نتخذ بعضنا بعضاً اربابا من دون اللہ فان تولوا فقولوا اشھدو لہ بانا مسلمون ۔

پس اسلام نام ہوا صرف اس کا کہ سوا ذات خدا کے اور کسی کی عبادت نہ کی جائے اور نہ کسی اور ہستی کو اس کا مقابل سمجھا جائے ۔ یہ تعلیم اس قدر سادہ، اس درجہ آسان اور ایسی قریب الفہم ہے کہ گمراہ سے گمراہ قوم بھی اس کی مخالفت نہیں کر سکتی ۔ ایک سوال اس جگہ ضرور پیدا ہوتا ہے کہ خدا کو اپنی عبادت کرانے کا کیوں اس قدر شوق ہے اور وہ شرک و کفر یا جحود و انکار سے کیوں اس درجہ برہم ہوتا ہے اور میرے خیال میں اسی کے سمجھنے پر نہ صرف اسلام بلکہ تمام مذاہب کے سمجھنے کا انحصار ہے ۔

یہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ خدا کی ذات اس تاثر سے بے نیاز ہے جو ایک انسان کے دل میں پیدا ہوتا ہے اور اس لیے اس کی برہمی یا خوشی کا مفہوم انسانی مضرت و منفعت کے علاوہ کچھ نہیں ہے، انسان کا خواہ انفرادی حیثیت سے ہو یا اجتماعی لحاظ سے کسی ایسے امر کا مرتکب ہونا جو اخوت عامہ کو صدمہ پہونچانے والا ہو جو اجتماعیت عالم کو برباد کرنے والا ہو، جو مرکز انسانیت سے انحراف پیدا کرنے والا ہو، جس سے اشتراک عمل تباہ ہو اور جس سے رشتۂ تمدن اور شیرازۂ تعاون کمزور ہو جانے والا ہو، شرک و کفر ہے، جحود و انکار ہے، بت پرستی ہے اور ہر وہ چیز ہے جس کو غیر خدا کی پرستش سے تعبیر کیا جاسکتا ہے کیونکہ ایسا کرنا منشاء و حکم کے خلاف کرنا اس کی اہمیت سے انکار کرنا ہے، اس کے وجود کو نظر انداز کر دینا ہے ۔ اس کی مخالفت پر آمادہ ہونا ہے ۔

اسی پر آپ اسلام و توحید کے مفہوم کا بھی قیاس کر سکتے ہیں، ورنہ ظاہر ہے نہ اذان سے خدا کو فائدہ پہونچتا ہے نہ ناقوس سے کوئی نقصان ۔ نہ مسجد سے خدا کو کوئی راحت ملتی ہے نہ کلیسا اور مندر سے کوئی تکلیف ۔

اگر ایک شخص غیر مسلم یعنی موجودہ جماعت اسلامی کا فرد ہونے کے باوجود تمام انہیں مکارم اخلاق اور محاسن فطرت سے آراستہ ہے جن کی محمد نے تعلیم دی ہے تو کیا آپ اس کو صرف اس لیے کہ وہ آپ کی جماعت میں شامل نہیں ہے، کافر و مشرک کہہ کر ناری و جہنمی کہہ دیں گے اور دوسرا شخص جو آپ کی جماعت کا فرد ہے، لیکن حد درجہ ظالم، بے رحم، مجرم اور شقی تو کیا اس کو صرف اس بناء پر کہ اس کا نام آپ ہی کی طرح ہے، آپ کے گروہ میں اس کا شمار ہوتا ہے، نجات و فردوس کا پروانہ دے دیں گے ۔

ایک بے رحم قزاق قافلہ کے قافلہ کو تباہ و برباد کر کے متعدد بے گناہ جانوں کے خون سے اپنے ہاتھ کو رنگین کر کے فارغ ہوتا ہے کہ دفعتاً مغرب کی اذان ہوتی ہے، وہ فوراً اپنے ہاتھ اور دامن سے خون کے دھبے دور کر کے نماز میں مشغول ہو جاتا ہے ۔ دوسرا شخص جو تمام تمام دن دھوپ میں محنت شاقہ برداشت کر کے اپنے متعلقین کے لیے حلال روزی فراہم کرتا ہے ۔ گاؤں کے بچوں، بوڑھوں، یتیموں اور بیواؤں کی خدمت کے لیے اپنی محنت، دولت، زندگی سب کچھ وقف کئے ہوئے ہے ۔ لیکن شام کو وہ نماز پڑھنے کے بجائے ناقوس پھونکتا ہے ۔ مسجد جانے کے بجائے وہ مندر کا رخ کرتا ہے ۔

اب آپ ایک مسلمان مولوی سے ایک متعصب مدعی اسلام سے دریافت کیجئے ۔ وہ نہایت آزادی سے بلاپس و پیش کہہ دے گا کہ بہرحال اس قزاق کو نجات ملنی ہے کیونکہ وہ مسلمان ہے اور اس دوسرے کو آخر کار دوزخ میں جانا ہے کیونکہ اس نے بت پرستی کی اور اسلام کو قبول نہیں کیا ۔ پھر اگر اسلام نام اسی وسعت نظر و انصاف کا ہے، اگر "صراط مستقیم" اسی کو کہتے ہیں ۔ اگر "**فامر ھم بالقسط**" کا یہی مفہوم ہے ۔ اگر دین محمدی کا یہی مدعا ہے تو میں مشورہ دوں گا کہ آئیے آپ بھی میرے ساتھ کافر ہو جائیے کیونکہ پھر تو خدا کفر ہی میں تلاش کرنے سے ملے گا ۔

مسلمانوں کا یہ یقین کر لینا کہ صرف خدا انھیں کا ہے اور دوسری قوموں کو اس نے صرف دوزخ کا ایندھن بنانے کے لیے پیدا کیا ہے ایسا لغو و

مہمل اعتقاد ہے جو کسی ذی فہم کے نزدیک قابل قبول نہیں ہو سکتا اور نہ اس تعلیم کے ساتھ ہم کسی کو اپنی طرف مائل کر سکتے ہیں اسی لیے میں نے کہا کہ جہاں تک نفس تعلیم مذہب کا تعلق ہے ۔ مسجد و کلیسا، ناقوس و اذان میں کوئی فرق نہیں ہے ، اگر ان دونوں جگہ مقصود خدا کی عبادت اور اصلاح اعمال ہے ۔

آپ جب تک اس رواداری سے کام نہ لیں گے ، جس وقت تک خیال میں یہ وسعت نہ پیدا ہو گی آپ کیونکر دوسروں سے توقع کر سکتے ہیں کہ وہ آپ کی جماعت میں شریک ہو جائیں گے آپ تو ناقوس کی آواز سن کر لاحول پڑھنے لگیں ۔ لیکن دوسرا آپ کی اذان کو سن کر سربہ سجود ہو جائے باجہ بجانا چھوڑ دے ۔ کیوں ؟ آپ میں آخر وہ کون سی خصوصیت ہے جس نے آپ کو خدا کا بیٹا بنا دیا ہے اور دوسرے کو گروہ شیطان و طاغوت میں داخل کر دیا ، آپ کیوں خدا کی ذات کو لپنے اندر محدود سمجھتے ہیں ، اس کی صفت خلق و ربانیت کو لپنے لیے کیوں مخصوص جانتے ہیں یہ حیثیت انسان ہونے کے ہر شخص خواہ وہ عیسائی ہو یا ہندو چینی ہو یا بدھ ۔ معتزلہ ہو یا اشعریہ ، ناصبی ہو یا خارجی ، شیعہ ہو یا سنی ، خدا کے نزدیک ایک ہے ، اس کا سب سے ایک ہی مطالبہ ہے ، پھر جو اس کو پورا کرے گا خدا اسی کو ترقی و فلاح دے گا اور جو اس کو ترک کرے گا ، خدا بھی اس کو چھوڑ دے گا ۔

بے شک یہ میرا ایمان ہے کہ مذہب اسلام یعنی وہ مذہب جسے محمدؐ نے پیش کیا ، یقیناً بہترین ذریعہ تصفیۂ اخلاق اور تزکیۂ نفس کا ہے اور اس لیے ہر انسان کا فطری فرض ہے کہ وہ اس مذہب کو اختیار کرے لیکن وہ اس کی اشاعت کو اس طرح پسند نہیں کرتا کہ دوسرے مذہب کو برا کہوں جب کہ مذہب ہونے کے لحاظ سے وہ بھی سب سچے ہیں ۔

آپ اگر ایک ہندو کو تعلیم اسلام دینا چاہتے ہیں تو آپ کا فرض یہ نہ ہونا چاہیے کہ اس کے ارکان پر ناک بھوں چڑھائیں ، اس کی طریق عبادت پر نکتہ چینی کرنے لگیں ، بلکہ طریقہ یہ ہونا چاہیے کہ آپ اس کو نفس مقصود مذہب سے آگاہ کر کے آمادہ کریں کہ وہ لپنے طریق مذہب کے ساتھ ہی ساتھ مذہب اسلام کو بھی دیکھے اور خود فیصلہ کرے کہ منزل تک پہونچانے کا سب سے زیادہ آسان اور سیدھا راستہ کون سا ہے اور میری رائے میں " جادلھم بالتی ھی احسن " کا بھی یہی مفہوم ہے ۔

آپ اگر اپنی حرمت چاہتے ہیں تو دوسروں کی حرمت کیجئے ۔ یہ عام اصول اخلاق کا ہے ۔ اس لیے اگر آپ لپنے مذہب کا وقار قائم کرنا چاہتے ہیں تو دوسرے مذاہب کی بھی عزت کیجئے ۔ اسلام تلوار سے نہیں پھیلا اور نہ قوت و جبر سے کوئی مذہب اشاعت پذیر ہو سکتا ہے ۔ تلوار ایک آدمی کا نام تو بدل سکتی ہے وضع و معاشرت میں تو تبدیلی پیدا کر سکتی ہے ۔ لیکن دل کو نہیں پھیر سکتی ، دماغ کو مجبور نہیں کر سکتی ہے ۔ اطمینان نفس ، طمانیت روح ، لطف و رافت ، محبت و شفقت ہی سے حاصل ہو سکتی ہے ۔ جس کے ثبوت میں اسوۂ نبوی آپ کے اور ہمارے سب کے سامنے موجود ہے اور یہ چیز مسلمانوں کے پاس ایسی عظیم المرتبت ، ایسی جلیل القدر ہے کہ اس کے سامنے سوا سر عجز جھکا دینے کے اور کوئی چارہ کار نہیں ۔ پھر کتنی حیرت کی بات ہے کہ جو حقیقی دولت آپ کے پاس ہے ، اسے تو آپ پیش نہیں کرتے ، دکھاتے ہیں خزف ریزوں کو اور دنیا کو مجبور کرتے ہیں کہ انھیں کو جواہر ریزے سمجھے ۔

سید سلیمان ندوی سے

ہندوستان کی آزادی سے کوئی پندرہ سال پہلے لکھا ہوا یہ مضمون آزادی اور ترقی کے لیے ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت پر روشنی ڈالتا ہے ۔ ہندو مسلم اتحاد تو نہ ہو سکا جس کا نتیجہ ملک کی تقسیم کی صورت میں ظاہر ہوا اور ہندوستانی مسلمان بے اثر اور حملوں کا نشانہ ہو کر رہ گئے مگر ملک کی ترقی کے لیے ہندو مسلم یک جہتی کی ضرورت سے آج بھی انکار کرنا مشکل ہے اس لیے نیاز صاحب کا یہ مضمون آج بھی قابل غور ضرور ہے ۔

اقتباس از "سید سلیمان ندوی سے" (مرتب)

جنب تک اعمال کے ساتھ خدا کا ڈر یا اس کی خوشنودی دبر ہی کا خیال شامل رہے گا انسان صحیح معنی میں کبھی کوئی نیکی نہیں کرسکتا۔ بلکہ اس کے تمام افعال حسنہ یا تو اس طمع کے زیر اثر ظہور پذیر ہوں گے جو حور و غلمان، یا کوثر و سلسبیل سے متعلق ہوسکتے ہیں، یا اس ڈر سے جو نظر تا آگ اژدہا، سانپ، بچھو وغیرہ سے انسان کو ہوتا ہے۔ خدا کو ماننا اور اس طرح ماننا کہ گویا وہ ہندوستان کی کسی ریاست کا نواب ہے۔ جس کے جاسوس ہر وقت، ہر جگہ لگے ہوئے ہیں اور جو ذرا ذرا سی بات میں دار پر کھنچوا سکتا ہے، کم از کم میرے خیال میں کسی طرح نہیں آتا ہیں خدا کو بے نیازی مطلق، استغنا محض جانتا ہوں، جس کو نہ ہمارے افعال بد سے واسطہ ہے نہ اعمال حسنہ سے کوئی تعلق، کائنات کے اور تمام نظام کے ساتھ اس نے انسان کی تمدنی زندگی کا بھی ایک قانون بنادیا ہے۔ جس کو انسان نے اپنی ارتقائی دور کے مختلف منازل میں اچھی طرح سمجھ لیا ہے، پھر اگر وہ اس پر کار بند ہوگا تو خود اسی کی ہیئت اجتماعی کو فائدہ ہوگا ورنہ تباہ و برباد ہوجائے گا خواہ بجائے پانچ کے چالیس وقت کی نماز کیوں نہ پڑھے۔ مولانا لکھتے ہیں کہ

"خدا پر ایمان لائے بغیر حسن عمل کا تصور ہی ممکن نہیں"۔

میں اس کے ماننے کے لیے تیار نہیں، کیونکہ دنیا میں بعض افراد ایسے بھی مل سکتے ہیں جو باوجود انکار خدا کے اچھے خصائل رکھتے ہیں اور اپنے ابنائے جنس کو فائدہ پہونچاتے رہتے ہیں، صرف اس خیال کے تحت کہ یہ ہر انسان کا فطری فرض ہے، میں حیران ہوں کہ مولانا اس کا انکار کیسے کرسکتے ہیں جب کہ وہ خود بھی اسی کے قائل ہوں گے کہ "نیکی خود آپ اپنا بدلہ ہے"۔ درآں حالیکہ اس نظریہ کے تحت خدا کے ماننے کی ضرورت نہیں یہ تو حصولی گفتگو ہوئی۔ اب رہا وہ مسئلہ جس کے سلسلہ میں مولانا نے یہ اظہار خیال کیا ہے سو میں دریافت کرنا چاہتوں ہوں کہ آپ لوگ جو ایک نیکوکار برہمن کو ناری بتاتے ہیں تو کیا وہ خدا کا قائل نہیں ہے۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ایک بت پرست (اصطلاحی معنی میں) حقیقتاً ایک اسی قوت کا قائل نہیں ہوتا جسے سوا خدا سمجھنے کے کوئی چارہ نہیں۔ اس لیے میری رائے میں مولانا کو یہ لکھنا چاہئے تھا کہ "بغیر مسلمان ہوئے حسن خلق کا تصور ممکن نہیں" اور یہ ثابت کرنے کے بعد وہ بے شک نکوکار برہمن کو ناری اور بدکار مسلمان کو ناجی کہہ سکتے ہیں۔

اس کے بعد مولانا زیادہ کھل کر اصل مدعا کی طرف آئے ہیں اور فرماتے ہیں

"آج جب کہ مسلمانوں کو عملاً کام کرنا ہے صرف باتیں بنانا نہیں، کچھ لوگ ایسے پیدا ہوگئے ہیں، جو اس پر بحث نہیں کرتے کہ ایمان ہو یا حسن خلق، عملاً حاصل کرنا چاہئے بلکہ اس پر بحث کرتے ہیں کہ نجات اخروی کا ذریعہ محض ایمان ہے یا حسن عمل صرف حسن عمل ہی سہی، ہمارے داعی اس کا نمونہ بن کر دکھائیں۔ اس کی اہمیت نمایاں کرکے بتائیں، وہ کبھی اس کی دعوت نہیں دیتے کہ نماز پڑھنی کسی قدر ضروری ہے۔ لے دے کے دعوت یہ ہے کہ نماز پانچ وقت ہے کہ "تین وقت"۔ تین ہی وقت سہی۔ مگر ان تینوں وقتوں میں پڑھی بھی تو جائے، یہ وہ لوگ ہیں جو لبہابی اسلام کے بجائے صرف سلبی اسلام کو مسلمانوں کی ہر ترقی کا ذریعہ جانتے ہیں۔ حالانکہ پانچ وقتوں والا غازی سلطان صلاح الدین، سلطان محمد فاتح اور سلیمان اعظم پانچ وقتوں کی نماز پڑھنے سے نہ اپنی سلطنت کھو بیٹھے اور نہ اس عہد کے ملاحدہ ترک صلوۃ و عدم ایمان کے باوجود ملک کا چھوٹا سا گوشہ حاصل کرسکے، اگر ملک ہی حاصل کرنا ترقی ہے"۔

وہ مانے اس بیان میں دو چند غلطیاں کی ہیں اول تو وہ "کچھ لوگ جو ایسے پیدا ہوگئے ہیں" خود نجات اخروی سے کوئی بحث نہیں کرتے۔ اس میں سے اگر آپ لفظ اخروی نکال دیں تو بیشک آپ کا یہ دعویٰ درست ہوسکتا ہے، کیونکہ اخروی کا جو مفہوم آپ کے یہاں ہے اس سے وہ کوسوں دور ہیں اور اگر بطور معارضہ بالاستفادہ اخروی نجات سے گفتگو کرتے ہیں تو صرف اس لیے کہ آپ اس کے قائل ہیں اور آپ ہی کے مسلمہ اصول کو سامنے رکھ کر اصولاً بحث کرنا چاہئے۔

دوسری غلط بیانی یہ ہے کہ ان لوگوں کو صرف باتیں بنانے والا ظاہر کیا گیا اور عملاً حسن خلق سے بالکل بیگانہ۔ اگر اس سے مقصود یہ نہیں ہے کہ دوسرے گھر کی تیز روشنی کو گل کرکے اپنے گھر کی ضعیف روشنی کو نمایاں کیا جائے تو میں حیران ہوں کہ مولانا نے کیسے کہہ دیا کہ ایسے لوگ حسن

اخلاق سے معرا ہوتے ہیں اور عمل کی طرف متوجہ نہیں ہوتے ۔ اس وقت اظہار انکسار کی ضرورت نہیں ۔ مجھے صاف صاف دریافت کرنا چاہیئے کہ مولانا مجھے کیوں اخلاق حسنہ سے معرا جانتے ہیں اور کس روایت کی بناء پر وہ مجھے بد اخلاق کہہ سکتے ہیں ۔ درآنحالیکہ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ مجھ صرف باتیں بنانے والے کے اخلاق بدرجہا ان بہت سے مولویوں سے اچھے ہیں جو مولانا کے نزدیک عملاً حسن اخلاق کے تعلیم دینے والے ہیں اور باتیں نہیں بناتے ۔

اب رہا یہ الزام کہ ایسے لوگ تین ہی وقت نماز پڑھنے کی دعوت لوگوں کو کیوں نہیں دیتے سو اس کا جواب زیادہ دشوار نہیں جب کہ صدیوں سے پانچ وقت کی نماز پڑھنے اور پڑھانے والوں کے اخلاق سامنے موجود ہیں ۔ " تو بروں درچہ کردی کہ درون کعبہ آئی " گفتگو تو اسی میں ہے کہ مولویوں نے لوگوں سے اس قدر نمازیں پڑھوائیں، اتنے روزے رکھوائے کہ وہ نماز و روزہ ہی کو اصل ایمان سمجھنے لگے ۔ اس لیے اب وقت کا اقتضا کیا ہے ۔ نماز کی اہمیت کا درس دینا یا اس چیز کا جس کے حصول کے مختلف ذرائع میں سے ایک ذریعہ نماز بھی تھی اور جو اب اپنی اہمیت ذریعہ ہونے کا بھی کھو چکی ہے ۔

اگر سلطان صلاح الدین وغیرہ پانچ وقت نماز پڑھنے سے اپنی سلطنت نہیں کھو بیٹھے تھے تو اس سے یہ بھی ثابت نہیں ہو سکتا کہ سلطنت ان کو پانچ وقت کی نماز ہی سے حاصل ہوئی تھی ۔ اور اگر یہ صحیح ہے تو کیوں نہ آج تمام مولوی پنج وقتہ نماز پڑھ کر کم از کم صوبہ، برار ہی انگریزوں سے چھین کر حضور نظام کو دلوا دیں یا خود ہی لے لیں ۔ اور خیر صوبہ، برار یا کوئی حصہء ملک تو بڑی چیز ہے، میں کہتا ہوں کہ بجائے پانچ وقت کے وہ چالیس وقت کی نماز ۴۰ ہزار برس تک ادا کرتے رہیں تو بھی وہ ایک انچ زمین حاصل نہیں کر سکتے ۔

اب رہا دوسرا الزام کہ ملاحدہ ترک صلوۃ و عدم ایمان کے باوجود کیوں نہیں ملک کا کوئی چھوٹا سا گوشہ حاصل کر لیتے، سو یہ بالکل بے محل ہے، کیونکہ انھوں نے تو اس کا کبھی دعویٰ ہی نہیں کیا اور نہ وہ اس کے قائل ہیں کہ سلطنت یا ملک گیری نماز سے متعلق ہے، اور اگر انزامی جواب دینا چاہیں تو کہہ بھی سکتے ہیں کہ آج دنیا میں حکمرانی کس قوم کا حصہ ہے، کیا وہ بڑی خدا ترس ہے ۔ کیا وہ بڑی مسلمان ہے، کیا وہ ملحد بے دین نہیں، اور دور کیوں جائیے خود ترکی کو دیکھیئے کہ اس کے احیاء ثانیہ کا کیا راز ہے ۔ اور کیا ترکوں پر الحاد و بے دینی کا الزام عاید نہیں کیا جاتا ۔ نماز کے متعلق آپ گفتگو کا ایسا پہلو کیوں اختیار کرتے ہیں، جو بالکل بے محل و غیر متعلق ہے ۔ میں نے کب کہا کہ نماز بری چیز ہے، یقیناً وہ ایک بہتر طریقہ اصلاح نفس کا ہے اور میں پابند صوم و صلوۃ کو اچھا سمجھتا ہوں بشرط آنکہ وہ آپ ہی کے نظریہ کے مطابق ایمان و عمل میں امتیاز پیدا کر سکے ۔ نماز اگر نفس ایمان سمجھ کر ادا کی جائے گی تو یقیناً وہ اپنے حدود سے متجاوز ہو کر ناجائز قرار دی جائے گی، لیکن اگر اس کو محض ایک ذریعہء فلاح سمجھ کر اختیار کیا گیا اور جذبہء رافت و لطف اس کی وساطت سے اپنے اوپر طاری کیا گیا تو اس کے بہتر ہونے سے کس کو انکار ہو سکتا ہے ۔

اخیر میں مولانا فرماتے ہیں کہ :

" اصل یہ ہے کہ آج کل جہاں یورپ کی نقالی ہر چیز میں ہے مذہب و اصلاح مذہب میں بھی نقالی ہے، یورپ کے رفارمیشن کی تاریخ پڑھ پڑھ کر ہر جدت پسند کو اسلام کا لوتھر بننے کا خیال ہے، لیکن یہ خبر نہیں کہ اسلام و مسیحیت میں اشتراک کیا ہے ؟ جس کے لیے اسلام کو لوتھر کی ضرورت پیش آئے عیسائیوں نے عیسائیت ملنے کے پندرہ سو برس بعد، عیسائیت کو چھوڑ کر سلطنت پائی لیکن مسلمانوں نے تو اسلام اور سلطنت ایک ساتھ پائی اور جب اسلام چھوڑا سلطنت بھی چھوٹی ۔ کیا یہ فرق ہمارے نئے مصلحین کے سامنے ہے ۔ غلط رسوم و رواج اور خارجی بدعات کا نام مذہب نہیں ہے جس کی تصویر آپ اپنے واہمہ سے کھینچ کر دکھائیں " ۔

اس کے جواب میں، ہم اسی عبارت کو دہرا کر خود مولانا سے سوال کریں گے کہ وہ اسلام کہاں گیا جس کے ساتھ ساتھ سلطنت آئی تھی ۔ اگر سلطنت کا ساتھ

آنا، اسلام کالازمی نتیجہ ہے تو پھر اس سے کیوں انکار کیا جاتا ہے کہ ترقی ملک گیری کا نام نہیں ہے، اگر آج اسلام کہیں نہیں ہے تو اس کا ذمہ دار کون ہے؟ کیا علماء کا گروہ اس الزام سے بری ہو سکتا ہے، یا تو اس کا اعتراف کیجئے کہ اس وقت کوئی عالم دین، کوئی ہادی، شریعت کوئی مصلح مذہب و ملت موجود نہیں ہے اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر ان اسباب کو تلاش کیجئے۔ جنھوں نے سلطنت کو اسلام سے جدا کر دیا۔ وہ لوگ جنھیں آپ نئے مصلحین کے نام سے یاد کرتے ہیں وہ بھی اس جستجو میں ہیں اور آخر کار اس نتیجہ پر پہونچ رہے ہیں کہ یہ سارا ادبار انھیں کا لایا ہوا ہے جو اپنے آپ کو علماء کرام اور ہادیان مذہب کہتے ہیں۔ اور آپ بھی اس جستجو میں ہیں لیکن آپ کی جستجو خود اپنے اندر سے شروع نہیں ہوتی اور اس لیے آپ کو اس "لنکا ڈھانے والا" کا پتہ نہیں چلتا۔

یہ آپ صرف زبان سے کہتے ہیں کہ "غلط رسوم اور خارجی بدعات" کا نام اسلام رکھ دیا گیا ہے لیکن ان رسوم و بدعات کے مٹانے کے لیے آپ کوئی عملی قدم نہیں اٹھاتے۔ کیونکہ آپ میں ایسا کرنے کی جرأت و جسارت نہیں ہے اور یہ جرأت و جسارت کیوں نہیں ہے؟ اس لیے کہ جب تک نصیحت دوسروں سے متعلق ہوتی ہے۔ بہت دلچسپ چیز ہے، لیکن جہاں اپنی ذات کا سوال آیا پھر وہی "کشف ساق" کا معاملہ پیش آجاتا ہے جس کا تحمل آسان نہیں۔

شیعہ سنی نزاع

سنیوں اور شیعوں کا جھگڑا ساری دنیا کے مسلمانوں کے لیے صدیوں سے درد سر بنا ہوا ہے اور اس کا کوئی حل نظر نہیں آتا ہے۔ اس کے بارے میں نیاز صاحب نے ایک طویل مضمون لکھا ہے جسے بہترین غیر جانبدارانہ محاکمہ ہی کہہ سکتے ہیں۔ اس مضمون کا ایک حصہ ملاحظہ فرمائیے۔

اقتباس از "شیعہ سنی نزاع" (مرتب)

میں نے ان دونوں جماعتوں کے اختلاف و نزاع پر مختلف پہلوؤں سے غور کیا ہے کبھی اپنے آپ کو سنی سمجھ کر حالات کا مطالعہ کیا، کبھی شیعہ بن کر واقعات پر نگاہ ڈالی، کسی وقت ایک شخص ثالث کی حیثیت سے اس کو سمجھنا چاہا لیکن آپ باور کیجئے کہ ان کے اختلاف کا حقیقی سبب سوا حماقتوں کے اور کچھ نظر نہ آیا سب سے زیادہ اہم مسئلہ جو دونوں فریق کے نزدیک "استخوان جنگ" بنا ہوا ہے بعض خلفاء و صحابہ سے متعلق ہے، لیکن میری سمجھ میں آج تک یہ بات نہیں آئی کہ اس کا تعلق دین اسلام سے کیا ہے اور اس پر جنگ ریزی کے کیا معنی ہے۔ فرض کیجئے کہ کسی کے باپ کے پاس مختلف لوگ آتے ہیں اور وہ ان سے دوستی کا سا برتاؤ کرتا ہے، باپ کے مرنے کے بعد دو بیٹوں میں یہ بحث آن پڑتی ہے کہ باپ کے پاس آنے والوں میں سے کون شخص سچا دوست تھا اور کون نہیں، ایک کہتا ہے سب وفادار دوست تھے، دوسرا کہتا ہے، نہیں بعض مخلص تھے اور بعض غیر مخلص، وہ بھی اپنے دلائل پیش کرتا ہے اور یہ بھی، یہاں تک تو خیر کوئی حرج نہیں لیکن اگر اختلافات نگاہ و حجت الـ ورت اختیار کرے کہ دونوں بھائیوں میں سے ہر ایک دوسرے کے خون کا پیاسا ہو جائے تو اس کو سوا حماقت کے اور کیا کہیں گے۔ اول تو یہ پوچھئے کہ اس وقت جب کہ نہ باپ زندہ ہے نہ اس کے پاس کے بیٹھنے والے احباب، اس بحث کی ضرورت ہی نہیں ہے اور اگر ضرورت مان لی جائے تو بھی اس گفتگو کا اس حد تک بڑھ جانا کہ دو بھائی ایک دوسرے پر تلوار کھینچ کر جان لینے کے لیے آمادہ ہو جائیں، سوا حماقت کے اور کس چیز سے تعبیر کیا جا سکتا ہے؟ اعتقاد کے لحاظ سے اسلام نام ہے صرف خدا کی وحدانیت اور رسول رسالت کے اقرار کا، سو اس میں شیعہ سنی دونوں برابر کے شریک ہیں۔ اگر حضرات شیعہ بعض خلفاء و صحابہ کو اچھا نہیں سمجھتے تو ظاہر ہے کہ اس کے کچھ اسباب و دلائل ان کے پاس ہوں گے اس لیے اس مسئلہ کا تعلق صرف تاریخ و تحقیق تاریخی سے ہونا چاہئے نہ کہ مذہب سے، یعنی ہم کو تاریخ کے صفحات میں جستجو کرنا چاہئے کہ وہ اسباب جو بیان کئے جاتے ہیں واقعی صحیح ہیں یا نہیں، اگر کسی کے نزدیک صحیح ہیں تو اس کو ایک تاریخی حقیقت کی صورت سے پیش کر کے خاموش ہو جانا چاہئے۔ برا بھلا کہنے یا گالیاں دینے سے کوئی فائدہ نہیں اور اگر کسی کے نزدیک غلط ہیں تو ان پر تنقید

کر کے علیحدہ ہوجانا چاہیئے اور اس جستجو میں نہ پڑنا چاہیئے کہ کوئی اپنے گھر میں کیا کہتا ہے اور کیا کرتا ہے۔

آج میں پوچھتا ہوں کہ کیا تمام شیعہ حضرات اپنی تاریخی کتب کو متفقہ طور پر صحیح تسلیم کرتے ہیں یا اہل تسنن بغیر کسی اختلاف باہمی کے تمام روایات کو منقح و درست باور کرتے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ دعویٰ کرنا بالکل خلاف واقعہ ہے، شیعہ سنی کی تاریخی کتابوں میں ہم کثرت سے اختلاف پاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ جس طرح خود شیعہ علماء و مورخین بہت سے تاریخی واقعات پر مختلف رائیں رکھتے ہیں اسی طرح سنی علماء بھی باہمد گر متفق نہیں تو پھر کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ جب اور تاریخی واقعات پر اختلاف ہونے کی وجہ سے آپس میں نزاع نہیں ہوتی تو خاص صحابہ کے مسئلہ پر کیوں جنگ کی جاتی ہے اور کیوں ایک دوسرے سے اس قدر علحدہ ہوجاتے ہیں کہ ایک کا مذہب ہی امامیہ یا شیعہ کہلانے لگتا ہے اور دوسرے کا حنفی یا سنی، اس پر جب غور کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس اختلاف کا سبب محض اختلاف تاریخی نہیں ہے بلکہ کچھ اور ہے جس کی بنیاد آج نہیں بلکہ اسی وقت پڑ چکی تھی جب رسول اللہؐ بقید حیات تھے اور اسلام ایک جیتا جاگتا مذہب تھا۔

جب کوئی پیغمبر رونما ہوتا ہے تو وہ ایک خاص خیال کے تحت اصول اصلاح و تبلیغ کو متعین کرلیتا ہے جو نتیجہ ہوا کرتے ہیں وقت کا ماحول کا اور ان خاص خاص واقعات کا جو اس زمانہ میں رونما ہوئے۔ اسی کو ایک مذہب کی سائیکالوجی کہتے ہیں اور یہیں سے اس کے مستقبل پر حکم لگایا جاسکتا ہے۔ مثلاً آپ ہندو مذہب کو لے لیجئے اور اس کی سائیکالوجی پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ یہ مزارعین و فلاحین کا مذہب ہے اور اسی لیے اب تک اس کے متبعین کی معاشرت و زندگی کے ہر ہر شعبہ میں ایک خاص قسم کی نباتیت پائی جاتی ہے۔ عیسوی مذہب کی ابتداء ایک مظلومانہ صبر و استقلال سے ہوئی اور اس کیفیت کے بعد جو عزم راسخ ایک قوم میں پیدا ہوجاتا ہے وہ اس وقت بھی عیسوی جماعت میں پوری طرح نظر آتا ہے، دین موسوی دنیوی برکات کے لیے برسرپیکار ہوکر نمودار ہوا اور آخر کار اس کے مقلدین میں وہ رد عمل پیدا ہوا جو دنیا پرست لوگوں میں قدرتاً پیدا ہوجانا چاہیئے۔ اسلام " انتم الاعلون " کا آوازہ بلند کرتا ہوا نمودار ہوا اور اس نے پاکیزگی اخلاق کے ساتھ دنیاوی سربلندی کو بھی پیش نظر رکھا پھر چونکہ فطرت انسانی تعیش پسند و جاہ طلب واقع ہوئی۔ اس لیے عہد سعادت کے بعد ہی دونوں کا توازن مفقود ہونے لگا اور خلافت راشدہ میں دو مخالف فریق پیدا ہوکر طلب جاہ و کش مکش باہمی کے مناظر سامنے آگئے۔ ان میں سے ایک فریق کامیاب ہوگیا جسے آج کل کی اصطلاح میں سنی کہتے ہیں اور دوسرا ناکام رہا جسے شیعہ کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے، اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ علوئین کی جماعت اول اول صرف جذبہء محبت کے تحت وجود میں آئی، کیونکہ وہ شخص جو رسول اللہ سے محبت کرے گا، اس کا آل رسول و اہلبیت سے محبت کرنا ناگزیر ہے۔ یہ فطرت انسانی ہے کہ جس سے محبت ہوتی ہے اس کو برسرعروج و اقتدار دیکھنے کی خواہش دل میں پیدا ہوتی ہے، لیکن اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ رحلت نبوی کے بعد خلافت کا مسئلہ جن لوگوں نے جس طرح طے کیا اس میں محبت کی رعایت تو یقیناً نہیں تھی، لیکن مصلحت و ضرورت کی رعایت ضرور تھی۔ پھر اب یہ فیصلہ کرنا کہ خلافت کا مسئلہ بربنائے اصول محبت طے ہونا چاہیئے تھا یا بربنائے مصلحت از بس دشوار ہے۔ کیونکہ وہ لوگ جو رسول اللہ و آل رسول سے محبت کرنے والے تھے بعد کو ان کی اولاد کے سامنے بھی سوال محبت کا نہیں رہا بلکہ وہی جاہ و ثروت کا رہ گیا تھا اور جنہوں نے اول دن مصلحت و ضرورت کو سامنے رکھ کر خلافت کے مسئلہ کو طے کیا تھا ان کی نسل میں تو خیر کوئی رعایت محبت و الفت کی ہو ہی نہیں سکتی تھی مگر بعد کو "مصلحت و ضرورت" کی اہمیت بھی ان کے سامنے باقی نہ رہی اختلافات بڑھتے گئے، مناقشات سنگین ہوتے گئے، دل کی کدورتیں زبانوں پر آنے لگیں، طبیعتوں کی برہمی نے تیغوں کو بے نیام کرنا شروع کیا " محبت و مصلحت " کی نزاع آخر کار صرف دنیاوی، ملکی اور سیاسی نزاع ہوکر رہ گئی۔ نہ رسول و آل رسول سے محبت کرنے والے رہ گئے۔ نہ دیانت و امانت کے ساتھ مصلحت پر غور کرنے والے باقی رہے، اور کھلم کھلا سلطنت و دولت اور جاہ و ثروت کے لیے دونوں جماعتیں میدان میں اتر آئیں، پھر دیکھو کہ اس کے بعد کیا ہوا، تاریخ کے صفحات ہر شخص کے سامنے کھلے ہوئے ہیں اور معمولی فہم کا انسان بھی آسانی سے ان کو پڑھ کر سمجھ سکتا ہے کہ خلافت راشدہ کے بعد جو زمانہ امیر معاویہ کی حکومت سے شروع ہوتا ہے کیا اس کو رسول و آل رسول کی محبت سے متعلق کرسکتے ہیں اور کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس میں سوا کسب دولت و ثروت اور حصول جاہ و مرتبت کے کوئی اسلامی ضرورت کا جذبہ کام کررہا تھا۔ اگر مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ مرنے کے بعد

روح معہ اپنے احساسات کے قائم رہتی ہے اگر اہل اسلام کا یہ ایمان ہے کہ رسول اللہ عالم روحانی میں اب بھی رسول اللہ ہیں تو خدا کے لیے بتاؤ قاتل حسین سے ان کی رضامندی کی صورت کیا ہو سکتی ہے اور وہ کیونکر امیر معاویہ کو معاف کر سکتے ہیں کہ انھوں نے حسین کے ہوتے ہوئے جان بوجھ کر اپنے فاسق و بادہ خوار بیٹے یزید کو خلیفہ مقرر کیا اور نہ صرف خلیفہ مقرر کیا بلکہ اس کی خلافت کی تکمیل میں ہر اس ترکیب و تدبیر سے کام لیا جو بادی سلطنت کے استحکام کے لیے سیاسیات کی دنیا میں اختیار کی جا سکتی ہیں، آج سنیوں کو شکایت ہے کہ حضرات شیعہ صحابہ و خلفاء کو برا کہتے ہیں، لیکن کیا کبھی ان خلفاء بنی امیہ و بنی عباس کے کارناموں پر بھی غور کیا ہے جنھوں نے علی الاعلان مسجدوں کے محراب و منبر پر علی کو گالیاں دیں اور دلوائیں یقیناً میں نہایت کراہت کے ساتھ دیکھتا ہوں کہ حضرات شیعہ صحابہ ثلٰثہ سے کسی کو برا کہیں لیکن بالکل اسی طرح جس طرح میں "سب علی" کو برا سمجھتا ہوں، پھر اگر یہ نزاعات و اختلافات محض تاریخی حیثیت رکھتے تو چنداں مضائقہ نہ تھا کیونکہ اسلامی حکومت و خلافت کے ساتھ یہ قصہ بھی ختم ہو چکا ہے لیکن مصیبت یہ آپڑی ہے کہ بجائے تاریخی اختلاف کے یہ مذہبی اختلاف ہو گیا اور اگر ایک طرف حضرات شیعہ نے "سب صحابہ" ایسے مکروہ و لایعنی فعل کو داخل مذہب کر لیا تو دوسری طرف سنیوں نے اس قدر عصبیت سے کام لیا کہ "لعن یزید" کو بھی ناجائز قرار دے کر فقہ و اصول فقہ میں شامل کرنے سے احتراز نہ کیا، حالانکہ کوئی ان سے پوچھے کہ اس مسئلہ کا فقہ سے کیا تعلق ہو سکتا ہے اور دوسرے یہ کہ اگر "لعن یزید" اس دلیل کی بناء پر ناجائز قرار دیا جاتا ہے کہ ممکن ہے خدا نے اسے بخش دیا ہو تو کیا کسی شخص کا یزید پر لعن کرنا "قتل حسین" سے زیادہ شدید معصیت ہے جس کو خدا معاف نہیں کر سکتا۔

الغرض آپ سنی شیعہ کے تمام ان اختلافات کو بغور دیکھئے جن کو داخل مذہب کر لیا گیا ہے اور پھر انصاف کیجئے کہ ان کا تعلق مذہب اسلام سے کتنا ہے، میں دعویٰ کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ایک اختلاف بھی ایسا نہیں نکلے گا جو اصول سے واسطہ رکھتا ہو بلکہ سب کے سب تاریخ سے متعلق ہوں گے جو سیاسی مصالح کی بناء پر کسی وقت قصداً پیدا کئے گئے تھے اور اب ہم لوگوں کی حماقت سے وہ داخل دین و مذہب سمجھے جانے لگے ہیں۔

ہماری قدامت پرستیاں

> مسلمانوں کو جدید علوم و فنون سے دلچسپی لینے اور ان میں دستگاہ حاصل کرنے کی ضرورت پر آج کل بہت زور دیا جا رہا ہے
> نیاز صاحب نے آج سے ساٹھ سال پہلے ہی اس موضوع پر قلم اٹھایا تھا مگر اپنے مخصوص انداز میں۔
>
> اقتباس از : "ہماری قدامت پرستیاں"

ادارۂ مذہب کے قیام کی تاریخ کا اگر آپ مطالعہ کریں گے تو معلوم ہوگا کہ اس کی بنیاد ہمیشہ کسی ایک مخصوص ہستی کے ساتھ جذبۂ خوف و احترام یا محبت و عقیدت پر قائم ہوئی اور اس ہستی کے اٹھ جانے کے بعد انسان نے اپنی عقیدت و ارادت کو وسیع و مستحکم بنانے کے لیے بہت سی ایسی باتیں اپنی طرف سے اضافہ کرکے بیان کرنا شروع کیں جو لوگوں کو مرعوب یا راغب کرنے والی تھیں۔ چنانچہ انبیاء کے معجزے، اولیاء کے کرامات، درویشوں کے خوارق عادات سب اسی قبیل کی چیزیں ہیں، جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ صرف ہمارے ہی ارادتمندانہ جذبات یا مصالح تبلیغ کی پیداوار ہیں۔ پھر جس طرح سو سال پیشتر کے کسی بزرگ کے حالات میں اس وقت ایک معتدبہ اضافہ اس کے کرامات کا نظر آتا ہے، اسی طرح آج کسی بزرگ کے متعلق بھی سو سال بعد ایسی ہی روایتیں منسوب کر دی جائیں گی، اور جس طرح چار قرن پہلے کی پختہ قبر آج کسی نہ کسی بزرگ کا مزار بن گئی ہے، اسی طرح نصف صدی بعد آج کی بنی ہوئی قبر پر بھی پھولوں کی چادر کا چڑھایا جانا مستبعد نہیں، اگر جہل و واہمہ پرستی کا یہی عالم رہا۔

ہمارے اسلاف نے اپنے عہد میں جو کچھ کیا وہ اس میں شک نہیں کہ لائق صد ہزار آفریں و ستائش ہے، لیکن یہ کہنا کہ جو کچھ وہ کر گئے ہیں اس میں کسی اضافہ کی گنجائش نہیں اور جو کچھ کہہ گئے ہیں۔ اس کو بلا چون و چرا آنکھ بند کرکے تسلیم کر لینا چاہیئے، حد درجہ مضر تعلیم ہے اور ایک قوم کی دماغی و ذہنی ترقی کو خاک میں ملا دینے والی ہے۔

آیئے اپنے بعض اسلاف کی علمی تحقیق اور ذہنی ترقی کا ایک لطیفہ سن لیجئے۔

علامہ قزوینی اور علامہ دمیری سے غالباً ہر وہ شخص واقف ہوگا جس نے تاریخ کا سرسری مطالعہ بھی کیا ہے۔

علامہ قزوینی وہی ہیں جنھوں نے "تاریخ گزیدہ" مرتب کی۔ ظفر نامہ لکھا اور نزہتہ القلوب تصنیف فرمائی یہ عمر بن یزید کی اولاد میں سے تھے جن کو میدان کربلا میں سید الشہداء کے ہمرکاب جہاد کی سعادت حاصل ہوئی تھی اور مذہباً شیعہ تھے۔ علامہ دمیری آٹھویں صدی ہجری کے مشہور فقیہ محدث و مفسر تھے جامع ازہر قاہرہ میں فلسفہ و ادب کے لکچرار تھے، خاص سرزمین مکہ میں سلسلہ درس و تدریس جاری رکھتے تھے، صاحب کرامات بھی مانے جاتے تھے اور منجملہ خطبات و دیگر کتب کے ایک مشہور کتاب حیات الحیوان کے بھی مصنف تھے۔

الغرض یہ دونوں ایسے صاحب فضل و کمال تھے کہ آج کوئی مولوی و عالم ان کے مرتبہ تک پہونچنے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ لیکن ان کی تحقیق انیق اور ان کی پختگی ذہن کا کیا عالم تھا۔ حیات الحیوان لے کر اسکول کے کسی طالب العلم کو دے دیجئے اور فیصلہ اسی پر چھوڑ دیجئے۔ مثلاً ان حضرات کی کاوش علمی کا ایک ادنیٰ نمونہ یہ ہے کہ عقاب کی تحقیق کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:

"جب عقاب (چیل) سال خوردہ ہو جاتی ہے اور بینائی کھو بیٹھتی ہے تو وہ فضا میں بلند ہوتی ہے اور اس حد تک اوپر اڑ کر چلی جاتی ہے کہ اس کے پر تمازت آفتاب سے جل جاتے ہیں، اس کے بعد وہ نیچے گرتی ہے اور ایک شور و تلخ پانی کے کنوئیں میں غوطہ لگا کر از سر نو نوجوان ہو جاتی ہے" (قزوینی)

"جب چیل ضعیف و کمزور ہو کر اندھی ہو جاتی ہے تو اس کے بچے اس کو چاروں طرف لادے پھرتے ہیں، یہاں تک کہ ہندوستان کے ایک چشمہ تک پہونچتے ہیں اور اس میں غوطہ لگاتے ہیں۔ اس کے اثر سے چیل کی بینائی عود کر آتی ہے اور وہ از سر نو نوجوان ہو کر اپنی شکاری زندگی شروع کر دیتی ہے"۔

"کرگس، چیل کے انڈے سے پیدا ہوتا ہے اور چیل کرگس کے انڈے سے۔ تمام چیلیں مادہ ہیں اور دوسری چڑیوں سے جفتی کھاتی ہیں۔ یہ صرف تین انڈے دیتی ہیں، لیکن تیسرے انڈے کو پھینک دیتی ہیں اور صرف دو سیتی ہیں، تیسرے انڈے کو ایک اور طائر جس کا نام کاسر العظام (ہڈی توڑ) ہے اٹھالاتا ہے اور اس سے بچہ نکالتا ہے۔

چیل، ہندوستان سے ایک پتھر لے آتی ہے اور گھونسلے میں رکھ دیتی ہے تاکہ انڈا دینے میں آسانی ہو، یہ پتھر کھوکھلا ہوتا ہے جس کے اندر ایک اور پتھر ہوتا ہے یہ پتھر عورتوں کے وضع حمل میں بھی آسانی پیدا کرتا ہے۔ (دمیری)

غالباً یہ کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ عقاب کے متعلق جو کچھ ان محققین نے لکھا ہے وہ صرف نقل ہے قدیم یونانی روایات کی جو عہد قدیم سے ان کے یہاں رائج چلی آرہی تھیں پھر جب آٹھویں صدی ہجری تک ہمارے یہاں کے مورخین و مصنفین کی تحقیق کا یہ عالم تھا کہ وہ روایات قدیمہ سے ایک انچ ہٹ کر خود اپنے ذہن و عقل سے کام لینا گناہ سمجھتے تھے تو ظاہر ہے کہ اس سے قبل اور کیا عالم رہا ہوگا اور ان کے علمی کارناموں کی زمانہء موجودہ میں کیا وقعت ہو سکتی ہے۔

یقیناً ان لوگوں پر کوئی الزام نہیں، کیونکہ جو کچھ انھوں نے کہا وہ ان کی بساط عقل کے لحاظ سے بالکل درست تھا، لیکن سوال یہ ہے کہ اس زمانہ میں جب کہ تفتیش و تحقیق نے غیر معمولی وسعت اختیار کر لی ہے، کیوں کسی کو اس امر کے ماننے پر مجبور کیا جائے کہ اسلاف پر جو کچھ لکھ گئے ہیں وہ بالکل ٹھیک ہے اور ہم انھیں کا اتباع کر کے ترقی حاصل کر سکتے ہیں۔

یہی وہ قدامت پرستی ہے جو اس سے قبل خدا جانے کتنی قوموں کو تباہ و برباد کر چکی اور اب مسلمانوں کی جماعت اس کا شکار بنی ہوئی ہے۔

اعجوبہ پرستی کا دور گزر گیا، یہ دور ہے صرف تجربہ و مشاہدہ کا اس لیے اب نہ معجزہ و کرامات پر محض اس لیے یقین کیا جاسکتا ہے کہ قدیم کتابوں

میں ایسا لکھا ہوا ہے اور نہ صرف خوارق عادات کی بناء پر کسی کی عظمت و بزرگی ثابت کی جاسکتی ہے کیونکہ جب تک طبیعات کی دنیا تک انسان کا دسترس نہ تھا، کسی کا دس فٹ بلند جست کرلینا بھی معجزہ کہلایا جاسکتا تھا لیکن اب کہ طیاروں اور ہوائیوں کے ذریعہ سے ہمدوش ثریا ہوجانا بھی مستبعد نہیں اور اولیاء کرام کے خوارق عادات کو ان کی بزرگی کے ثبوت میں پیش کرنا صرف یہی معنی رکھتا ہے کہ آج ہم یوروپ کے ایک ایک موجد و مخترع کو صاحب کرامات یقین کرنے پر مجبور ہیں۔

کس قدر افسوسناک امر ہے کہ اس وقت بھی جب تمام دنیا میں علم کا اجالا پھیل گیا ہے اور انسان حقیقی معنی میں "خلافت الٰہی" کے دور سے قریب تر ہوا جارہا ہے، ہم بدستور اسی زمانے میں جب بقول قزوینی دو میری چیل کے گھونسلے میں پارس پتھر پایا جاتا تھا اور مستقبل کی امیدیں صرف نزول مسیح اور ظہور مہدی سے وابستہ کئے ہوئے ہیں۔

کاش، ہم سمجھ سکتے کہ اس وقت دنیا کو حاجت نہ مہدی کی ہے نہ مسیح کی بلکہ ضرورت ہے اڈیسن و مارکونی کی، رامان اور بوس کی کیونکہ انسان اب معجزہ و کرامات کی حدود سے گزر کر عالم جدو جہد کی اس منزل تک پہونچ گیا ہے جہاں خود اس میں "جذبہء الوہیت" پیدا ہوتا نظر آرہا ہے اور "انسانیت کبریٰ" کا مشاہدہ ایک ایسی "حقیقت ذاتی" کا احساس اس کے اندر پیدا کررہا ہے جس کو اگر ہم چاہیں تو معرفت ربانی سے بھی تعبیر کرسکتے ہیں اور قرب الٰہی سے بھی۔

اس لیے اگر تم قدامت پرستی کی لعنت سے آزاد ہونا چاہتے ہو تو اپنے آپ کو احمق و جاہل نہ سمجھو بلکہ ہوش گوش والا انسان باور کرکے ہر بات کے سمجھنے کی کوشش کرو، اپنے ذہن و دماغ دو کو قدرت کی گتھیاں سلجھانے کا اہل بناؤ اور پرستش اسلاف ترک کردو کہ اس سے زیادہ سنگ گراں ترقی کی راہ میں اور کوئی نہیں ہوسکتا، اسی کے ساتھ اپنی اولاد کی تربیت و تعلیم میں بھی اسی کا لحاظ رکھو کہ ان کی عقلی آزادی محو نہ ہونے پائے اور دوسروں کی پیروی میں مطالعۂ اشیاء کی عمارت ان کی "حریت فکر" کو تباہ نہ کردے۔ پھر اگر تمہاری ایک نسل بھی اسی اصول کے تحت تربیت پا گئی تو سمجھ لو کہ تمہاری تمام مصیبتیں دور ہوگئیں ورنہ کل جو تم کو اور تمہاری اولاد کو دیکھنا ہے اسے آج میری زبان سے سن لو اور یاد رکھو کہ جس طرح اور ہزاروں اندھی قومیں اب سے قبل تباہ ہوچکی ہیں اسی طرح تم کو بھی تباہ و برباد ہوجانا ہے اور خدا اس سے بالکل بے نیاز ہے کہ مسلمان کا وجود دنیا میں باقی رہے یا نہ رہے۔

ہمارا مستقبل

[اس مضمون میں نیاز صاحب نے بتایا ہے کہ ہندوستان کے ووٹ دہندگان میں تفریق و اختلاف کا سبب مذہب کی وہ غلط تعبیر ہے جو ہندو مسلم علماء مذہب کی طرف سے پیش کی جاتی ہے۔

مدیر انشاء]

پیشین گوئیاں دو قسم کی ہوا کرتی ہیں۔ ایک وہ جو انبیاء اولیاء کی زبان پر جاری ہوتی ہے اور دوسری وہ جو علم و تجربہ کا نتیجہ ہوا کرتی ہے قسم اول کی پیشنگوئی وحی و الہام ہو یا دور بینی (Telepathy) ہمیں اس سے بحث نہیں کیونکہ اول تو ایسی پیشین گوئیاں کرنے والے اب موجود نہیں اور اگر ہوں بھی اس دور تعقل میں کون ان کی سنتا ہے لیکن قسم دوم کی پیشین گوئی ہر صاحب عقل آسانی سے کرسکتا ہے اور اکثر و بیشتر وہ صحیح بھی نکلتی ہے کیونکہ کاروبار عالم مقررہ اصول پر چل رہا ہے۔ اور اسباب و علامات کو دیکھ کر نتائج پر حکم لگانا زیادہ دشوار نہیں۔

ابتداء آفرینش سے لے کر اس وقت تک انسان نے کہاں کہاں اور کس کس طرح زندگی بسر کی، حیات اجتماعی کے لیے اس نے کیا کیا اصول مقرر کئے، ارتقاء کی کیا کیا صورتیں ہم نے اختیار کیں، اور اقوام عالم عروج و زوال کی منزلوں سے کیونکر گزرتی ہیں، یہ اور اسی طرح کے بہت سے موضوع ہیں جن سے تاریخ کی کتابیں بھری پڑی ہیں، لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ جس وقت کوئی قوم عروج و ترقی سے گزر رہی تھی، اس کو کبھی ایک لمحہ کے لیے یہ اندیشہ پیدا ہوا تھا کہ اسے انحطاط و زوال کی منزل سے گزرنا پڑے گا اور آخر کار ایک دن فنا ہوجائے گی؟ کبھی نہیں۔

دنیا میں سب سے بڑی حکومت جس کی سطوت و جبروت نے تقریباً تمام کرۂ ارض کا احاطہ کر لیا تھا، سلطنت روما تھی، لیکن آج وہ کہاں ہے چنگیز و ہلاکو جنھوں نے سارے عالم کو لرزہ براندام کر رکھا تھا، آج ان کی اولاد کہاں اور کس عالم میں ہے؟۔ بابل و اسیریا کے محیر العقول تمدن کی بنیاد ڈالنے والے فرمانرواؤں کے نشانات کیا ان کھنڈروں کے علاوہ کچھ اور ہیں جو اب صرف درندوں کو پناہ دے سکتے ہیں، اسی طرح تم فراعنۂ مصر کا سرد جم اور دیگر جبابرہ عالم کی تاریخ اٹھا کر دیکھو تو معلوم ہوگا کہ جب وہ دور ترقی سے گزر رہے تھے تو اپنے کو غیر فانی سمجھتے تھے، لیکن آج جب کہ وہ فنا ہو چکے ہیں، ہمیں یہ تسلیم کرنے میں بھی تامل ہو سکتا ہے کہ وہ کبھی تھے بھی یا نہیں۔

زیادہ نہیں صرف ساڑھے تیرہ سو سال قبل کی بات ہے کہ ایک صحرا نشین امی ریگزار عرب سے پیدا ہوتا ہے اور اپنے بعد ایک ایسے تمدن کی بنیاد چھوڑ جاتا ہے کہ اس کے جانشین مغرب و مشرق پر چھا جاتے ہیں، لیکن آج اس قوم کا کیا حال اس کے تمدن و تہذیب کا کیا رنگ ہے اور وہ انحطاط کے کس دور سے گزر رہی ہو؟

این سخن را چہ جواب ست تو ہم میدانی

لیکن غور طلب امر یہ ہے کہ کیا اس کا یہ دور ختم ہو گیا ہے اور کیا اس کے انجام کے متعلق حکم لگانا کوئی ایسی پیش گوئی کرنا ہے جو صرف انبیا کے لیے مخصوص تھی؟

اگر اقوام عالم کی ترقی اسباب کی محتاج ہے تو ان کے تنزل کو بھی اصولاً اسباب کا پابند ہونا چاہیئے۔ اور اس لیے تاریخ عالم کے مطالعہ کے بعد بھی یہ معلوم کر لینا دشوار نہیں کہ ایک قوم کا مستقبل ہمیشہ اس کے حال میں پوشیدہ ہوا کرتا ہے اور مسلمانوں کا جو حال ہے وہ کسی سے مخفی نہیں

اسلامی تہذیب دنیا کی تمام گزشتہ تہذیبوں سے ایک ممتاز حیثیت رکھتی تھی اور وہ حیثیت صرف یہ تھی کہ اس نے انسانی زندگی کے سامنے ایک ایسا لائحہ عمل پیش کیا جو مادی ترقی کے ساتھ ساتھ اخلاقی ترقی کا بھی ضامن تھا، بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ اس کی تمام مادی ترقیاں منحصر تھیں صرف اخلاق کی بلندی پر۔

موجودہ تہذیب میں مادی ترقی کی جو صورتیں نظر آ رہی ہیں وہ یقیناً تمام ازمنۂ گزشتہ سے زیادہ وسیع ہیں لیکن چونکہ اخلاق کا پہلو نظر انداز کر دیا گیا ہے اسی لیے وہ نوع انسانی کو فائدہ پہونچانے کے بجائے اور زیادہ نقصان پہنچا رہی ہیں اور ظاہر ہے کہ وہ مادی ترقی جو خود بنی نوع انسان کی تباہی کی طرف منجر ہو کبھی صحیح معنی میں ترقی نہیں کہلائی جا سکتی۔

اسلام نے اس توازن کے قیام کے لیے سب سے پہلے جس تعلیم کو پیش کیا وہ یہ تھی کہ تمام انسان برابر ہیں اور دولت کی کمی یا زیادتی کی وجہ سے جذبہ سادات و اخوت کو متاثر نہ ہونا چاہیئے۔ پھر یہ تعلیم صرف زبانی نہ تھی یا کسی علمی نظریہ کے طور پر پیش نہیں کی گئی تھی، بلکہ عملاً روز پانچ وقت شاہ و گدا کو پہلو بہ پہلو کھڑا کر کے اس کا درس دیا جاتا تھا۔

جب یہ تعلیم رائج ہو گئی تو ان کو بتایا گیا انسان دنیا میں صرف کام کرنے کے لیے آیا ہے اور اس کو بے کار کبھی نہ بیٹھنا چاہیئے، اور اس کے ساتھ یہ بھی سمجھا دیا گیا کہ دنیا میں ترقی کی جتنی راہیں ہو گئی ہیں ان سب کو اختیار کرنا چاہیئے۔

پھر ظاہر ہے کہ دنیا میں جو قوم اس اصول پر کاربند ہو وہ کبھی زوال پذیر نہیں ہو سکتی، اور اگر آج مسلمان پستی کے عالم میں ہیں تو اس کا سبب سوا اس کے کچھ نہیں ہو سکتا کہ اس نے اس تعلیم کی روح کو پس پشت ڈال دیا ہے اور اگر حالت یہی رہی تو اس کا فنا ہو جانا بالکل یقینی ہے۔

تعلیم مساوات سے بے خبری و بے تعلقی کا یہ عالم ہے کہ نوع انسانی تو خیر بڑی چیز ہے وہ خود اپنی ہی قوم کا شیرازہ پراگندہ کر چکے ہیں اور محض فروعی مسائل کے اختلاف پر ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کے لیے طیار ہیں عملی زندگی کی یہ کیفیت ہے کہ تقدیر پر بھروسہ کر کے ہاتھ پاؤں ڈال دینا خود مذہب قرار دیا جاتا ہے اور اس کا اصطلاحی نام صبر و توکل رکھا گیا ہے۔

رہ گیا دنیاوی ترقی میں زمانہ کا ساتھ دینا، سو اس کے متعلق کیا کہا جا سکتا ہے جب کہ ایک زمانہ تک علوم جدیدہ کا حصول کفر کے مترادف سمجھا

سیاور اب بھی ہمارے یہاں کے مذہبی علماء اور قائدین امت ان سے بالکل نابلد ہیں اور نابلد رہنے ہی میں اپنی اخروی نجات سمجھتے ہیں۔

پھر غور کیجئے ایسا کیوں ہے؟ تاریخ کے صفحات اٹھا کر دیکھئے کہ مسلمانوں کے زوال کی تاریخ کب سے شروع ہوتی ہے اور خود ہی فیصلہ کیجئے کہ کیا اس کی ابتداء علماء مذہب سے نہیں ہوئی اور کیا ذہنی غلامی کی بنیاد ڈالنے والی کوئی اور جماعت تھی؟ بنو امیہ کی سلطنت کو تباہ کرنے والے، بنو عباس کی حکومت کا تختہ الٹ دینے والے یہی لوگ تھے جو شاہان وقت کی ناجائز، خواہشوں کی تکمیل کے لیے بھی حدیثیں گھڑا کرتے تھے اور جنھوں نے صرف طمع نفس کی بناء پر رفتہ رفتہ اسلام کے لٹریچر کو اس قدر گندگی سے آلودہ کر دیا کہ آج اس کے صحیح خط و خال کا مطالعہ ازبس دشوار ہو گیا ہے۔

پھر ظاہر ہے کہ جب قرون اولی میں اس جماعت کا یہ رنگ تھا تو عہد حاضر میں اس کی بے بصری کا کیا عالم ہو گا اور جو قوم اپنا مستقبل ان کی تعلیم و ہدایت پر منحصر رکھے گی اس کی تباہی میں کس کو کلام ہو سکتا ہے۔

یقیناً اس وقت تمام دنیا کے مسلمان ایک رشتہ سے وابستہ نہیں ہیں اور نہ ایسا ہونا ممکن ہے، لیکن اس کا علاج نہ پان اسلامزم سے ممکن ہے اور نہ فلسطین میں کسی یونیورسٹی کے قیام سے بلکہ اس کا تعلق صرف احساس وطنیت سے ہے اور افسوس ہے کہ ہندوستان کا بدنصیب مسلمان اس احساس سے محروم ہے اور اب تک یہ سودا اس کے دماغ سے نہیں نکلا کہ وہ ہندوستان میں حکمراں ہو کر آیا تھا اور حکمراں قوم کا فرد ہونے کی حیثیت سے اس کو ایسا تفوق حاصل ہے جس کے سامنے یہاں کے تمام باشندوں کو اس کے سامنے گردن جھکا دینا چاہئے۔

ہندوستان میں صدیوں تک قیام کرنے کے بعد یہ اجنبیت کیوں ہے؟ اس کا سررشتہ بھی علماء مذہب ہی کے ہاتھ میں ہے جنھوں نے سرزمین ہند کو دارالحرب و کفرستان اور یہاں کے رہنے والے کو ہمیشہ کافر کہہ کر اختلاف و دشمنی کی وسیع خلیج حائل کر دی، درانحالیکہ نہ ہندوستان کفرستان ہے اور نہ ہندو کافر و مشرک۔

ایک ہندو مندر میں جا کر بت کے سامنے جھک جاتا ہے تو کافر ہے لیکن ایک مسلمان مسجد میں جا کر محراب کے سامنے سربہ سجود ہو جاتا ہے تو کافر نہیں۔ ایک ہندو پتھر کی مورتی کو بوسہ دیتا ہے تو مشرک ہے، لیکن ایک مسلمان طواف کعبہ کے وقت سنگ اسود کو چومتا ہے تو مشرک نہیں کیوں؟

اگر مسلمان کے یہ مذہبی مراسم خالصتاً للہ ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہندو کا مقصود اس سے علحدہ ہو۔ اگر ایک مسلمان سنگ اسود کو صرف اس لیے چومتا ہے کہ وہ ایک بڑے شخص کی یادگار ہے تو آپ کیوں یقین کریں کہ بتوں کی پرستش کسی اور جذبہ کے تحت کی جاتی ہے۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ وہ کونسا ہندو ہے جو بتوں کو خدا سمجھ کر ان کی پوجا کرتا ہے۔ اور اگر بعض جاہل افراد ان میں ایسے ہیں تو پھر ان مسلمانوں کو کیا کہا جائے گا جو قبروں کی خاک چاٹ چاٹ کر تعزیوں اور مقبروں کی جالیوں میں منت کی دھجیاں باندھ باندھ کر ہندوؤں سے زیادہ کفر و شرک میں مبتلا نظر آتے ہیں۔

بہرحال مدعا یہ ہے کہ ہندوستان کی دو بڑی آبادیوں میں تفریق و اختلاف کا سبب صرف مذہب کی وہ غلط تعبیر ہے جو ہندوستان میں دونوں کے علماء مذہب کی طرف سے پیش کی گئی اور اب بھی پیش کی جا رہی ہے۔

اس لیے اگر ہندوستان کی ترقی و آزادی کے لیے ہندو مسلمان کا اتحاد ضروری ہے تو سب سے پہلے دونوں جماعتوں کو مذہبی تعصب ترک کر کے اپنا شعار صرف انسانیت کی پرستش قرار دینا چاہئے۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب پنڈتوں کی گرفت سے ہندو اور علماء کے چنگل سے مسلمان آزاد ہو جائیں۔

گزشتہ و آئندہ

نیاز صاحب نے اس مضمون میں یہ بتایا ہے کہ اگر مسلمانوں نے اسلام کو صحیح رنگ میں دنیا کے سامنے پیش نہ کیا تو وہ اپنی بنیادی خصوصیات کھو کر کچھ سے کچھ ہو جائے گا۔ یہ عمل تغیر اشتراکیت کی صورت میں نمودار بھی ہو چکا ہے۔ مگر یہاں نیاز صاحب دھوکا کھا گئے۔ اشتراکیت کا قلعہ ستر سال قائم رہ کر اس طرح منہدم ہو گیا کہ اب دوبارہ بننے کا کوئی امکان بھی

نہیں مگر اسلام مسلمانوں کی ساری کمزوریوں کے باوجود نہ صرف قائم ہے بلکہ اس کی وسعت روبہ اضافہ بھی ہے۔

اقتباس : از "گزشتہ و آئندہ"

یہ واقعہ ہے کہ دیگر علوم و فنون کے ساتھ مذہبی نظریوں میں بھی غیر معمولی تغیر پیدا ہوا اور وہ وقت آنے والا ہے جب اس کی انتہا کچھ اور ہوگی یعنی مذہب کا نام لینا ہی گناہ سمجھا جائے گا اور جس طرح کسی وقت دین نے بیدینی کا استیصال تیغ و خنجر سے کیا تھا؟ بالکل اسی طرح بیدینی دین کو محو کر دینے کی کوشش کرے گی۔ کیونکہ اس وقت مذہبی اہمیت صرف سیاسیات کے رجحان پر قائم ہے اور اس کی حیثیت سرمایہ دارانہ پروپگنڈا سے زیادہ باقی نہیں رہی۔

جس حد تک روحانیت کا تعلق ہے مذہب جس میں ظاہری مراسم و شعائر کی پابندی ضروری ہے کوئی معنی نہیں رکھتا، مادی نظریہ اس کی ناکامی کسی سے مخفی نہیں کہ آج تک وہ قوی کے مقابلہ میں ضعیف کو پامالی سے نہ بچا سکا، نفسیاتی زاویہء نگاہ سے دیکھئے تو معلوم ہوگا اس کی خصوصیات علمی و تمدنی ترقی کے لیے بہت حارج ہوئیں۔ رہی وجدانی و مابعد الطبیاتی تسکین سو یہ علم اخلاق کی وسعت سے حاصل ہو سکتی ہے جو عام "اخوت انسانی" کے رشتہ کو قائم کرنا چاہتی ہے۔ الغرض اس وقت مغرب کی علمی دنیا میں جو جدید مذہب پھیلتا جا رہا ہے وہ "اشتراکیت" ہے جس کا پیغمبر لینن اور جس کی شریعت سائنس ہے۔

پھر مذہبی نظام کے خلاف یہ ہیجان صرف یورپ و امریکہ ہی میں محدود نہیں ہے بلکہ ایشیا میں بھی پایا جاتا ہے ترکی اپنی قومی ترقی و اصلاح کے لیے اسلام کو پس پشت ڈال چکا ہے چنانچہ ۱۹۲۷ء میں مصطفےٰ کمال نے اپنی ایک تقریر کے دوران میں صاف صاف کہہ دیا تھا کہ "کانسٹی ٹیوشن میں اس امر کا اظہار کہ ترکی، اسلامی حکومت ہے، ایک ایسی بات کا اظہار ہے جس کو اولین مناسب فرصت میں کالعدم ہو جانا چاہیئے"۔ یہی حال تقریباً ایران و مصر کا ہے، چین و ہندوستان میں بھی اس انقلاب کے آثار پوری طرح نمایاں ہیں کیونکہ اس وقت دنیا کے سامنے اہم ترین فکر یہ نہیں ہے کہ انسان گناہوں سے کس طرح باز رہے بلکہ یہ ہے کہ تمدنی و معاشری نظام میں کون سی ایسی تبدیلی پیدا کی جائے کہ انسان بھوکا نہ مرے اور چونکہ مذاہب عالم کا موجودہ نظام انسانیت کے اس درد دکھ کا علاج اب تک نہیں کر سکا، اس لیے لامحالہ یا تو اس کو پس پشت ڈالنا پڑے گا یا اس میں کوئی ایسا تغیر پیدا کیا جائے گا جو اس گتھی کو سلجھا سکے۔ بہرحال اس دور انقلاب میں مذاہب کو ضرور صدمہ پہونچے گا۔ اور اگر حامیان مذہب نے اپنے اصول کار میں اقتضاء زمانہ کے لحاظ سے کوئی تبدیلی پیدا نہ کی تو ان کا منصب شریعت سے ہٹ جانا ناگزیر ہے۔

اگر شخص ثالث کی حیثیت سے فیصلہ کیا جائے تو اس سے انکار ممکن نہیں کہ مذہب موجودہ انقلاب میں زندہ رہنے کی صلاحیت رکھتا ہے، بشرطیکہ اس کی اصل روح کو پیش کیا جا سکے اور ظاہری شعائر و مراسم کی پابندی پر زور نہ دیا جائے۔

اس وقت اصولاً تقریباً تمام ممالک نے اس بات کو تسلیم کر لیا ہے کہ حکومت و سلطنت کی بہترین صورت جمہوریت ہے اور سرمایہ دارانہ ذہنیت نے جو مصائب دنیا پر توڑ رکھے ہیں۔ ان کا علاج سوا اشتراکی اصول کے اور کوئی نہیں ہو سکتا پھر کیا سوا اسلام کے دوسرا مذہب کوئی اور ہے جو اس بات کا حامی ہو۔ سوال نہ بنو عباس کا ہے نہ بنو امیہ کا، نہ دولت فاطمیہ کا نہ ہندوستان کے دور مغلیہ کا بلکہ غور طلب امر صرف یہ ہے کہ اسلام کی اصل تعلیم کیا ہے۔ اگر عہد رسالت کے بعد اس عوامل پر عمل نہ کر کے لوگوں نے بجائے جمہوریت کے مستبدانہ حکومتوں کی بنیاد ڈالی ہو تو اسلام مورد الزام نہیں ٹھہرتا اور اگر آج بھی اس تعلیم کو پیش نہیں کیا جاتا تو اس میں قصور ہمارے قائدین مذہب کا ہے نہ کہ اسلام کا۔

تمام نوع انسانی کو ایک مرکز پر لانے کے لیے جو جذبہ عملاً کوئی خدمت کر سکتا ہے وہ اخوت عامہ کا جذبہ ہے اور اگر اس کے خلاف کوئی تعلیم پیش کی جاتی ہے، خواہ وہ اصول سے تعلق رکھتی ہو یا فروع سے، شعائر سے وابستہ ہو یا عقائد سے، کبھی صحیح اسلامی تعلیم نہیں ہو سکتی۔

اس وقت اسلام کے اصطلاحی معنی خواہ کچھ ہی کیوں نہ قرار دے لئے گئے ہوں، لیکن حقیقتاً وہ ایک بسیط مفہوم رکھتا ہے اور اس کو ہم کسی طرح محدود کر ہی نہیں سکتے۔ کیونکہ اسلام نام صرف استعلاء کا عروج و ترقی کا، جد و جہد کا، کردار و عمل کا، ایک ایسی "لامذہبیت" کا جو تمام مذاہب کا ایک

مرکز پر لانے کی اہلیت رکھتی ہے اور شمائر ومراسم سے بے نیاز ہو کر صرف پاکیزگی اخلاق اور تکمیل تمدن کی حامی ہے۔

پھر چونکہ اس نکتہ کو مسلمان فراموش کر چکے ہیں اور مذہب کی صحیح تعلیم کو انسان کی خود غرضانہ ذہنیت خراب کر چکی ہے، اس لیے عام طور پر یہی باور کیا جاتا ہے کہ یہ ساری خرابیاں تعلیم مذہب کی ہیں اور اسی بناء پر تمام اسلامی ممالک میں وہ ردعمل ظاہر ہو رہا ہے جس کا دوسرا نام کفر و ارتداد رکھا گیا ہے لیکن باور کیجئے کہ یہ حالت عرصہ تک قائم نہ رہے گی اور اس انقلاب کا نتیجہ استیصال مذہب کی صورت میں ظاہر ہو گا اگر اس کے اصلی خدو خال پیش نہ کئے گئے۔

ممکن ہے جو مفہوم میں نے اسلام کا پیش کیا ہے وہ اس وقت تعجب و نفرت کی نگاہ سے دیکھا جائے، لیکن وہ وقت آنے والا ہے، جب ایک ایک شخص وہی کہے گا جو میں کہہ رہا ہوں، اور اسلام تمام دنیا پر حاوی ہو کر رہے گا۔

پھر ہو سکتا ہے کہ اس کی صورت دوسری ہو اس کا نام کچھ اور ہو، لیکن اس کا مفہوم وہی ہو گا جو آج کہہ رہا ہوں اور اس کے خدو خال وہی ہوں گے جنھیں آج میرا قلم پیش کر رہا ہے۔

یوم النبی

یہ بھی نیاز صاحب کا ایک محققانہ اور نصیحت خیز مضمون ہے جس میں یوم النبی کو صرف خوشی اور خام و نمود کے ذریعے منانے کے بجائے اس میں خرچ ہونے والی دولت کو مفید تعمیری کاموں میں خرچ کرنے کی راہ دکھائی گئی ہے مضمون کا ایک حصہ۔

اقتباس از "مسلمانوں کا یوم النبی"

اگر اسوۂ رسول کی عظمت کو ہم صرف رنگین جھنڈیوں سے ظاہر کر سکتے ہیں، اگر اس کی پاکیزہ سیرت کے اظہار میں صرف بجلی کے قمقموں کا روشن کرنا کافی ہے، اگر اس کی مقدس تعلیم کا نشر و اعلان محض شیرینی تقسیم کرنے سے پورا ہو سکتا ہے اور اگر ہم اس کے باطنی و اخلاقی علو کو جھنڈیاں لے لے کر سڑکوں پر گشت لگانے سے ثابت کر سکتے ہیں، اور اگر اس کی صداقت عمل کی تبلیغ میں ظاہری نمود و نمائش کے علاوہ کسی اور چیز کی ضرورت نہیں تو بے شک یہ سب کچھ درست ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ لہو و لعب کا مظاہرہ نامناسب نہیں، لیکن اگر خود رسول نے کبھی وہ نہیں کیا جو ہم کر رہے ہیں اور کبھی اس کی اجازت نہیں دی جو ہماری طرف سے ظاہر ہو رہا ہے تو پھر اس کو "یوم النبی" کی یادگار کہنا یقیناً رسول اللہ کی توہین ہے۔ اسلام کی تذلیل ہے اور مسلمانوں کے اندر اک ایسے جذبہ کی پرورش کرنا ہے جو بت پرستی کی طرف تو منجر ہو سکتا ہے لیکن خدا پرستی سے اسے کوئی تعلق نہیں۔ یہ تو ہوئی عملی پہلو کی کمزوری یا اس کا فقدان جو یوم النبی کے سلسلہ میں مسلمانوں کی طرف سے ظاہر ہوتا ہے، اب رہ گئی تاریخی یا مذہبی حیثیت جس کو سامنے رکھ کر ہمارے علماء کرام ذکر میلاد فرماتے ہیں، سو اس کا حال اس سے بھی بدتر ہے کیونکہ اس کا مقصود رسول اللہ کو ایک انسان کی حیثیت سے پیش کرنا کبھی نہیں ہوتا، بلکہ ایک مافوق الفطرت ہستی کی صورت سے پیش کرنا ہوتا ہے۔ وہ ابھی پیدا نہیں ہوئے کہ ان کا نور لاکھوں سال قبل سے خدا جانے کہاں کہاں چکر کھاتا پھرتا ہے، وہ جس وقت پیدا ہوتے ہیں تو اکاسرہ کے محل او صنمکدوں کے بت سرنگوں ہو جاتے ہیں وہ ابھی عالم طفلی میں ہوتے ہیں کہ فرشتہ ان کا سینہ چاک کر کے آلائش سے پاک کر دیتا ہے وہ دعوائے نبوت کرتے ہیں تو سنگریزے اس کی شہادت دیتے ہیں۔ جب آپ چلتے ہیں تو جسم کا سایہ نظر نہیں آتا اور کبھی جوش نبوت میں انگلی کا اشارہ کر دیتے ہیں تو چاند کے دو ٹکڑے ہو جاتے ہیں، پھر میں حیران ہوں کہ جب ذکر میلاد کے سلسلہ میں قولاً و عملاً کوئی بات بھی کام کی نہیں ہوتی تو کیوں اس پر ہزاروں روپیہ ضائع کیا جاتا ہے اور کیوں اس طرح کے ظاہری مراسم و شعائر کی طرف متوجہ کر کے ان کے قواء عمل کو اور ضعیف بنایا جاتا ہے۔

اس وقت سب سے ضروری امر جس کی طرف اکابر اسلام کو توجہ کرنا چاہیئے وہ مسلمانوں کی اقتصادی کمزوری ہے، جو نہ نمازیں پڑھنے سے دور ہو سکتی ہے نہ یوم النبی منانے سے بلکہ صرف ایک ایسی تنظیم سے جو ان کی معاشرت و معیشت کو اجتماعی طور پر اپنے ہاتھ میں لے لے۔ اور نہایت

آسانی سے ممکن ہے اگر ہمارے یہاں کے علماء و اکابر صرف زکوۃ کے مسئلہ پر توجہ کر کے ایک قومی بیت المال قائم کر سکیں۔ لیکن ہمیں معلوم ہے کہ ان کی تن آسانیاں اور خود غرضیاں کبھی اس کی اجازت نہ دیں گی اور وہ "یوم النبی" کی تقریب میں مقالاً مزافات کا ایک طومار اور عملاً لہو و لعب کے دلچسپ پروگرام کو ضرور پیش کریں گے لیکن کام کی کوئی بات کبھی نہ کریں گے۔

اس وقت مسلمانوں کی ۸ کروڑ آبادی میں سے اگر ایک کروڑ مسلمان بھی اوسطاً ایک روپیہ سالانہ دینے والے مل جائیں اور یہ رقم ایک جگہ جمع ہو کر قومی ادارہ میں صرف ہو تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ایک ربع صدی کے اندر کتنا عظیم انقلاب برپا ہو سکتا ہے اور فقر و فاقہ و بیکاری جس میں مسلمانوں کی اکثر تعداد مبتلا نظر آتی ہے، کتنی آسانی سے دور ہو سکتی ہے۔

یوم النبی کی تقریب ہندوستان کے ہر گاؤں، ہر قصبہ اور شہر کے ہر محلہ میں منائی جاتی ہے اور اس لیے اس سے بہتر کوئی موقعہ عام تنظیم کے لیے نہیں ہو سکتا۔ ہر محلہ میں ایک ایک کمیٹی چند آدمیوں کی بنادی جائے جو ماہوار وصولی زکوۃ کے ذمہ دار ہوں، اور ان کمیٹیوں کا تعلق شہر کی صدر کمیٹی سے ہو، اسی طرح شہروں کی کمیٹیاں صوبہ کی مرکزی کمیٹی سے متعلق ہوں اور صوبائی کمیٹیاں بیت المال عمومی سے وابستہ ہوں جو سارے ملک کا ایک ہو اس کا سالانہ جلسہ ہر جگہ یوم النبی کی تقریب میں منعقد کیا جائے اور رپورٹ پیش کی جائے کہ سب کمیٹیوں نے سال بھر میں کیا کام کیا اور یہ تمام رپورٹیں بیت المال عمومی کے صدر کے پاس جائیں گی جو ایک بورڈ کے مشورہ سے ہدایات جاری کرے گا۔ ہر محلہ کے مستحقین امداد کی فہرست باقاعدہ مرتب کی جائے اور ایک خاص حد تک شہر کی کمیٹی کو خرچ و امداد کے اختیارات دیئے جائیں۔

الغرض یہ اور اسی طرح کی بہت سی صورتیں اس سلسلہ میں ایسی پیدا ہو سکتی ہیں جو مسلمانوں کے بہت سے نادار طلبہ کو تعلیم دلانے میں مدد دے سکتی ہیں اور خدا جانے کتنے صنعتی مدارس اور تجارتی ادارے قائم کر کے لاکھوں بیکار مسلمانوں کو کام میں لگایا جا سکتا ہے۔ مگر ہمارے اکابر کو کیا غرض ہے کہ وہ اس طرف توجہ کریں اور ہمارے علماء کرام کو کیا پڑی ہے کہ وہ دردسر مول لیں۔

قرآن کے کلام خدا ہونے کا صحیح مفہوم

اس طویل مضمون کا ابتدائی حصہ نقل کیا جا رہا ہے جس سے پورا نفس مطلب سمجھ میں آجاتا ہے۔ بحث بڑی نازک اور اختلاقی ضرور ہے مگر محرر نے جو کچھ کہا ہے اس کو پڑھ لینے میں کیا حرج ہے۔

فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

اقتباس از "قرآن کے کلام خدا ہونے کا صحیح مفہوم"

میں آج کی صحبت میں ذرا تفصیل کے ساتھ بتانا چاہتا ہوں کہ قرآن پاک کو اس مفہوم میں خدا کا کلام کہنا جو عام طور پر قرار دیا جاتا ہے نہ صرف یہ کہ خود قرآن کے منشاء کے خلاف ہے بلکہ اس صحیح تصور وحدانیت کے بھی منافی ہے جس کی تعلیم رسول اللہؐ نے پیش کی ہے۔ میں اس بحث میں نہ احادیث و تفاسیر سے استناد کروں گا نہ اقوال سلف سے، کیونکہ یہ جھگڑے کی چیزیں ہیں بلکہ خود کلام پاک کی آیات سے یہ سمجھنے کی کوشش کروں گا کہ کیا قرآن واقعی خدا کا کلام ہے اور اگر ہے تو کس مفہوم میں۔

۱۔ چونکہ قرآن کے متعلق اہل مذہب کا مسلمہ عقیدہ ہے وہ وحی کے ذریعہ سے پہونچایا گیا تھا، اس لیے نامناسب نہ ہوگا اگر سب سے پہلے وحی کی حقیقت معلوم کر لی جائے۔

وحی کے لغوی معنی "اشارۂ سریع" یا "الہام بالسرعۃ" کے ہیں اردو میں اس کا صحیح مفہوم "برمحل سوجھ بوجھ" کے فقرہ سے ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ قوت کسب و اکتساب سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ فطری ودیعت ہے اس لیے، ہم کہہ سکتے ہیں کہ وحی خدا کی عنایت ہے اور نتیجہ ہے اس ذہنی قوت کا جو فطرتاً انسان میں ودیعت کی گئی ہے اور چونکہ یہ قوت انبیاء میں زیادہ پائی جاتی ہے اور ان کا ہر قول و فعل صرف نوع انسان کی خدمت کے لیے ہوتا تھا اس لیے یہ کہنا غلط نہیں کہ ان کی ہر بات وحی کا نتیجہ تھی اور ان کے منہ سے جو کچھ نکلتا تھا وہ اسی اشارۂ خداوندی کے تحت ہوتا تھا

وحی کا مفہوم جو میں نے معین کیا ہے وہ میری ذاتی رائے کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ خود قرآن پاک سے ظاہر ہوتا ہے۔

سب سے پہلی غلطی جو وحی کا مفہوم متعین کرنے میں روا رکھی گئی ہے یہ ہے کہ وحی کو انبیاء و رسل کے لیے مخصوص سمجھ لیا گیا، حالانکہ حقیقت یہ نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ انبیاء و رسل کے پاس وحی بھیجے جانے کا ذکر کلام پاک میں پایا جاتا ہے، لیکن غیر انبیاء بلکہ حیوانات و جمادات پر بھی وحی کا نازل ہونا قرآن سے ثابت ہے، سورہ قصص میں ارشاد ہوتا ہے۔

" واوحینا الی ام موسیٰ ان ارضیعه "

ہم نے موسیٰ کی ماں کی طرف وحی بھیجی کہ وہ موسیٰ کو دودھ پلائیں۔

ظاہر ہے کہ موسیٰ کی ماں نبیہ نہ تھیں اور اس لیے آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم نے موسیٰ کی ماں کے جی میں یہ بات ڈال دی کہ وہ موسیٰ کو دودھ پلائیں اور اس طرح وحی کے معنی وہ نہ رہے جو عام طور پر سمجھے جاتے ہیں۔

خدا نے انسان کے علاوہ حیوانات پر بھی وحی بھیجی ہے۔ سورہ نحل کی آیت ہے۔

" واوحی ربک الی النحل ان اتخذی من الجبال بیوتا و من الشجر و مما یعرشون "

ہم نے شہد کی مکھی کی طرف وحی بھیجی کہ وہ پہاڑوں اور درختوں اور مکانوں میں اپنا چھتا بنائے۔

اس جگہ وحی کے معنی اس فطرت ذکاوت کے ہوئے جس سے کام لے کر شہد کی مکھی اپنا خوبصورت چھتا تیار کرتی ہے۔ جمادات پر وحی نازل ہونے کا ثبوت سورۂ زلزال کی اس آیت سے ملتا ہے۔

یومئذ تحدث اخبارہا بان ربک اوحیٰ لہا۔

" اس دن زمین اپنی خبریں اس طرح بیان کرنے لگے گی جیسے خدا نے اس پر وحی نازل کی ہو "۔

ظاہر ہے کہ زمین زبان نہیں رکھتی اس لیے اس کا یہ بیان بہ زبان حال ہوگا اور اس جگہ وحی کا مفہوم " **ماحول و اقتضاء ماحول** " قرار پایا۔

کلام مجید میں ایک جگہ اس سے بھی زیادہ وسیع معنی میں اس لفظ کا استعمال ہوا ہے۔ سورۂ "حم" میں ارشاد ہوتا ہے۔

" فقضاہن سبع سموات فی یومین و اوحیٰ فی کل سماء امرہا "۔

پس ہم نے دو دن میں سات آسمانوں کی تخلیق کا حکم دے دیا اور ہر آسمان میں اس کے نظم و اصول کو وحی کر دیا۔

اس جگہ وحی کے معنی ودیعت کرنے کے ہوئے۔

آپ نے دیکھا کہ قرآن میں وحی کا لفظ کس قدر وسیع معانی میں استعمال ہوا ہے اور اس کا تعلق بڑی حد تک اس فطری صلاحیت یا ذکاوت سے ہے جو خدا نے ایک انسان کے ذہن و دماغ میں ودیعت کر دی ہے لیکن آپ سن کر تعجب کریں گے کہ الہام و وحی کا استعمال بری باتوں کے لیے بھی کیا گیا ہے۔

سورۂ شمس میں نفس ایمانی کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے۔

" فالہمہا فجورہا و تقواہا "

یعنی اس میں برائی بھلائی الہام کی۔ یہاں بھی الہام اسی فطری صلاحیت و عدم صلاحیت کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔

لفظ وحی بھی ایک جگہ اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ بری باتوں کے لیے استعمال کیا گیا ہے ملاحظہ ہو سورۂ انعام کی یہ آیت۔

وکذالک جعلنا لکل نبی عدوا شیاطین الانس و الجن یوحی بعضہم الی بعض زخرف القول غرورا۔

اس طرح ہم نے ہر نبی کے ساتھ اس کے دشمن اس کے ساتھ لگادئیے ۔ یہ وہ شیاطین ہیں جو ایک دوسرے کو لغو باتوں کی وحی کرتے رہتے ہیں ۔
اس جگہ وحی کے معنی" بری بات سجھانے" کے ہوئے ۔ یہاں تک تو لفظ وحی کے اس مفہوم سے بحث ہوئی جو مختلف جگہ پر مختلف مفہوم میں مستعمل ہوا ہے ، اب خود قرآن پاک سے جو تعلق وحی کا ظاہر کیا گیا ہے اسی بھی ملاحظہ فرمالیجئے ۔

سورۂ نجم میں ارشاد ہوتا ہے ۔

ماینطق حسن الھویٰ ان ہوالا وحی یوحی علمہ شدید القویٰ

رسول ہوائی باتیں نہیں کرتا ، بلکہ وہ سب کچھ وحی ہے اور ایک بڑی قوت والے نے اسے سکھایا ہے ۔

سورۂ انعام میں رسول اللہ کی زبان سے یہ کہے جاتے ہیں ۔

واوحی الی ہذاالقرآن لانذرکم بہ ۔

مجھ پر قرآن وحی کیا گیا ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے میں تمہیں بری باتوں کی طرف سے ڈراؤں ۔

سورۂ بنی اسرائیل میں قرآن کو حکمت کی کتاب بتایا جاتا ہے ۔

ذلک مما اوحی الیک ربک من الحکمتہ ۔

سورۂ انعام میں ارشاد ہوتا ہے ۔

قل لاءقول لکم عندی خزاین اللہ ولا اعلم الغیب ولا اقول لکم انی ملک ان اتبع الاما یوحی انی ۔

(اے رسول کہہ دو کہ نہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں نہ میں غیب کا حال جانتا ہوں اور نہ میں یہ کہتا ہوں کہ فرشتہ ہوں ، میں تو صرف اسی کا اتباع کرتا ہوں جو مجھے وحی کیا جاتا ہے)

ان تمام آیات سے قرآن کو وحی بتایا گیا ہے لیکن صرف اس کے علم و حکمت ہونے کے لحاظ سے اور کہیں یہ ظاہر نہیں کیا گیا کہ اس کے الفاظ بھی خدا کے بولے ہوئے الفاظ ہیں ۔

خدا کسی سے ، ہم کلام نہیں ہو سکتا ، نہ کوئی انسان اس سے ، ہم کلام ہو سکتا ہے ، اور عبد و معبود کی اس باہمی گفتگو کی صورت کوئی اگر ہو سکتی ہے تو صرف وحی کے ذریعہ سے چنانچہ سورۂ شوریٰ میں ارشاد ہوتا ہے ۔

وماکان لبشران یکلمہ اللہ الا وحیاً اومن دراء حجاب ۔

اس آیت سے اس عقیدہ کی بھی تردید ہوتی ہے کہ موسیٰ خدا سے باتیں کرتے تھے ۔

مسلمانوں میں یہ عقیدہ کیوں پیدا ہوا کہ قرآن کے تمام الفاظ خدا کے الفاظ ہیں اور فرشتہ ان الفاظ کو رسول اللہ کے پاس لایا کرتا تھا اس کے متعلق ، ہم آئندہ بیان کریں گے ، لیکن ایسا عقیدہ رکھنے والوں کی طرف سے جو آیتیں کلام پاک کی پیش کی جاتی ہیں پہلے انہیں سن لیجئے ۔

سورۂ زخرف کی آیت ہے ۔

ان جعلنا قرآنا عربیا لعلکم تتقون ، وانہ فی ام الکتاب لدنیا لعلی حکیم ۔

اس آیت کے آخری ٹکڑے کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن اس ام الکتاب کا ایک حصہ ہے جو ہمارے پاس موجود ہے یہ ام الکتاب ہے کیا اس کی صراحت میں وہ کلام مجید کی یہ آیت پیش کرتے ہیں ۔

بل ہو قرآن مجید فی لوح محفوظ

یعنی قرآن ایک تختی میں محفوظ ہے ۔

ان آیتوں سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن ام الکتاب کا ایک حصہ ہے جس کا دوسرا نام لوح بھی ہے لیکن جس وقت ، ہم سورۂ رعد کی حسب

ذیل آیت پڑھتے ہیں تو ہم کو "لوح وام الکتاب" دونوں کا صحیح مفہوم معلوم ہو جاتا ہے ارشاد ہوتا ہے۔

ھو اللذی انزل علیک الکتاب منہ آیات محکمات ھذ ام الکتاب و اخر متشابھات۔

اس آیت میں "ام الکتاب" کو "آیات محکمات" سے تعبیر کیا گیا ہے یعنی "مضبوط و مستحکم نشانیاں" یا بالفاظ دیگر وہ قوانین فطرت جو اٹل ہیں اور جن میں تبدیلی ممکن نہیں اور یہی مفہوم لوح یا تختی کا بھی قرار پایا۔

۲۔ اب عام روایات کی بناء پر اس عقیدہ کو بھی ملاحظہ فرمائیے جو قرآن کے ام الکتاب اور لوح محفوظ میں مرسوم ہونے کے متعلق عام مسلمانوں میں رواج پایا گیا ہے۔ قصص الانبیاء کی روایت ملاحظہ ہو۔

عرش اعظم سے نیچے اس نے ایک دانۂ مروارید پیدا کیا اور اس موتی سے اس نے لوح محفوظ بنائی۔ اس لوح کا طول ۷۰۰ سال کی راہ اور عرض ۳۰۰ برس کی راہ تھا (۱)

اس کے حاشیہ پر خدا نے اپنی قدرت سے لعل و یاقوت کی گل کاری کی تھی۔ بعد ازاں قلم کو حکم ہوا کہ "لکھ اے قلم میری تمام مخلوق کی نسبت اور جو کچھ تاقیامت ہوگا اس کے متعلق میرے علم کا حال۔

قلم نے لوح محفوظ پر "بسم اللہ الرحمن الرحیم" لکھا اور پھر تمام مخلوقات کی نسبت قیامت تک کا حال لکھا، یہاں تک کہ درخت کا پتہ ہلنے گرنے یا اور پر اڑنے تک کا حال درج کیا"۔

اس بیان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ لوح محفوظ ایک مادی تختی تھی جو موتی سے بنائی گئی تھی اور جس پر خوشنویسوں کی رسم کے مطابق چاروں طرف حاشیہ میں گلکاری بھی کی گئی تھی۔ اس لغویت کے ساتھ ہی اس بیان سے یہ عقیدہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ عالم کی تخلیق سے قبل ہی قرآن لوح محفوظ میں درج ہو گیا تھا، لیکن اس خیال کی تکذیب خود قرآن پاک کے بیانات سے بھی ہوتی ہے کیونکہ اس میں زبور، توریت، وانجیل وغیرہ کا بھی ذکر ہے۔ اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ قرآن سے پہلے ہی لوح محفوظ میں درج ہو گئی ہوں گی ورنہ ایسی چیز کا ذکر جو وجود میں نہ آئی ہو کوئی معنی نہیں رکھتا۔

حقیقت یہ ہے کہ لوح کے عقیدہ کا خیال بہت قدیم ہے۔ اہل بابل کا عقیدہ تھا کہ ہر شخص کی قسمت کا حال ایک لوح پر لکھا ہوا محفوظ ہے، یہی خیال توریت میں منتقل ہوا جیسا کہ کتاب استثناء باب ۱۰ آیۃ العاشیہ ۵ سے ظاہر ہوتا ہے، اس میں لکھا ہے کہ جب موسیٰ نے خدا کے حکم سے ویسی دو تختیاں پتھر تراش کر بنائیں، جیسی اس نے توڑ دی تھیں، تو خدا نے ان پر احکام عشرہ تحریر فرمائے اور موسیٰ کو خدا نے حکم دیا کہ وہ ان تختیوں کو ببول کی لکڑی کے صندوق میں محفوظ رکھے"۔ اور پھر یہی خیال یہود سے مسلمانوں میں منتقل ہوا، چنانچہ عبرانی زبان میں جو لفظ تختی کے لیے استعمال ہوا ہے وہی ہے جو عربی میں پایا جاتا ہے۔

چونکہ رسول اللہ کے زمانہ میں یہود و نصاریٰ عام طور پر یہی عقیدہ رکھتے تھے کہ ان کے توریت وانجیل لوح محفوظ میں منقوش خدا کے پاس موجود ہیں اور اس عقیدہ سے عوام بہت متاثر ہوتے تھے اس لیے مسلمانوں نے بھی سمجھ لیا کہ اگر قرآن توریت وانجیل کی طرح خدا کی بھیجی ہوئی کتاب ہے تو اسے بھی لوح محفوظ میں درج ہونا چاہیئے اور اس باب میں متعدد حدیثیں گھڑلی گئیں۔

۳۔ یہاں تک میں نے روائتی حیثیت سے اس مسئلہ پر روشنی ڈال کر واضح کر دیا ہے کہ قرآن کا وحی ہونا کیا مفہوم رکھتا ہے اور اس کو لوح محفوظ میں درج سمجھنا ایک مستعار عقیدہ ہے جو قدیم بابلیوں اور یہود و نصاریٰ سے لیا گیا ہے۔ اب روائتی حیثیت سے دیکھیئے تو معلوم ہوگا کہ قرآن کو اس معنی میں خدا کا کلام کہنا کہ اس کا ایک ایک لفظ خدا کی زبان سے ادا کیا ہوا لفظ ہے، حد درجہ جاہلانہ عقیدہ ہے جس سے ایک طرف خدا کے تصور وحدانیت کو صدمہ پہونچتا ہے اور دوسری طرف رسول کی عظمت کو۔

---

(۱) (معلوم نہیں راہ کس کی مراد ہے، انسان کی طیور کی یا حشرات کی اور اگر موٹر یا ہوائی جہاز کی رفتار کو سامنے رکھا جائے تو یہ راہ کتنے دن کی قرار پائے گی)

اگر ہم الفاظ قرآن کو بھی الہامی اور منطوق خداوندی کہیں گے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ خدا کی صفت نطق مادی اسباب کی محتاج ہوگی اور یہ اسلام کے تصور وحدانیت کے منافی ہے۔

گفتگو، نطق، الفاظ ان سب کے تخیل کے ساتھ ہم مجبور ہیں کہ ان تمام آلات نطق یا عضلات و اعصاب وغیرہ کو بھی سامنے رکھیں جو ادائے صورت کے لیے ضروری ہیں اور اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ خدا ایسے الفاظ بغیر کسی مادی اسباب یا ذرائع کے پیدا کرسکتا ہے تو ایسا فرض کرنے کی نہ کوئی دلیل موجود ہے اور نہ ضرورت۔

خدا کی عظمت ظاہر کرنے کے لیے تو قطعی اس امر کی ضرورت نہیں کہ وہ انسان کی طرح چلتا، پھرتا، بولتا، چالتا، فرض کیا جائے، اور رسول کی برتری اخلاق کے ثبوت کے لیے بھی ضروری نہیں کہ خدا اس سے باتیں کرے یا اس کی زبان میں کوئی کتاب تصنیف کرکے اپنے فرشتہ کے ذریعہ سے اس کے پاس بھیج دے بلکہ سچ پوچھیے تو یہ رسول کی عظمت کے منافی ہے کہ جو کچھ وہ کہے وہ خود اس کے دماغ کا نتیجہ نہ ہو۔

رسول کو محض ایک ایسے پیغامبر کی حیثیت دینا جو خود کوئی عقل یا ارادہ نہ رکھتا ہو، جسے خود کچھ کہنے سننے کا اختیار نہ ہو، ایک ڈاکیہ کی حیثیت دے دینا ہے اور اس کی انسانی حیثیت کو عام انسانی سطح سے بھی نیچے گرا دینا ہے۔

ہم رسول کو مصلح قوم کہتے ہیں، لیکن کیا وہ شخص صحیح معنی میں مصلح ہوسکتا ہے جو وقت و زمانہ کے لحاظ سے خود کوئی حکم لگانے یا فیصلہ صادر کرنے کا اختیار نہ رکھتا ہو، جو خود قوانین اصلاح وضع نہ کرسکتا ہو اور جو اپنی ذاتی عقل و رائے سے کام لینے کا مجاز نہ ہو، فوج کے ایک جنرل کا یہ کام نہیں کہ وہ صرف مرکز کے احکام کی تعمیل کرے اور خود اپنی سوجھ بوجھ سے کام لے کر فوج کو نہ لڑائے۔ اس کا اولین فرض یہ ہے کہ وقت و موقعہ کے لحاظ سے خود مناسب احکام صادر کرے کیونکہ وہ جنگ کو کامیاب بنانے کا ذمہ دار ہے۔

اگر قرآن کا ایک ایک لفظ ایک ایک حرف خدا کا بتایا ہوا ہے تو پھر اس میں رسول اللہ کا کیا کمال ہے اور خود ان کے ذاتی شرف پر اس سے کیا روشنی پڑتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ قرآن کی فصاحت و بلاغت کا دنیا میں جواب نہیں اور اگر خدا کوئی کلام کرسکتا ہے تو واقعی اس کو ایسا ہی فصیح و بلیغ ہونا چاہیئے لیکن اس سے رسول اللہ کی ذہنی بلندی یا قوت اختراع کیا ثابت ہوتی ہے۔

الغرض قرآن کو خدا کا کلام کہنا یا لوح محفوظ میں اس کا مرتسم ہونا یقین کرنا صحیح اسلامی خیال نہیں ہے بلکہ مستعار ہے یہود و نصاریٰ سے قرآن میں جہاں جہاں کلام اللہ اور کلمات اللہ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں ان سے مراد خدا کے احکام ہیں، رسول نے صرف الفاظ پیش کرکے ان کی پوجا نہیں کرائی بلکہ احکام پیش کرکے ان کی تعمیل چاہی ہے۔

یہ ہے میرا عقیدہ قرآن پاک اور رسول اللہ کی رسالت کے متعلق اور میں سمجھتا ہوں کہ رسول کی عظمت کا اقتضاء یہی ہے کہ قرآن کو انھیں کا کلام سمجھا جائے اور اس کے وحی ہونے کا مفہوم وہی قرار دیا جائے جو اس سے قبل کے صفحات میں ظاہر کیا گیا ہے۔

اگر قرآن کو خدا کا کلام سمجھا جائے جو عام طور پر لوگوں کے ذہن نشین ہے تو اس پر بہت سے شبہات وارد ہوتے ہیں۔ مثلاً

(۱) قرآن مجید کو خدا نے پیدا کیا ہے یا خدا کے ساتھ وہ بھی از خود وجود میں آیا ہے، دوسری صورت فرض کرنا ممکن نہیں کیونکہ اس طرح قرآن کو بھی خدا کی طرح قدیم ماننے پڑے گا۔ حالانکہ قدیم ذات صرف خدا کی ہے اور اگر اول صورت مانی جائے تو قرآن کو "شئے مخلوق" ماننا پڑے گا، لیکن "شئے" کے متعلق یہ ارشاد ہے کہ "کل شی ءِ ھالک الا وجہہ" اس لیے نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن فنا ہوجانے والی چیز ہے، اور اس لیے خدا کا کلام نہیں ہوسکتا۔

(۲) اگر قرآن شریف نام ہے ان الفاظ یا حروف کا جو کاغذ پر منقوش ہوتے ہیں جو پریس کے ذریعہ چھاپے جاتے ہیں اور جو انسان کی زبان سے ادا ہوتے ہیں تو کلام مجید کا ہر نسخہ کلام خداوندی ہے اور جو نسخہ ان میں سے ضائع ہوجائے اس کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ خدا کا کلام ضائع ہوگیا۔

(۳) اگر قرآن پاک خدا کا کلام ہے تو اس کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں یا تو اس کو خدا کی عین ذات تصور کیا جائے، یا صفات خداوندی میں شامل کیا جائے، قرآن کو خدا کی عین ذات نہیں کہہ سکتے کیونکہ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ قرآن خدا ہے اور خدا قرآن ہے، اس لیے لامحالہ اسے "صفت ربانی" ماننا پڑے گا لیکن چونکہ خدا کی ہر صفت اس کی ذات سے جدا نہیں ہے اس لیے یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ الفاظ یعنی عربی زبان بھی خدا کی طرح قدیم ہے۔

اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ قرآن کا ہر ہر لفظ "نطق خداوندی" ہے جو جبرئیل کے ذریعہ سے آنحضرت تک پہونچایا گیا تھا تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ رسول اللہ نے بھی اسی طرح اس کو نطق کیا تھا۔ جس طرح خدا نے کیا تھا، بلکہ ہم لوگ سب اسی طرح اس کو ادا کرتے ہیں جس طرح خدا نے ادا کیا تھا اور اس طرح گویا رسول اللہ اور ہم سب اس صفت میں خدا کے مماثل قرار پائیں گے جو بالکل محال ہے۔

کچھ اپنے اور اپنے مذہبی عقائد کے متعلق

زیر نظر سطور نیاز صاحب کے ایک طویل مضمون بعنوان روح و بقائے روح علمی اور اسلامی نقطۂ نظر سے - کا وہ ٹکڑا ہے جس میں انہوں نے اپنے مختصر حالات زندگی اور عقائد پر روشنی ڈالی ہے۔

اقتباس از "ماخذ القران پر ایک اصولی گفتگو"

اسلام میرے نزدیک

پچھلے پندرہ سال کے اندر مجھے اتنی بار کافر، مرتد، ملحد، و دہریہ کہا گیا کہ کبھی کبھی مجھے بھی سوچنا پڑا کہ کیا حقیقتاً میں اسلام سے خارج ہو چکا ہوں، کیا واقعی میرے لیے اب اس مذہب میں کوئی جگہ باقی نہیں رہی لیکن باور کیجئے، کبھی مجھ کو اس کا یقین نہیں آیا اور میں نے جس قدر زیادہ غور و فکر سے کام لیا، میں اپنے خیال پر زیادہ مستحکم ہو گیا اور بار بار رسول اللہ کا وہی ارشاد سامنے آیا جو آپؐ نے اپنے چچا ابو طالب سے کہا تھا کہ "خدا کی قسم اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ پر سورج اور دوسرے پر چاند لاکر رکھ دیں تو بھی اپنے خیال سے باز نہ آؤں گا۔"

اس موقعہ پر قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر میں اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہوں تو میرا اسلام کس قسم کا ہے؟ اس کے کیا اصول ہیں اور یہ اصول قرآن و حدیث پر کیونکر منطبق ہو سکتے ہیں۔

اگر میری سابقہ تحریروں کا مطالعہ کیا جائے تو ان میں ان سوالات کا جواب مل سکتا ہے لیکن چونکہ وہ سب کے سامنے نہیں ہیں اس لیے مجملاً مجھے اس کی وضاحت یہاں کر دینا چاہیئے۔

اسلام کی اساسی شرط یہ بتائی جاتی ہے کہ "خدا کے سوا کسی اور کو معبود نہ سمجھا جائے اور محمدؐ کو اس کا رسول تسلیم کیا جائے" اور اس حد تک مجھ میں اور عام مسلمانوں میں شاید کوئی فرق نہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ تسلیم کرنے کے بعد بھی ایک شخص مسلمان نہیں ہو سکتا۔ اور غالباً یہی وہ خیال تھا جس کی بناء پر حضرت عمرؓ نے "**من قال لا اله الا الله فقد دخل الجنته**" کی روایت کو بہ جبر روک دیا۔ کیونکہ محض خدا کو زبان سے ایک کہہ دینا کوئی ایسی بات نہیں جس کا انعام جنت قرار پائے رسول اللہ کی بعثت سے قبل بھی بہت سے لوگ توحید کے قائل تھے اور اس کے بعد بھی کافی تعداد ایسے لوگوں کی پائی جاتی تھی لیکن اپنے اخلاق کے لحاظ سے وہ اتنے گرے ہوئے تھے کہ ان کو کوئی توقع جنت یا کسی دوسرے انعام کی نہ ہونا چاہیئے تھی۔

ہر جماعت میں داخل ہونے کے لیے بعض مخصوص شرائط ہوا کرتے ہیں جن کا تعلق ظاہر و باطن دونوں سے ہوا کرتا ہے اور اس قسم کے بعض شرائط جماعت اسلامی میں داخل ہونے کے لیے مقرر تھے۔ ظاہری شرائط یہ تھے۔

(۱) توحید و رسالت کا اقرار (۲) متعینہ طریقوں سے مراسم عبادت ادا کرنا (۳) بعض مخصوص مابعد الطبیعیاتی عقائد کا ماننا، لیکن معنوی شرط صرف ایک تھی اور وہ یہ کہ اسوۂ رسول کی پابندی کی جائے، پھر چونکہ اجتماعی مفاد صحیح طور پر معنوی شرائط ہی سے وابستہ ہوتا ہے اور ظاہری شرائط

محض علامات و آلۂ کار کی حیثیت رکھتی ہیں اس لیے میرے نزدیک مسلمان ہونے کی پہلی اور آخری شرط یہی ہے کہ وہ رسول کی سیرت کو سامنے رکھ کر اس کی پابندی کرے اور اسی لیے میں نے بارہا اس خیال کو ظاہر کیا ہے کہ میں اگر مسلمان ہوں تو صرف محمد رسول اللہ کی حد تک " لا الہ الا اللہ " کی بحث میں پڑنا نہ صرف یہ کہ بیکار بلکہ ایک حد تک نقصان رساں بھی ہے کیونکہ یہ مسئلہ اتنا مشکل یا دلچسپ ہے کہ پھر انسان کو "ترک ماسوا" کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہیں رہتا اور مذہب و ذہب سب رخصت ہو جاتے ہیں حالانکہ اس دنیا میں زندہ رہنے کے لیے کوئی نہ کوئی ایسا لائحۂ عمل ہمارے سامنے ہونا بالکل ضروری ہے جو یہاں کی مادی کشمکش میں، ہماری بقاء حیات کا ضامن ہو اور یہی وہ لائحۂ عمل ہے جس کو میں "سیرت نبوی" سے تعبیر کرتا ہوں اور اسی کی پابندی کو اصل اسلام قرار دیتا ہوں۔

میری نامسلمانی کی ابتداء

میری نامسلمانی کی تاریخ بہت دلچسپ ہے اور ممکن ہے کہ کسی وقت اپنے سوانح حیات کے ساتھ ساتھ بالتفصیل اسے پیش کر سکوں تاہم نہایت اختصار کے ساتھ اس وقت بھی سن لیجئے۔

مجھے بالکل علم نہیں کہ میرے والد سے قبل میرے خاندانی افراد جاہل تھے یا عالم، مذہبی تھے یا غیر مذہبی، لیکن خود اپنے والد کے متعلق مجھے یقین کے ساتھ معلوم ہے کہ وہ سخت مذہبی انسان تھے گو اصطلاحی حیثیت سے وہ فرنگی محل یا دیوبند کے سند یافتہ عالم نہ تھے لیکن ان کا علم بڑے بڑے عالموں سے زیادہ وسیع تھا۔ فارسی کے وہ بڑے زبردست شاعر و انشاء پرداز تھے، صہبائی سے عنفوان شباب میں مشورہ لیتے تھے، غالب کے پرستار تھے اور کتب بینی کے سوا ان کا کوئی مشغلہ نہ تھا۔ رہی مذہبیت سو اس کی سختی کا اندازہ آپ اس بات سے کر سکتے ہیں کہ میری عمر ساڑھے سات سال سے زیادہ نہ تھی لیکن وہ اس وقت مجھے جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے پر مجبور کرتے تھے۔

اب یہاں اس تفصیل کا موقعہ نہیں کہ میری تعلیم و تربیت کے متعلق ان کا کیا نظریہ تھا اور انھوں نے اس کے لیے کیا کیا اہتمامات کئے مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ میری ابتدائی تعلیم نہایت سخت مذہبی ماحول میں ہوئی اور ایک نہایت متعصب مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرا نشو و نما ہونے لگا۔ میں نمازیں بھی پڑھتا تھا۔ روزے بھی رکھتا تھا ظاہری وضع و لباس میں بھی سر سے لے کر پاؤں تک نہایت خشک و بھیانک قسم کا مسلمان تھا اور چونکہ صحبت عالموں اور مولویوں ہی کی تھی اس لیے شب و روز میرے دل و دماغ پر مذہب ہی مسلط رہتا تھا اور میں دنیا کی ہر بات کو مذہب ہی کے نقطۂ نظر سے دیکھتا تھا، لیکن اس کے ساتھ یہ بات ضرور دل میں کھٹکتی رہتی تھی کہ مذہبی لوگوں اور مولویوں کے اخلاق پست کیوں ہیں خصوصیت کے ساتھ ان کی رعونت اور ان کا پندار تفوق مجھے بہت برا معلوم ہوتا تھا، ان کی یہ خواہش کہ ہر شخص دور ہی سے دیکھ کر ان کے سامنے جھک جائے، مجھے اچھی نہ معلوم ہوتی تھی اور آخر کار یہ سمجھنے پر مجبور ہوا کہ ان کی عبادتیں بے روح ہیں اور بے روح عبادت بالکل بے کار چیز ہے۔

میری فطرت شروع سے ہی یہ ہے کہ ہر بات کے سبب و نتیجہ پر غور کرتا ہوں اور جب تک کوئی معقول وجہ نہ ہو میں مشکل ہی سے کسی بات کو مان سکتا ہوں، چنانچہ حضرات علماء کرام کے ان اطوار و انداز کو دیکھ کر میں اس نتیجہ پر پہونچا کہ لوگ نمازیں پڑھتے ہیں صرف نماز کی غرض سے اور مذہب کا مفہوم ان کے یہاں سوا اس کے کچھ نہیں کہ مراسم عبودیت کو مخصوص اوقات پر مخصوص طریقہ سے ادا کر دیا جائے اور بس۔ انھیں اس سے بحث نہیں کہ ان کے قلب و روح میں بھی کوئی کیفیت پیدا ہوتی ہے یا نہیں اور اس کا نتیجہ قدرتاً یہی ہونا چاہئے کہ ان کے دلوں میں شقاوت پیدا ہو اور اس پندار کی بناء پر کہ وہ خدا کے بڑے عبادت گزار مقبول بندے ہیں، ہم لوگوں سے وہ اپنے آپ کو بلند سمجھنے لگیں۔

یہ تھی ابتداء میرے تنفر کی جو مولویوں کی طرف سے مجھ میں پیدا ہوا اور مطالعہ و تجربہ کے ساتھ ساتھ برابر بڑھتا رہا یہاں تک کہ احادیث کا نصاب میرے سامنے آیا اور مشکوٰۃ کا درس شروع ہوا چونکہ اب مجھ میں غور و فکر کی اہلیت زیادہ پیدا ہو گئی تھی اس لیے خود میری عقل نے فیصلہ کیا یہ تمام احادیث یقیناً رسول اللہ کا ارشاد نہیں ہو سکتیں کیونکہ ان میں سے اکثر بالکل طفلانہ خیالات کا مجموعہ اور جب میں نے اپنے شبہات اساتذہ کے سامنے

یش کئے تو انھوں نے زجر و توبیخ کے علاوہ تشفی بخش جواب نہ دیا۔ اور ہمیشہ یہی کہہ کر خاموش کرنا چاہا کہ مذہب میں عقل آرائی کافروں اور ملحدوں کا م ہے۔

یہ تھا سب سے پہلا فتوائے کفر و الحاد جس نے مجھے یہ سمجھنے پر مجبور کیا کہ مولویوں کی جماعت واقعی مسلمان ہے یو میں یقیناً کافر ہوں اور اگر میں سلمان ہوں تو یہ سب نامسلمان ہیں کیونکہ ان کے نزدیک اسلام نام ہے صرف کورانہ تقلید کا، اور تقلید بھی رسول و احکام رسول کی نہیں بلکہ بخاری ر مسلم و مالک وغیرہ کی اور میں سمجھتا تھا کہ حقیقی کیفیت یقین کی اس وقت تک پیدا ہی نہیں ہو سکتی جب تک ہر شخص اپنی جگہ غور کر کے کسی نتیجہ پر نہ پہونچے۔

محمدؐ کی عظمت کا تصور

قصہ مختصر یہ کہ اولین بیزاری اسلامی لٹریچر کی طرف سے مجھ میں احادیث نے پیدا کی اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ مطالعۂ اسلام کے لیے مجھے اقوال سول نہیں بلکہ "افعال رسول" پر غور کرنا چاہیئے چنانچہ میں نے سیرت نبوی کے متعلق چھان بین شروع کی اور ہر چند سیرت کی کتابوں میں بھی مجھے بڑا حصہ مزخرفات ہی کا نظر آیا، کیونکہ یہاں بھی وہی احادیث و استناد احادیث کا جھگڑا موجود تھا، تاہم میں نے یہ ضرور سمجھ لیا کہ محمدؐ کی ہستی واقعی نہایت عجیب و غریب ہستی تھی اور ایسے پاکیزہ اطوار و خصائل کا انسان بن نہیں سکتا بلکہ پیدا ہوتا ہے اور یہی مفہوم ان کے اور تمام انبیاء کے معبوث ہونے کا ہے، اس کے بعد قدرتاً مجھے قرآن کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے تھا کیونکہ اس باب میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ قرآن میں جو کچھ پایا جاتا ہے وہ یقیناً رسول کی زبان سے ادا ہوا ہے اور اگر اسے عام مروجہ مفہوم میں خدا کا کلام نہ مانا جائے تو رسول کا کلام ہونے میں شک ہو ہی نہیں سکتا اور اس لیے اسلام کے قیمتی مقاصد سمجھنے کے لیے تنہا یہی ذریعہ اختیار کرنا چاہیئے۔

چند اعتقادوں کی وضاحت

عذاب قبر، نکیرین، حشر و نشر، میزان و صراط، ہادیہ و جہنم طوبیٰ و فردوس، کوثر و سلسبیل، حور و قصور وغیرہ کا بیان جس انداز سے قرآن میں کیا گیا ہے، وہ سب عربوں کی ذہنیت کو سامنے رکھ کر کیا گیا ہے اور اسلام سے پہلے جن مذاہب نے اس نوع کا انداز بیان اختیار کیا تھا، انھوں نے بھی انسان کی اسی عام ذہنیت کو سامنے رکھ کر حساب و کتاب اور سزا و جزا کی یہی مادی صورتیں پیش کی تھیں۔

اس سلسلہ میں یہ سوال ضرور سامنے آتا ہے کہ انبیاء نے جو مابعد الطبیعیاتی عقائد پیش کئے تھے وہ ان کو واقعی ویسا ہی سمجھتے تھے جیسا کہ انہوں نے ظاہر کیا یا صرف اصلاح کی غرض سے مصلحتاً یہ انداز بیان اختیار کیا تھا۔ اس کا جواب زیادہ مشکل نہیں، اگر ضرورت سے زیادہ خوش اعتقادی سے کام نہ لیا جائے۔

اس سے تو شاید کسی کو انکار نہ ہوگا کہ انسان کی ذہنی و عقلی ترقیاں تدریج کے ساتھ ہوئی ہیں اور انبیاء و مصلحین قوم بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ جو علمی حقائق آج دریافت ہوئے ہیں وہ آج ہی دریافت ہو سکتے تھے۔ اس سے قبل ان کا علم ناممکن تھا، اس لیے رسول اللہ سے قبل انبیاء نے جن عقائد کی تعلیم دی تھی، وہ یقیناً ان کو حقیقت سمجھتے تھے اور کوئی مصلحت۔ ان کے سامنے نہ تھی، لیکن قرآن و احادیث میں البتہ بعض بیانات ایسے ملتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہ کے ذہن میں دوزخ و جنت کا مفہوم ادیان سابقہ کے سمجھے ہوئے مفہوم سے مختلف تھا۔ یہ موضوع ایک بسیط گفتگو چاہتا ہے، تاہم اجمالاً بعض تصریحات کا ذکر یہاں بھی ضروری ہے۔

جنت

اس میں شک نہیں کہ فردوس کے بیان میں قرآن بھی بہت سی باتیں ایسی پیش کرتا ہے، جن کا تعلق مادی دنیا اور جسمانی لذتوں و راحتوں سے معلوم ہوتا ہے لیکن یہ انداز بیان یقیناً تمثیلی ہے اور جس کا ثبوت قرآن و حدیث دونوں سے ملتا ہے۔

سورۂ سجدہ میں برے اور اچھے اعمال کی سزا و جزا کا ذکر کرتے ہوئے نعائم جنت کی حقیقت ان الفاظ میں ظاہر کی گئی ہے۔

"فلا تعلم نفس ما اخفی لھم من قرۃ اعین، جزاء بما کانو یعملون"۔

یعنی کوئی اس حقیقت کو نہیں جان سکتا کہ اچھے کام کرنے والوں کی جزا کس کس طرح ان کی آنکھوں کو ٹھنڈک پہونچائے گی۔
ظاہر ہے کہ آنکھوں کی ٹھنڈک سے یہاں ظاہری آنکھ کی ٹھنڈک مراد نہیں بلکہ اس سے مقصود دل و دماغ اور قلب و روح کے سکون کو ظاہر کرنا ہے۔

سورۂ محمدؐ میں اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ جنت کے متعلق جو بیانات پیش کئے جاتے ہیں وہ سب تمثیلی ہیں۔

"مثل الجنتہ اللتی وعدالمتقون، فھا انھار من ماء غیر آسن وانھار من لبن لم تیغیر طعمہ، وانھار من خمر لذۃ للشاربین وانھار من عسل مصفی ولھم فیھا من کل الثمرات"۔

یعنی پرہیزگاروں کے لیے جو وعدہ کیا گیا ہے کہ ان کے لیے جنت میں دودھ، شراب اور شہد کی نہریں ہوں گی لیکن یہ سب تشبیہات ہیں۔
رسول اللہ کی ایک حدیث جسے بخاری نے نقل کیا ہے اس مسئلہ کو اور زیادہ صاف کر دیتی ہے آپ سے دریافت کیا گیا کہ نعائم جنت کی حقیقت کیا ہے تو آپ نے جواب دیا کہ وہ لذتیں ایسی ہیں کہ :

"مالا عین راءت، ومالا اذن سمعت وما خطر علی قلب بشر"۔

نہ کسی آنکھ نے آج تک ان کو دیکھا ہے نہ کسی کان نے ان کا ذکر سنا ہے اور نہ انسان ان کے متعلق کوئی صحیح رائے قائم کر سکتا ہے۔
تلاش سے متعدد ایسی آیات و احادیث پیش کی جا سکتی ہیں جن سے جنت کا صحیح مفہوم متعین ہو سکتا ہے۔

دوزخ

جنت کی طرح دوزخ کا مفہوم بھی قرآن میں مادیات سے تعلق نہیں رکھتا اور اس کے ثبوت میں غالباً قرآن میں صرف ایک آیت کو پیش کرنا کافی ہوگا، جس میں آتش دوزخ کی حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

"نار اللہ الموقدۃ اللتی تطلع علی الافئدۃ"۔

"یعنی دوزخ کی آگ وہ خدائی آگ ہے جو انسان کے دلوں پر مستولی ہوتی ہے"۔
اگر دوزخ کی آگ سے یہی دنیا کی آگ مراد ہوتی تو اس کو خدا سے منسوب کرکے نار اللہ نہ کہا جاتا، اور نہ یہ کہ وہ دلوں سے تعلق رکھتی ہے۔ ظاہر ہے کہ دل کی آگ وہی ہو سکتی ہے جو انسان کو روحانی کرب میں مبتلا کر دے اور ظاہری آگ سے اسے کوئی تعلق نہیں۔

دیگر معتقدات

دوزخ و جنت کی طرح اور تمام عقائد جو میزان، صراط حشر و نشر اور ملائکہ وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں، وہ بھی سب مادیات سے علیحدہ، اپنا مفہوم جداگانہ رکھتے ہیں اور اگر غور کیا جائے تو یہ بات خود قرآن سے ثابت ہو سکتی ہے۔

اس میں کلام نہیں کہ اسلام میں حیات بعد الموت کا جو تصور پیش کیا گیا ہے۔ وہ ادیان سابقہ سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے اور اس سلسلہ میں تقریباً تمام انہیں عقائد کو پیش کیا گیا ہے جو اسلام سے قبل رائج تھے، لیکن جیسا کہ میں اس سے قبل ظاہر کر چکا ہوں قرآن میں ان کو حقائق کی صورت سے نہیں بلکہ تمثیل و تعبیر کی حیثیت سے بیان کیا گیا ہے۔

چونکہ عام ذہن انسانی، مادیات سے ہٹ کر کوئی روحانی تصور جزا و سزا کا قائم نہیں کر سکتا، اس لیے اس کو سمجھانے کے لیے ضروری تھا کہ مثال میں دنیا کی وہی چیزیں پیش کی جاتیں جن کو انسان روز دیکھتا رہتا ہے اور وہ جانتا تھا کہ جب کوئی شخص جرم کرتا ہے تو حکومت اپنے آدمیوں کے ذریعہ سے اسے گرفتار کراتی ہے اس کے اعمال کا احتساب کرتی ہے اور جب جرم ثابت ہو جاتا ہے تو نوعیت جرم کے لحاظ سے سزا دی جاتی ہے اور اگر آپ مذاہب کے مابعد الطبیعیاتی عقائد کا تجزیہ کریں گے تو وہ سب اسی دنیاوی طریق احتساب و سزا کی مختلف صورتیں نظر آئیں گی۔

ف۔ س۔ اعجاز کی مطبوعات

تنہائیاں (غزلیں۔ نظمیں)

مالک یوم الدین (نظمیں)

اسلامی تصوف اور صوفی — تصوف پر ایک مضمون اور مثنوی مولانائے روم سے منتخب حکایات

موسم بدل رہا ہے (غزلیات)

لاشریک (نظمیں)

یوروپ کا سفر نامہ — ماسکو، ناروے، ڈنمارک، لندن، پیرس کا سفر نامہ

خوابوں کے اسرار — نفسیاتی مضامین

آئندہ تصنیفات

نیتاجی سبھاش چندر بوس کی سوانح عمری (سیاست)
(سیسر کمار بوس کی انگریزی تحریر کا ترجمہ)
(ناشر : نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا، حکومت ہند)

اونچے مکانوں کے قریب (غزلیات)

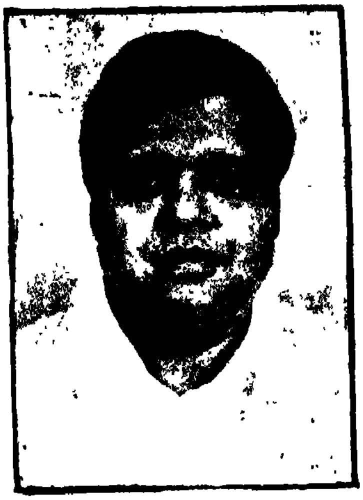
مؤقف (تنقیدی مضامین)

ذہانت ننگے پاؤں چل رہی ہے (انشاء کے اداریے)

ماہنامہ

اِنشاء

کی انتھک محنتوں اور
نتیجہ خیز کوششوں کے اعتراف
کے ساتھ
اہل اردو کو مبارکباد
پیش کرتا ہوں



اردو پریمی : **راجیش کھیتان**

ممبر مغربی بنگال اسمبلی

کانگریس (ا)

PRINTED AT INSHA PUBLICATIONS, 6-A, KANAI SEAL ST., CAL - 73
PRINTED, PUBLISHED BY EDITOR & PUBLISHER F.S. EJAZ FROM 25-B, ZAKARIA ST., CAL - 73